فاران
کراچی
پاکستان

ماہر القادری

توحید نمبر

فاران

جلد ۹ —— نمبر ۳

جون ۱۹۵۷ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

☆

چندہ

سالانہ .. چھ روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

قیمت توحید نمبر

تین روپے آٹھ آنے

نظم و ترتیب

نقش اول۔	ماہر القادری	۲
توحید خالص۔	ترجمہ مولانا ظفر احمد عثمانی	۵۹
اسلامی توحید کی حقیقت۔	علامہ محمد البشیر الابراہیمی۔	۶۳
توحید۔	مولانا سید ابو الحسن علی ندوی	۷۴
عقیدۂ توحید کا اثر ہماری عملی زندگی پر۔	مولانا امین احسن اصلاحی۔	۸۳
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیتیں۔	ترجمہ مولانا ظفر احمد عثمانی۔	۸۶
چار اہم سوالات	مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی	۹۱
عملی شرک	...	۹۶
علم غیب	مولانا قادری محمد طیب	۹۷
توحید الوہیت	ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے۔	۱۳۰
بدعات و محدثات	مولانا مفتی محمد شفیع	۱۴۷
زیارتِ قبور	مولانا محمد اسمٰعیل سلفی	۱۵۶
الوسیلہ کا حقیقی مفہوم	محترمہ عطیہ خلیل عرب	۱۷۳
عقیدت کا غلو اور اس کے نتائج	مولانا محمد نجیب اللہ ندوی	۱۸۴
اسلام میں توحید	مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	۲۰۶
پیامِ توحید	مولانا محمد اویس ندوی نگرامی	۲۱۱
عقیدۂ توحید اور انسانیت	ابو محمد امام الدین رام نگری	۲۲۵
بدعت توحید کی ضد ہے۔	مولانا عامر عثمانی	۲۴۶
ایصال ثواب کے لئے قرآن پاک کا ختم	"الصدیق" ملتان	۲۸۷
قبر پرستی	ابو منظور رشید احمد	۲۸۹
اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کیلئے نذر و نیاز۔		۳۲۴
اللہ واحد لا شریک لہٗ	مولانا عبد المجید ارشد	۳۳۷
شرک کیا ہے؟	مولانا محمد ناظم ندوی	۳۵۲
انسانی زندگی پر توحید کے اثرات	مولوی عبد الرحمان حماد	۳۵۶
بدعت اور اس کی خرابیاں	مولانا مفتی محمد شفیع۔	۳۶۲
توحید اور مسلمانوں کی مروجہ رسمیں	مولانا محمد اسحاق ندوۃ العلماء	۳۷۰
اذانِ بت کدہ۔	مختلف شعراء	۳۸۳

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اس پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سب سے زیادہ اہم "توحید" کا ذکر فرمایا ہے یہی وہ "محور" ہے جس کے اردگرد اسلام، ایمان اور اخلاق کے تمام تقاضے گردش کرتے ہیں۔ "توحید" اسلام اور ایمان کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد میں اگر فرق آگیا اور یہ عقیدہ خدانخواستہ مجروح ہوگیا۔ تو پھر ایمان، اسلام اور عبادت و تقویٰ سب کے سب نامعتبر قرار پاتے ہیں اور یہ وہ خسارہ اور نقصان ہے جسے نہ رسولؐ کی محبت پُر کرسکتی ہے اور نہ کسی ولی کی عقیدت! اور نہ کوئی نیکی اس کا بدل ہوسکتی ہے!

انبیاء کرام کی بعثت کی غرض و غایت ہی یہ تھی انسانوں کے سامنے خالق کائنات کی توحید۔ معبودیت، اور اس کے "الٰہ" ہونے کے عقیدے کو پیش کریں۔ چنانچہ یہ نفوسِ قدسیہ بعثت سے لے کر نفسِ واپسیں تک "توحید" ہی کا درس دنیا کو دیتے رہے۔ یہی نقطۂ توحید اُن کی دعوت کا آغاز بھی تھا، وسط بھی تھا اور نقطۂ اختتام بھی تھا!

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ۔

اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول مگر اس کو بھی حکم دیا تھا کہ (بیشک بات یوں ہی ہے) کہ کوئی "الٰہ" نہیں سوائے میرے، سو بندگی کرو میری!

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں صرف اسی پر بس نہیں کیا کہ "مجھے اللہ مانو اور میری بندگی کرو" بلکہ اُس نے بار بار، طرح طرح سے عنوان بدل کر اور مثالیں دے کر، یہ بھی فرمایا کہ مجھ جیسا کوئی نہیں۔ میری خدائی میں کوئی شریک نہیں۔ میرے سوا نہ کوئی کسی کی مشکل کھول سکتا ہے، نہ کسی کو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے، میں ہی خالق ہوں۔ رازق ہوں، حاجت روا او

مشکل کشا ہوں۔ میں کسی کو کچھ دینا چاہوں تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں کسی کو نہ دوں تو کوئی اُسے دلوا نہیں سکتا۔ ہر جاندار کی چوٹی میرے ہاتھ میں ہے۔ کائنات میں بلا شرکتِ غیرے متصرف میں ہوں۔ میری ہی ربوبیت کے سہارے دونوں جہاں پل رہے ہیں اور میری ہی قدرت کاملہ کونین کے نظام کو چلا رہی ہے۔ "حی" صرف میں ہوں کہ میری ذات کے سوا ہر جان اور ہر شے ہالک اور فانی ہے۔ "قیوم" صرف میری ذات ہے! پانی میں برساتا ہوں۔ رزق میں دیتا ہوں۔ کھیتیاں میں اُگاتا ہوں۔ دریا میرے حکم سے رواں دواں ہیں۔ ہوائیں میرے حکم سے چلتی ہیں۔ چاند سورج میرے حکم کے تابعدار ہیں۔ غرض تمام کائنات میں میری اور صرف میری حکومت اور خدائی ہے۔ اور اس میں میرا کوئی شریک ساجھی اور ہاتھ بٹانے والا بھی نہیں ہے! عزتیں اور ذلتیں سب کو میرے در سے ملتی ہیں۔ عالم الغیب والشہادہ صرف میری ذات ہے کونین کی تمام مخلوق میری محتاج ہے۔ اور ہر کوئی میرے ہی در کا فقیر اور بھکاری ہے! خالق میں ہوں، میرے سوا کوئی انسان ایک مکھی اور بھنگے تک کو پیدا نہیں کر سکتا!

یہ ہے "توحید" کے اجمال کی تفصیل، جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اور بار بار پیش فرمائی ہے! اس عقیدہ توحید کا نہ صرف یہ کہ اقرار کرنا اور اُس پر ایمان لانا ضروری ہے بلکہ اپنے عمل سے بھی اس اقرار و ایمان کا پُورا پُورا ثبوت دینا چاہیئے! دعا اور عبادت میں، دفعِ بلا اور طلبِ نعمت میں، استمداد و استعانت میں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح کسی بندے سے چاہے وہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو۔ اگر معاملہ کیا جائے گا تو اس سے "توحید" کا عقیدہ مجروح ہوگا۔ اور ظروف و احوال، اور کیفیات کے اعتبار سے "شرک"، یا "شبہ شرک" کا ارتکاب لازم آئے گا!

عرب کے مشرکین خدا کے وجود کے منکر نہ تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق بھی مانتے تھے، مگر وہ بُتوں کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں "سفارشی" سمجھ کر اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرتے تھے۔ جو اللہ کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ یعنی بُتوں کے روبرو سجدہ ریزی، اُن کی دُہائی دینا، اُن سے مدد چاہنا، اُن کو کائنات میں متصرف اور دخیل سمجھنا۔ ان مشرکانہ حرکات کے ساتھ اُن کا "خدا کو ماننا" اللہ کے یہاں مقبول نہ ہو سکا، اور اُن کو مشرک قرار دیا گیا۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا
عِنْدَ اللهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحٰنَهُ
وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

اور پوجتے ہیں جو اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو نہ کچھ فائدہ دیویں اُن کو نہ کچھ نقصان۔ اور کہتے ہیں "یہ سفارشی ہیں اللہ کے پاس"۔ کہہ۔ کیا بتلاتے ہو تم اللہ کو جو نہیں جانتا وہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں؟ سو وہ پاک ہے ان سب سے جن کو یہ شریک بتاتے ہیں!

دُوسری آیت میں کفارِ قریش کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:-

وَمَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللهِ زُلْفٰى!

پُوجتے ہیں ہم اُن کو صرف اس لئے کہ وہ ہم کو اللہ سے نزدیک کر دیں!

یہ بُت جن کی کفارِ قریش پرستش کیا کرتے تھے۔ جن سے مرادیں مانگتے تھے اور جن کے ناموں کی دُہائی دیتے تھے۔ اُن کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایتوں سے ثابت ہوتا ہے

کو مشرکین نے نیک اور برگزیدہ اشخاص (رجال صالحین) کے ناموں پر بتوں (ود، سواع، یغوث، نسر، اساف، نائلہ) کے نام رکھ لئے تھے!

البدایہ والنہایہ میں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (ص۱۰۶) پر راویوں کے ناموں کے ساتھ روایت نقل کی ہے:-

وداً رجلاً صالحاً وکان محبباً فی قومہ فلما مات عکفوا حول قبرہ -

(وَدّ ایک مرد صالح تھا، جو اپنی قوم میں محبوب تھا، جب وہ مرگیا تو اس کی قبر کے ارد گرد لوگ گھومنے (طواف کرنے) لگے!

اس روایت میں تفصیل ملتی ہے کہ کس طرح شیطان نے ان لوگوں کو بہکایا اور ان لوگوں نے آگے چل کر وَدّ کی تمثال کی پوجا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ:-

حتیٰ اتخذوہ الٰہاً یعبدونہ من دون اللہ !

(یہاں تک کہ لوگوں نے اُسے "الٰہ" بنا لیا اور اللہ کے سوا اُسے پوجنے لگے)

پھر آگے چل کر علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

ومقتضی ھذا السیاق ان کل صنم عندہ عبدہ طائفۃ من الناس -

(اس سیاق عبارت سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس طرح کے تمام بُت انسانوں کے گروہوں سے تھے)

اس تصریح سے یہاں کھل کر سامنے آتی ہے کہ کفارِ قریش جن مشہور بُتوں کی پرستش کرتے تھے، اُن کے نام شروع شروع میں اولیاء اور صلحاء کے ناموں پر رکھے گئے تھے۔ اور ان بتوں کی پرستش کے پیچھے صالحین کی ارواح کی پوجا اور اُن سے طلب و استمداد کا تصور بھی کسی نہ کسی حد تک موجود تھا!

اہلِ بدعت کی طرف سے جو یہ کہا جاتا ہے کہ ہم دُنیا میں جو ایک دوسرے سے امداد طلب کرتے ہیں، ایک شخص دوسرے کے پاس اپنی حاجت لے جاتا ہے، اُس سے عرض معروض کرتا ہے، جب ایسا کرنا شرک نہیں ہے، تو پھر انبیاء اور اولیاء اور صلحاء سے طلبِ امداد شرک کیوں ہونے لگا! اس لئے کہ "شرک" تو یہ ہے کہ کوئی کسی کو "خدا یا بالذات قادر، مختار اور معطی" سمجھ کر اُس سے امداد چاہے۔ بندوں میں بالذات قدرت نہیں ہے، اللہ کی عطا کی ہوئی قدرت ہے۔ تو اللہ کی دی ہوئی قدرت کی بناء پر انسانوں سے استمداد و استعانت شرک نہیں ہے! ؟

یہ نہایت فریب آمیز مغالطہ ہے۔ جو اہلِ بدعت کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اُن کے تمام علم کلام کی بُنیاد ہی اسی "ذاتی" اور "عطائی" کی تقسیم اور تفریق پر ہے۔ یہ وہی استدلال ہے جو نمرود بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس سے فرمایا:-

"..... رَبِّیَ الَّذِی یُحْیٖ وَیُمِیتُ

میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جِلاتا ہے (یعنی جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے)

تو اس کے جواب میں نمرود نے کہا:-

"..... اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیتُ !" میں بھی مارتا اور جِلاتا ہوں (یعنی زندگی اور موت میرے اختیار میں بھی ہے)

اہلِ بدعت کی طرح نمرود نے بھی "ذاتی اور عطائی" قدرت کے لفظی مغالطہ کو اپنے استدلال کی بنیاد بنایا۔ اور یہ اتنی

احمقانہ بات ہے کہ اس کا جواب دینا خود انسانی عقل کی توہین ہے۔ اس لئے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جاہلانہ اور احمقانہ استدلال کی تردید کئے بغیر اپنی گفتگو کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔

قَالَ اِبْرٰهِيْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ !

ابراہیم نے کہا۔ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا مغرب سے نکال لا۔ یہ سُن کر وہ منکرِ حق ہکا بکا رہ گیا !

اہلِ بدعت کے اس مغالطہ کی تردید خود اُن آیتوں سے ہوتی ہے، جو اُوپر پیش کی گئی ہیں۔ مشرکینِ عرب اپنے "بتوں" کو (اور یہ ذہن میں رکھیئے کہ صلحا و اولیاء کے ناموں پر ان بتوں کے نام رکھے گئے تھے) "خدا" نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ ان "بتوں" کو اللہ کی بارگاہ میں اپنا "شفیع" اور ذریعۂ تقرب خیال کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس فعل اور عقیدہ کو "شرک" سے تعبیر کیا۔ اور وہ اس لئے کہ وہ تعظیم میں، دفعِ بلا اور طلبِ رزق و منفعت میں ان "بتوں" کے ساتھ وہ معاملہ کرتے تھے، جو اللہ کے ساتھ کرنا چاہیئے !

کہا جا سکتا ہے کہ لکڑی اور پتھر کی بنی ہوئی مورتیوں میں کسی کو کچھ دینے، کسی کی عرض و معروض سُننے اور کسی کی امداد کرنے کی طاقت کہاں ہے ؟ بیشک نہیں ہے۔ مگر جب مشرکینِ عرب ان بتوں کو "الٰہ" نہیں سمجھتے تھے، تو پھر ان کے اس فعل کو "نادانی" اور "حماقت" کہنا چاہیئے تھا۔ اہلِ بدعت کے خود تراشیدہ نظریہ کی بناء پر تو کفارِ قریش کے اس فعل کو "شرک" نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے "شرک" فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول ہی حق ہے !

قرآن کریم کی آیتیں واضح طور پر بتاتی ہیں کہ غیر اللہ کو "الٰہ" نہیں۔ بلکہ مخلوق اور بندہ سمجھتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ تعظیم، پرستش اور دُعا و استمداد کا وہ معاملہ کرنا جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفت کا حق ہے، "شرک" ہے !

آج بزرگانِ دین کی قبروں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جا رہا ہے، جو مشرکینِ عرب "بتوں" کے ساتھ کرتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "الفوز الکبیر" میں لکھتے ہیں :-

"اگر تو مشرکینِ عرب کے عقائد اور اُن کے اعمال اور اُن کے حالات کی پوری پوری تصویر سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اِس زمانہ کے عوام و جہلاء کو دیکھ لے کہ وہ قبروں اور آستانوں پر جاتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ غرض اس زمانہ کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جو اس زمانہ کی ایک قوم اس کا ارتکاب نہیں کرتی۔ اور اُن کے مثل اعتقاد نہیں رکھتی، خدا ہم کو ایسے عقیدوں اور عملوں سے بچائے۔ (اُردو ترجمہ)

جس طرح "توحید" ایمان کا جوہر، اسلام کی روح اور اخلاق و عبادت کی جان اور مغز ہے کہ اس کے بغیر ان میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول اور معتبر نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے "شرک" کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے !

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۔ (النساء)

اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا۔ اس کے ماسوا جس قدر گناہ ہیں، وہ جس کے لئے چاہتا ہے

معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا۔ اُس نے بہت بڑا جھوٹ گھڑا۔ اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

ایک طرف "توحید" کی اہمیت قرآن پاک بتاتا ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی "غیر اللہ" کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ روا رکھنا چاہیئے۔ تو وہ "شرک" ہے۔ دُوسری طرف "شرک" کی یہ خوفناک مذمت کہ ہر بڑے سے بڑا گناہ معاف ہوسکتا ہے، مگر "شرک" معاف نہیں ہوسکتا۔ یہ ناقابلِ معافی گناہ ہے!

"توحید" کی اس عظیم الشان اہمیت اور "شرک" کی اس قدر خوفناک مذمت کے بعد ایک صاحب ہوش انسان اور ایک مُسلمان کا رویّہ کیا ہونا چاہیئے؟ یہی کہ وہ نہ صرف یہ کہ کھلے ہوئے شرک سے بچے، بلکہ اس کے دواعی، محرکات، ترغیبات اور مشابہت و مثال سے بھی اجتناب کرے!

"زہر" زندگی کا قاتل ہے۔ تو ہر وہ انسان جس کو اپنی زندگی عزیز ہوتی ہے۔ ہر اُس چیز سے جس میں زہر کے چھو جانے کا وہم بھی ہوتا ہے، اجتناب کرے گا۔ چاہے وہ چیز دیکھنے میں کتنی ہی خوش رنگ اور ذائقہ میں کتنی ہی مزیدار کیوں نہ ہو۔ بالکل اسی طرح جس کو اپنا ایمان عزیز ہوگا اور وہ یہ جانتا ہوگا کہ "شرک" سے ایمان کی موت واقع ہوجاتی ہے، تو وہ "شرک" کے وہم و شائبہ سے بھی دُور رہے گا۔ اور "شرک" کے معاملہ میں کسی تاویل، نکتہ، لطیفہ اور لفظی ہیر پھیر کے پاس بھی نہ پھٹکے گا اور نہ اُس کو دلیل بنائے گا!

وَاَخْرَجَ احمد عن معاذ بن جبل، قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم
لَا تُشْرِکْ بِاللّٰهِ شَیْئاً وَاِن قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ!

امام احمد نے ذکر کیا کہ معاذ ابن جبل نے روایت کی کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاہے تجھے قتل کیا جائے یا جلا یا جائے مگر تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا!

پس جس دل میں "توحید" گھر کرگئی اور رچ گئی ہوگی، وہ غیر اللہ کی عقیدت و احترام میں "توحید" کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھے گا۔ اور اس سے کوئی ایسا قول و فعل صادر نہ ہوگا۔ جس سے "توحید" پر ذرّہ برابر بھی حرف آتا ہو۔ اور "شرک" سے اتنی بھی مشابہت پیدا ہوتی ہو۔ جتنی اُردو پر سفیدی!

اور یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُمت کو یہی تعلیم دی ہے۔ اسی لئے "غیر اللہ" کی قسم کھانے کو شرک قرار دیا گیا۔ کہ "قسم" میں جس شدّتِ عظمت کا احساس مضمر ہوتا ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہی مخصوص رہے!

اخرج الترمذی عن ابن عمرؓ قال سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یقول من حَلَفَ بغیر اللہ فقد اَشرکَ! (مشکوٰۃ، باب الایمان والنذور)

ترمذی نے ذکر کیا کہ روایت کی ابن عمرؓ نے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرماتے تھے کہ جس نے قسم کھائی غیر اللہ کی سو اُس نے شرک کیا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو "ملک الملاک" (بادشاہوں کا بادشاہ) کہنے سے منع فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی

حاکمیت اور شہنشاہی سے مشابہت کا پہلو نکلتا ہے!
قربان جائیے اس موحدِ اعظم (علیہ السلام) اور "شرک و بدعت" کے ماحی و قاطع (روحی لہ الفداء) کے کہ جس نے "جو اللہ چاہے اور جو محمدؐ چاہیں" تک کے کہنے سے روکا ہے!

اخرج فی شرح السنۃ عن حذیفۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لاتقولوا ماشاء اللہ وشاءَ محمدٌ وقولوا ماشاء اللہ وحدہٗ۔ (مشکوٰۃ۔ باب الاسامی)

حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یوں نہ بولا کرو "جو چاہے اللہ اور جو چاہے محمدؐ" بلکہ یوں بولا کرو کہ "جو اللہ تعالیٰ تنہا چاہے"۔

مشکوٰۃ شریف کی ایک اور حدیث ہے:۔

اخرج مسلمٌ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَا یقولنَّ احدُکم عبدی و اَمتی کلکم عَبیدُ اللہ وکُلُّ نساءِکم إماءُ اللہِ وَلَا یقلِ العبدُ السیّد ہٗ "مولایَ" فإنَّ مولاکم اللہ۔

مسلم نے ذکر کیا کہ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یوں نہ بولے کہ "میرا بندہ اور میری بندی" تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری عورتیں سب اللہ کی بندی ہیں۔ اور غلام بھی اپنے آقاؤں کو "میرا مولا" (مالک) نہ کہے۔ کیونکہ تم سب کا "مولا" (مالک) اللہ ہے!

ایک طرف "توحید" کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شدتِ احتیاط، اور دوسری طرف وہ لوگ جو اپنے "عاشقانِ رسولؐ" ہونے کا دم بھرتے ہیں، اُن کی "توحید" کے معاملہ میں بے پروائی، تساہل اور ڈھیل کا یہ عالم ہے کہ ایسے ایسے نکتے تراشتے اور لطیفے اختراع کرتے ہیں، جن سے "توحیدِ خالص" غبار آلود بلکہ مجروح ہوتی ہے!

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ !

کے ترجمہ میں "ی" کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

"تم کہو اے میرے بندو .... (یعنی محمد رسول اللہ کے بندو)

حالانکہ پورا قرآن ان اہلِ بدعت کی اس "نکتہ شناسی" کی نفی کرتا ہے!

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ....

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہیگا کہ تم ربّانی بنو!!

جس کے دل میں "توحید" کا مزہ اور اُس کی اہمیت کا صحیح احساس ہوگا، کیا وہ اس قسم کے خطرناک نکتے تراش سکتا

ہے۔ ایسے لطیفے شعر و شاعری کی دُنیا میں تو زیب دیتے ہیں مگر "قرآن کے ساتھ یہ مشاعرانہ سلوک" روا نہیں رکھا جا سکتا۔ (معاذ اللہ)

اسی ذہنیت کے لوگوں نے — مشکل کشا، غریب نواز، داتا اور گنج بخش — جیسے القاب، جن کے اطلاق کی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہو سکتی ہے۔ صلحاء اور بزرگوں کے لئے تراش لئے ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو اس قسم کے شعروں پر ؎

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے — جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے (توبہ!)

جھومتا ہے، اور ؎

اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام — رکھ لیا خواجہ غریب نوازؒ (استغفر اللہ)

جیسے مشرکانہ شعروں پر "صدائے احتجاج و نفرت" بلند نہیں کرتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس نکتہ پر وجد کرتے ہیں کہ ؎

احد میں اور احمد میں فقط ہے "میم" کا پردہ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "احمد بے میم" اور عرب کو "عرب بے ر" کہتے ہیں۔ اُن کے شعروں میں، تقریروں اور تحریروں میں، جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں جو "توحید خالص" کو مشتبہ اور ملتبس بناتی ہیں، اور "شرک و بدعت" کے لئے گنجائش نکالتی ہیں!

انبیاء کی دعائیں

"وحی" اور "نبوت و رسالت" اتنا بڑا شرف ہے کہ اس شرف کے مقابلہ میں دُنیا کے تمام اوصاف مل کر بھی اس شرف کی برابری نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا تمام اُمت، قوم بلکہ پوری انسانی سوسائٹی میں اپنے ایک "بندے" کو نبوت و رسالت کے لئے منتخب فرمانا اور اُس پر ایسے مخفی طریقہ سے وحی کرنا کہ جس کا "نبی" کے سوا نہ کوئی احساس کر سکتا ہے اور نہ تحمل! اس سے بعض لوگ دھوکا کھا کر "نبی" سے الوہی صفات منسوب کر سکتے ہیں کہ "عقیدت و احترام" کے دوراہے پر شیطان کے لئے غالی معتقدین اور توہم پرست نیازمندوں کو گمراہ کر دینا بہت آسان ہے!

اس لئے قرآن پاک کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اُس نے انبیاء کے حالات بالکل سادہ الفاظ میں پیش کئے ہیں۔ جس میں سب سے زیادہ زور اُن کی "عبدیت" اور "بشریت" پر دیا گیا ہے۔ خود انبیاء کرام کی زبانی اس کی نفی کرائی گئی ہے! کہ وہ کائنات میں کوئی اختیار رکھتے ہیں، یا لوگوں کے نفع و نقصان کے مالک ہیں!

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہتے ہیں:۔

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۔

میں تیرے لئے معافی ضرور چاہوں گا اور مالک نہیں میں تیرے نفع کا اللہ کے یہاں کسی چیز کا!

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان سے اللہ تعالیٰ نے کہلوایا:۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۔

تو کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے بُرے کا نہ بھلے کا مگر جو اللہ چاہے!

یہاں تک کہا گیا:۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ ۔

تُو کہہ میں کچھ نیا رسول نہیں ہوں ، اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ (بھی کیا ہونے والا ہے)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ کہلوا کر :-

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ .... ''

تُو کہہ میں نہیں کہتا کہ میرے پاس خزانے ہیں اللہ کے ، اور نہ میں غیب جانتا ہوں ۔

" نورانی " اور " عطائی " کی جاہلانہ اور گمراہ کن تفریق کے بُت کو بھی پاش پاش کر دیا ۔ جب نبیؐ کے پاس بھی اللہ کے دیئے ہوئے خزانے نہیں ہیں تو پھر اور کس کے پاس ہو سکتے ہیں !

جب نفع و نقصان کا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی مالک نہیں ہے اور انبیاء کرام تک اس معاملہ میں اپنے عجز و عدم اختیار و قدرت کا اظہار کرتے ہیں ، تو پھر نبی اور رسول سے بڑھ کر ایسا کون " اللہ کا پیارا اور چہیتا " ہے ، جسے ، اللہ کے دیئے ہوئے خزانوں کا مالک ، انسانوں کے نفع و نقصان کا مختار اور احوالِ کائنات میں متصرف مان لیں ! اگر کوئی انبیاء ، اولیاء اور صلحائے امت کے بارے میں ایسے عقائد رکھتا ہے ، تو اللہ کی کتاب کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کرتا ہے اور قیامت کے دن انبیاء اور اولیاء ، سے اس کی عقیدت ، عشق و محبت اور نیاز مندی کے یہ دعوے اس کے منہ پر مار دیئے جائیں گے !

یہ بھی صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عین تمنا تھی کہ بیت المقدس کے بجائے " کعبہ " کو اُمتِ مسلمہ کا قبلہ قرار دیا جائے ، اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس تمنا اور آرزو کو پورا فرما دیا ۔ مگر اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا " قیاس مع الفارق " کی بدترین مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی " رضا " کا پابند تھا ، یا جو آپ کی رضا ہوتی تھی ۔ وہ ضرور بالضرور پوری ہو کر رہتی تھی ۔ بندے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے پابند ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کسی کی " رضا " اور " تمنا " کا پابند نہیں ہے !

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ)

یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ ۔ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ایسے فاسق لوگوں سے ہرگز راضی نہ ہوگا !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب و مقرب ، اطاعت گزار بندے تھے ۔ حضورؐ نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیا تھا ۔ حضورؐ کا قدم صراطِ مستقیم سے بال برابر اِدھر اُدھر نہیں ہوا ۔ آپ کی اکثر و بیشتر دعائیں بھی اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتا تھا کہ قبولیت و اجابت تو لطفِ محمدیؐ کی راہ دیکھتی رہتی تھیں ۔ اس شرف و اجتہاد کے باوجود قرآن یہ بھی بتاتا ہے :-

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۚ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۔ (التوبہ)

اے نبی ! تم ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو ، اگر تم ستر مرتبہ بھی اُن کے معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انھیں ہرگز معاف نہ کرے گا !

یہ آیت "مشرکانہ عقائد" پر ضرب نہیں، شاہ ضرب (master stroke) لگاتی ہے۔ یہ آیت کسی ذرا سے بھی اشتباہ کے بغیر دو ٹوک انداز میں بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بعض اوقات انبیاء کرام اور ان میں بھی امام الانبیاء اور افضل الرسل تک کی درخواست اور دعا قبول نہیں ہوتی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور درخواست تک کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز میں یہ عالم ہو، تو پھر دنیا کے پردے پر کون ایسا انسان اور عالمِ برزخ میں کون ایسی روح ہے۔ جس سے ہم استغاثہ کرتے ہوئے یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کا کہا ٹال ہی نہیں سکتا۔ اور یہ جس بات پر اڑ جائیں بس اُسے پورا ہی کرا کے رہیں گے! جو کوئی اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے وہ درحقیقت عَبد اور معبود کے رابطہ اور تعلق سے ناواقف ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی اور بے نیازی کے بارے میں بڑا سطحی اور پست تصور رکھتا ہے!

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔ حضورؐ کی تبلیغ کی بدولت عرب کی پوری آبادی کو ہدایت نصیب ہوئی۔ اور جب سرکارؐ دنیا سے رخصت ہوئے ہیں تو عرب کے طول و عرض میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی پرستش نہ ہوتی تھی! قیامت تک جس کسی کو بھی رشد و ہدایت ملے گی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اتباع اور فرمانبرداری میں ملے گی، جہاں حضور کی اتباع نہیں، وہاں ہدایت کی روشنی نہیں۔ مگر ہدایت کا دینا اور سیدھی راہ پر لانا اور چلانا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضۂ اختیار سے باہر تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۔ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ۔

تُو راہ پر نہیں لاتا جس کو تُو چاہے بلکہ اللہ راہ پر لاتا ہے جس کو وہ چاہے! اور وہی (اللہ) خوب جانتا ہے کہ کون راہ پر آئیں گے!

اگر انبیاء اور صلحاء کی ارواح سے استغاثہ جائز ہوتا۔ تو قرآنِ پاک میں کوئی ایک آیت تو اس کے جواز میں نازل ہوتی، یا کم سے کم کسی قرآنی آیت سے اس کا کوئی اشارہ ہی نکلتا ہوتا۔ انبیاء کرام کی دعائیں قرآنِ پاک میں مرقوم اور مسطور ہیں۔ ان میں کسی نبی نے اپنے پچھلے گزرے ہوئے نبی اور رسول کو مصیبت کے وقت نہیں پکارا۔ نہ اُن سے اللہ کے حضور دعا کرنے کی درخواست کی۔ انتہا یہ ہے کہ کسی قرآنی دعا میں "بحق فلاں" اور "بجاہ فلاں" یا یہ کہ "یا اللہ! تو فلاں نبی کے وسیلہ سے ہماری دعا قبول فرما" تک نہیں ملتا!

حضرت نوح علیہ السلام براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں:-

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ فَنَجَّیْنٰہُ وَاَھْلَہٗ مِنَ الْکَرْبِ الْعَظِیْمِ ۝

اور نوح، جب اس نے پکارا اس سے پہلے! پھر قبول کر لی ہم نے اُس کی دعا، سو بچا دیا اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو بڑی گھبراہٹ (پریشانی) سے!

حضرت ایوب علیہ السلام مصیبت میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:-

وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝

اور ایوب جس وقت پکارا اُس نے اپنے رب کو مجھ پر پڑی ہے تکلیف اور تو ہے سب رحم والوں سے رحم والا!

حضرت یونس علیہ السلام بھی اپنے رب ہی سے غم کے اندھیروں میں فریاد کرتے ہیں:۔

فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ !

پھر پکارا ان اندھیروں میں (یونسؑ نے) کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے،

اور میں تھا خطا کاروں میں سے!

اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، تنزیہ کامل اور ایسی عصمت جہاں سرے سے بھول چوک اور نسیان و ذہول کا امکان ہی نہ ہو، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو سزاوار ہے۔ حضرت یونسؑ سے بہ تقاضائے بشریت تھوڑی سی بھول ہوگئی کہ وحی کا انتظار کئے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس پر اللہ کے اس فرمانبردار بندے اور مقدس نبی نے اپنے اللہ سے معافی طلب کی۔

حضرت زکریا علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حضور اپنی تمنا پیش کرتے ہیں:۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ -

اور زکریا کو (دیکھ) جب پکارا اس نے اپنے رب کو، اے رب! نہ چھوڑ مجھ کو اکیلا

اور تو ہے سب سے بہتر (والی اور) وارث!

یہ تو چند دعائیں ہیں۔ جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ قرآن میں جہاں بھی کسی نبی کی دعا اور مصیبت کے وقت فریاد و استغاثہ کا ذکر آیا ہے، تو ہر نبی نے براہ راست اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ ان نفوس قدسیہ کو اللہ تعالیٰ کا یہی حکم تھا۔ وہ دنیا کو اسی کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی فریاد رس اور مشکل کشا ہے اور نہ مصیبت کو ٹال دینا کسی کے بس میں ہے!

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ - وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ -

اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے! اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے!

دعا کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگیں اور اسی کو پکاریں اور اس طرح پکاریں کہ اس دعا، پکار، فریاد و استغاثہ میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی شرکت اور میل نہ ہو:۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ -

سو پکارو اللہ کو خالص کر کے واسطے بندگی کے، چاہے منکرین برا ہی کیوں نہ مانیں!

خدا چیلنج دیتا ہے کہ میرے سوا بیکس کی پکار کو بھلا اور کون پہنچ سکتا ہے اور میرے سوا اس کے دکھ درد کو کون دور کر سکتا ہے!

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ !

بھلا کون پہنچتا ہے بیکس کی پکار کو، جب اس کو پکارتا ہے اور دور کر دیتا ہے اس کی مصیبت کو!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں گے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر اس عقیدہ میں کہیں ایسی شدت اور بے اعتدالی نہ پیدا ہو جائے کہ جس سے توحید پر حرف آتا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ـ

اے ایمان والو! جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے اُس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی!

اس آیت میں " ...... وَلَا شَفَاعَةٌ " (اور نہ سفارش چلے گی) میں اس قسم کے " عقیدۂ شفاعت " کی تردید منظور ہے۔ جیسے بادشاہوں کے یہاں امیر، وزیر اور اُن کے مصاحب اور مقربین سفارش کیا کرتے ہیں کہ جو اپنی چرب زبانی سے بادشاہ سلامت کو متاثر کردیتے ہیں، یا کسی دباؤ کی وجہ سے بادشاہ اُن کی سفارش ماننے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

اللہ کے دربار میں اُس کی اجازت اور حکم کے بغیر کسی کو لب کشائی کی جرأت ہی نہیں ہوسکتی!

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ إِلَّا بِإِذْنِهٖ ـ

کون ہے جو اُس کے جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے!

احادیث میں ملتا ہے کہ جب قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ وسلم کو " مقامِ محمود " اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عطا فرمائے گا۔ تو آپؐ سجدے میں گر جائیں گے اور اس کے بعد حضورؐ کو شفاعت کی اجازت ہوگی!

" یہ شفاعت " وزیروں اور امیروں کی " سفارش " شاہانِ بےخبر کے درباروں جیسی نہیں ہے۔ " یہ شفاعت " ایک مطیع و فرمانبردار اور اللہ کی مرضی پر چلنے والے نیک بندے کی، خدائے علیم و خبیر کے حضور ہے!

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی " عالم الغیب " نہیں

ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب اور جتنا علم مناسب سمجھا۔ وحی کے ذریعہ انبیاء کرام کو عطا فرمایا ہے۔ اور یہ وہ علم ہے جسے قرآن " اظہارِ غیب " اور " اطلاعِ غیب " کہتا ہے:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ ـ

مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کرے۔ غیب کی باتوں کی اطلاع دینے کے لئے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کرلیتا ہے!

یہ علم جو انبیاء کو عطا کیا گیا ہے " اظہارِ غیب " اور " اطلاعِ غیب " ہے۔ مگر اس " اطلاع و اظہار " کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز انبیاء کرام کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہتی۔ اور اُن کو ہر بات کا علم حاصل ہوجاتا ہے! اس عقیدہ کی خود قرآن نفی کرتا ہے:۔

فَقَالَ أَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَّقِيْنٍ ـ　(النمل):۔

کہا میں لے آیا خبر ایک چیز کی کہ جس کی تجھ کو اُس کی خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے خبر لے کر!

ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ کہہ رہا ہے کہ " میں ایسی چیز کی خبر لایا ہوں، جس کی آپ کو خبر نہ تھی " ۔ اور ملکِ سبا کے حالات کا علم نہ رکھنے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی منزلت میں ذرہ برابر کمی نہیں آجاتی۔ کہ۔ سارے جہان کے حالات کا علم رکھنا، نبوت کا لازمہ ہرگز نہیں ہے!

فَلَمَّا رَآ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ۔

پھر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں اُن سے ڈرا۔ وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں قوم لوط کی طرف !

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان و منزلت کا کوئی ٹھکانا ہے کہ نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام خود "ملتِ ابراہیمی" پر تھے، اُن کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے فرشتوں کو نہیں پہچان سکتے اور دل میں خوف محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ فرشتے بتلاتے ہیں کہ آپ خوف نہ کیجئے، ہمیں تو لوط کی بدکار قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ صحیحین میں بھی ایک واقعہ ملتا ہے کہ جبریل علیہ السلام آدمی کی شکل میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال و جواب کرتے رہے۔ اور جب وہ اُٹھ کر چلے گئے تو حضورؐ کو بتایا گیا کہ یہ جبریلؑ تھے — !

اگر حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے نافرمان بیٹے کے انجام کی خبر ہوتی تو آپ اُس کے بچانے کی تمنا نہ کرتے، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے، مگر برسوں تک اپنے پیارے اور چہیتے بیٹے یوسفؑ کی خبر نہ معلوم کرسکے۔ کہ اُن کا نورِ نظر کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ یہاں تک کہ اس غم میں پُتلیاں سفید ہو گئیں۔ اور سب سے بڑھ کر خود سیدنا آدم علیہ السلام کا واقعہ اُن کے "غیب" پر مطلع ہونے کی نفی کرتا ہے۔ اگر آپ کو مستقبل کا علم ہوتا اور شیطان کے دل کی بات جان لیتے۔ تو شیطان لعین کے دھوکے میں نہ آتے — !

"غیب" اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے۔ اس میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے کو "عالم الغیب" فرمایا ہے! اور کسی تشابہ اور ابہام کے بغیر دوٹوک انداز میں کہا ہے:۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ۔

کہ نہیں جانتے وہ جو ہیں آسمانوں اور زمین میں۔ غیب کو، مگر اللہ! اور نہیں خبر رکھتے کب اُٹھ کر جائیں گے !

"غیب" کی عمومی نفی کے بعد، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے خود آپ کے عالم غیب ہونے کی نفی کرائی:۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۚ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔

کہہ! میں اختیار رکھتا اپنی جان کے کسی نفع اور نقصان کا مگر جو کچھ اللہ چاہے۔ اور جو میں جانتا غیب تو بیشک بہت سی لے لیتا بھلائی اور نہ چھوتی مجھے کوئی بُرائی۔ میں تو فقط ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔ اُن لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بے شمار واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ "عالم الغیب" نہ تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جو تہمت لگائی گئی تھی، تو کتنے دن تک حضورؐ مضطرب رہے! یہاں تک کہ

وحی الٰہی نے حضرت صدیقہؓ کی پاکبازی کا اعلان کرکے اس تہمت کا قلع قمع کردیا ۔ اور وحی کے بعد حضورؐ کے قلب مبارک کو چین آیا ۔ حضور عالم الغیب ہوتے تو اس افواہ سے مضطرب ہونے کی ضرورت کیا تھی ! اور آپؐ صحابہ سے فرما سکتے تھے کہ میں نبی ہوں اور نبی پر تمام مشرق و مغرب کے احوال و مقامات منکشف ہوتے ۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ عائشہ اس تہمت سے پاک اور بری ہیں ۔ جو صحابہ حضورؐ کی بیان کی ہوئی "وحی" پر ایمان لاتے تھے، وہ آپؐ کے ذاتی علم یا "عطائی غیب" سے بتائی ہوئی حقیقت پر بھی یقین کرلیتے !

مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر حدیبیہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی افواہ سن کر، آپؐ صحابہ کرام سے بیعت لینا شروع کردیتے ہیں ۔ حالانکہ حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع نہیں ہوئی تھی ۔ یہ محض افواہ تھی ۔ اگر حضورؐ "عالم الغیب" ہوتے، تو افواہ کے سنتے ہی فرمادیتے کہ یہ خبر غلط ہے ۔ عثمانؓ مکہ میں زندہ ہیں ۔ صحابہ کرام کی اتنی بڑی جماعت تک کو اصل واقعہ کا کشف نہیں ہوتا اور وہ بھی اصل حقیقت سے بے خبر اور لا علم رہتے ہیں !

مشکوٰۃ کے باب "اعلان النکاح" میں ہے کہ ایک شادی میں کچھ چھوکریاں دف بجا رہی تھیں اور شہداء بدر کا ذکر کررہی تھیں ۔ اُن میں سے ایک کہنے لگی :-

وَفِینَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ -

ہم میں ایک نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے !

حضورؐ نے اس پر تنبیہ کے انداز میں فرمایا :-

دَعِی ھٰذِہٖ وَقُوْلِی بِالَّذِی کُنْتِ تَقُوْلِیْنَ -

یہ بات چھوڑدے اور وہی کہہ جو کہتی تھی !!

اَخْرَجَ الْبُخَارِی عَنْ اُمِّ الْعَلَاءِ الْاَنْصَارِیَّۃِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا اَدْرِیْ وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ -

بخاری نے ذکر کیا کہ نقل کیا اُمّ العلاء انصاریہ نے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ۔ قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا، پھر قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا ۔ حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں ۔ کہ کیا معاملہ ہوگا میرے ساتھ اور (کیا معاملہ ہوگا) تمہارے ساتھ !!

اور قرآن پاک میں تو یہاں تک فرمادیا گیا ہے :-

وَمِمَّنْ حَوْلَکُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَمِنْ اَھْلِ الْمَدِیْنَۃِ (وقف) مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ (وقف) لَا تَعْلَمُھُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُھُمْ -

تمہارے آس پاس کے بادیہ نشینوں میں منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں ۔ اُنھیں تو نہیں جانتا ۔ ہم اُنھیں جانتے ہیں !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ یہ خطاب فرماکر کہ "ان (منافقین) کو تو نہیں جانتا، ہم جانتے ہیں" کیا معاذ اللہ! رسولؐ کی شان کو گھٹانا چاہتا ہے؟ بات یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کے احوال کا جاننا اور مستقبل کے تمام واقعات کی خبر رکھنا، یہ "نبوت و رسالت" کے فرائض میں داخل ہی نہیں ہے! خود قرآن کہتا ہے ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے

واقعات شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ "عالم الغیب" نہ تھے۔ یہ ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "عالم الغیب" نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہونا چاہیئے۔ یہ شان تو اللہ تعالیٰ کی ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام جزئیات کا اُسے علم ہے! اور یہ "زمانوں" کی تقسیم تو ہم حادث وفانی انسانوں کے لئے ہے۔ اللہ کے لئے ہر زمانہ "حال" ہی حال ہے!

کیا شان ترے جمال میں ہے
ہر وقت زمانہ حال میں ہے

کوئی شک نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشخاص کے متعلق اور بعض آنے والے حالات کے بارے میں خبریں بھی دی ہیں اور پیش گوئیاں بھی فرمائی ہیں اور وہ "حق" ثابت ہوئی ہیں۔ قیامت کے آثار و علائم اور مستقبل میں اُمت کے لئے پیش آنے والے بعض فتنوں کی بھی حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم و بصیرت کی بناء پر خبر دی ہے! اور یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو علم نہیں دیا گیا۔ مگر خود قرآن اور احادیث آپؐ کے "عالم الغیب" ہونے کی نفی کرتی ہیں۔ اور ایسے واقعات بھی بتاتی ہیں جن سے "غیب" کے اثبات کے مقابلہ میں "نفی" ثابت ہوتی ہے!

معجزات وکرامات حق ہیں مگر......! انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے بیشک معجزات عطا فرمائے تھے۔ جو انبیاء کے معجزات میں شک کرتا ہے، اُس کا ایمان معتبر نہیں!

فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے معجزہ سے جادوگروں کے سحر کو باطل فرماتے ہیں۔ مگر اس سے یہ اصول اور کلیہ وضع کرنا کھُلی ہوئی گمراہی ہے کہ دُنیا کے پردے پر جہاں کسی پر کوئی جادو کرتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اور جو کوئی انھیں مدد کے لئے پکارے تو وہ اللہ کے دیئے ہوئے معجزے سے جادو اُتار دیتے ہیں۔ اس کی نہ قرآن میں کوئی دلیل ملتی ہے، نہ احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے! یہاں تک کہ توریت و انجیل میں بھی ایسی بات بیان نہیں کی گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے معجزات عطا فرمائے تھے کہ آپ خدا کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیا کرتے تھے، اور مُردوں کو جلا دیتے تھے!

وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ !

مگر آپ کے واقعہ "رفع" کے بعد سے لے کر آج تک کسی مسلمان نے اپنے مُردے کے جلائے جانے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے استغاثہ نہیں کیا۔ اور نہ صحابہ نے آنکھیں دُکھتے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُہائی دی کہ آپ تو مادرزاد اندھوں کو اچھا کر دیا کرتے تھے، دُکھتی ہوئی آنکھوں کا اچھا کر دینا آپ کے لئے کیا مشکل ہو!

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ جب صحابہ کو سفر میں اور جنگوں (سرایا) میں کوئی مصیبت پیش آتی ہو، یا جو صحابہ کرام باہر کی بستیوں میں رہتے تھے، وہ کسی پریشانی میں مبتلا رہتے ہوں۔ تو اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لئے پکارتے ہوں۔ اور اُن کا یہ عقیدہ رہا ہو کہ ہم جہاں سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکاریں گے، آپ ہماری فریاد کو سُن لیں گے!

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر کتنا سخت وقت آن کر پڑا تھا، اُن کا مکان روضۂ رسولؐ سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا، تاریخ و آثار میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ حضرت عثمانؓ نے ان جان لیوا مشکلات میں حضورؐ کے نام کی دہائی دی ہو۔ یا وہ صحابہ کرام جو اس کشمکش سے سخت بیزار تھے، انہوں نے ہی قبر رسولؐ پر آکر حالات کو بدلنے کے لئے حضورؐ سے استغاثہ کیا ہو۔!

کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور اہلِ بیت کرام پر قیامت گزر گئی، مگر ان نفوسِ قدسیہ میں سے کسی نے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امداد کے لئے پکارا اور نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دہائی دی!

جسے ہم معجزہ کہتے ہیں، قرآن کی اصطلاح میں اُسے "آیت" کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خود زندگی اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی "آیت" تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ اور تمام انسانیت کے لئے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو "آخری معیار" قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو معجزات بھی عطا فرمائے! اس معجزہ (تکثیر) کا آپ سے بار بار ظہور ہوا کہ تھوڑی چیز آپؐ کی معجزنمائی سے "بہت" ہوجایا کرتی تھی، لیکن اس کی کوئی روایت صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں ملتی کہ صحابہ کو جب رزق، پانی اور دوسری اشیاء کی تنگی ہوتی ہو۔ تو صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا ہو کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے "خیرِ کثیر" عطا فرمایا ہے، آپؐ ہماری قلتِ اشیاء کو کثرت سے بدل دیجئے!

انبیاء کرام کے معجزات کی یہ نوعیت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے، معجزات ظہور میں آتے ہیں۔ اور جب نہیں چاہتا، اُن کا صدور نہیں ہوسکتا۔ ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے بارہا پانی میں، دودھ میں، کھانے میں اور پھلوں میں غیر معمولی برکت ہوگئی ہے! اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ آپؐ کی جگر گوشہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں فاقے ہو رہے ہیں۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر دل متاثر ہوتا ہے۔ مگر رضا الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم ہے! غزوۂ خیبر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھوں میں آشوب تھا۔ حضورؐ لعابِ دہن لگاتے ہیں اور دکھتی آنکھیں آن کی آن میں اچھی ہوجاتی ہیں۔ ایک طرف یہ شانِ اختیار اور دوسری طرف یہ مجبوری اور بے اختیاری کی یہ کیفیت کہ خود آپؐ پر جادو کا اثر ہوتا ہے اور آپ اُسے دُور نہیں فرماسکتے!

شبِ اسراء میں "طئے زمان و مکان" کا یہ عالم کہ ایک رات میں افلاک، سدرہ و عرش اور عالم وراء الوراء اور لامکان تک کی سیر کر آئے، دوسری طرف بعض غزوات میں یہ کیفیت ہے کہ صحابہ کرام کے پاس پوری سواریاں نہیں ہیں۔ گرمی کی شدت ہے، زمین تپ رہی ہے۔ بعض بعض نے تو اپنے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لئے ہیں۔ حضورؐ ان حالات کو دیکھتے ہیں۔ اور دل دُکھتا ہے، مگر راضی بہ رضا ہیں۔ ورنہ اگر آپ کے اختیار میں ہوتا تو "طئے ارض" کے معجزہ کے زور سے اسلامی لشکر کو آن کی آن میں منزلِ مقصود پر پہنچا دیتے۔ اور صحابہ کرام سفر کی صعوبتوں سے بچ جاتے!

احادیث میں یہ معجزہ بھی ملتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک خفیہ مشورت ہوتی ہے، جس کا انعقاد مدینہ میں بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوجاتا ہے۔ اور دوسری طرف حدیث کی کتابیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ حدیبیہ، مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے، وہاں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت واقع نہیں ہوتی، صرف افواہ سن کر آپؐ صحابہ سے

بیعت لینا شروع کر دیتے ہیں اور کئی دن تک اصل حقیقت سے رسول اللہ اور صحابہ باخبر نہیں ہو پاتے !

حضرت سیدنا یعقوب علیہ السلام ہی کے واقعہ کو لے لیجئے کہ ایک طرف تو آپ پیراہن یوسفؑ کی خوشبو بہت دور سے سونگھ لیتے ہیں اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ برسوں تک حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات سے بے خبر رہتے ہیں۔ اور اس غم تک آپ کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں !

جو لوگ اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ہر کہے کو مان لیتا ہے اور وہ قبر و برزخ سے لوگوں کی مشکل کشائی کرتے رہتے ہیں۔ اور مخلوق کے درد و مصیبت کو دور کرنا اُن کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہے، کاش! سورہ یوسفؑ میں تدبر و تفکر کی اُن کو توفیق نصیب ہوئی ہوتی !

حضرت یعقوب علیہ السلام برسوں تک شدید حزن و ملال میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی اور مشیت و حکمت اپنے مقرب و برگزیدہ نبی کے اس اضطراب، بے چینی، اور غم و اندوہ کی پروا نہیں کرتی، یہ حزن و ملال اسی وقت دور ہوتا ہے جب اللہ کی مشیت کو منظور ہوتا ہے۔ جب انبیاء کرام تک رضاء الٰہی کے مقابلہ میں اتنے بے اختیار ہوں۔ تو وہ کون ایسا ولی اور اللہ کا پیارا ہے، جو انبیاء کرام سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں مقرب اور محبوب ہے اور مشیتِ الٰہی جس کے اشاروں پر چلتی ہے ! (معاذ اللہ)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر سینکڑوں میل دور کے ایک مقام کو منکشف فرما دیا تھا۔ آپ نے "ساریہ ! الی الجبل" کا نعرہ مدینہ سے بلند کیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ساریہؓ کو حضرت عمرؓ کی یہ آواز سُنوا دی —— یہ کرامت ہے، اور حق ہے ! مگر اس کرامت سے کیا یہ اصول وضع کیا جانا قرینِ صواب ہے کہ مملکتِ اسلامیہ کا ایک ایک گوشہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا ! اور اسلامی فوجوں کو جب اور جہاں کہیں بھی کوئی خطرہ پیش آتا تھا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ میں بیٹھ کر اُسے دیکھ لیا کرتے تھے اور وہیں سے فوج کے کمانڈروں کو کرامت کے ذریعہ مطلع فرما دیا کرتے تھے ! اور کیا اس واقعہ کے بعد سے صوبوں کے گورنروں اور حضرت عمر فاروقؓ کے درمیان گفتگو دُور دُور ہی سے کرامت کے ذریعہ ہو جایا کرتی تھی — حالانکہ تاریخ بتاتی ہے اور ٹھیک بتاتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس جنگ کے میدانوں سے خبر آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو آپ انتہائی مضطرب رہتے تھے۔ اور بعض گورنروں کی جب شکایتیں آپ تک پہنچی ہیں، تو آپ تحقیق حال کے لئے سینکڑوں میل کے دشوار گزار سفر کی صعوبت برداشت فرما کر صوبہ کے صدر مقام پہنچے ہیں ——!

ایک طرف تو "برطارم اعلیٰ نشینم" کا یہ عالم کہ سینکڑوں میل کا واقعہ فاروقِ اعظمؓ پر منکشف ہو جاتا ہے اور دوسری طرف۔ ؎

"گہے بر پشت پائے خود نہ بینم"

کی یہ کیفیت کہ ابولؤلؤ خنجر لے کر آپ کے قتل کرنے کے لئے آتا ہے اور آپ کو اس کے ارادے کی، آمد کی اور اُس کے خنجر کی خبر نہیں ہو پاتی —— !

عبدیت اور بشریت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" اور اُس کے لوازم سے جب بحث کی جاتی ہے تو اہلِ بدعت بہت چراغ پا ہوتے ہیں کہ یہ "وہابی" اس عنوان سے حضورؐ کی شان گھٹاتے ہیں

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل اپنا جیسا بشر سمجھتے ہیں!
اس بحث کے آغاز سے قبل ایک مثال عرض کی جاتی ہے۔ قارئین کرام اس پر ضرور غور فرمائیں۔ کہ بعض سیدھی اور سچی باتیں بھی بعض اوقات آدمی کو بہت کچھ کھٹکنے لگتی ہیں۔ اس مثال سے اسی قسم کے خدشوں اور وسوسوں کا ازالہ مقصود ہے!

کسی بادشاہت میں بادشاہ نے اپنے ایک مقرب، ندیم اور پسندیدہ آدمی کو صوبہ کا والی اور حاکم مقرر کر دیا ہے۔ یہ حاکم بادشاہ کا پوری طرح فرمانبردار اور نیاز مند ہے، کچھ لوگ جو اس حاکم سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں، یہ کہنے لگتے ہیں کہ اس حاکم کو تو بادشاہ نے ملک کے سیاہ وسپید کا مالک بنا دیا ہے! بس جو کچھ یہ حاکم چاہتا ہے، وہی ہو کر رہتا ہے۔ خود بادشاہ سلامت اس والی سے رضا جو ہیں۔ حقیقی بادشاہ نے اپنے تمام اختیارات اس حاکم کو عطا کر دیئے ہیں، کسی ملکی مسئلہ پر یہ حاکم اڑ بیٹھے اور ضد کرنے لگے تو بادشاہ سلامت کو اس کی ضد پوری کرنی پڑتی ہے! یہ حاکم بادشاہ کا دراصل انتہائی محبوب ہے اور محب اور محبوب میں اپنا پرایا نہیں ہوا کرتا۔ جو محبوب کی مرضی، وہی محب کی مرضی! عشق و محبت میں — ع

من تو شدم تو من شدی

کا معاملہ ہو تا ہے!

ملک کے دو سرے ارباب فکر اور اہل کار جو بادشاہ اور حاکم صوبہ کے فرق مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور ملکی سیاست اور بادشاہت کے مسائل کی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ صوبہ کے حاکم کی شان میں اس طرح کا غلو، خود نظام سلطنت میں ابتری پیدا کر دے گا اور بادشاہ اور عمال اس عقیدہ کے بعد قریب قریب ایک ہی سطح پر آ جائیں گے — تو اس عقیدت کے غلو کے جواب میں اگر وہ یہ کہیں:-

"بھائیو! ایسا نہ کہو، یہ صوبہ کا حاکم تو بادشاہ سلامت کا نوکر اور چاکر ہے۔ بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی تو آخر یہ کھاتا پیتا انسان تھا۔ اُس وقت اس کی یہ حیثیت کہاں تھی؟ بادشاہ کی جوتیوں کے طفیل اس کو یہ عزت اور منصب ملا ہے!! اور تم جو عقیدت اس حاکم کے بارے میں رکھتے ہو، اُس کا علم اگر اس حاکم کو ہو جائے تو وہ اسے کسی عنوان پسند نہ کرے گا۔ بلکہ اپنے عقیدت مندوں پر اُلٹا خفا ہو گا۔ بادشاہ سلامت خود مختار حاکم ہیں۔ ہوشیار اور معاملہ فہم ہیں، وہ اس حاکم کی ہر بات کو مان کس طرح سکتے ہیں! اُن پر اُن کے کسی ماتحت کا زور چل کیسے سکتا ہے؟ اور اُن کے دربار میں تو یہ حاکم ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ بالکل چاکروں اور غلاموں کی طرح! بادشاہ سلامت چاہیں تو اس حاکم کو بھرے دربار سے نکلوا دیں، بادشاہ کو سب کچھ اختیار ہے۔ جس کو عزت دی ہے، اُس سے چھین بھی سکتا ہے —! اور ہاں! فلاں فلاں معاملہ میں تو اس حاکم کی درخواست کو جہاں پناہ نے رد کر دیا — آقا پھر آقا ہے، نوکر پھر نوکر ہے!"

یہ الفاظ اگر سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے دیکھے جائیں۔ یعنی کسی کو ان کا پس منظر نہ معلوم ہو کہ کس "مبالغہ آمیز عقیدت" کے جواب میں یہ کہے گئے ہیں، تو بعض پڑھنے اور سننے والوں کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہو سکتی ہے کہ "والی صوبہ اور حاکم علاقہ کی شان میں سوء ادب یا کم سے کم خفت کا پہلو اختیار کیا گیا ہے"

مگر جب کسی کے سامنے اس قضیہ کا پس منظر ہوگا کہ بعض لوگوں نے اپنی کم فہمی کے سبب حاکمِ صوبہ کو بادشاہ کا مدِمقابل ٹھہرا دیا تھا اور وہ ایسی ایسی مبالغہ آمیز باتیں حاکم کی شان میں کہتے تھے، اُس کے جواب میں یہ کچھ کہا گیا، تو اس عبارت میں سے کوئی کھٹک محسوس نہ ہوگی، کہ مقصود "حاکمِ صوبہ" کی خفت اور اہانت نہیں ہے۔ بلکہ حاکمِ صوبہ کو بادشاہ سلامت کے مدِمقابل جو ٹھہرایا جا رہا تھا، اُس کی تردید مقصود ہے!

شرک و بدعت کے رد میں بعض موحدین کو یہی اندازِ بیان اختیار کرنا پڑا ہے۔ جس کو اہلِ بدعت "اہانتِ رسولؐ" کے عنوان سے اور اُس پر طرح طرح کے حاشیئے چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کے فدائی اور جاں نثار تھے اور حضورؐ کی معمولی سے معمولی سنّت کو بھی جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی پوری زندگی "احیاءِ سنّت" ہی کی جد و جہد میں گزری! اور اُن کی یہی تمنّا، آرزو اور کوشش رہی کہ مسلمان "سنّتِ رسولؐ" کو اپنی زندگی کا نصب العین، محور، اور غایت و مقصود بنا لیں۔ —— ہاں! یہ ضرور ہے کہ بعض موحدین علماء سے لفظوں میں بے احتیاطی ضرور ہوگئی ہے! بات قرینہ اور خوبصورتی کے ساتھ محتاط انداز میں کہی جانی چاہیئے تھی۔ ان بزرگوں کی پوری زندگی میں ہم سُنّتِ رسولؐ کو جلوہ گر پاتے ہیں۔ اس لئے اُن سے "اہانتِ رسولؐ" جیسا غارت گرِ ایمان جرم منسوب نہیں کر سکتے! اُن کے دینی شغف اور دُوسرے حالات کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان حضرات کی نیت بخیر تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ مطہرہ پر اسی لئے تو عمل کرتے تھے کہ حضورؐ کی محبّت اور عقیدت اُن کے دلوں میں رچی اور بسی ہوئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کا بھی ہمیں اعتراف ہے کہ لفظوں کی بے احتیاطی اور بدسلیقگی کے سبب، خود اُن کے مشن کو اس لئے نقصان پہنچا، کہ مخالفین نے اس لفظی اوِرچ پیچ اور اظہار و بیان کی بے اعتدالی کو نمک مرچ لگا کر عام مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ اور اُن کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ تختۂ گل پر جو کیچڑ کے چھینٹے پڑ گئے تھے، فریقِ مخالف نے ان کو اتنا نمایاں کیا کہ جیسے یہ پھولوں کا تختہ نہیں ہے، بلکہ سارے کا سارا کھُورا اور تمام کا تمام مزبلہ ہے!!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ اہلِ بدعت نے "مُحَمَّدٌ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ" کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کی براہ راست زد "توحید" کے عقیدہ پر جا کر پڑتی ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مالکِ کون و مکان"۔ "احمد بلا میم" اور "عالم الغیب" سے لے کر:-

وہ جو کہ مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر
اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر (معاذ اللہ)

تک کہہ دیا ہے! اور اس اپنی عقیدت اور عشقِ رسولؐ پر یہ لوگ ناز بھی فرماتے ہیں! حالانکہ وہ "عشقِ رسولؐ" جس سے عقیدۂ توحید مجروح ہوتا ہو، نہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک معتبر ہے! اسی قسم کی "محبت" قدر و ستائش کی جگہ ناپسندیدگی بلکہ عتاب کا باعث ہوگی!

قرآن پاک ہی نے ہمیں اس کی تعلیم دی ہے، اسی بناء پر ہم اللہ کے نبیوں اور رسولوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔ اور اُن سب کی عزت و احترام کرتے ہیں۔ اور ہمارے قلوب تمام انبیائے کرام کی عقیدت، احترام اور محبّت سے معمور ہیں۔ تمام انبیاء جن میں نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی شامل ہیں۔ اس طرح ہیں، جیسے ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ... کے بھائی ہوتے ہیں!

قرآن پاک میں انبیاء کرام کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ جن کی چند جھلکیاں اوپر پیش کی جاچکی ہیں، اُن میں اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ ترین بندوں کی "بشر" اور "عبد" کی حیثیت ظاہر کی گئی ہے۔ اور "عبد" بھی کیسے؟ اللہ تعالیٰ کے انتہائی فرمانبردار اور اپنے معبود کے آگے اپنا عجز و نیاز پیش کرنے اور اُس سے ڈرنے والے! اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو شرفِ وحی سے بھی نوازا تھا! اور اُن کو معجزات بھی عطا کئے تھے۔ مگر اس تمام اکرام و اعزاز اور تقرب کے باوجود وہ "بشر" اور "بندے" ہی تھے ـــ!

قرآن پاک میں جگہ جگہ انبیاء کرام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ جن سے اُن کی "الوہیت" کی نفی ہوتی ہے اور اُن کی بشریت" اور "عبدیت" کا ثبوت ملتا ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور سے واپس آئے ہیں، تو آپ نے دیکھا کہ قوم گئوسالہ پرستی کی لعنت میں مبتلا ہے۔ اس پر آپ کو خیال ہوا کہ آپ کے بھائی اور جانشین حضرت ہارون علیہ السلام سے شاید اصلاح حال میں کچھ کوتاہی ہوئی، اس پر آپ نے غضب میں آکر:-

وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۝ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ
وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ؗ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝
اور ڈال دیں وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا۔ لگا کھینچنے اُس کو اپنی طرف۔ وہ بولا کہ میرے
ماں جائے بھائی لوگوں نے مجھ کو کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں۔ سو مت ہنسا
مجھ پر دشمنوں کو اور نہ ملا مجھ کو گنہگاروں میں ـــ!

حضرت ہارون علیہ السلام کے اس جواب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوتا ہے کہ شدت غضب میں جو اپنی ہوائے نفس کے لئے نہیں بلکہ خالص اللہ تعالیٰ ہی کے لئے یہ غضب اور غیرت تھی، اُن سے پوری نیک نیتی کے باوجود بے اعتدالی ہوگئی ہے، تو آپ نے فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی:-

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝
(موسیٰ) نے کہا۔ اے میرے رب مجھے معاف کر اور میرے بھائی کو۔ اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت
میں اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عصا اور ید بیضا کے معجزات عطا فرمائے تھے، ضرب کلیمی کے اثر سے سمندر پھٹ گیا تھا۔ اور فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی دُنیوی زندگی میں حضرت کلیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے کلام فرمایا۔ یہ تمام شرف و مجد اپنی جگہ درست اور بجا! مگر وہ بہرحال "عبد" اور "بشر" ہی تھے۔ سارے جہان کے احوال و کوائف آپ پر روشن نہیں تھے۔ اسی بناء پر آپ نے اپنے بھائی ہارونؑ کے بارے میں ایک ایسا خیال قائم کیا تھا۔ جو واقعہ کے مطابق نہ تھا۔ جس کی تفصیل ابھی اوپر گزر چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی تنزیہی عصمت جس میں ذہول و نسیان کا شائبہ تک نہ ہو، صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیبا ہے!

حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو قرآن پاک میں بار بار "عبد" کہا گیا ہے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ ـــ!

(سب تعریف اللہ کو جس نے اُتاری اپنے بندہ پر کتاب!)

واقعہ معراج کا ذکر فرمایا تو اُس میں بھی:-

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ - پاک ذات ہے، جو لے گیا اپنے بندہ کو!

فرمایا گیا۔ یعنی حضورؐ کی "عبدیت" کا اظہار اور اعلان!

واقعہ معراج اتنا بڑا شرف تھا کہ کسی نبی اور رسول کو یہ شرف اور تقرب عطا نہیں فرمایا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دیکھا۔ آپؐ کو کیا دکھایا گیا۔ قرب کی منزلیں کس طرح طے کیں۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے! اس لئے ایسے عظیم الشان اور محیر العقول واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے "اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" کا اعلان کیا کہ لوگ واقعہ معراج سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور صاحب معراج کی "عبدیت" کا عقیدہ ترو تازہ رہے۔ اور کسی مشرکانہ تصور سے یہ عقیدہ دبنے نہ پائے۔ پھر خود آپؐ کی زبانِ وحی ترجمان سے آپؐ کے "بشر" ہونے کا اعلان کرایا گیا:-

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰۤی اِلَیَّ -

(تو کہہ میں بھی آدمی ہوں جیسے تم (بجز اس کے) کہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے)

اس آیت میں بھی "مِّثْلُکُمْ" غور طلب ہے۔ رسول اللہ سے صرف یہی نہیں کہلوایا گیا کہ "اَنَا بَشَرٌ" (میں بشر ہوں) بلکہ "بشریت" کے ساتھ اس کا اظہار ضروری سمجھا گیا کہ "مِّثْلُکُمْ" (تم جیسا بشر ہوں) تاکہ آپؐ کی "بشریت" میں کسی اور ہی صفت کے تشابہ کا بھی امکان نہ رہے!

اس آیت میں ذرا سا بھی ابہام اور تشابہ نہیں۔ یہ ایک محکم آیت ہے۔ جس کے ایک سے زیادہ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ اب کوئی قرآنی تحریف پر ہی تُل جائے اور "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کو "اِنَّ مَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" (یعنی میں تم جیسا بشر نہیں ہوں) بنا دے، تو ایسے ظالم گستاخ، اور محرفِ قرآن کو ہم لائقِ خطاب ہی نہیں سمجھتے!

ہمارا ایمان ہے کہ جہاں تک فضیلت کا تعلق ہے کوئی بشر حضورؐ کی برابری نہیں کر سکتا! آپؐ انبیاء کے سردار اور رسولوں کے بشیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بعد ہر عزت و عظمت کی سزاوار سرکار ہی کی ذات ہے! حضورؐ کے نعلین مبارک سے جو ذرّے چھو جائیں، خدا کی قسم وہ ذرّے ہماری روحوں سے زیادہ لطیف اور مبارک ہیں! مگر ان تمام صفات و کمالات کے باوجود آپؐ ہیں "بشر" ہی۔ وہی صفت کے آپؐ حامل نہیں۔ بلکہ بشری صفات کے حامل ہیں! اور اس پر قرآن اور احادیث گواہ ہیں۔ جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "بشر" نہیں مانتا یا آپؐ کو "بشر" کہتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ وہ اللہ کے کلام کو جھٹلاتا ہے! یا کم سے کم اُسے اشتباہ و تشکیک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، یا اُسے اس بات کا زعم اور دعویٰ ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں رسول اللہ کی حقیقت کو وہ زیادہ جانتا ہے! (معاذ اللہ)

حضورؐ کی تمام زندگی قرآن کے اس اعلان "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کی شاہد ہے۔ اللہ نے چاہا تو رات کی رات میں لامکان تک کی سیر کرادی! اور جب نہ چاہا تو تاریخ و سیر میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ حضورؐ جب مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرماتے ہیں تو عبداللہ ابن اریقط جو مسلمان بھی نہ تھا، اُس کی خدمات مدینہ کے سفر میں راستہ بتانے کے لئے حاصل کی جاتی ہیں۔ اور شبِ معراج میں فلک الافلاک کی سیر کرنے والا، کئی دن کی مسافت کے بعد قبا پہنچتا ہے اور اس سفر میں ایک غیر مسلم دلیلِ راہ ہوتا ہے!

اللہ نے چاہا تو یہ بھی ہوا کہ سراقہ بن جعشم نے ہجرت کے وقت راستہ میں حضورؐ کا تعاقب فرمایا۔ اور جب حضورؐ کے قریب پہنچنے کا ارادہ کیا تو گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور سراقہ زمین پر گر پڑا۔ اور ایک بار تو گھوڑے کے پیر بھی زمین میں بری طرح دھنس گئے۔ دُوسری طرف یہ واقعہ بھی تاریخ دیکھو میں ملتا ہے کہ غزوۂ احد میں عبداللہ بن قمیہ کی تلوار حضورؐ کے مغفر پر پڑی تو دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چُبھ گئیں۔ اور چہرۂ مبارک سے خون جاری ہو گیا۔ دونوں واقعات اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو سراقہ کے گھوڑے کو زمین میں دھنسا دیا۔ مگر غزوۂ احد میں ابن قمیہ کی تلوار نے آپؐ کو زخمی کردیا اور اُس تلوار کی زد کو روکنا اللہ کی مشیت اور حکمت کو منظور نہ تھا۔ حضورؐ یہ تو نہیں چاہتے تھے کہ خود زخمی ہو جائیں اور تیر انداز صحابہ کی غفلت کی وجہ سے مسلمانوں کی شکست ہو جائے! یہی وہ مقدرات تھے جن کا رد کرنا حضورؐ کے قبضۂ اختیار میں نہ تھا۔ اس لئے کہ آپؐ "عبد" اور "بشر" تھے !!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کافروں کے جادو اور زہر کا بھی اثر ہو جاتا ہے۔ آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم وفات پاتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کے اختیار میں ہوتا تو لختِ جگر کو بھلا مرنے دیتے۔ اور بیٹے کے غم میں یہ اشکباری بشری فطرت کا عین تقاضا تھی !

"الآن کما کان" تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے! کہ وہاں کسی تغیر و حادثہ کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ بشر کو اللہ تعالیٰ نے جسم عنایت فرمایا ہے، لہٰذا اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی شباب اور اس کے بعد ادھیڑ عمر اور قدرے بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے، مسلم (جلد اوّل) کی روایت ہے:-

"ایک بار حضورؐ نے بیماری کی حالت میں نماز عشاء پڑھنے کے لئے مسجد میں جانے کا ارادہ کیا۔ جب چلنے لگے تو غش آگیا۔ جب افاقہ ہوا تو گھر والوں سے دریافت کیا کہ مسجد میں لوگوں نے کیا نماز پڑھ لی؟ گھر والوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ آپؐ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کئی مرتبہ اسی طرح ہوا" اور وہ اس لئے کہ آپ "بشر" تھے !

"بشر" اور "عبد" ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ اور ہم بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اسی سے دعا مانگتے ہیں کہ بندوں کی فریاد کو وہی پہنچ سکتا ہے! دلوں کے چھپے ہوئے خطروں کو وہی جان سکتا ہے اور دل کی دھڑکن کو وہی سُن سکتا ہے ! جو حیّ و قیوم ہے، جس کی ذات کو فنا نہیں۔ جس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند ! اور نہ دُنیا کے کارخانے کے چلانے سے اُسے تھکن محسوس ہوتی ہے۔ نہ جس پر بیماری کا کوئی اثر ہوتا ہے۔ جو لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ہے۔ جس سے کونین کا ایک ذرہ بھی چھپا ہوا نہیں ہے ! ہمہ شما کا کیا ذکر، انبیاء اور صلحاء بھی اُس کے محکوم، تابعِ فرمان اور اُس کی رضا کے چاہنے والے ہیں۔ اور اُس کی مشیت کے آگے دم بخود ہیں !

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک مستند واقعہ کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے:-

"مصعب بن عمیرؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے اُن کو شہید کر دیا۔ اور غل مچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ بدحواسی میں اگلی

صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ حضرت حذیفہؓ کے والد یمان، اس کشمکش میں آگئے اور اُن پر تلواریں برس پڑیں۔ حضرت حذیفہؓ چلاتے ہی رہے کہ میرے باپ ہیں۔ لیکن کون سنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہوگئے، اور حضرت حذیفہؓ نے ایثار کے لہجہ میں کہا، مسلمانو! خدا تم کو بخش دے! (صحیح بخاری غزوہ احد)
بحوالہ سیرت النبی جلد اوّل)

یہ صحابہ کرامؓ ہیں! حضورؐ کے تربیت یافتہ! خود حضورؐ موقعہ واردات پر موجود ہیں۔ مگر صحابہ کی بے خبری اور لاعلمی کے سبب ایک مسلمان کی شہادت واقع ہوجاتی ہے! حضورؐ بھی صحابہ کرامؓ کو متنبہ نہیں فرماتے کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اگر حضورؐ کو اس کشمکش کا علم ہوتا تو صحابہ کو روکنا اور ٹوکنا آپؐ پر فرض ہوجاتا۔ جب صحابہ کرام جو انبیاء کے بعد اُمت میں سب سے افضل ہیں۔ اُن کا یہ عالم ہو کہ نظروں کے سامنے کے آدمی کو کشمکش میں نہ پہچان سکیں! تو ہم کسی ولی، قطب، غوث اور ابدال کے بارے میں "حسنِ ظن" قائم کرلیں کہ اس پر ساری دُنیا کے احوال و کوائف ہمہ وقت منکشف رہتے ہیں۔ اور اُس کو جہاں سے بھی پکارا جائے وہ پکارنے والے کی پکار سُن لیتا ہے۔ اور اُس کی مصیبت کو دُور کردیتا ہے!

اس تفصیل کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پڑھیے:۔

اخرج الشیخان عن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ بن مریم فانما انا عبدہٗ فقولوا عبداللہ ورسولہ

مشکوٰۃ کے باب المفاخرہ میں لکھا ہے کہ بخاری ومسلم نے ذکر کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ــــ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسا حضرت عیسیٰؑ بن مریم کو نصاریٰ نے بڑھایا۔ سو میں تو اُس کا بندہ ہوں، (میرے بارے میں) یہی کہو کہ "اللہ کا بندہ اور اس کا رسول"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ:۔

"میرے مرتبہ کو نہ گھٹانا"

اس لئے کہ پچھلی امتوں کے احوال آپؐ کے سامنے تھے۔ کہ انہوں نے بعض انبیاء کے مرتبہ کو گھٹایا نہیں تھا۔ بلکہ حد سے زیادہ بڑھادیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جو کوئی کسی نبی کا اُمتی اپنے نبی کے رتبہ کو گھٹاتا ہے۔ اُس کا ایمان ہی کب سلامت رہتا ہے، خوف الحاد اور بے دینی سے نہیں ہے کہ وہ تو ظاہر ہوجاتی ہے! محلِّ خوف وہ "عقیدت" ہے، جو اُس شخص کو جس سے عقیدت ہوتی ہے، بڑھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ ایسی عقیدت خوفناک اور پُرخطر اس لئے ہے کہ عقیدت مند اتنا کچھ کرنے کے بعد اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، ٹھیک کہا ہے اور جس کی محبت اور عقیدت میں کیا ہے اُس کی خوشنودی مجھے حاصل ہو گی!

نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت، آپ کے معجزات اور آپ کے "کلمۃ اللہ" اور "روح اللہ" ہونے سے دھوکا کھا گئے، اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کے بندے اور بشر ہونے کی حقیقت کو بھلا بیٹھے!

یہاں تک کہ انھیں ابن اللہ بنا دیا۔ اور یہ شرک کرنے کے بعد بھی وہ "موحد" ہونے کے دعویدار ہیں۔ اور اس حسن ظن بلکہ غلط فہمی اور جہالت و حماقت کا شکار ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں "ابن اللہ" کا عقیدہ رکھنا "توحید" کے منافی اور مخالف نہیں ہے!

ایک اور حدیث ہے، جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

انی لا اُرِیْدُ ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنیہا اللہ تعالٰی انا محمد بن عبد اللہ عبدہٗ و رسولہ۔ (رواہ رزین)

(بیشک میں نہیں چاہتا کہ بڑھاؤ تم مجھ کو زیادہ اس رتبہ سے جو اللہ نے مجھے بخشا ہے۔ میں تو وہی محمدؐ ہوں بیٹا عبد اللہ۔ اللہ کا بندہ اور اُس کا رسولؐ)

جس مسلمان کو حضورؐ کے ارشاد اور فرمان و نصیحت کا پاس ہوگا، اُس کے قلم، زبان اور کسی دوسرے عمل سے ایسی بات ظاہر ہوہی نہیں سکتی، جو "محمدؐ بن عبد اللہ" کو "ارباب من دون اللہ" بنا دے!

حضورؐ کا یہ فرمانا کہ:۔

"اِنِّی لَا اُرِیْدُ ان ترفعونی فوق منزلتی ...."

(بے شک میں نہیں چاہتا کہ تم بڑھاؤ مجھ کو زیادہ میرے رتبہ سے ....)

اور یہ ارشاد:۔

"لا تطرونی" (مجھ کو میری حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ)

کتنی نفسیاتی حکمتوں کا حامل ہے۔ اور اس سے شرک آمیز عقیدت کی جڑ کٹتی ہے! اُس "عبد کامل" کے قربان جائیے کہ جس نے اُمت کو گمراہی اور ضلالت کے فتنوں سے بچانے کے لئے کیسے کیسے خطروں، ذہن و نفس کی چوریوں اور شیطان کے فریب سے خبردار فرمادیا ہے!

یہ حدیثیں دو حقیقتوں کو سامنے لاتی ہیں:۔

۱۔ ایک تو یہ کہ حضورؐ کی مدح و منقبت اور توصیف و نعت اس انداز میں کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے جس سے کسی دوسرے نبی کی منقصت نکلتی ہو۔ کوئی شک نہیں کہ حضورؐ "سید الانبیاء" ہیں۔ مگر اس قسم کے اشعار

آج یوسفؑ بھی اُن کی غلامی میں ہیں
لُوٹنے دیکھ زلیخا ہمارا نبیؐ

خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کا سبب نہیں ہوسکتے! بلکہ بارگاہِ رسالت سے ان کو رد ہی کردیا جائے گا۔ شاعری میں اس قسم کے شعروں کی اچھی خاصی تعداد ملتی ہے!

۲۔ دوسری حقیقت اور حکمت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات میں سب سے افضل ہیں۔ اس لئے دنیا کے جس بڑے سے بھی بڑے انسان پر آپ کو فضیلت دی جائے گی۔ تو اس "فضیلت" اور انداز نعت و توصیف پر:۔

"لا تطرونی" (مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ)

کے انتباہ اور ممانعت و قدغن کا اطلاق نہیں ہو سکتا - کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد تمام مجد و شرف حضورؐ ہی کے لئے سزاوار ہے - اور ایسی تعریف جس میں حضورؐ کو تمام مخلوقات سے افضل کہا جائے "حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نہیں ہو سکتی"۔ "حد سے زیادہ بڑھی ہوئی" وہی نعتِ رسولؐ اور توصیف ہوگی جس میں حضورؐ کو حدِ شریعت سے بڑھا کر مرتبۂ الوہیت کے برابر پہنچا دیا جائے ! اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری صفات اور پیمبرانہ کمالات میں "الوہیت" کا رنگ پیدا کیا جائے !

قرآن پاک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان سے یہ کہلوایا جاتا ہے:-

قُلْ لَا اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ -

(اے نبیؐ!) کہہ کہ میں مالک نہیں ہوں اپنے واسطے بُرے کا نہ بھلے کا، مگر جو اللہ چاہے !

اب اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انداز میں تعریف کرتا ہے کہ ساری مخلوقات آپ کے دَر سے پل رہی ہے، آپ کائنات کے مالک و مختار ہیں - آپ حاضر و ناظر ہیں، آپ ہر اُمتی کے حال پر نگاہ رکھتے ہیں - آپؐ پریشان حالوں کی فریاد سنتے اور اُن کی مشکلوں کو کھولتے ہیں، تو وہ آپ کو "حد سے زیادہ بڑھاتا" ہے - اور ایسا کرنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے !

قرآن کریم کی متعدد آیتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "عالم الغیب" نہیں ہے ! خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:-

"ہم نے بعض رسولوں کا تم سے ذکر کیا اور بعض رسولوں کا ذکر ہی نہیں کیا۔"

وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْکَ ۔ (النساء)

یعنی ہم نے داؤدؑ کو زبور دی، ہم نے اُن رسولوں پر وحی نازل کی، جن کا ذکر اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اُن رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا - (یعنی تمہیں جن کے احوال کی اطلاع نہیں دی)

قرآن پاک تو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض رسولوں کے حالات تک کی اطلاع نہیں دی مگر اس کے خلاف کوئی اگر حضورؐ کو "عالم الغیب" کہے یا یہ کہ "ماکان وما یکون" کا علم آپؐ کو دیا گیا ہے اور کائنات کے احوال کی کوئی اگلی پچھلی بات آپؐ سے چھپی ہوئی نہیں ہے - تو یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو:-

"حد سے زیادہ بڑھانا"

جس کی ممانعت آئی ہے ! تو جو لوگ "عشقِ رسولؐ" کے نام پر حضورؐ سے الوہی صفات منسوب کرتے ہیں - اُن کا یہ "عشق" خود اُن کی ذات کے لئے آخرت میں وبال بن جائے گا - اور اس قسم کے فاسد عقائد سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برأت اور بیزاری کا اظہار فرمائیں گے ! یہ "عشق" کی عجیب و غریب قسم ہے کہ "محبوب" کچھ کہتا ہے اور عشاق کچھ اور کہتے ہیں بلکہ اُس کے کہنے کا اُلٹ کرکے دکھلاتے ہیں - محبوب کے حکم کی خلاف ورزی کرکے، اُس سے دعویٰ محبت کرنا - محبت نہیں نفس کا فریب اور شیطان کا پھونکا ہوا افسوں ہے !

یہ "عطائی" اور "ذاتی" کی بحث و تفریق، جس کی طرف چند صفحے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، بڑی دھوکے میں ڈالنے والی چیز ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے انبیاء، اولیاء اور شہداء کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ کائنات میں جس طرح چاہیں تصرف کریں

قبر و برزخ میں ہزاروں میل سے لوگوں کی فریاد سُن کر اُن کی مصیبتوں کو ٹال دیں۔ کون و مکان کا کوئی ذرّہ اُن سے پوشیدہ نہ ہو۔ رزق، اولاد، دولت، جاہ و منصب کے وہ بانٹنے اور عطا کرنے والے ہوں۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو "ذاتی خدائی" ہے، بہت سے "عطائی خدا" بنا دیئے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی غیرتِ تفرید و توحید اس "شرک" کو کسی عنوان گوارا نہیں کر سکتی !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا :-

"کہ مجھے میری حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ"

"عبدیت" اور "بشریت" کا کتنا واضح اقرار اور کھلا ہوا اعتراف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہی صرف ایسی ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ ہر بڑے سے بڑے انسان اور اللہ تعالیٰ کے مقرب سے مقرب بندہ کی ذات و صفت اور کمالات کی ایک حد ہے ! اور سب سے نمایاں اور روشن حد تو "بشریت" اور "الوہیت" کی حد ہے کہ اس کا "ٹوٹنا" نہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس "حد شکنی" سے خوش ہو سکتے ہیں۔ صحابہ کرام سے بڑھ کر عاشقِ رسول اور سرکار کا قدرشناس اور کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے حضور کی مدح و توصیف میں ایسا مبالغہ نہیں کیا، جس سے یہ "حد" ٹوٹتی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی اُن پر رحمتیں ہوں کہ انہوں نے انتہائی عقیدت و محبت کے باوجود اس "حد" کو چھوا تک نہیں۔ بلکہ اس "حد" کی حفاظت کرتے رہے !

عیسائی، ہندو اور بودھ جتنے مشرکین اور کفار زمین کے پردے پر پائے جاتے ہیں، اُن کا فسادِ عقائد اس باب میں مشترک ہے کہ انہوں نے اپنے نبیوں، پیشواؤں اور رشیوں، منیوں کو مبالغہ آمیز عقیدت سے "الٰہ" بنا دیا ہے اور انہوں نے "بشریت" اور "الوہیت" کی حد کو توڑ دیا ہے۔ وہ ان بڑے لوگوں کو "خدا" نہیں کہتے مگر اُن کی عقیدت نے اُن سے "الوہی صفات" منسوب کر دی ہیں۔ "کالی مائی" کو کائنات میں تصرف کرنے کا ذرّہ برابر اختیار نہیں ہے، مگر ہندو "کالی کی جے" پکارتے ہیں۔ مسلمانوں کا تو بس ایک ہی "نعرہ" اور "جیکارا" (slogan) ہے، اور وہ ہے "اللہ اکبر"، مسرت کے وقت، مصیبت کے عالم میں، جنگوں اور معرکوں میں اُن کی زبان سے "اللہ اکبر" بلند ہوتا ہے تاریخ میں، سیرت میں، احادیث میں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی کہ صحابہ کرام نے "اللہ اکبر" چھوڑ کر یا اُس کے ساتھ ساتھ — "یا رسول اللہ" کا بھی نعرہ بلند کیا ہو ! وہ ایسا نعرہ بلند کیسے کر سکتے تھے، جب کہ وہ توحید و رسالت کی حد کو جانتے اور پہچانتے تھے، اور اُن کا اس بات پر یقینِ جازم اور ایمانِ کامل تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کی فریاد اور پکار کو نہیں سن سکتا۔ تکبیر اُسی کے نام کی بلند ہونی چاہیئے۔ جو کائنات میں "سب سے بڑا" (اکبر) ہے ؟ اور جو سمیع و بصیر، علیم و خبیر، اور علیٰ کلّ شیئٍ قدیر ہے !

اہلِ بدعت نے "نعرہ تکبیر" کے توڑ پر "نعرہ رسالت" اختراع کیا ہے، کہ وہ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں — "یا رسول اللہ" کا نعرہ بلند کرتے ہیں ! — یہ ہے :-

"وہ حد سے بڑھ جانا"

جس کی حضور نے ممانعت فرمائی تھی — اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور ارشاد کی مخالفت کر کے کوئی شخص سعادت حاصل نہیں کر سکتا ! اور ایسی "عقیدت" ان لوگوں کے منہ پر مار دی جائے گی !

"نعرۂ رسالت" کے مقابلہ میں "نعرۂ حیدری" (یا علیؓ) حال ہی میں ایجاد کیا گیا ہے! ایسا ہونا تعجب خیز نہیں ہے۔ کہ اہلِ بدعت نے "توحید" کے معاملہ میں ہمیشہ ڈھیل اور بے پروائی سے کام لیا ہے اور یہ ذہنیت "مشرکانہ عقیدت اور بدعت و احداث" کے مسئلہ میں، ہر دور میں یکساں رہی ہے!

عبدیت | نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات، آپ کے "روح اللہ" ہونے اور آپ کی معجزانہ ولادت سے دھوکا کھا کر، حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں اس قدر غلو کیا کہ جناب مسیح کو "ابن اللہ" بنا دیا۔ اُن کی اس گمراہی سے آنے والی انسانی نسل کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں انبیاء کرام کے معجزات کا ذکر فرمایا ہے وہاں انبیاء کے "عبد" اور "بشر" ہونے کا بار بار ذکر کیا۔ اور نبیوں اور رسولوں کی زندگی کے ایسے واقعات پیش کئے، جس سے اُن کی عبدیت اور بشریت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی یہ شان تھی کہ اُنگلی کا اشارہ فرمایا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ دستِ مبارک میں کنکریاں کلمہ پڑھنے لگیں۔ درخت کو اشارہ کیا تو وہ چلنے لگا۔ کھجور کا بے جان اکڑا تنا رحمتِ عالم کو دیکھ کر اس طرح بلبلانے لگا، جیسے وہ اپنی بھوک پیاس کی فریاد کر رہا ہے! طشت میں ہاتھ ڈال دیا تو انگشتانِ مبارک سے پانی کی دھاریں نکلنے لگیں، صاحبِ معراج، رحمۃ للعالمین، سراجِ منیر، کائنات میں سب سے افضل و اعلیٰ، دنیا میں بہت بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے لیکن پوری تاریخ انسانی میں "انسانِ کامل" ایک ہی پیدا ہوا۔ جس عمل پر اطاعتِ رسولؐ کی چھاپ نہ ہو، وہ عمل اللہ کے یہاں قبول ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام فضائل و مناقب اپنی جگہ مسلّم! مگر ان فضائل و معجزات کو دیکھ کر لوگ دھوکا نہ کھا جائیں۔ اس لئے خود قرآن میں آپؐ کی بشریت اور عبدیت کا بہ تکرار اظہار کیا گیا۔ اور آپؐ کی زبانی کہلوایا گیا کہ:-

"میں کسی بھلائی اور بُرائی پر قدرت نہیں رکھتا"

نمازوں میں "محمداً" کے معاً بعد "و عبدہٗ" پڑھا جاتا ہے! اور پانچوں وقت ایک مسلمان کے یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے "بندے" ہیں اور بندے اور اللہ میں سب سے زیادہ نمایاں امتیاز "احتیاج" ہے۔ کہ بندہ کسی مقامِ رفعت و تقرب پر بھی پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا! بندگی اور احتیاج لازم و ملزوم ہیں! اور جو اللہ تعالیٰ سے خود احتیاج رکھتا ہو، کیا وہ تمام کائنات کے انسانوں کی احتیاج ر
معاملہ کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ میں (معاذ اللہ) اُنیس بیس کا فرق ہے۔ اور آپؐ کی ذات اور صفات اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سے بس کچھ ہی نیچی ہیں! ہمارا ایمان ہے کہ حضورؐ کائنات میں سب سے افضل و اعلیٰ ہیں! مگر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کے مقابلہ میں یہ آپ کی علوِ مرتبت اور افضلیت کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ پس گفتگو میں، تقریر و تحریر اور شاعری میں کوئی ایسا رمز و کنایہ، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفت، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کے مماثل یا مشابہ ٹھہرتی ہوں۔ آپؐ کی صفات میں "الوہیت" کا امتزاج پایا جاتا ہو۔ دینی نقطۂ نگاہ سے رد کر دینے کے قابل ہیں۔ اور ایسی باتوں سے نہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے اور نہ رسولؐ کی خوشنودی!!

زیارتِ قبور | قرآن کریم میں "زیارتِ قبر" کا کوئی حکم، اشارہ اور ایما تک نہیں ملتا۔ اور نہ کسی نبی اور صالح

اُمتی کا کوئی ایسا واقعہ مذکور ہے کہ فلاں نبی نے اپنے سے پہلے نبی کی قبر کی زیارت کے لئے سفر کیا تھا۔ یا نبی کے کسی صحابی نے نبی کے وفات پانے کے بعد اُس کی قبر کی مجاورت کی تھی!

اگر قبروں کی زیارت دین کی کوئی بہت بڑی اور ناگزیر ضرورت ہوتی تو اس کا ذکر قرآن پاک میں ضرور آتا! "زیارتِ قبور" دین کا کوئی ایسا رکن اور شعار کبھی نہیں رہا کہ جس کے ترک کر دینے سے کوئی دینی قباحت یا اعتقاد کی خرابی لازم آئے۔ ورنہ اس کا کسی نہ کسی عنوان سے قرآن ضرور ذکر کرتا!

کتاب اللہ کے بعد دین کا ماخذ سنّتِ رسولؐ اللہ ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت منصوص ہے! کتاب وسنّت ہی کی اساس پر دین کی ساری عمارت قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے "اسوۂ حسنہ" کو دُنیا کے لئے نمونہ اور مثال (model) قرار دیا ہے۔ حقیقت میں جس منزل میں حضورؐ کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں۔ بس وہی صراطِ مستقیم ہے!

حدیث میں ملتا ہے:۔

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ۔

میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے منع کیا تھا۔ سو اب قبروں کی زیارت کیا کرو۔ کہ یہ چیز دُنیا سے بے رغبتی کرتی اور آخرت کو یاد دلاتی ہے!

شروع شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کی ممانعت فرمادی تھی۔ اور اس ممانعت کا سبب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عرب بُت پرستی کے عادی تھے، وہ کفر و شرک سے نکل کر نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ حضورؐ کو اندیشہ تھا کہ ممکن ہے بعض طبیعتیں "قبروں" کی زیارت میں کسی ایسی بے اعتدالی کا ثبوت دیں جو اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ اور مبغوض ہو۔ ممانعتِ قبور کی مدّت کا تعین مشکل ہے کہ کتنے زمانہ تک یہ ممانعت باقی رہی، پھر حضورؐ نے زیارتِ قبور کی اجازت دے دی۔ اور اُس کی غرض کسی رمز و کنایہ کے بغیر بالکل واضح اور کھلے ہوئے لفظوں میں بتا بھی دی۔ یہ کہ قبروں پر اس لئے جاؤ کہ وہاں جانے سے (۱) دُنیا سے بے رغبتی پیدا ہو اور (۲) آخرت کی یاد آئے!

حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ قبروں پر پھول اور چادریں چڑھاؤ۔ اور اہلِ قبور سے اپنے لئے اللہ کے حضور دُعا کرنے کے لئے درخواست کرو۔ یا اُن سے استمداد و اعانت چاہو اور وہاں سے فیض حاصل کرو۔ اس قسم کا کوئی حکم، ایماء اور اشارہ تک حضورؐ کے کسی قول اور فعل سے نہیں ملتا!

ایک طرف حضورؐ نے زیارتِ قبور کی غایت بتادی اور دُوسری طرف خود اپنی "قبر" کے بارے میں اُمت کو متنبہ کیا:۔

اخرج النسائی عن ابی هريرةؓ قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم يقولُ لَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيدًا أَوْ صَلُّوا عَلَيَّ فَإِنَّ صلواتكم تبلغني حيث كُنْتُمْ!

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ میری قبر کو "عید" مت بناؤ۔ اور درود بھیجو مجھ پر اس لئے کہ تمہارا درود مجھ تک پہنچایا جاتا ہے، چاہے تم کہیں بھی ہو!

"عید" کہتے ہیں میلہ لگانے کو، اور اسے سب لوگ جانتے ہیں کہ میلوں ٹھیلوں میں کیا کیا ہوتا ہے اور میلے کس طرح جمتے اور لگتے ہیں۔!

ایک طرف یہ فرمایا کہ "میری قبر کو "عید" نہ بناؤ"۔ دوسری طرف یہود و نصاریٰ پر لعنت کی گئی کہ ان بدبختوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو "سجدہ گاہ" بنا لیا تھا۔

اخرج الشیخان عن عائشۃ اَنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی مرضہ الّذی لَمْ یَقُمْ مِنْہُ لَعَنَ اللہ الیہود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد !

بخاری اور مسلم نے بروایت حضرت عائشہؓ نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری میں جس سے اُٹھے نہیں، فرمایا کہ لعنت ہو اللہ کی یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے پیغمبروں کی قبروں کو مساجد بنا لیا — !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے قبل اُمت کو جس فتنہ سے متنبہ فرمایا، وہ یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ نے فرطِ عقیدت اور غلو احترام کے سبب اپنے نبیوں اور پیغمبروں کی قبروں کو مساجد بنا لیا تھا۔ اور اُن کا یہ فعل قابلِ لعنت ہے! مساجد میں لوگ چراغ جلاتے ہیں۔ فرش اور پردوں کا انتظام کرتے ہیں۔ پھر رکوع و سجود کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں۔ یہی باتیں اگر کسی نبی اور ولی کی قبر پر کی جائیں، تو ایسا کرنے والوں نے اس قبر کو گویا "مسجد" بنا لیا۔ اور اس فعل کے کرنے والے پر حدیث میں لعنت آئی ہے !

ایک اور ارشادِ نبویؐ :-

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَعَنَ اللہ زائراتِ القبور والمتخذین علیھا المساجد والسُّرُج - (مشکوٰۃ باب المساجد)

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لعنت کی اللہ نے اُن عورتوں کو جو زیارت کریں قبروں کی اور ان لوگوں پر لعنت خدا کی جو بنائیں قبروں پر مسجدیں اور روشن کریں (قبروں پر) چراغ !

اس حدیث میں قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور قبروں پر چراغ جلانے والوں کے لئے "لَعَنَ اللہ" (اللہ نے لعنت کی، یا اللہ کی لعنت ہو) کی خوفناک وعید دی گئی ہے !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "قبر" کے ساتھ ہر قسم کی مشرکانہ وابستگی اور دلچسپی کی جڑ کاٹ دی ہے۔ فرمایا :-

اخرج مسلم عن جابر قال نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یُجَصَّصَ القبرُ وان یُبنیٰ علیہ وان یُقعد علیہ !

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ منع کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے، قبر پر گچ کیا جائے اور اُس پر عمارت بنائی جائے اور اُس پر بیٹھا جائے !

اس حدیث میں قبر کو پختہ بنانے اور اُس پر عمارت قائم کرنے کی صریح لفظوں میں ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اور "ان یُقعد علیہ" کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ "قبروں پر چڑھ کر بیٹھنے سے روکا گیا ہے"۔ اس لئے کہ قبروں کے اُوپر چڑھ کر بیٹھنے کا کبھی رواج نہیں رہا۔ اور یہاں حدیث کا سباق و سیاق بتا رہا ہے کہ "ان یُقعد علیہ" کا مطلب یہ ہے کہ قبروں پر مُراقب ہو کر (اور مجاور بن کر) بیٹھنا ممنوع ہے!

ایک دوسری حدیث میں قبروں پر گچ کرنے، اُن پر کچھ لکھنے اور اُن پر پاؤں رکھ کر چلنے یعنی روندنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

اخرج الترمذی عن جابر قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبور وان یکتب علیھا وان توطا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر گچ کرنے سے، اور قبروں پر لکھنے سے اور قبروں کو روندنے سے!

ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ واضح ارشادات ہیں۔ اور دوسری طرف اہلِ بدعت کا قبروں کے ساتھ سلوک دیکھئے۔ کہ اپنے ایک ایک فعل سے فرمانِ رسولؐ کی خلاف ورزی کرتے ہیں!

حضورؐ نے اپنی قبر کو ''عید'' بنانے سے منع فرمایا تھا۔ اور یہاں اہلِ بدعت نے حضورؐ کے غلام جو حضورؐ کی خاکِ پا کے بھی برابر نہیں ہیں، اُن کی قبروں کو مسجد، عید اور شمع و چراغ سے شبستان بنا دیا ہے!

قبروں پر میلے ہیں گانا بجانا اور کھیل تماشے ہیں۔ طواف اور سجدے ہیں۔ مجاورت اور مراقبے ہیں۔ مزاروں سے حاجت مندوں کی عرضیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہاں آ آ کر مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ گاگر، پنکھے اور صندل کے جلوس نکلتے ہیں، کوئی قبر پر ماتھا ٹیک کر عرض معروض کر رہا ہے۔ کسی نے بارہ دری کے ستون کو تھام رکھا ہے، اور صاحبِ مزار کی دُہائی دے رہا ہے! کوئی دروازہ کے پاس جہاں دھمال صاحب رقص فرما رہے ہیں۔ ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ اور صاحبِ مزار کے جلال و جبروت کے خوف سے اندر حاضر ہونے کی ہمت نہیں کرتا! مجاور مزار کے چراغوں کی زائرین کو.... راکھ چٹا چٹا کر نذرانے وصول کر رہے ہیں۔ عقیدت مندوں کے سروں پر مور کے پنکھوں کو گھمایا، گلے میں کلاوا باندھا، چند الائچی دانے ہاتھ پر دھرے، اور مٹھی گرم کر لی۔ سجادہ نشین صاحب مندروں کے مہنتوں کی طرح چڑھاوے وصول کرتے ہیں! اور راوی اُن کے لئے سدا چین ہی چین لکھتا ہے۔

قبور و مزارات کے اس پورے نظام کو کیا اسلام سے کوئی دُور کا بھی واسطہ ہے؟ ان خرافات کے لئے کوئی دلیل کوئی سند، کوئی ثبوت، نقلی، عقلی، روایت سے درایت سے؟ اگر یہ حرکتیں شرک و بدعت نہیں تو پھر شرک و بدعت کسے کہتے ہیں؟

ہر بدعت گمراہی ہے!

صحیح مسلم کی حدیث ہے:۔

''اِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ وَخَیْرَ الْھُدٰی ھُدٰی مُحَمَّدٍ شَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ۔

(بہترین کلام خدا کی کتاب ہے، اور راستوں میں بہترین راستہ محمدؐ کا راستہ ہے۔ اور بدترین باتیں (دین میں) نئی نکلی ہوئی باتیں ہیں۔ اور (دین میں) ہر نئی نکلی ہوئی بات گمراہی ہے!

اس حدیث میں ہر ''بدعت'' کو گمراہی کہا گیا ہے۔ اس میں بدعت کی قسمیں نہیں کی گئیں۔ کہ یہ تو (۱) بدعتِ سیئہ ہے اور یہ (۲) بدعتِ حسنہ ہے۔ حضورؐ نے ''کل بدعۃ'' فرما کر ہر ''بدعت'' کے ''ضلالت'' ہونے کی تصدیق فرما دی ہے!

ایک دوسری حدیث میں ''اہلِ بدعت'' کے لئے کتنی خوفناک وعید آئی ہے:۔

اخرج الشیخان عن سهل بن سعد قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
انّی فرطکم علی الحوض من مرّ علیّ شرب ومن شرب لم یظمأ ابداً لیردن
علیّ اقوامٌ اعرفهم ویعرفوننی ثم یحال بینی وبینهم فاقول انهم منّی فیقال
انک لاتدری ما احدثوا بعدک فاقول سحقاً سحقاً لمن غیّر بعدی -

سہل بن سعد نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں حوض کوثر
پر تم سب سے پہلے جاؤں گا، جو کوئی حوض کوثر کی طرف آنکلے گا اور جب (آپ کوثر)
پیئے گا تو اُسے پھر کبھی پیاس نہیں لگے گی۔ البتہ میرے پاس آئیں گے کئی فرقے کہ میں اُن کو پہچانتا ہوں گا
اور وہ مجھ کو پہچانتے ہونگے، پھر ایک پردہ حائل ہو جائے گا - میرے اور اُن کے درمیان
تو میں کہوں گا یہ تو میرے ہیں - اس پر کہا جائے گا کہ تُو نہیں جانتا، انہوں نے کیا کیا
نئی نئی باتیں نکالی تھیں تیرے بعد، تب میں کہوں گا کہ دُوری ہو، دُوری ہو - اُس کیلئے
جس نے میرے دین کو متغیر کر دیا !

"بدعت" دین میں نئی بات نکالنے کو کہتے ہیں، ایسی بات جس کا کتاب وسنّت تو کجا آثار صحابہؓ تک میں
اُس کا پتہ نہ ہو - جو لوگ "بدعتیں" نکالتے یا اُن پر عمل کرتے ہیں، وہ "ترک بدعت" سے گھبراتے ہیں - اور انھیں
خوف لگتا ہے کہ فلاں رسم اور طریقہ کو ہم نے چھوڑ دیا - تو اس سے نہ صرف یہ کہ ہم بہت بڑی سعادت سے محروم
ہو جائیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ بھی ہوگا - اور جو کوئی اُن کی طرح بدعتوں میں مبتلا نہیں ہے، یا اُن پر
نکیر کرتا ہے، وہ بدبخت تو ہے ہی، مگر ساتھ ہی بدعقیدہ بھی ہے !

بدعت اور اجتہاد میں زمین آسمان کا فرق ہے، بدعت ضلالت ہے اور "اجتہاد" دین کی ضرورت ہے -
اس لئے مجتہد کو نیک نیتی اور دین کی خیر خواہی کے سبب غلطی پر بھی اجر ملتا ہے !

"لاؤڈ اسپیکر" کے بارے میں علماء کی اکثریت نے اجتہاد کیا کہ نماز اور جمعہ کے خطبہ میں اسے استعمال کیا جا سکتا
ہے، اس "اجتہاد" سے دین کا کوئی اصول نہیں ٹوٹتا اور نہ کوئی "لاؤڈ اسپیکر" کے عدم استعمال کو دین کی کسی کوتاہی
کے مترادف سمجھتا ہے ! اس اجتہاد کے مقابلہ میں قبروں پر چادر چڑھانا "بدعت" ہے، کہ قبریں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ میں بھی موجود تھیں، چادریں بھی اُن کے پاس تھیں - اگر یہ کوئی نیک کام یا
دینی ضرورت ہوتی، تو اس کے بتلانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام گریز نہ فرماتے ! اسی طرح
اموات کا تیجا، دسواں اور چالیسواں بھی بدعت ہے - کہ کتاب وسنّت اور آثارِ صحابہ اور سیرت اہل بیت میں
اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا !

"بدعت" پر یہ جو دلیل لائی جاتی ہے کہ ریڈیو، ٹیلیفون، ریل، ہوائی جہاز، یہ سب بدعتیں ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کا وجود نہ تھا - اس دلیل میں کوئی وزن نہیں - بلکہ یہ دلیل کہنے والے کے
سطح ذہن کا پتا دیتی ہے کہ حضرت اس قدر عقلمند (؟) واقع ہوئے ہیں — !
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میرے زمانے کے بعد آلات، اسلحہ اور دُوسری چیزیں ایجاد

ہوں تو اُن کو استعمال نہ کرنا! پھر ان "ایجادات" سے دین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا! اس لئے یہ "بدعت" کا حکم نہ پاسکیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں تمام صحابہ کرام ٹھیک وہی لباس نہیں پہنتے تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے، حضورؐ نے زندگی بھر میں شاید ایک بار پاجامہ پہنا ہے، سرکارؐ ہمیشہ تہمد استعمال فرماتے تھے، مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پاجامہ پہننے کے عادی تھے، سُنت ستر عورت کا ڈھکنا اور ایسا لباس پہننا ہے، جس سے استکبار و غرور نہ ظاہر ہو، حضورؐ نے کسی خاص لباس کی قید نہیں لگائی!

حجاج بن یوسف ثقفی نے جو مصحف مقدس (قرآن کریم) پر اعراب لگائے تھے، تو اُسے جو کوئی "بدعت" کہتا ہے وہ نہایت درجہ بلید الذہن ہے۔ اور اگر وہ "بدعات" کے جواز کے لئے جان کر ایسی نکتہ آفرینی کرتا ہے تو وہ اس طرح دین میں بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھولتا ہے! اور جس چیز (بدعت) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" کہا ہے، اُس کو سندِ جواز دینے کے لئے وہ تاویلیں کرتا اور حیلے تراشتا ہے! اس ذہنیت اور فکر و مزاج سے اللہ کی پناہ!

حجاج بن یوسف کے زمانہ میں قرآنِ پاک لکھا لکھایا موجود تھا۔ اُس کی تلاوت کرنے والے، تجوید کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے تھے، تو حجاج نے بس یہ کیا کہ جو "اعراب" زبان سے ادا ہوتے تھے، اور اُن کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی تھی، انھیں قرطاس پر منتقل کر دیا۔ اور یہ اُس نے زیادہ تر عجمی مسلمانوں کی سہولت کے لئے کیا، تاکہ تلاوتِ قرآن میں انھیں زحمت پیش نہ آئے اور وہ غلطیاں کرنے سے بچ جائیں! یہ دین میں ایک سہولت تھی —!

نماز کے لئے وقت کا پہچاننا ضروری ہے، اس سہولت کے لئے گھڑیوں سے استفادہ کیا جاتا ہے! نماز کے لئے وقت کے پہچاننے کا حکم کتاب و سنت سے ثابت ہے! اس حکم کی تعمیل میں ایک ایجاد سے فایدہ اُٹھایا جاتا ہے! اور یہ نہ بدعت ہے نہ احداث فی الدین ہے! اس نخل سے دین و شریعت میں ذرہ برابر کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا!

تراویح کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول "نعمۃ البدعۃ" کو ایک کلیہ بنا کر بدعت کے حسنہ ہونے کا جو ایک نکتہ پیدا کیا گیا ہے، خود یہ نکتہ آفرینی "بدعت" کی بدترین مثال ہے! تراویح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پڑھی جاتی تھی۔ اور جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی۔ مگر حضورؐ نے باجماعت تراویح پر مداومت نہیں فرمائی۔ یہ پورا سلسلہ مسنون تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس طریقۂ مسنونہ کو ہمیشہ کے لئے جاری کر دیا۔ یہ لغوی معنیٰ میں "نعمۃ البدعۃ" ہے۔ شرعی اصطلاح والی وہ "بدعت" نہیں ہے، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" فرمایا ہے!!

قبروں پر عرس کرنا اور میلہ لگانا "نعمۃ البدعۃ" اس لئے نہیں ہے کہ کتاب و سنت بلکہ آثارِ صحابہ تک سے اس کے لئے کوئی سند نہیں ملتی! بلکہ حضورؐ نے اپنی قبر کو "عید" بنانے سے منع فرمایا ہے! لہٰذا قبروں پر عُرس، عید و جشن اور نذر و نیاز کا یہ پُورے کا پُورا نظام "بدعت" ہے۔ کہ اس کے لئے سنن و آثار میں کوئی دلیل نہیں بلکہ ایسی باتوں کی ممانعت ہی ملتی ہے!

"نعمۃ البدعۃ" کے لغوی معنیٰ کو ایک کلیہ قرار دے کر، دین میں ہر اضافہ، زیادتی اور احداث کو جائز

اسے "حسنہ" قرار دینا - حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے متبع سنت جلیل القدر صحابی پر کتنی بڑی تہمت ہے، جو لگائی جارہی ہے!
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں متعدد صحابہ وفات پاتے ہیں، مگر کسی وفات پائے ہوئے صحابی کا نہ تیجا ہوتا ہے نہ دسواں اور چالیسواں، اور نہ اُن کی قبروں پر عُرس کیا جاتا ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اس قسم کی کسی رسم کا حدیث وسیرت کی کتابوں میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا - دین وشریعت میں یہ سب بعد کے لوگوں کے اضافے ہیں - زیادتیاں ہیں - خرافات و بدعات ہیں - قبروں پر عُرس اور نذر و نیاز کی بعض صورتوں اور ہیئتوں میں "شرک" کی بقدر وافر آمیزش پائی جاتی ہے - جن کو بُرا سمجھنا اور اُن سے دُور رہنا تو ایمان و توحید اور اتباعِ سنت کا تقاضا ہے ہی - مگر قوت حاصل ہو تو انھیں روک دینا بھی چاہیئے!

"بدعات" پر ہر زمانہ میں نکیر کی گئی ہے - متقدمین کی کتابوں میں تو اہلِ بدعت سے میل جول رکھنے تک کو ناپسند کیا گیا ہے اور وہ اس لئے کہ اُن کی صحبت میں رہ کر "بدعات" کو دیکھتے دیکھتے اُن کی "نفرت" دل سے یا تو جاتی رہتی ہے یا کم ہو جاتی ہے۔ ایمان و اسلام کا تقاضا ہے کہ بدعت وشرک اور منکرات کو دیکھ کر دل میں جھنجلاہٹ اور نفرت پیدا ہو اس احساسِ غیرت کا باقی، زندہ اور فعال رہنا ضروری ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو "اہلِ بدعت" کی تعظیم و توقیر کی ان لفظوں میں ممانعت فرمائی ہے :-

من وقرا صاحب بدعة فقد اعان على هدم الاسلام -

جس شخص نے کسی صاحب بدعت (بدعتی) کی تعظیم و توقیر کی، وہ دراصل اسلام کی عمارت ڈھانے میں مددگار ہوا - !

بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حال پر قائم نہیں رہتی - اس میں اضافے ہی ہوتے چلے جاتے ہیں! پچھلی اُمتوں نے شرک و بدعات اور احداث فی الدین کے ذریعہ دین کو مسخ کر دیا تھا - "بدعت کوئی ایسی ہلکی اور معمولی بُرائی نہیں ہے، جسے نظر انداز کر دیا جائے، یہ تو اپنی فطرت اور مزاج سے "ضلالت" ہی "ضلالت" واقع ہوئی ہے !

دین میں "نئی بات" (بدعت) نکالنا کوئی معمولی بُرائی اور ہلکی خرابی نہیں ہے! "بدعت" اس بات کی دلیل ہے کہ خاکم بدہن گستاخ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا تو اس بات کے بتانے سے بُخل کیا یا آپ نے خیانت فرمائی - امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے "بدعت" پر انہی لفظوں میں نکیر کی ہے !

ایصالِ ثواب جائز ہے! کسی شخص نے کسی بزرگ کے یومِ وفات پر اُن کے نام سے فقراء اور حاجت مندوں کو کچھ دے دیا، اور اُس دن اُن کی قبر پر بھی ہو آیا اور فرطِ محبت سے قبر پر سے پتے اور کنکریاں وغیرہ صاف کر کے ایک کپڑا ڈال دیا، چلو چھٹی ہوئی! مگر چھٹی کیسے ہو سکتی ہے اور معاملہ اسی نوبت پر جا کر ختم کیسے ہو سکتا ہے! کہ "بدعت" کا معمولی سا شائبہ بھی بنار فاسد علی الفاسد کے اصول پر:-

تا ثریا می رود دیوار کج

بن کر رہتا ہے، بعد کے آنے والوں نے اُن بزرگ کے "یومِ وفات" کو ضروری قرار دے لیا - قبر پر نہ صرف یہ کہ چادریں چڑھنے لگیں، بلکہ اُن کے جلوس نکلنے لگے، پھر اس قبر کے کچھ لوگ متولی، سجادہ نشین اور خدام و مجاور مقرر ہوئے - اور معاملہ مزار کے چراغاں اور قبر کے "غسلِ مبارک" (۹) سے لے کر نارِ رنگ، سجدہ و طواف اور استمداد و استغاثہ تک پہنچ گیا -

صحابہ کرام ان معاملات میں اس قدر احتیاط برتتے تھے کہ ایک شخص نے اپنے کسی عزیز بچّہ کی ختنہ پر کچھ لوگوں کو بُلایا، اس پر صحابہ نے اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں "ختنہ" کے لئے نہ کوئی اعلان ہوتا تھا اور نہ لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا تھا!

نفل نماز پڑھنا ایک ثواب کا کام ہے، مگر چونکہ نماز عید سے پہلے نفل پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول نہیں رہا۔ اس لئے ایک شخص کو نماز عید سے قبل دوگانہ پڑھتے دیکھ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اُسے ٹوکا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ نماز کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، جس کی وجہ سے مجھ پر عذاب ہوگا۔ حضرت علیؓ نے اس پر فرمایا:۔

إنّ الله لا يثيبُ على فعلٍ حتى يفعله رسول الله صلى الله عليه وسلم
يحث عليه فتكون صلواتك عبثاً والعبث حرامٌ فلعله تعالى يعذبك
بمخالفتك لنبيه ۔

جب تک کسی کام کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے نہ ملے،
اللہ تعالیٰ اُس پر ثواب نہیں دیتا۔ تیری نماز (اس لئے) ایک بے معنی اور عبث
کام ہوگا اور عبث کام کا کرنا حرام ہے۔ کیا عجب ہے کہ پروردگار عالم اپنے نبیؐ کی
مخالفت کرنے کی وجہ سے اس نماز کے سبب تجھے عذاب دے!

"بدعت" پر شدید وعید اس لئے آئی ہے کہ "بدعت" سے یہ احساس اُبھرتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ سے کچھ ایسی باتیں بیان کرنے سے رہ گئیں، جن کے کرنے سے آخرت میں بڑا ثواب حاصل ہوگا اور روحانیت میں ترقی ہوگی! یہ احساس کس قدر گمراہ کن ہے!! — توبہ!

ابوبکر شیبہ نے اپنی کتاب "مصنف" میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک شخص مدینہ منورہ میں روضۂ رسولؐ کے قریب کھڑا ہوا کچھ عرض معروض کر رہا تھا۔ حضرت امام زین العابدین ابن حسین رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے اُسے منع فرمایا۔ اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"لا تتخذوا قبری وثناً"

(میری قبر کو "بُت" نہ بنانا)

جُہلاء کے قول و عمل کا کوئی وزن اور اعتبار نہیں۔ اہلِ حق نے "بدعات" پر ہمیشہ نکیر کی اور سختی کے ساتھ ٹوکا ہے! قرآن کی تلاوت کرنا، باعثِ اجر و ثواب ہے، قبر کے پاس قرآن کی تلاوت کی جائے، تو اس میں بظاہر کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ مگر اس میں بھی:۔

اختلف الفقهاء في حكم قراءة القرآن عند القبر، فذهب إلى استحبابها الشافعي
ومحمد بن الحسن، لتحصل للميت بركة المجاورة ووافقهما عياض والقرافي من المالكية
ويرى احمد، انه لا بأس بها، وكرهها مالك وابوحنيفة لانها لم ترد بها السنة!
فقہائے قبر کے پاس تلاوتِ قرآن کے بارے میں اختلاف کیا ہے! شافعی اور محمد بن الحسن اس کے
استحباب کے قائل ہیں تاکہ میّت کو مجاورتِ تلاوت کی برکت حاصل ہو اور (قاضی) عیاض اور قرافی

نے جو مالکیہ میں سے ہیں، ان دونوں کی رائے سے اتفاق کیا ہے، اور امام احمد کا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے اسے مکروہ سمجھا ہے، کیونکہ اس کے متعلق کوئی سنّت موجود نہیں ہے !

"تلاوتِ قرآن" جیسے بے ضرر، بلکہ باعثِ ثواب فعل کے بارے میں امام مالک اور امام ابو حنیفہ کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ وہ قبروں کے پاس تلاوتِ قرآن کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ سنّت میں اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی! جن لوگوں کے سامنے اُن کے اکابر اور سلفِ صالحین کے یہ امثال و نظایر اور طریقِ فکر ہو، وہ "بدعات" میں مبتلا ہو جائیں، تو اس سے زیادہ بے دانشی اور بد توفیقی اور کیا ہو سکتی ہے ؟

"گیارھویں شریف" جسے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے اور "چھٹی شریف" جسے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور ایسی دُوسری رسموں، تقریبوں اور تیوہاروں پر جو علماءِ اہلِ حق، حامیانِ سُنّت اور ماحیانِ بدعت کی طرف سے نقد و احتساب نکیر اور گرفت کی جاتی ہے، تو اس سے ان بزرگوں کا رُتبہ ذرا بھی نہیں گھٹتا۔ بلکہ اُن کا مُوقف اور واضح ہو جاتا ہے! کہ اُن سے جن بدعات کی نسبت کی گئی ہے، اُن کے نہ کرنے کی نہ انہوں نے تلقین کی اور نہ ایسی خلاف شرع باتوں کو وہ پسند فرماتے تھے !

اگر بزرگانِ دین کے ولادت و وفات کے "یوم" منانے کو اسلام میں پسندیدہ سمجھا جاتا، تو انبیاء صالقین ایک دُوسرے کا یومِ ولادت و وفات ضرور مناتے! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کوئی قول اور عمل ضرور ملتا کہ آپؐ نے اپنی ازواجِ مطہرات حضرت خدیجہؓ، حضرت زینبؓ بنت خزیمہ، اپنے عمِ محترم حضرت سیدالشہداء حمزہؓ، اپنے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار اور اپنی صاحبزادیوں (زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ) میں سے کسی کا یومِ ولادت و وفات منایا، یا منانے کی ہدایت فرمائی !

خود حضور رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یومِ ولادت و وفات آپؐ کے بعد صحابہ کرام اور اہلِ بیت اطہار نے نہیں منایا۔ خیر القرون میں ان رسموں اور تقریبوں کا رواج ہی نہ تھا۔ یہ "مولود"، جو مسلمانوں میں مروج ہے، اس کا بانی مبانی سلطان ملک شاہ سلجوقی ہے، جس نے بغداد میں ۴۸۵ھ ہجری میں پہلی مرتبہ "محفلِ مولود" منعقد کی۔ تو یہ مروجہ "مولود" نہ سُنّتِ رسُولؐ ہے، نہ اسوۂ صحابہ اور نہ طریقِ سلفِ صالحین ہے! بلکہ یہ "سُنّتِ ملوک" ہے، تو جس کو رسُولؐ کی سُنّتِ مطہرہ اور صحابہ کا اسوہ پسند ہو گا، وہ اُس کی پیروی کرے گا۔ اور جس کو بادشاہوں کی "سنت" محبوب ہو گی، وہ اس کے احیاء و بقاء کو باعثِ سعادت سمجھے گا!

پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی !

یہاں گفتگو " مروجہ میلاد" سے ہے، جہاں تک حضورؐ کی سیرت کے تذکرہ و بیان اور اُس کی نشر و اشاعت کا تعلق ہے، اُس کو زیادہ سے زیادہ عام ہونا چاہیئے۔ "سیرت النبیؐ" کے جلسوں کا انعقاد ہونا ضروری ہے کہ ان سے ایمان تازہ اور اتباعِ رسُولؐ کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ پُوری انسانی تاریخ اور کائنات میں "محمدؐ" بس ایک ہی پیدا ہوا۔ جس کی تعریف زمین و آسمان میں ہوتی ہے، کروڑوں آدمی اُس کا نام نمازوں میں لیتے ہیں۔ اذان و تکبیر میں اس انسانِ کامل کا نام بلند ہوتا ہے۔ اور پورے چودہ سو سال کی مدّت میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ "ذکرِ محمدؐ" سے

۲

خالی رہی ہو۔ اس لئے کہ خود اللہ نے آپؐ کے ذکر کو بلند فرمایا ہے:۔

"وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ"

اور جس کے ذکر کو اللہ تعالیٰ بلند فرمائے کس کی مجال اور طاقت ہے جو اُس کے ذکر کو پست کردے!

گفتگو اس میں ہے کہ "ذکرِ رسول" کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں ہے، جس سے بے اعتدالیوں کے لئے راہیں نکلتی ہوں، اور ایسی باتوں کو ضروری ٹھہرالیا گیا ہو، جن کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے۔ مثلاً محفلِ میلاد شریف میں "قیام" ایک نادر اجدت ہے، جس کا کوئی ثبوت، کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ یا ائمہ فقہا کے قول و فعل سے نہیں ملتا۔ بلکہ حدیث میں کھڑے ہو کر تعظیم دینے کو عجمی لوگوں کے ناپسندیدہ طریقے سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

اخرج ابو داؤد عن ابی امامة قال خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم متكئاً على عصا فقمنا له فقال لا تقوموا كما يقوم الاعاجم بعضهم بعضاً۔

ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لکڑی پر ٹیک لگائے ہوئے باہر تشریف لائے، آپؐ کی تعظیم کے لئے ہم کھڑے ہو گئے (اس پر) آپ نے فرمایا کہ نہ کھڑے ہوا کرو، جیسے کھڑے ہو جاتے ہیں عجمی لوگ ایک دوسرے کو تعظیم دینے کے لئے!

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں اپنی تعظیم کے لئے صحابہ کرام کا کھڑا ہونا پسند نہیں تھا، تو حضورؐ کو یہ بات کس طرح پسند آسکتی ہے اور آپؐ کی خوشنودی کا سبب بن سکتی ہے کہ آپؐ کی ولادت کا جب محفلوں میں ذکر آئے تو سامعین تعظیم کے لئے کھڑے ہو جائیں، محفلِ میلاد میں "قیام" کی رسم عجمیوں سے لی گئی ہے اور یہ عجیب منطق اور طرزِ استدلال و تفکر ہے کہ جو لوگ اس "عجمی بدعت" کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ناپسندیدہ تھی، برکت و ثواب کا سبب اور موجبِ رحمت سمجھتے ہیں، وہ تو کہلائیں "عاشقانِ رسول" اور جو خدا کے نیک بندے اور حضورؐ کی سنت کے متبع "قیام" پر جو عجمی بدعت ہے، گرفت کریں، وہ کہلائیں "بے ادب اور رسولؐ کی شان کو گھٹانے والے"! یہ کس قدر کھلی ہوئی ناانصافی، ظلم اور غلط اندیشی ہے!

قرآن پاک میں "میلادِ آدمؑ" کا ذکر آیا ہے۔ اگر ذکرِ ولادت پر قیام کرنا برکت و ثواب کا باعث ہوتا تو جن آیتوں میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق و پیدائش کا ذکر ہے، ان کو تلاوت کرتے ہوئے حضورؐ اُٹھ کھڑے ہوتے، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معجزانہ ولادت کا ذکر قرآن میں سب سے زیادہ تفصیل سے آیا ہے، اگر انبیاء کرام کے ذکرِ ولادت کے وقت "قیام" کرنے میں کوئی بھلائی ہوتی، تو قرآن کی ان آیتوں کی تلاوت کے وقت جن میں مسیح علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو جاتے!

صحابہ کرام سے زیادہ عاشقِ رسولؐ اور حضورؐ کا فدائی اور جاں نثار اور کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کبھی نہیں کیا کہ "ذکرِ ولادتِ رسولؐ" کے وقت تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے ہوں۔ تابعین تبع تابعین اور ائمہ فقہ میں کسی نے "قیام" نہیں فرمایا!

محفلِ میلاد کا "قیام" وہ بدعت ہے، جو یہ بتاتی ہے کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی ایک

بھلائی بتانے سے رہ گئی - اور صحابہ کرام بھی اس نیکی پر مطلع نہ ہو سکے - اور تابعین اور ائمہ فقہ پر بھی "تعظیم رسول" کے یہ اسرار نہ کھل سکے، صدیوں کے بعد جا کر یہ "نیکی اور سعادت" کچھ لوگوں پر ظاہر ہوئی - اور اُسے تعظیم رسول اور عشقِ نبی کی نشانی اور علامت ٹھہرا دیا گیا —— ہائے "عشقِ رسول" کی یہ مظلومیت —— !

عشق و محبت کا صحیح تقاضا!

عشق کا تقاضا کیا ہوتا ہے؟ یہی اور صرف یہی کہ عاشق اپنی مرضی اور خواہشوں کو محبوب کی رضا میں گم کر دے، "عشق" محبوب کی قدم بہ قدم اور حرف بہ حرف اطاعت کا نام ہے - جو بات محبوب کو پسند ہو، وہی محب کو پسند ہو - ع

عاشقی چیست؟ بگو بندۂ فرماں بُودن !

اگر کوئی شخص "عشق" کا تو مدعی ہو، مگر محبوب کے احکام کی پروا نہ کرے ! اور اپنے دل اور خواہش سے ایسی باتیں نکال لے، جو محبوب کو پسند نہ ہوں، تو ایسا "عشق" کیا معتبر کہا جا سکتا ہے؟ عشق نافرمان اور سرکش ہو ہی نہیں سکتا !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم سے اعلان فرمائیں :-

" ..... کہ میں اپنی جان کے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا ! "

(..... لَا اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعاً وَّلَاضَرًّا .....)

اس کے مقابلہ میں "عاشقانِ رسول" (؟) اپنے قول و عمل سے اس کا ثبوت دیں کہ حضور ! آپ فرماتے ہیں - "کہ میں اپنی جان کے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا" مگر ہم تو آپ کو تمام کائنات کے نفع و نقصان کا مختار سمجھتے ہیں، آپ ہی کے در سے ساری دُنیا کو رزق، اولاد، صحت اور مال و متاع تقسیم ہوتا ہے، آپ مالک کون و مکان اور دونوں جہان کے مختار اور رکھوالے ہیں !

آپ فرماتے ہیں :-

وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ، مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ - (مشکوٰۃ، باب البکاء والخوف)

(قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا، قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا، حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں کہ کیا معاملہ ہوگا میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ)

مگر ہم "عاشقانِ رسول" تو آپ کے اس ارشاد کے توڑ پر آپ کو "عالم الغیب" کہتے اور سمجھتے ہیں ! اور آپ کی ذات کے لئے "علم غیب" ثابت کرنا، ہمارا سب سے زیادہ دل پسند موضوع ہے !

آپ نے فرمایا :-

" تم میں کوئی یوں نہ بولے کہ میرا بندہ (عبدی) یا میری بندی (اَمتی) تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری عورتیں بھی سب اللہ کی بندی ہیں !" (مشکوٰۃ - باب الاسامی)

مگر ہم "عاشقانِ رسول" نے آپ کے اس حکم کی تعمیل" (؟) اس مخالفت کے ذریعہ کی ہے کہ اپنے نام "عبد المصطفےٰ" اور "عبد الرسول" رکھ لئے ہیں -

حضورؐ نے فرمایا کہ "میری قبر کو "عید" (میلہ) نہ بنانا، وثن (بُت) نہ بنانا" اور :-

حضورؐ نے "قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے"

مگر ہم "عاشقانِ رسولؐ" ایک ایک پیر، فقیر اور ولی کی قبر کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں، جس سے آپؐ کے ایک ایک قول کی نفی ہوتی ہے، قبروں پر میلے ہم لگاتے ہیں۔ چراغاں ہم کرتے ہیں۔ کھانے کی دیگیں پکا پکا کر ہم لٹاتے ہیں۔ چادریں ہم چڑھاتے ہیں۔ مرادیں ہم مانگتے ہیں۔ مزاروں کا طواف ہم کرتے ہیں۔ صاحبِ قبر کے نام کی دہائی ہم دیتے ہیں۔ قبریں ہماری تجارت اور آمدنی کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ قبریں ہمارے مشائخ کی جائیدادیں اور دفینے ہیں — اور

"حضورؐ نے قبروں کو "گچ" کرنے (پختہ بنانے سے) منع فرمایا"

اور ہم آپؐ کے عاشقوں (؟) اور جاں نثاروں (؟) نے چونہ اور اینٹوں پر ہی بس نہیں کیا بلکہ سنگِ مرمر اور سنگِ رخام تک قبروں پر لگا دیا ہے اور کسی کسی قبر پر تو چاندی اور سونے کے پتر منڈھ دیئے ہیں۔ اور اطلس و مخمل کے پردے لٹکا دیئے ہیں۔

اور "حضورؐ نے ہر "بدعت" کو "ضلالت" فرمایا اور ہر ضلالت کو "جہنم" سے نسبت دی۔"

مگر ہم آپؐ کے حلقہ بگوشوں اور جاں نثاروں نے "نعمت البدعۃ" کو آڑ بنا کر "بدعات" کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہمیں جیسی دلچسپی "بدعت" کے ساتھ ہے، اتنی دلچسپی اور کسی چیز سے نہیں ہے۔ عُرس، تیجا، دسواں، بیسواں، چالیسواں، مدار کی چھڑیاں، سدّو کا بکرا، کسی کا توشہ، کسی کی سہ منی نیاز، کسی کی صحنک، کسی کے کونڈے، کسی کے نام کی گاگر، کسی کا پنکھا۔ کسی کی نیاز حلوے مانڈے پر، کسی کی فاتحہ شربت اور کھیر پر، اور کسی کی بالائی اور حلیم پر! قبروں کو غسل دے کر اُن کا پانی ہم تبرک کے طور پر پیتے ہیں۔ قبروں پر جلنے والے چراغوں کی، یعنی جس فعل پر آپؐ نے لعنت بھیجی ہے، اُن چراغوں کی راکھ ہم چاٹتے ہیں!

اور وہ جو حضورؐ نے حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے فرمایا تھا:-

"اللہ تعالیٰ کا کسی کو شریک نہ ٹھہرانا چاہیے، تجھے قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے"۔

(مشکوٰۃ باب الکبائر)

تو حضورؐ آپؐ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر اپنے مزاج اور طبیعت کو کیا کریں کہ "شرک" کے معاملہ میں ہم کچھ بے پرواہ واقع ہوئے ہیں۔ اور اس میں جتنی بھی "ڈھیل" ہو جائے ہمیں نہیں کھلتی۔ آپؐ کو "احمد بلا میم" کی اصطلاح اور ترکیب ہماری ہی ذہنِ نادرہ کی تخلیق ہے، ہم آپؐ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ جہاں کہیں سے بھی ہم آپؐ کو پکاریں، آپؐ ہماری پکار کو سن لیتے ہیں۔ اور آپؐ ہی نہیں، ایک ایک وفات پائے ہوئے پیر اور ولی کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مخلوقات کی دستگیری کرتے ہیں اور اپنے ماننے والوں اور عقیدت کیشوں کے احوال کی اُن کو خبر رہتی ہے — (ان عقائد و اعمال سے اللہ تعالیٰ کی کروڑ بار پناہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد، حکم اور فرمان کی اس بے دردی کے ساتھ مخالفت اور خلاف ورزی کرنے کے بعد "عشقِ رسولؐ" کا دعویٰ! ایک ایسا تضاد ہے کہ جس کی مثال دُنیا کے پردے پر شاید ہی کہیں مل سکے! کتنا بڑا دھوکا ہے جو "عشق و محبت" کے نام پر شیطان نے اُن لوگوں کو دے رکھا ہے۔ جو "مشرکانہ اعمال و رسوم اور بدعات" سے انتہائی شغف رکھتے ہیں اور جن کا مشن ہی یہ ہے کہ یہ خرافات فروغ پائیں۔ اور ان خرافات کے فروغ کو وہ اپنے "مسلک" کی بہت بڑی فتح سمجھتے ہیں!!

وہابیت اور دیوبندیت! مکہ میں جب اسلام پھلنا شروع ہوا تو کفارِ قریش نے مسلمانوں کے لئے ایک طنز آمیز لقب "صابی" تراشا تھا - جس کے معنی "بے دین" کے تھے - یعنی جس کافر کو اللہ ہدایت دیتا اور وہ اسلام قبول کر لیتا تو کفارِ قریش طنزاً غیظ و غضب کے لہجہ میں کہتے کہ "فلاں شخص "صابی" ہو گیا!"

اہلِ بدعت نے بھی خدا کے اُن عبرت مند بندوں کے لئے جو "شرک و بدعت" کو کسی عنوان برداشت ہی نہیں کر سکتے، "وہابی اور دیوبندی" کے لقب تراش لئے ہیں - اور جب کوئی اُن کی خرافات پر ٹوکتا ہے تو اُسے "وہابی اور دیوبندی" کہہ کر مطعون کر دیتے ہیں - ان لوگوں نے بیچارے عوام کے دلوں میں اپنے پروپیگنڈے کے زور سے یہ بات اُتار دی ہے کہ "وہابی اور دیوبندی" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کیا کرتے ہیں - اور اولیاء اللہ کے دشمن ہیں"!

اہلِ بدعت نے ان "وہابیوں اور دیوبندیوں" کی کتابوں کے بعض غیر محتاط جملوں اور غیر معتدل عبارتوں کا اس زور شور سے پروپیگنڈا کیا ہے کہ اس تصویر کے تمام روشن اور تابناک پہلو عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں - اور یہ چند "جھائیاں" پوری تصویر پر چھا گئی ہیں - حالانکہ "اہلِ حدیث (وہابیوں) اور دیوبندیوں" کا مشن اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دُنیا کو "کتاب و سنت" کی دعوت دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوۂ حسنہ" کی طرف انسانیت کو بلائیں، وہ خود اپنی ذات سے بھی اتباعِ سنت کی امکانی کوشش کرتے ہیں - اور "وہابیوں" کا تو اس معاملہ میں یہ حال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کی ذات سے "اطاعت" و "اتباع" ہی نہیں - بلکہ "تقلید" تک کی نسبت اُنھیں گوارا نہیں!

مقامِ حیرت ہے کہ جو ہر بات کے لئے کتاب و سنت سے سند طلب کرتے ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی بناء پر۔

مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ۔

(جس نے کوئی کام کیا اور اس کام کرنے کا میرا حکم نہیں ہے، وہ مردود ہے)

ہر اُس "بدعت" "اِحداث" اور "جدت" کو ٹھکرا دیں، جس کے لئے سنتِ رسول میں دلیل نہ ملتی ہو - اُن کو تو "رسول اللہ کے مرتبہ کو گھٹانے والا" کہا جائے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کے مقابلہ میں دوسروں کی نکالی ہوئی بدعتوں، جدتوں اور نئی نئی باتوں ہی کو دین سمجھتے ہوں، وہ دعویٰ کریں "عشقِ رسول" کا! ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

اگر "دیوبندیت اور وہابیت" شرک و بدعت کے ردّ و مخالفت اور سنتِ رسول کے بقاء و احیاء اور تمسک کا نام ہے، تو پھر یہ بڑی اچھی چیز ہے! اور اسلام میں شروع ہی سے یہی "فکر" کارفرما اور فعال رہی ہے!

حجرِ اسود جس کی پاکیزگی سب کے نزدیک مسلّم ہے، جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لب ہائے مبارک سے چوما ہے اور کروڑوں صالحین اور اولیاء اللہ نے اُس کو چھوا اور بوسہ دیا ہے، اُسے مخاطب کر کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-

رایت عمر یقبل الحجر ویقول لاعلم انک حجر ما تنفع ولا تضر ولولا انی رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبلک ما قبلتک!

(عابس بن ربیعہ نے کہا) میں نے عمرؓ کو حجر اسود چومتے دیکھا کہ وہ کہتے جاتے تھے کہ میں جانتا ہوں تو پتھر ہے، نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے نہ دیکھتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس درخت کے نیچے صحابہ کرام سے بیعت لی تھی اور جس کا ذکر خود قرآن کریم میں آیا ہے؟

"لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ۔"

یہ درخت برکت کا کتنا بڑا اثر اور نشان بن سکتا تھا، مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر کہ لوگ اس درخت کے پاس کثرت سے آنے جانے لگے تھے، اور خطرہ ہوگیا تھا کہ عقیدت کا غلو کہیں مسلمانوں کو کسی بے اعتدالی میں مبتلاء نہ کردے اور آنے والی نسلیں اس درخت کو "نشانِ تعظیم" نہ بنالیں، حضرت عمرؓ نے اس درخت ہی کو سرے سے کٹوا دیا!

کیا حضرت عمرؓ "وہابی اور دیوبندی" تھے؟ کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبہ کو گھٹانا چاہتے تھے؟ کیا فاروقِ اعظم انبیاء کے آثار و نشان کی برکت سے واقف نہ تھے؟ — فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قسم کے رکیک تصورات کا ذہن میں لانا جہالت ہی نہیں معصیت ہے، سنتِ رسولؐ کی اتباع اور حفاظت میں عمر فاروقؓ کا قدم کسی سے پیچھے تو کیا ہوتا بلکہ کچھ آگے ہی تھا۔ عشقِ رسولؐ کے تقاضوں کو اُن کی برابر پہچاننے والے صحابہ کرام میں بس دو ایک ہی ہونگے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا "شجرِ بیعت الرضوان" کو کٹوا دینا، اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ بزرگوں کے آثار و نشانات اور اُن سے جو مادی چیزیں نسبت رکھتی ہیں، وہ "توحید" کے مقابلہ میں اضافی ہیں، کسی بزرگ اور ولی کے "اثر و نشان" سے اگر فتنہ اور غلو پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اور "توحیدِ خالص" کے تقاضوں پر اس کی زد پڑ رہی ہو۔ تو پھر اُس "اثر و نشان" کا چھپا دینا ہی اولیٰ اور مناسب ہے!

شرک و بدعت اور مبالغہ آمیز عقیدت کے رد اور توحید کی حمایت میں یہی فاروقِ اعظمؓ کی فکر ہے جو ہر دور کے صالحین اور علماءِ حق کے قول و عمل میں کارفرما رہی ہے! خاص طور سے امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ جیسے علماء اور صاحبِ عزیمت اسلامی مفکرین کے افکار حمایتِ توحید اور ردِ شرک و بدعت کے معاملہ میں "فکرِ فاروقیؓ" ہی کی صدائے بازگشت ہیں! (اللّٰھم کثّر امثالھم)

"دیوبند" کے مدرسہ کو قائم ہوئے بہت سے بہت نوّے سال ہوئے ہوں گے اور ان کے مشہور اکابر جن سے "دیوبندیت" منسوب کی جاتی ہے، اُن کو ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ نہیں ہوا، اسی طرح جسے "وہابیت" کہا جاتا ہے اُس کی عمر دو سو، سوا دو سو سال کی ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے نہ دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم پائی ہے اور نہ اکابرِ دیوبند سے بیعت ہیں اور نہ "اہلِ حدیث" (جن کو اہلِ بدعت "وہابی" کہتے ہیں) کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جب بھی بدعت و شرک کا رد اور توحید کی حمایت کرتے ہیں۔ تو اُن کی باتوں کو بے وزن اور ہلکا کرنے کے لئے مبتدعین کی طرف سے "وہابی" اور "گلابی وہابی" اور "دیوبندی" کی پھبتیاں چُست کی جاتی ہیں! حالانکہ توحید و سنت کی حمایت اور شرک و بدعت کا رد ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اس مضمون میں قرآن کریم کی کتنی آیتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں پیش کی جاچکی ہیں، جو شرک و بدعت کے رد میں روشن برہان ہیں!

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسے علماء اور ارباب فکر ملیں گے، جنہوں نے "شرک و بدعت" کے ان فتنوں پر گرفت کی ہے
امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھ سو سال پہلے کھُل کر فرمایا:۔

انہم وضعوا ھذہ الاصنام والاوثان علی صور انبیائہم واکابرھم وزعموا انہم متی اشتغلوا العبادۃ ھذہ التماثیل فان اولئک الاکابر تکون شفعاء ھم عند اللہ تعالیٰ ونظیرہ فی ھذا الزمان اشتغال کثیر من الخلق بتعظیم قبور الاکابر علی اعتقاد انہم اذا عظموا قبورھم، فانھم یکونون شفعاء ھم عند اللہ!

یعنی جن بُت پرستوں نے اصنام واوثان اپنے انبیاء واکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم اُن کی عبادت میں مشغول ہوں گے، تو یہ اکابر اللہ تعالیٰ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے، اس کی نظیر اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں سے مشغولیت ہے! اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے!

عرس، فاتحہ، نذر و نیاز، دسواں، بیسواں، چالیسواں، مولود شریف کا قیام، اور قبر کے ساتھ جو معاملات کئے جاتے ہیں۔ دین میں ان کا کوئی درجہ ہوتا تو فقہ کی کتابوں میں ان کا ذکر ضرور آنا چاہیئے تھا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ کی کتابیں ان تمام باتوں کے ذکر سے خالی ہیں اور اگر کہیں ذکر آیا ہے تو ان باتوں کی مخالفت ہی میں آیا ہے، چند مثالیں:۔

- جو نذریں اموات کے واسطے ہوں، از روئے تقرب کے وہ باطل اور حرام ہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری، دُرِمختار)
- نذر عبادت ہے، اور مخلوق عبادت کے لائق نہیں۔ اگر نذر ماننے والے کا یہ خیال ہے کہ میّت کو اختیارات حاصل ہیں تو یہ عقیدہ صریحاً کفر ہے۔ (بحر الرائق)
- غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا یا غیر اللہ کی نذر ماننا شرک ہے! (تفسیر عزیزی)

ان معاملات میں صحیح دینی پوزیشن یہ ہے کہ کسی شہر میں رہ کر کسی بزرگ کی قبر پر کوئی ساری عمر میں ایک بار بھی (زیارت کیلئے) نہ جائے تو اُس سے اللہ تعالیٰ ذرّہ برابر بھی باز پرس نہ کرے گا۔ اور قبر پر نہ جانے سے اُس کے دین و ایمان میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا، اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اُلٹے ہاتھ سے پانی پیئے گا تو "مخالفتِ سنّت" کا وبال اس کے سر آئے گا ــــ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مستحب نہیں، فرض اور منصوص ہے اور کسی فرض کی تعمیل اور تکمیل سُنّتِ رسُول کی اتباع کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام و فرائض کی تعمیل کرانے کے لئے انسانوں کے سامنے نہیں آتا۔ اس فرض کو رسُول انجام دیتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ اللہ کے اس حکم کی اس طریقہ اور اس ہیئت و انداز سے تعمیل ہوگی۔ سنّتِ رسُول کوئی اضافی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اصل دین ہے! دین و دُنیا کی تمام سعادتیں کتاب و سُنّت ہی سے وابستہ ہیں۔ اگر کوئی شخص رات میں سوتے ہوئے اُس انداز اور ہیئت سے سوتا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استراحت فرمایا کرتے تھے تو اُس کی یہ شب خوابی نیکی میں گزرے گی!

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

"صراطِ مستقیم" نام ہی اُس شاہراہ کا ہے، جہاں حضورؐ کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں!

۳۶۵۷۱

١ جب کوئی عرس، نذر و نیاز اور اہلِ قبور سے استغاثہ پر گرفت کرتا ہے تو اہلِ بدعت کی طرف سے طنز کی جاتی ہے کہ "ایسا کہنے والے اولیاء اللہ کو نہیں مانتے"۔ یہ "اولیاء اللہ کو ماننا" بھی عجیب مغالطہ آمیز کلیہ ہے! "اولیاء اللہ کا ماننا" کیا خدا اور رسول کے ماننے کی طرح "کلمۂ شہادت" کا کوئی جزو ہے۔ کہ جس کے بغیر ایمان ہی مستند نہیں ہوتا۔ اولیاء اللہ کا ماننا، اس کے سوا اور کیا ہے کہ اُن کے اعمالِ صالحہ کے سبب ہم اُن سے محبت رکھیں اور اُن کی صالح زندگی سے اثر قبول کر کے اپنے کو بھی صالح، اللہ کا فرمانبردار بندہ اور رضائے الٰہی کا جویا بنائیں!

"ماننے" اور "نہ ماننے" میں جو ایمان و کفر ثابت ہوتا ہے، اُس کا انسانوں میں تعلق صرف انبیاء کرام کی ذات سے ہے، اُن میں ہم کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے، اور خود انبیاء کرام میں نہ ایک دُوسرے پر تنقید ہے، نہ مناقشت اور مسابقت ہے۔ نہ اُن میں کوئی جدال و نزاع ہے! یہی وہ مقام ہے جہاں سے "نبوت و رسالت" کا امتیاز، علم و تزکیہ کی ہر بلندی کے مقابلہ میں نمایاں نظر آتا ہے!

٢ انبیاء کرام جیسی طہارت و عصمت کسی کو حاصل نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ صحابہ کرامؓ جو عدول تھے۔ اُن میں خونریز جنگیں ہوئی ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی ولی تھے اور امام بخاری قدس سرہٗ بھی ولی تھے، مگر امام بخاریؒ نے امام ابوحنیفہؒ پر خوب کس کر تنقید کی ہے، ایک گروہ امام ابوحنیفہؒ پر "قلتِ فہمِ حدیث" کی طنز کرتا ہے اور دُوسری جماعت امام بخاریؒ کی "قلتِ تفقہ" کو موضوعِ گفتگو بناتی ہے۔ ایک گروہ کے "قطب العالم" دُوسرے گروہ کے نزدیک اور دوسرے گروہ کے "اعلیٰ حضرت مجدد مأتہ" پہلے گروہ کے نزدیک انتہائی مبغوض ہیں۔

اولیاء، صلحاء اور علماء حق پر گرفت کوئی اچھی بات نہیں ہے، کہ یہ بڑی محرومی کی دلیل ہے مگر یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنے سے ایمان جاتا رہتا ہے! اولیاء کرام اور صلحاء سے خوش گمانی اور محبت و عقیدت ہی رکھنی چاہیئے کہ انہوں نے اپنی زندگیاں کتاب و سنت کے اتباع اور دین کی خیر خواہی میں گزاری ہیں۔ مگر ظاہر ہے وہ انبیاء کرام کی طرح نہ معصوم تھے اور نہ مطاع تھے، اس لئے اگر اُن کا کوئی قول و فعل کتاب و سنت سے مطابقت نہ کرتا ہو۔ تو دین کی خیر خواہی اور کتاب و سنت کے اتباع ہی کا یہ تقاضا ہے کہ اُسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ — یہ ہے "اولیاء اُمت کو ماننے" کی صحیح دینی پوزیشن!

عیسائیوں نے اپنی ہوائے نفس سے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو "ابن اللہ" بنا دیا۔ یہ عقیدہ اُن کے ایمان کا نہ صرف یہ کہ جزو ہے، بلکہ اُن کے ایمان کی اساس ہے! تو اس "خیالی ابن اللہ" کو جو کوئی "عبد اللہ" کہتا ہے۔ اُسے وہ حضرت عیسیٰؑ کا "نہ ماننے والا" اور "توہین کرنے والا" سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور قابلِ اعتراض (معاذ اللہ) قرآن پاک ہے کہ جس نے کھل کر مسیحؑ کے "ابن اللہ" ہونے کی تردید کی ہے! اُن کے اس عقیدہ کے نہ ماننے کے سبب عیسائی تمام مسلمانوں کو حضرت عیسیٰؑ کا دشمن، مخالف، اور توہین کرنے والا سمجھتے ہیں!

اسی پر قیاس کیجیے کہ اہلِ بدعت نے بھی اپنے تصورات کے زور سے رسول اللہ اور اولیاء کرام کے لئے "مناصب و مقامات" وضع کر لئے ہیں۔ یعنی یہ کہ "وہ مشکل کشا اور حاجت روا ہیں"۔ حاضر و ناظر ہیں۔ اللہ کے حکم سے رزق دیتے ہیں۔ کوئی کہیں سے اُن کو پکارے تو وہ ہر پکارنے والے کی پکار سُن لیتے ہیں —! وھلم جرًا۔
جب کوئی اہلِ بدعت کے ان "مزعومہ تصورات" اور خود تراشیدہ عقائد" کی تردید کرتا ہے، تو وہ شور مچانے لگتے ہیں

کہ یہ دیکھو! رسول اللہ کی شان گھٹائی جارہی ہے! اولیاء اللہ کے ساتھ یہ دشمنی ہورہی ہے! حالانکہ یہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کی تخفیف ہے اور نہ اولیاء کرام کے ساتھ عداوت ہے! بلکہ یہ اہلِ بدعت کے تراشے ہوئے عقاید کی تردید ہے —!

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد حضرت حسنین رضی اللہ عنہما نے اُن کی کوئی ضریح نہیں بنائی، اور نہ واقعہ کربلا کے بعد حضرت امام زین العابدینؓ نے اور اُن کے بعد اُن کی اولادِ اطہار نے اس واقعہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے کوئی تعزیہ نکالا، نہ سڑکوں پر ماتم کیا، نہ مہندی، جھولے اور دُلدل کا گشت کرایا۔ یہ سب بعد کے لوگوں کی نکالی ہوئی بدعات ہیں! مگر جو کوئی اس فرقہ کا ان بدعات میں اُن کا ساتھ نہیں دیتا، تو وہ اُسے اہلِ بیت کا نہ ماننے والا اور اُن کے درجہ کو نہ پہچاننے والا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان "بدعات" اور عجمی اختراعات اور کھیل تماشوں سے اہلبیت کرام کی محبت اور عقیدت کا کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں ہے! اسی طرح اہلِ بدعت عرس، نذر و نیاز اور قبور پر ہونے والی بدعات پر، نکیر کرنے والوں کو "اولیاء اللہ کے نہ ماننے والوں" اور "اُن کا رتبہ گھٹانے والوں" میں شمار کرتے ہیں! یہ سب کچھ ان لوگوں کی خام خیالیاں اور غلط اندیشیاں ہیں۔ انہوں نے عقاید و تصورات کے جو بُت تراش رکھے ہیں، اُن پر کوئی ضرب لگاتا ہے تو اس "بت شکنی" پر وہ واویلا مچانے لگتے ہیں۔ کہ یہ تو کعبہ کی بُنیادیں ڈھائی جا رہی ہیں! ع

چوں نہ دید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند!

"بدعت" سنت کی ضد ہے اور کوئی "اہلِ سُنّت" بدعات سے شغف نہیں رکھ سکتا۔ فاسق و فاجر کو تو یہ نصیب ہوسکتی ہے کہ وہ فسق و فجور کو اچھا نہیں سمجھتا اور اپنے کئے پر پشیمان سا ہی رہتا ہے، یا کم سے کم فخر نہیں کرتا۔ مگر بدعتی کو توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ وہ "بدعت" کو دین کی بھلائی اور خیر خواہی سمجھتا ہے! اُسے "بدعات" میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی، اور ان خرافات پر وہ اُلٹا فخر کرتا ہے!

اس باب کو ختم کردینے سے پہلے اس بات کا اظہار کر دینا ضروری سمجھا گیا کہ ہم نے جگہ جگہ ایک گروہ کو "اہلِ بدعت" جو کہا ہے، بعض حضرات کو غالباً گراں گزرے کہ یہ "جدال احسن" کی راہ نہیں ہے! اس کے جواب میں گزارش یہ ہے کہ جن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا "بدعات" ہوں، اُن کو "بدعتی" اور "اہلِ بدعت" نہ کہیں تو آخر کیا کہیں؟ جس کو جس چیز سے شغف ہوگا اور جس کے لئے وہ جدوجہد کرے گا، اُس کو اُسی سے منسوب بھی کیا جائے گا۔ پھر خود یہ حضرات اپنی مخصوص محفلوں ہی میں نہیں، پبلک جلسوں میں اپنے کو "قبر پرست" اور "اہلِ بدعت" کہتے ہیں۔ پس جس نام اور لقب کو انہوں نے خود قبول کر لیا ہے، ہم نے اُسی لقب سے انھیں یاد کیا ہے!!

مُغالطے | اہلِ بدعت کا خاصہ ہے کہ جب شرک آمیز عقائد اور بدعات پر انھیں ٹوکیئے تو وہ چراغ پا ہوجاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے "محبوبوں" کو تم اس قدر بے اختیار سمجھتے ہو؟ ان لوگوں نے غالباً "مجازی محبوبوں (lovers) اور محبوبوں" (beloved) کے انداز پر اللہ اور رسول اور اولیاء اللہ کے روابط کو قیاس کیا ہے۔ اس کا اظہار اپنے شعروں میں وہ اس طرح کر بھی چکے ہیں سے

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب — یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا!!

یہ تو مجازی طرزِ بیان ہے کہ "ہم تم دوست دوست! جو تمہارا مال، سو ہمارا مال، محبوب و محب میں عینیت اور اپنا پرایا نہیں ہوا کرتا" مگر اللہ اور رسولؐ کے بارے میں اس قسم کے مجازی تعلقات اور دوستانہ روابط کا تصور بھی ایمان کو لرزا دینے کے لئے کافی ہے! مجازی محبت میں "محب" محبوب کی نہ صرف یہ کہ نازبرداری کرتا ہے بلکہ اس سے ڈرتا اور اس کا دباؤ مانتا ہے اور ہر وقت اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح کوئی بات "محبوب" کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے! کیا اللہ تعالیٰ (رسولؐ کا محب) بھی رسولؐ اللہ (اللہ کے محبوب) سے معاذ اللہ خوف کھاتا ہے اور آپؐ کی محبوبیت کا دباؤ مانتا ہے؟ حالانکہ قرآن و احادیث بتاتی ہیں کہ حضورؐ اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے اور "مغفرت چاہنے والے تھے، اور دن رات اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں لگے رہتے تھے، اور ایک بندۂ قانت" اور "عبدِ شکور" کی طرح زندگی گزارتے تھے۔

"وسوف یعطیک ربک فترضیٰ"!

سے یہ نکتہ نکالنا کہ اللہ تعالیٰ دنیوی محبوں کی طرح اپنے محبوب (رسولؐ) کی رضا کا پابند ہے۔ یا آپؐ کی رضاجوئی میں لگا رہتا تھا، اللہ تعالیٰ کے حضور میں شدید ترین گستاخی اور بے ادبی ہے! یہ آیت تو صاف بتاتی ہے کہ "فترضیٰ" (تو راضی ہو جائے گا) یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے! یہ کوئی نازبرداری یا دباؤ نہیں ہے! حیرت ہوتی ہے اُن لوگوں پر جو "توحید" کے معاملہ میں اس قدر بے پروا واقع ہوئے ہیں اور اُن کو اسی میں لطف آتا ہے کہ کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا کر کے اللہ اور رسولؐ کو ایک ہی سطح پر لے آئیں۔ اور عبد و معبود کا یہ فرق و امتیاز کسی نہ کسی حیلہ سے مٹے نہیں تو کم سے کم مشتبہ ہو جائے!

"اہلِ بدعت" نے "وسیلہ" کا جو ایک تصور قائم کر رکھا ہے، اس کے ثبوت میں وہ قرآنِ کریم کی یہ آیت:-

"یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلہ" (مائدہ)

بے تکلف پڑھ دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی مختصر ترین تفسیر "جلالین" سے لے کر تفسیر کبیر امام رازی تک میں "الوسیلہ" کے معنی "خدا کی اطاعت اور اُس کی مرضی کے اعمال سے اُس کا تقرب حاصل کرنے کے" بیان کئے گئے ہیں۔ مفسرین کے ذہن میں "الوسیلہ" کے یہ معنی نہیں آئے کہ اس لفظ سے اللہ کے حضور میں انسانی شخصیتوں کا وسیلہ، ذریعہ اور وساطت مراد ہے! یہ آیت اعمالِ صالحہ پر مسلمانوں کو اُبھارتی ہے! اور یہی اس آیت کا مقصود، مفہوم اور شرح و تفسیر ہے —!

...... "اغناھم اللہ ورسولہ" جو قرآن پاک میں آیا ہے، اُس سے "اہلِ بدعت" استناد کرتے ہیں کہ "دیکھا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو غنی بنا دیا کرتے تھے! خود قرآن اس پر شاہد ہے!" جہاں تک حضورؐ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے، اس کا صاف، سیدھا اور واقعات کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے مدینہ میں غلہ کی فراوانی ہوئی، وہاں کے باشندوں کے عام مالی حالات درست ہو گئے۔ اس سے مومنین صادقین کے ساتھ منافقین بھی بہرہ اندوز ہوئے تھے اور عام مسلمانوں میں ملے جلے رہنے کے سبب غنائم سے بھی منافقین فائدہ اٹھاتے تھے، یہ ہے "اغناھم اللہ ورسولہ" کی صحیح تفسیر، اور واقعہ کے مطابق ترجمانی! اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں دنیا کے پردے پر

جس کسی کو بھی آسودگی، فراغت اور مال و دولت ملتا تھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرماتے تھے۔ یا قیامت تک کے لئے تمام انسانوں کو غنا و آسودگی دینے کا منصب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو سپرد فرمادیا ہے! یہ مفہوم نہ اس آیت سے نکلتا ہے نہ مفسرین نے ایسا سمجھا ہے ـــ!

حضورؐ کی بعثت سے قبل دُنیا کو غنی اور آسودہ بنانے کی خدمت کس نبی کے سپرد تھی؟ کیا قرآن میں اس کا کوئی اشارہ ملتا ہے؟؟

تاریخ و سیر کے واقعات سے ثابت ہے کہ حضورؐ کے پاس مال ہوتا تھا تو عطا فرماتے تھے اور نہیں ہوتا تھا تو نہیں دیتے تھے۔ ایک بار ایک سائل آیا، حضورؐ سے سوال کیا، آپؐ نے امہات المومنین کے گھروں میں معلوم کرایا کہ کچھ دینے کے لئے ہو تو سائل کو دے دیا جائے، پتہ لگا کہ پانی کے سوا حریم نبوت میں کچھ نہیں ہے۔ اس لئے آپؐ نے اس سائل کو دوسرے صحابہ کے پاس بھیج دیا!

پھر "..... اغناھم اللہ ورسولہ" کی تفسیر میں کیا یہ بھی کہیں ملتا ہے کہ صحابہ کرام نے فقر و احتیاج کے عالم میں، اپنے گھروں میں بیٹھ کر یا دُور بستیوں میں رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا ہو کہ "یا رسول اللہ! ہماری محتاجی دُور فرما کر ہمیں غنی بنا دیجئے"۔ جب صحابہ کرام کو ہم فقر و فاقہ اور دُنیوی مشکلات میں مبتلا پاتے ہیں، تو اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ ہم کس طرح قائم کریں کہ فلاں بزرگ کے پاس اللہ کے دئیے ہوئے خزانے ہیں اور وہ اُن میں تصرف فرما کر جس کو جب چاہیں مالا مال کر دیں ـــ!

اہلِ بدعت نہ صرف یہ کہ "توحید" کے معاملہ میں بے پروا واقع ہوئے ہیں، بلکہ آیتوں اور حدیثوں سے ایسے نکتے نکالنا جن سے "عبد و معبود" کے مابین امتیاز اور فرقِ مراتب زیادہ سے زیادہ مشتبہ ہو، اُن کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ (Hobby) ہے ـــ!

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللهَ رَمٰى ۔ (الانفال)

کی تفسیر میں یہ لوگ کیا کیا نکتے نکالتے اور کیسے کیسے حاشئیے چڑھاتے ہیں!

واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں جب مسلمانوں سے کافروں کا مقابلہ ہوا۔ تو حضورؐ نے اپنی مُٹھی میں ریت لے کر "شاھت الوجوہ" پڑھا اور ریت کفار کی طرف پھینک دی، اور وہ کنکریاں اور ذرّے کافروں کی آنکھوں میں جا پڑے!

تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے فوق العادۃ فعل کے بارے میں فرما رہا ہے کہ ہم نے تم میں یہ قوت پیدا کر دی تھی، ورنہ تم اپنے کسب و اختیار سے یہ کام نہ کر سکتے تھے، یہ آیت تو "توحید خالص" پر ایک نہایت روشن دلیل ہے، اللہ نے بدر میں چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ریت کے ذرّے پھنکوا دیئے، جس نے کافروں کو بدحواس اور پریشان کرنے میں مؤثر کام سرانجام دیا۔ دوسری طرف اُحد میں اللہ نے نہ چاہا تو آپؐ سے کسی معجزہ اور فوق العادۃ فعل کا صدور نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ آپؐ زخمی ہو گئے! یہ آیت تو اس لئے نازل کی گئی تھی کہ "شاھت الوجوہ" پڑھ کر ریت پھینکنے کے اس معجزہ کے سبب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی الوہی اور خدائی تصرف کہیں منسوب نہ کر دیں۔ اسی آیت کا پہلا جزو یہ ہے:۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلٰكِنَّ اللهَ قَتَلَهُمْ!

(پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا)

بدر میں صحابہ کرام کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی، ساز وسامان اور اسلحہ کی قلت تھی، مگر پھر بھی مسلمان اللہ کے فضل سے کفار پر غالب آگئے، یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مجاہدین صحابہ کو مخاطب کر کے اپنا احسان جتایا کہ:-

"تم نے انھیں (یعنی کافروں کو) قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا۔"

یہاں بھی صحابہ کے اختیارات وقدرت کی نفی کی جارہی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی حکمت، مشیت اور قدرت کا اظہار فرمارہا ہے!

اہلِ عرب کے درمیان جو شدید مخالفتیں صدیوں سے چلی آرہی تھیں۔ وہ بعثت نبوی کے بعد دُور ہوگئیں، خاص طور سے اوس وخزرج کی دیرینہ عداوتوں کا خاتمہ ہوگیا، اور وہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ اس "تالیفِ قلوب" اور "دلوں کے جوڑ دینے" کو اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں ظاہر فرماتا ہے:-

وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ
وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ (الانفال)

اور الفت ڈال دی اُن کے دلوں میں، اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارے کا سارا، تو نہ اُلفت ڈال سکتا اُن کے دلوں میں، لیکن اللہ نے اُلفت ڈالی اُن میں!

اس آیت میں اللہ تعالیٰ دوٹوک لفظوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمارہا ہے کہ دلوں کا جوڑ دینا ہمارا کام ہے، اہلِ عرب کے دل آپ نے نہیں جوڑے، آپ زمین کے تمام خزانے بھی خرچ کر دیتے تو بھی عرب کے دلوں میں اُلفت نہ ڈال سکتے تھے، اُن کے دلوں کو تو ہم نے جوڑا ہے اور اُن کے درمیان ہم نے اخوت اور مودت پیدا کی ہے!

حیرت ہے کہ لوگ قرآن کریم میں اس قسم کی محکم آیتوں کو پڑھتے ہیں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ نبیوں، ولیوں، پیروں، اور شہیدوں کو کائنات میں متصرف سمجھتے ہیں، اس قسم کی بیسیوں قرآنی آیات صاف طور پر بتاتی ہیں کہ قدرت و اختیار کا سررشتہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اُس کے حکم کے بغیر کسی نبی اور رسول نے ایک سانس بھی اپنے اختیار سے نہیں لی۔ اُس کو جب منظور ہوتا تھا، انبیاء کرام سے معجزے صادر کرا دیتا تھا۔ اور جب منظور نہ ہوتا تھا تو انبیاء کرام کی تمناؤں اور دعاؤں کے باوجود کچھ نہ ہو سکتا تھا۔!

غیر اللہ سے استعانت کے جواز میں "اہلِ بدعت" جب قرآن کریم کی آیت:-

"استعینوا بالصبر والصلوٰۃ"

سے استدلال کرتے ہیں، تو اُن کے ذہن وفکر کی اس کجی پر بڑا دُکھ ہوتا ہے! آپ نے کبھی سُنا اور دیکھا ہے کہ کوئی شخص "صبر اور نماز" سے اعانت طلب کرتا ہو، کہ یا ایھا الصبر (اے صبر!) اور یا ایھا الصلوٰۃ (اے نماز!) تم میری مدد اور دستگیری فرماؤ۔ اگر کوئی ایسا فعل کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی احمق نہیں، اور ایسا کرنے کو اُس نے اس آیت کے مفہوم کے حکم کی تعمیل سمجھ رکھا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا مذاق اُڑاتا ہے! اللہ تعالیٰ ایسے فعلِ عبث کی تعلیم دے کس طرح سکتا ہے۔!

اس آیت کا سیدھا اور صاف مفہوم یہ ہے کہ صبر اختیار کروگے اور نماز پڑھوگے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل فرمائیگا۔ اس سے حلِ مقصد اور کشائشِ مشکلات ہوگی!

ظاہری لفظوں کے "متشابہ" سے اس قسم کے لطیفے اور نکتے پیدا کرنا، فراست مومن کو رُسوا کرنا نہیں تو اور کیا ہے ___ ؟
"من انصاری الی اللہ" میں "انصاری" کا لفظ آجانے سے کیا یہ معنی لے جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی واقعی اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے انصار و اعوان اور مددگاروں کی ضرورت لاحق ہوا کرتی ہے اور "انصار اللہ" اللہ کی مدد کیا کرتے ہیں ___ ! (معاذ اللہ)

یہ تو قرآن کی آیتوں کیساتھ اہلِ بدعت کا رویّہ اور سلوک ہے، اسی طرح احادیث نبوی سے اپنے مزعومہ اور خود تراشیدہ عقائد کی تائید کرانا چاہتے ہیں:۔

"وَ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللہُ یعطی"

پڑھ کر کس زور شور سے اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے تمام خزانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیئے ہیں، حقیقی معطی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، رسول اللہ اس عطا کے قاسم (بانٹنے والے) ہیں !

اصل حدیث کی ابتدائی عبارت نہ جانے کیوں حذف کر دی جاتی ہے، پوری حدیث یہ ہے:۔

"من یرد اللہ بہ خیراً یفقہ فی الدین و اِنَّمَا انا قاسمٌ واللہ معطی"

جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اُس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں تو بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا ہے !

حدیث کے الفاظ خود بول رہے ہیں اور عبارت کا سیاق و سباق بتا رہا ہے یہاں "عطا" سے مال اور رزق و دولت کی تقسیم ہرگز مراد نہیں ہے ! حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

قولہٗ اِنَّمَا انا قاسمٌ - قال التوربشتی رحمۃ اللہ علیہ - اشار النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقولہ واِنَّمَا انا قاسمٌ اِلیٰ ما یلقی الیہم من العلم والحکمہ وبقولہ واللہ یعطی ای انہم یھتدی بہ الی خفیات العلوم فی کلمات الکتاب والسنہ وذٰلک انہٗ لما تفقہ فی الدین وما فی نیہ من الخیر !

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم و حکمت عطا فرماتا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکمت صحابہ کو بتاتے (تقسیم فرماتے) تھے۔ اسی کو حدیث میں "تفقہ فی الدین" کہا گیا ہے اور یہی وہ "فہم" ہے، جو کتاب و سنت کے نکات و معانی کی طرف ہدایت و رہنمائی کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو حکمت عطا فرمائی تھی، وہ احادیث کی کتابوں میں محفوظ اور مرقوم و مسطور ہے۔ اور کوئی شخص نبوی تعلیم و حکمت سے بے نیاز ہو کر، دین میں فلاح و سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس حدیث سے یہ مفہوم ہرگز ہرگز نہیں نکلتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے خزانے بخش دیئے ہیں۔ اور آپ اُن کو تقسیم فرمایا کرتے ہیں !

اہلِ بدعت "اُوتیت بمفاتیح خزائن الارض" سے جو دلیل لاتے ہیں، یہ پوری حدیث یہ ہے:۔

وَعن ابی ھریرۃ، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بعثت بجوامع الکلم ونصرت بالرعب وبینھا انا نائمٌ رایتنی اوتیت بمفاتیح خزائن الارض فوضعت یدی" (متفق علیہ)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں، اور رعب کیساتھ میری مدد کی گئی ہے اور جب میں سو رہا تھا تو مجھے دکھایا گیا کہ مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے اور میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے!

ایک طرف یہ حدیث، دوسری طرف قرآن کی یہ آیت :-

" قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ "

اے نبیؐ! تم کہہ دو کہ میرے پاس اللہ کے (دیئے ہوئے) خزانے نہیں ہیں -

اور ظاہر ہے کہ جو حدیث قرآن کی مخالف ہوگی اُسے قبول نہیں کیا جا سکتا، اور وہ بھی کسی فقہی مسئلہ میں نہیں بلکہ بنیادی اعتقاد میں - اس آیت میں "خزائن اللہ" آیا ہے، صرف "خزائن" نہیں کہا گیا - یعنی اس آیت میں " اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے خزانوں " کی بھی نفی کی گئی ہے - " ذاتی " اور " عطائی " کی تاویل کے لئے بھی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے !

مگر حدیث قرآن کی مخالف نہیں ہے، ہاں! قرآن کی مخالف اُس وقت ہوگی، جب اس کے وہ معنی لئے جائیں جو " اہل بدعت " لیتے ہیں - اور عام طور پر اہل بدعت اسی حدیث سے استدلال کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے خزانوں کی کنجیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کردی ہیں - حالانکہ قرآن جس کی نفی کرتا ہو، حدیث اُس کا اثبات کرے، ناممکن ہے !

اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمین پر اپنے اُمتیوں کے قبضہ و تسلط اور حکومت کی طرف اشارہ اور پیشین گوئی ہے! جو عالم مثال میں آپؐ کو دکھایا گیا تھا - خود حضورؐ کے دورِ مبارک میں بھی عرب پر آپؐ کا قبضہ ہو چکا تھا - اور مسلمانوں کی تاریخ میں ایسا بھی دور گزرا ہے کہ اُس وقت کی دنیائے معلوم کا بہت بڑا رقبہ اُمتیانِ نبیؐ آخر کے زیرنگین تھا، اور تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے - اور اس دورِ انحطاط میں بھی آج لاکھوں میل کے رقبہ پر مسلمانوں کا تسلط، قبضہ اور حکومت ہے! جن میں کم و بیش تیس کروڑ انسان بستے ہیں -

مشکوٰۃ کی حدیث کے اس ٹکڑے :-

" و اُحلت لی الغنائم و اُحلت لی الارض مسجداً و طهوراً "

(اور میرے لئے غنیمتیں حلال کی گئیں اور زمین میرے لئے مسجد اور پاک کرنے والی بنائی گئی)

" اُحلت لی " (میرے لئے حلال کئے گئے) میں وہ تمام غنائم شامل ہیں، جو آپؐ کے اُمتی جہاد کے ذریعہ حاصل کریں گے اور " زمین میرے لئے مسجد بنائی گئی " میں وہ تمام رقبۂ زمین شامل ہے، جو حضورؐ کے اُمتی قیامت تک اپنے سجدوں سے معمور کریں گے، اسی طرح " اور تیت بمفاتیح خزائن الارض " میں عرب کے علاوہ وہ تمام رقبۂ زمین شامل ہے، جو آپؐ کے اُمتیوں کے قبضہ میں آیا اور قیامت تک آتا رہے گا !

اگر یہ حدیث خواب کا واقعہ نہ ہوتی تو بھی اس کے یہی معنی لئے جاتے کہ کتاب اللہ سے ٹکراؤ نہ ہو - مگر حضورؐ کا کا یہ فرمانا - " و بینھا انا نائم رایتنی " (جب میں سو رہا تھا، تو مجھے یہ دکھایا گیا) اس نے معاملہ کو آسان تر بنا دیا - اس پر شاید یہ اعتراض وارد کیا جائے کہ انبیاء کرام کے خواب سچے (رویائے صادقہ) ہوتے ہیں - یقیناً ہوتے ہیں - مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کو آنے والے واقعات عالمِ مثال میں دکھلائے جاتے ہیں - جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو خواب میں دیکھا - کہ وہ انھیں سجدہ کر رہے ہیں اور یہ مثالی واقعہ اس طرح سچا ہو کر رہا -

وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا -

شاید کہا جائے کہ یوسف علیہ السلام نے جب خواب دیکھا تھا، تو وہ اُس وقت کمسن تھے، نبوت جب تک کہاں ملی تھی - اسی کے جواب میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ خواب میں جو شے حضورؐ کو نظر آئی، اس کی خود حضورؐ نے تاویل فرمائی ہے :-

" عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رایت ذات لیلۃ بینما یری النائم کانا دار عقبۃ بن رافع فاتینا برطب من رطب ابن طاب فاولت ان الرفعۃ فی الدنیا والعاقبۃ فی الآخرۃ وان دیننا قد طاب "

(میں نے ایک رات اُس حالت میں، جس حالت میں سونے والا دیکھا کرتا ہے، دیکھا کہ گویا میں عقبہ بن رافع کے گھر میں ہوں، اور ہمارے سامنے رطب (تازہ کھجور) لائے گئے، تو میں نے اُس کی یہ تاویل کی کہ ہمارے لئے دُنیا میں رفعت ہے اور آخرت میں انجام (اچھا) ہے اور ہمارا دین مکمل اور احسن ہو گیا)

حدیث میں آیا تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے اور غلّہ پر ہاتھ اُٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن اشیاء کی مقدار کو کثیر و وافر کر دیا - مگر اہلِ بدعت اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ بزرگوں کے نام کی جو فاتحہ دی جاتی ہے اور اُس میں کھانا اور شربت و شیرینی سامنے رکھ کر جو ہاتھ اُٹھا کر دعا پڑھتے اور ایصالِ ثواب کرتے ہیں، اس کا جواز اس حدیث سے نکلتا ہے - مگر خدا کے بندو! اس حدیث سے یہ کہاں ثابت ہے کہ حضورؐ نے غلّہ، طعام اور پھلوں پر ہاتھ اُٹھا کر کسی کی روح کو ثواب پہنچایا تھا - واقعہ کیا ہے اور اس سے مفہوم کیا پیدا کیا جا رہا ہے؟

اسی طرح یہ حدیث کہ حضورؐ کہیں سے گزر رہے تھے، دو قبروں پر آپ نے ہری شاخیں گاڑ دیں - اور فرمایا کہ ان قبروں پر عذاب ہو رہا تھا، یہ شاخیں جب تک ہری رہیں گی، اہلِ قبر کے لئے دعائے مغفرت کریں گی! مگر اس حدیث سے یہ کس طرح ثابت ہوتا ہے کہ قبروں پر پھول چڑھانا جائز ہے - حضورؐ نے ان قبروں پر پھول کب چڑھائے تھے! اور یہ جو بزرگانِ دین کی قبروں پر عقیدت مند پھول چڑھاتے ہیں، تو اُن کی کیا یہ نیت ہوتی ہے کہ اُن کے ایسا کرنے سے اُن بزرگوں کے عذابِ قبر میں تخفیف ہو جائے گی، اس قسم کا واہمہ بھی کسی زائر کے ذہن و قلب میں نہیں گزرتا اور نہ گزرنا چاہیئے - پھول تو عقیدت و تکریم کی نیت سے چڑھائے جاتے ہیں - جس کی کوئی سند کتاب و سنّت، آثارِ صحابہ بلکہ ائمہ فقہ کے کسی قول تک سے نہیں ملتی، لہٰذا یہ فعل "بدعت" ہے! اور گمراہی ہے!

یہ ہے ان " عاشقانِ رسولؐ " (؟) اور " حامیانِ سُنّت " (؟) کا سلوک جو احادیث کے ساتھ کرتے ہیں - اور یہ ہیں اُن کے استدلال، تفکر و تعمق اور تفقہ فی الدین کے چند نمونے !!

اہلِ بدعت " غیر اللہ " سے استمداد کے جواز میں حصن حصین کی یہ روایت استدلال میں پیش کرتے ہیں کہ حضورؐ سے مروی ہے کہ جو کوئی راستہ بھول جائے، وہ یوں پکارے :-

" اعینونی یا عباد اللہ "

طبرانی کے الفاظ یہ ہیں :-

"ان اراد عوناً فلیقل یا عباد اللہ اعینونی، یا عباد اللہ! اعینونی۔"

(جو کوئی عون (استمداد) چاہے، تو اُسے یوں کہنا چاہیئے کہ اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔
اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو)

یہ حدیث اس لئے حجت نہیں بن سکتی کہ اس میں انقطاع و نکارت کی علتیں پائی جاتی ہیں۔ اور اس حدیث کا ایک راوی عتبہ بن غزوان مجہول الحال ہے! قرآن شریف میں کتنی محکم آیتیں ایسی ہیں، جن میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو مصیبت کے وقت پکارنے سے منع کیا گیا ہے! احادیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ حضورؐ سے جو دعائیں مروی ہیں، اُن میں بھی اللہ تعالیٰ ہی سے براہ راست عرض معروض کیا گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی کسی پریشانی، اضطراب اور مصیبت میں اللہ کے سوا کسی دوسرے سے مدد نہیں چاہی! اُن کا یہ معمول نہیں رہا!

کتاب و سنت کے بے شمار واضح احکام و شواہد کے مقابلہ میں:۔

"یا عباد اللہ! اعینونی"

والی تنہا روایت "حجت"، کس طرح بن سکتی ہے، جبکہ یہ روایت صحت کے درجہ کو بھی نہیں پہنچتی۔ اور اس میں علتیں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ پایۂ صحت سے گری ہوئی ایک روایت، جس سے قرآن کی متعدد آیتوں اور سینکڑوں حدیثوں کی مخالفت ہوتی ہو، کس طرح قبول کی جا سکتی ہے!

"اہل بدعت" کی طرف سے کبھی کبھار یہ لطیفہ بھی سننے میں آتا ہے کہ قبروں پر جو کچھ ہوتا ہے، اگر بزرگانِ دین کو یہ پسند نہ ہوتا تو وہ ایسا کا ہیکو ہونے دیتے؟ یہ ایسی بات ہے کہ اس پر ہنسیئے بھی اور روئیے بھی! اس دلیل کی بنیاد پر سب سے بڑا اعتراض تو حضرت مسیح علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے کہ آپ کی اُمت نے آپ کو "ابن اللہ" بنا ڈالا! اسے آپ نے نہیں روکا، اس لئے یہ اس کی دلیل ہوئی کہ نصاریٰ کے اس مشرکانہ فعل سے آپ ناخوش نہ تھے، بلکہ رضامند تھے! (استغفر اللہ)

اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا کو دار الامتحان بنایا ہے، اور خیر و شر کا ایک معرکہ اُس کے حکم سے گرم ہے! اس میں بڑی نازک حکمتیں اور باریکیاں چھپی ہوئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے، عادل ہے، جو کچھ وہ کر رہا ہے، ٹھیک عدل کے مطابق کر رہا ہے، یہ بات تو خود نبیوں، اور ولیوں کی عدم قدرت اور مجبور و بے اختیار ہونے کی دلیل ہے، کہ اُن کی تمام جدوجہد، کوشش اور دعاؤں کے باوجود بعض اوقات انسانوں کے حالات نہ سنبھل سکے، یہاں تک کہ عذابِ الٰہی نے نافرمان قوموں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا!!

تاریخی تجزیہ! اس عنوان پر گفتگو کرنے سے قبل ہم اس بات کو واضح کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں کہ وہ "تصوف" جو کتاب و سنت کے مطابق ہے اور "تزکیہ نفس" جس کا موضوع ہے، اُس سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے اور صوفیاء کرام نے جو کتاب و سنت کے مطابق زندگیاں گزاری ہیں، دین کی تبلیغ کی ہے اور لوگوں کی اصلاح فرمائی ہے اور اُن کے دلوں کے آئینوں کو اُجالا ہے، اُن کی عقیدت سے ہمارا دل معمور ہے (اللہ کی اُن پر رحمتیں ہوں) اب رہے صوفیاء کرام کے بعض احوال و اقوال، رسم اور طریقے تو اُن کے جانچنے کے لئے اللہ نے جو "کتاب و سنت" کی کسوٹی بنا دی ہے! اُسی پر اُن کو پرکھ کر دیکھا جائے گا۔ اور یہ کسوٹی جو بتائے گی، وہی حق ہوگا۔

مسلمانوں میں کوئی فرقہ کسی صحابی کے نام سے منسوب نہیں ہے، حالانکہ صحابہ کی تعداد لاکھوں کے لگ بھگ تھی۔

اُن میں بڑے رتبہ اور شان وجلالت کے بھی صحابی تھے، جن کے علم وتفقہ اور تقویٰ کا بھی مقام ممتاز اور بلند تھا۔
جب کسی صحابی اور اہلِ بیت کے کسی فرد نے کوئی فرقہ نہیں بنایا۔ تو ہم اس الزام سے حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو قطعاً بری اور پاک سمجھتے ہیں کہ آپ نے مسلمانوں میں کسی فرقہ کی بنیاد ڈالی ہو! علیؓ کی ذات دین کی جامع تھی، دین کو معاذ اللہ منفرق کرنے والی نہ تھی!

تین خلافتوں کا زمانہ حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کرام نے دیکھا ہے۔ اس عرصہ میں اُن کی طرف سے کسی اعتقادی اور دینی اختلاف کا اظہار نہیں ہوا۔ اور ہم فاتح خیبر جیسے شجیع، حق شناس، حق گو اور بلند کردار انسان سے یہ کمزوری ہرگز ہرگز منسوب نہیں کرسکتے کہ آپ اتنی طویل مدت تک مخصوص دینی عقائد، منفرد اسلامی فکر اور کوئی خاص فلسفۂ اخلاق وروحانیت چھپائے بیٹھے رہیں!

"شیعانِ علیؓ" کسی ایسی جماعت کا نام ہرگز ہرگز نہ تھا، جس کے دینی عقائد عام مسلمانوں سے مختلف تھے جمل وصفین کی جنگوں میں جو لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جھنڈے کے تلے مخالف گروہوں سے لڑے، اُن کو "شیعانِ علیؓ" کہتے تھے۔ ہم اگر اُس زمانہ میں ہوتے تو ہم بھی علیؓ مرتضیٰ کے پرچم تلے آپ کی مدافعت اور حمایت میں جنگ کرتے، اس لئے ہم بھی اپنے کو "شیعانِ علیؓ" ہی سمجھتے ہیں!

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے جنگ کسی ایسے مسئلہ پر نہیں کی کہ جو توحید، نبوت، معاد وآخرت اور اسلام کے بنیادی عقائد کا کوئی اختلافی مسئلہ ہو۔ حضرت علیؓ نے اپنے مخالف گروہوں اور اُن کے قائدین پر یہ الزام نہیں لگایا کہ تمہارے عقائد فاسد ہیں! اور میں صحیح عقائد پیش کرتا ہوں، یا تمہاری نمازیں اور روزے کتاب وسنت کے مطابق نہیں رہے، میں نے ان غلطیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے!

حضرت علیؓ نے دین وشریعت اور اخلاق وروحانیت کا کوئی ایسا فلسفہ یا طرزِ فکر پیش نہیں کیا، جو جمہور صحابہ سے مختلف اور منفرد تھا۔ حضرت علیؓ نے کوئی فرقہ نہیں بنایا اور نہ کوئی ایسا جداگانہ فلسفہ روحانیت واخلاق پیش فرمایا، جس سے دوسرے صحابہ نا واقف تھے، صحابہ کرام، اہلِ بیت اور خود حضرت علیؓ، سب کے سب ایک ہی معلمِ اخلاق (روحی فداہ) کے شاگرد تھے۔ حضورؐ کی تعلیم سب کے لئے عام تھی، اور کھلی ہوئی تھی۔ تعلیم کے اخذ کرنے میں تو ذہنوں کی استعداد وصلاحیت کے اعتبار سے کم اور زیادہ اور فوق وتحت کا فرق ہوسکتا ہے۔ مگر زبانِ وحی ترجمان نے علم وحکمت کے سلسلہ میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔ یہ بات تو کیمیا گروں کو زیب دیتی ہے کہ وہ کچھ چٹکلے سینہ بہ سینہ رہنے دیں۔ نبی کی نہ تو زندگی راز ہوتی ہے اور نہ اُس کی تعلیم پُر اسرار ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کتابِ مبین" کو "بلاغِ مبین" کے ساتھ پیش فرمایا!

اسلام میں سب سے پہلا فتنہ جو ظاہر ہوا وہ "سبائی فتنہ" تھا۔ عبداللہ بن سبا ایک یہودی، شہر صنعا کا رہنے والا، اس فتنہ کا بانی مبانی تھا۔ اسلام کے عروج کو دیکھ دیکھ کر اُس کے سینہ پر سانپ لوٹتے تھے، یہ شخص مسلمانوں میں شامل ہو کر اُن کا شیرازہ بکھیرنے اور جمی ہوئی بساط کو اُلٹنے کی غضبیہ تدبیریں کرنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ کو آلِ رسولؐ کا حامی، خیر خواہ اور اُن کا عقیدت مند ظاہر کیا اور اس قسم کے عقیدے کہ حضرت محمد رسول اللہ بھی،

حضرت عیسیٰؑ کی طرح دنیا میں ضرور آئیں گے،" مسلمانوں میں پھیلانے شروع کئے!

"سبائی فتنہ" کے بعد جو پہلا گمراہ فرقہ مسلمانوں میں ظاہر ہوا، وہ خوارج کا فرقہ تھا۔ جن کے بعض عقائد مسلمانوں کے جمہور سے یکسر مختلف تھے، یہ کم بخت حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہ کو دین سے خارج سمجھتے تھے ــــ! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی اور کئی بار اُن کی جمعیت کو تتر بتر کر دیا۔ یہ فرقہ اور اس کے عقائد مسلمانوں میں مقبول نہ ہو سکے! مسلمانوں کے جمہور نے اس گمراہ فرقہ سے اپنی برأت ظاہر کی، اور آج دنیا میں اُن کی تعداد بہت ہی کم پائی جاتی ہے! خوارج میں بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں، جو بدنصیب متشدد ہیں، وہ تو "صرف ایک رکعت نماز صبح اور ایک رکعت شام کے قائل ہیں"۔ اور ان میں سے بعض پوتیوں، نواسیوں اور بھتیجے اور بھانجے کی بیٹیوں سے نکاح کو حلال سمجھتے ہیں! اور کہتے ہیں کہ سورۃ یوسفؑ قرآن کا جزو نہیں ہے (ان گمراہ عقائد سے کروڑ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ!)

"سبائی فتنہ" کو ذہن میں رکھئے، اور آگے بڑھئے، علوی خلافت کے دور میں بعض لوگوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی الوہیت کا اعلان کیا۔ اور آپ نے ایسا کہنے والوں کو دردناک سزائیں دیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے:-

يهلك فيّ رجلان محبٌّ مفرطٌ يفرطني بما ليس فيّ ويبغض يحمله شنآني على ان يبهتني!

میرے بارے میں دو شخص ہلاک ہوں گے، ایک غلیہ محبت سے، ایسی تعریف میری کرے گا، جو بات مجھ میں نہیں ہے اور دوسرا عداوت رکھنے والا کہ اس کو میری عداوت نے آمادہ کیا اس بات پر کہ مجھ پر بہتان باندھے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد کسی صحابی اور خلیفہ کے بارے میں کوئی غلو نہیں کیا گیا۔ اسلام میں عقائد کے سب سے پہلے فتنہ کا ظہور "عقیدت" کے غلو سے ہوا، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات وصفت میں کیا گیا، حضرت علی کا دامن اس سے بالکل پاک ہے، یہی وہ طرزِ فکر ہے جو باطنیہ، اسماعیلیہ اور قرامطہ کے قالبوں میں ڈھلتی چلی گئی! اور مشرکانہ تصورات و بدعات اور عجمی فلسفہ کے انبار پر انبار لگتے چلے گئے!

چند جھلکیاں:-

- عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں اور معتقدوں نے کہا کہ حضرت علیؓ "معبودِ حقیقی" ہیں اور وہ شہید تھوڑی ہوئے ہیں، ابن ملجم نے تو ایک شیطان کو قتل کیا تھا۔ جس نے آپ کی شکل میں روپ دھار لیا تھا۔ حضرت علیؓ بادلوں میں پوشیدہ ہیں، بادل کی گرج آپ کی آواز ہے اور بجلی کی کڑک آپ کا کوڑا ہے!
- اسی مکتبۂ فکر کے ایک فرقہ مفضلیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت علی کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے وہی نسبت ہے جو مسیح علیہ السلام کو حق تعالیٰ سے ہے، اور جس کسی کا اتحاد ذاتِ لاہوت سے ہو وہ نبی ہے!
- فرقہ بزیغیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ لاہوت کا حلول صرف پانچ ہستیوں میں ہوا ہے، وہ یہ ہیں:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عباسؓ۔ حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عقیلؓ (رضی اللہ عنہم)
- فرقہ بزیغیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت جعفر "اللہ" تھے اور وہ اپنی اصلی صورت میں نظر نہ آتے تھے!

- فرقہ جناحیہ اس کا قائل ہے کہ روحِ الٰہی، حضرت آدم و شیث علیہما السلام اور تمام نبیوں کے اجسام سے درجہ بدرجہ منتقل ہوتی ہوئی، حضرت پیغمبر آخرالزماں تک آئی اور پھر حضورؐ سے حضرت علیؓ، حضرت حسنینؓ اور محمد بن الحنفیہؒ تک پہنچی!
- فرقہ باقریہ - امام باقرؒ کو "حیٌّ لا یموت" مانتے ہیں اور اُن کے "امام منتظر" ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں!

یہ ہے وہ مشرکانہ طرزِ فکر اور "عجمی عقائد" جو مسلمانوں میں عقیدت و محبت کے نام پر داخل ہوئے ہیں۔ اور یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے کہ ان عقائد کا مرکز حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کی ذات کو بنایا گیا ہے۔ حالانکہ علیؓ مرتضیٰ اور ائمہ اہلِ بیت کا دامن بے غبار ہے۔ اور اُن پر کسی مشرکانہ عقیدہ اور بدعت کی ذرّہ برابر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی! جس طرح نصاریٰ نے "ابن اللہ" کے مرکزی تصوّر کے اردگرد، پُورا فلسفہ اور مکمل علمِ کلام کھڑا کر دیا ہے، اسی طرح حضرت علیؓ اور ائمہ اہلِ بیتِ اطہار کو مرکزِ عقیدت قرار دے کر، پُورا علمِ کلام تصنیف کیا گیا۔ جس کی چند جھلکیاں اُوپر گزر چکی ہیں!

یہ بات بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ تصوّف کے تمام سلسلے نقشبندیہ سلسلہ کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی سے منتسب ہیں اور آپ پر ہی منتہی ہوتے ہیں۔ ان سلسلوں میں اکابر صوفیاء گزرے ہیں، جنہوں نے کوئی شک نہیں دین کی اور خاص طور سے تزکیۂ نفس کی بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں! (رحمہم اللہ تعالیٰ)

اس اعتراف کے بعد ہمیں یہ بھی کہنا ہے کہ طریقت کے سلسلوں کے اس انتساب نے اس تصوّر کو بھی مسلمانوں میں اُبھارا کہ ولایت، طریقت، روحانیت اور تصوّف کی مرکزیت، رہنمائی اور قیادت کا منصب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تفویض ہوا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد عہدِ خلافت میں یہ تصوّر اور یہ امتیاز نہ پایا جاتا تھا۔ اور جس طرح دوسرے اکابر صحابہ سے لوگ دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے، اسی طرح حضرت علیؓ کے پاس بھی دین حاصل کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ یہ تصوّر سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ عمرؓ اور عبداللہؓ ابن مسعود تو دین کے ظاہری احکام کی تعلیم دیتے ہیں اور علیؓ دین کے اسرار اور باطن کی تعلیم دینے پر مامور ہیں! اور ولایت کے لئے حضرت علیؓ کی ذات سے روحانی انتساب ضروری ہے! اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور اس دَور کے دوسرے ائمہ حدیث و فقہ جن کا زمانہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بہت قریب تھا۔ وہ طریقت کے کسی سلسلہ میں منسلک نہیں ہیں۔ اگر ولایت، روحانیت اور تزکیۂ نفس کے لئے یہ انتساب اور انسلاک ضروری ہوتا تو ائمہ فقہ و حدیث بھلا اس برکت و سعادت سے محرومی گوارا کر سکتے تھے، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی یہ تفریق قرنِ اوّل میں نہ پائی جاتی تھی!

لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اس تفریق کے آثار بعد میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، عارفان باللہ اور اولیاء کرام کے جن کتابوں اور تذکروں میں نام اور احوال درج ہوتے ہیں، اُن میں امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ جیسے اکابر صلحاء اُمت کے نام نظر نہیں آتے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ و طہارت کی کوئی حد و نہایت ہے، پھر آپ کا کتاب و سُنت سے شغف بلکہ اس میں مہارت اور تعمق "نورٌ علیٰ نور!" اور "تفقہ فی الدین" کی استعداد اور صلاحیت میں تو امام موصوف اپنی آپ نظیر تھے! ان تمام دینی اوصاف کے باوجود اگر ابوحنیفہ ولی عارف باللہ اور صاحبِ روحانیت نہ تھے تو پھر پوری اُمت میں نہ کوئی ولی گزرا اور نہ کوئی صاحبِ عرفان و روحانیت پیدا ہوا!

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے احادیث نبوی کے صحیح ترین مجموعہ کو مدوّن کر کے تمام اُمتِ اسلامیہ

پر احسان کیا ہے، جو خدا سے ڈرنے والے تھے، سنتِ رسولؐ کے سب سے بڑے جامع، ناشر، مبلغ اور متبع تھے، جن کے اندر کمال درجہ کا تقویٰ اور صالحیت پائی جاتی تھی، اُن تک کا نام " ولایت وعرفان" کی فہرستوں میں نظر نہیں آتا ـ ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی اس " تفریق " اور امتیاز نے عقائد و اعمال کو اچھوتا نہیں رہنے دیا ـ غضب خدا کا منصور حلاج اور سرمد جیسے مجہول لوگوں کو تو اسرارِ باطن کا ماہر اور عرفان و شہود کا نمائندہ سمجھا جائے، مگر امام ابوحنیفہ رضی اور امام بخاری جیسے صلحاء اور اتقیا اور دین و شریعت کے محافظین کو علماءِ ظاہر میں شمار کیا جائے! اور تصوف و روحانیت کے باب میں انہیں کو نا سمجھا جائے۔

تاریخ کے ان حقائق کو بھی ذہن میں رکھئے کہ فرقہ باطنیہ نے انتہائی عیاری اور چالاکی کے ساتھ ظاہر و باطن کی تقسیم کو ابھارا، قرآنی احکام کے بارے میں یہ کہا کہ اصل عمل ان احکام کے باطن پر ہونا چاہیئے ـ اور باطن کی تربیت کے لئے امام معصوم کی ضرورت ہوتی ہے ـ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کئے جاتے ہیں! پھر اس عقیدہ کو پھیلایا گیا کہ کچھ نفوسِ قدسیہ اور معصوم ائمہ دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو کر عالمِ غیبوبیت میں رہتے ہیں ـ اور غاروں اور سردابوں سے احکام نافذ کرتے اور روحانی تربیت فرماتے ہیں ـ اور " نماز " سے مراد تو امام کو پکارنا ہے، اور " زکوٰۃ " وہ ہے جو امام کو دی جائے اور " حج " امام کی خدمت میں حاضر ہونا ہے!

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ حضرت علیؓ کو " الٰہ " اور معبود کہا گیا " پھر " امام " سے جو اوصاف منسوب کئے گئے، اس نے " نبوت " کے مقابل " امامت " کا ایک تصور پیدا کر دیا ـ پھر " باطن و روحانیت " کے مقابلہ میں دین و شریعت کو کمتر اور گھٹیا ٹھہرا گیا، اس مشن نے، تعلیم نے اور تحریک نے توحید، نبوت اور شریعت پر ضرب لگائی اور ذہن و فکر کو بہت بڑے خلجان اور فتنہ میں مبتلا کر دیا!

" لاہوت اور ناسوت کا اتحاد، روح اور نور کا انسانی قالبوں میں منتقل ہونا، الوہیت کا باطن پر ظہور تجلی کے لباس میں . . . . . . "

یہ طرزِ بیان، یہ اندازِ فکر، کشف و وجدان کا یہ اظہار، یہ اصطلاحیں اور یہ زبان رفتہ رفتہ پھیلتی چلی گئی اور معاملہ چند اقوال اور ملفوظات تک ہی محدود نہیں رہا، مبسوط کتابیں اس نہج پر تصنیف ہوئیں اور لوگوں نے انہیں اسرار کا گنجینہ، معارف کا خزینہ، باطن کا دفترِ بے پایاں، کشف و شہود کے نگینے اور عرفان و تجلی کے آئینے سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا ـ !

حدیث و فقہ میں جس طرح جرح و تعدیل سے کام لیا گیا اور نقد و احتساب کیا گیا جس کے سبب ہر چیز نکھر نکھر کر سامنے آگئی، فقہ میں شاگردوں نے اپنے استادوں اور اماموں سے اختلاف کیا صرف حق کی بناء پر، کہ اُن کو اپنے استاد کی رائے یا اجتہاد، یا تاویل و استنباط قریبِ صواب نظر نہ آیا ـ تصوف میں افسوس ہے کہ فقہ و حدیث کی طرح نقد و احتساب کو روا نہیں رکھا گیا، اگر اہلِ تصوف میں امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی جیسے جری نقاد پیدا ہوتے رہتے، تو یہ آئینہ بے غبار رہتا! اور اس گلکدہ کے خار و خس اور جھاڑ جھنکار چھٹتے رہتے!

" وحدت الوجود " اگر اسلام و ایمان کا کوئی بنیادی عقیدہ ہوتا تو کتاب و سنت میں اس کا ذکر آتا اور اس سے تزکیۂ نفس کی ضرورت پوری ہو سکتی تو بھی سنت و آثارِ صحابہ اس کے ذکر و بیان سے خالی نہ ہوتے، یہ مسئلہ دراصل دین کا نہیں بلکہ طبیعات کا مسئلہ ہے، جس طرح یوں کہتے ہیں کہ " کائنات میں ایک توانائی کام کر رہی ہے " تو " وحدتِ توانائی " دین کا مسئلہ نہیں ہے! مگر اس کو کیا کیجئے کہ " وحدت الوجود " کو اس قدر تنوع اور رنگا رنگ انداز میں پیش کیا گیا کہ " وحدت الوجود "

تصوف کا ایک اہم مسئلہ بن کر رہ گیا !

بعض صوفی علماء نے کوئی شک نہیں کہ "وحدت الوجود" کی قابلِ قبول شرحیں کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سورج نکلتے ہی ستارے نظر نہیں آتے، اگرچہ ستارے غائب نہیں ہوتے، مگر سورج کے سامنے وہ ماند پڑ جاتے ہیں۔ اور لاشئے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وجود کے مقابلہ میں کائنات اسی طرح ہیچ اور لاشئے ہے، جیسے سورج کے آگے ستارے ! اگر "تصوف" کے مسائل میں تشریح و افہام کا یہی سادہ انداز رہتا تو پھر کوئی اُلجھن پیش نہ آتی۔ مگر دوسرے نازک مسائل اور خاص طور سے "وحدت الوجود" کی شرح میں جو پیچیدہ اور دقیق و نازک زبان اور انداز اختیار کیا گیا، اُس نے خلجان اور اُلجھاوے پیدا کر دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے "متشابہات" کی چھان بین اور اُن کے پیچھے پڑنے سے روکا تھا۔ مگر بعض صاحبانِ وجد و حال نے چھانٹ چھانٹ کر اُن نازک ترین اور پیچیدہ و ادق مسائل پر گفتگو کی، جو "متشابہات" کا مزاج رکھتے ہیں۔ اسلامی ادب میں یہ اندازِ بیان حوصلہ افزائی کا مستحق نہ تھا، مگر آنے والوں نے اس اندازِ بیان کے موجدوں کو معارف و حقائق کے بحرِ بے پایاں کا شناور بتایا۔ اور کہا کہ یہ وہ اہلِ کشف و شہود تھے، جن پر باطنی علوم کے تمام پردے چاک ہو گئے تھے !

زبان و اصطلاح کے بعد بعض اشغال و اوراد اور رسوم میں بھی اس کی جھلک آئی، اگرچہ شیخ نصیر الدین چراغ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محتاط صوفیوں نے جرأت کے ساتھ یہ فرمایا۔

"مشائخ کا فعل حجت نہیں۔"

مگر عقیدت نے اُس پر عمل کس قدر ہونے دیا ؟

جو لوگ "بدعت" اور "عجمی فلسفۂ الٰہیات" سے شغف اور دلچسپی رکھتے تھے، اُن کے لئے تصوف کے طرزِ بیان اور بعض مشائخ کی اختیار کی ہوئی رسوم و طریق سے رخصتوں، اباحتوں اور بے اعتدالیوں کے لئے سندِ جواز ہاتھ آ گئی !

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو "الٰہ و معبود" کہا گیا تھا، کیا اُس کی جھلک اُن کے لقب "مشکل کشا" میں نہیں ملتی ؟ یہ لقب عجمیوں کی اختراع ہے، اسی لقب اور ترکیب کی پیروی میں "داتا" اور "غریب نواز" جیسے القاب تراشے گئے ! انبیاءِ عظام اور صحابہ کرام میں سے کسی کے نام کے ساتھ اس قسم کے القاب و خطابات آپ کو نہیں ملیں گے !

باطنیوں کا وہ عقیدہ کہ بعض نفوسِ قدسیہ دُنیا والوں کی نگاہوں سے غائب ہو کر چھپ جاتے ہیں اور اپنے مقاماتِ غیبوبت سے دُنیا کی باطنی تربیت اور دستگیری فرماتے ہیں —— اس عقیدہ نے اہلِ بدعت میں اس طرح رواج پایا کہ جگہ جگہ شہروں میں "شاہ ولایت" صاحبان کے مزار بنے ہوئے ہیں، جن کے بارے میں یہ عقیدہ تراش لیا گیا ہے کہ اس شہر کا انتظام اور نظم و نسق ان "شاہ ولایت" صاحب سے متعلق ہے ؟

اہلِ ائمہ کی عصمت کا عقیدہ، یہاں مشائخ اور پیروں کے احترام و عقیدت کے آداب اس طرح سکھائے گئے۔

"کسی پیر کو خلافِ شریعت اور بُری بات میں مُبتلا دیکھو تو بھی اس سے حُسنِ ظن رکھو، اُس سے بدعقیدہ نہ ہو" اور

بہ مے سجادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

پھر قبروں کے ساتھ وہ مشرکانہ آداب و رسوم اور بدعات وابستہ ہوتی چلی گئیں، جو انسانوں کو "الٰہ و معبود" بنانے والے

"ذہن و فکر" کا مقصود تھا ــــ !

اس فکر و عقیدہ نے کیسے کیسے روپ دھارے ہیں، بعض لوگ اپنے خطوں کے شروع میں "ہو العلی" - "ہو القادر" اور "ہو المعین" لکھتے ہیں۔ کوئی پوچھے، یہ کیا ہے؟ تو اُسے یہ کہہ کر مطمئن کردیتے ہیں کہ "علی" - "قادر" اور "معین" تو اللہ کے نام ہیں۔ مگر کیا وہ اللہ سے بھی اپنے دلوں کی چوری چھپا سکتے ہیں کہ ان لفظوں میں انھوں نے "صنعتِ ایہام" سے کام لیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ساتھ حضرت علی، شیخ عبد القادر جیلانی اور خواجہ معین الدین اجمیری کے ناموں کی بھی رعایت رکھی گئی ہے ــــ !

شاعری میں یہ فتنہ اس طرح رونما ہوا کہ کفر کو اسلام پر، صومعہ اور بُت کدہ کو کعبہ پر، شراب کو آبِ زمزم پر۔ برہمن کو شیخ پر، رند کو زاہد پر، زنّار کو تسبیح پر ترجیح دی گئی اور ڈنکے کی چوٹ کہا گیا ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

اور ؎ نہفتہ کافرم دبت در آستیں دارم !

بعض ایسے شعراء جن کی شاعری میں رندی و ہوسناکی رچی ہوئی ہے اور جسے پڑھ کر ذہن میں نیکی کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ طبیعت مستی و ہوس کی طرف مائل ہوتی ہے، انھیں "لسان الغیب" اور "عارف باللہ" کا خطاب دیا گیا۔ غرض

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا، کجا نہم !

تک معاملہ پہنچ گیا !

دعوتِ فکر "توحید نمبر" اتمامِ حجت بن کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ اگر کچھ جبینیں اسے پڑھ کر شکن آلود اور کچھ چہرے خشم آلود ہو جائیں تو ہم معذور ہیں، کسی کی ناخوشی اور سرکہ جبینی کے خوف سے ہم حق بات کو چھپا نہیں سکتے !

قبولِ حق کا معاملہ تو قلوب کی استعداد اور اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے، کیا عجب ہے کہ "توحید نمبر" کے مضامین کچھ لوگوں کی اصلاح کا سبب بن جائیں !

جو حضرات تحقیق کا ذوق اور انکشافِ حق کی تڑپ رکھتے ہیں، اُن کی خدمت میں ہماری مخلصانہ اور ہمدردانہ گزارش ہے کہ جن مسائل کا "نقشِ اوّل" میں ذکر آیا ہے اور جو اس شمارۂ خاص میں پھیلے ہوئے ہیں، اُن میں سے کسی ایک مسئلہ کو وہ تحقیق کے لئے منتخب فرمالیں۔ مثلاً "مزاروں کے عرس" کا مسئلہ ہے، اس کی وہ تحقیق کریں، اور مخالف و موافق جماعتوں میں سے کسی ایک کی بھی کوئی کتاب نہ پڑھیں۔ بلکہ براہِ راست کتاب اللہ میں، احادیث میں، سیرت النبی میں، اسوۂ صحابہ اور ائمہ فقہ و حدیث کے حالات میں، اس مسئلہ کا پتہ لگائیں کہ کہیں اس کا وجود ملتا ہے؟ کوئی آیت، کوئی حدیث، کوئی اثر اور کسی کا قول، اس کے جواز میں پایا جاتا ہے؟ اس تحقیق میں اگر سال دو سال بھی صرف ہو جائیں، تو اہلِ تحقیق کو صبر سے کام لینا چاہیئے، یہ مسئلہ واضح ہوتے ہی پھر اُن کے ہاتھ میں ایسی کنجی آجائیگی۔ جس سے اس قسم کے تمام مسائل کے قفل کھٹ کھٹ کھلتے چلے جائیں گے۔ اور حق واضح ہو جائے گا !

"شرک و بدعت کا معاملہ کوئی "فرقہ وارانہ" معاملہ نہیں ہے۔ شرک و بدعت کو ہر دور میں اہلِ حق نے قابلِ رد

وملامت ہی سمجھا ہے! "شرک" جسے قرآن "ظلم عظیم" کہتا ہے، اور جس گناہ کی خوفناکی کا یہ عالم ہے کہ اُس کو اللہ کی شانِ غفاری نے معاف نہ کرنے کا اعلان کیا ہے اور "بدعت" جسے اللہ کے آخری نبیؐ نے "ضلالت" کہا ہے۔ اُن کا رد کرنا دین کی سب سے بڑی خدمت اور مسلمانوں کے ساتھ انتہائی خیر خواہی ہے، اگر اس کوشش کو کوئی فتنہ سمجھتا ہے، تو وہ انبیاء کرام پر معاذ اللہ "فتنہ ساز" ہونے کی تہمت لگاتا ہے! جن کا مشن ہی شرک و بدعت کا استیصال، اللہ کی توحید کی تبلیغ اور دینِ خالص کے قیام کی دعوت تھی!

جس طرح نجاست اور طہارت کے درمیان اعتدال کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح "شرک و بدعت" اور "توحید و سنت" میں کوئی درمیانی راہ نہیں نکالی جا سکتی! "توحید" پر ایمان کا دارومدار ہے، یہی اسلام کی اوّلین اساس ہے۔ اس بنیاد پر بال برابر بھی آنچ آئے تو ایمانی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ مدافعت کے لئے تیار ہو جائے!

"توحید نمبر" میں جو مسائل آئے ہیں، وہ ایسے نہیں ہیں کہ ایک مفروضہ اور قیاس کے طور پر اُن کا وجود تسلیم کر لیا گیا ہو، یہ مسائل مسلمانوں میں موجود ہیں، ان پر نکیر کرنی ہی چاہیئے! مشرکانہ رسوم و بدعات میں رواداری یا سکوت شیطان کا بہت بڑا فریب ہے!

یا اللہ! ہم سچے دل سے اقرار کرتے ہیں کہ تو "ایک" (واحد و احد) ہے، تجھ جیسا کوئی نہیں۔ تیری ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں، تیری ذات حلول و تجسم سے پاک ہے، حلّالِ مشکلات، کارساز، بگڑی کا بنانے والا، فریاد کا سننے والا، روزی دینے والا، ہر کسی کی مصیبت میں کام آنے والا، تُو اور صرف تُو ہے! عام و خاص، غریب و امیر، بادشاہ و گدا، جاہل و عالم، اولیاء اور انبیاء سب تیرے محتاج ہیں! جس کو جو کچھ ملتا ہے تیرے در سے ملتا ہے، تیرے حکم کے بغیر ایک ذرّہ بھی نہیں ہل سکتا۔ یہ تیری اور صرف تیری قدرت ہے کہ تو مخلوقات اور کائنات کے رتی رتی بھر حال کی ہر لحظہ خبر رکھتا ہے! عالم الغیب والشہادہ تو ہے! سمیع و بصیر اور علیم و خبیر تُو ہے!

رب العالمین! ایسی توفیق عطا فرما کہ ہمارا جینا اور مرنا خالص تیرے لئے ہو، ہماری ساری تمنّائیں، آرزوئیں اور ارادے تیری مرضی کے تابع ہو جائیں! ہمیں عزت مند بنا، غیرت اس کی کہ شرک کے ادنیٰ سے شائبہ کو بھی ہم گوارا نہ کر سکیں! تیرے نبیؐ کی سُنّت اور اسوۂ حسنہ ہماری زندگیوں کا موضوعِ فکر ہی نہیں، معیارِ عمل بھی بن جائے، سُنّت کے مقابلہ میں "بدعت" کو دیکھ کر ہمارے اندر اُسے مٹا دینے کا جذبہ پیدا ہو اور ہم سخت کرب و اضطراب محسوس کریں!

یا اللہ! ہم میں اخلاص پیدا فرما کہ ہم کسی نیک کام پر تیرے سوا کسی سے نہ تو قدرشناسی اور اجر و ستائش کی تمنّا رکھیں اور نہ کسی سے خوف کریں، تیرے ذکر سے قلوب حلاوت و اطمینان محسوس کریں!

یا اللہ! جب ہم قیامت میں تیرے حضور حاضر ہوں، تو اس پیشانی پر تیری غلامی اور بندگی کے سوا اور کسی آستانہ کے غبار کا ایک ذرّہ بھی لگا ہوا نہ ہو!

بارِ الٰہا! اسلام کو اور مسلمانوں کو عزت و سربلندی عطا فرما! سازشیوں اور غداروں سے ملتِ اسلامیہ کو نجات دے، اور ملت کا سربراہ کار اُن کو بنا جو تیرے دین کو سربلند کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں!

یا اللہ! تیری بندگی کو ہم صرف تیرے ہی لئے خالص رہنے دیں، اُس میں کسی اور کی غلامی اور محکومیت شریک

نہ ہونے پائے! جو تجھ سے بندگی اور ربوبیت کا معاملہ ہے، وہ دُنیا میں اور کسی سے نہ ہو! ہم صرف تیری چشمِ کرم کے امیدوار، تیرے در کے سوالی، تیرے آستانہ کے فقیر اور تیرے کوچے کے بھکاری ہیں! ہم تیرے سوا ہر کسی کی بندگی اور معبودیت سے بغاوت کا اعلان کرتے ہیں! پرستش اور بندگی کے لائق صرف تیری ذات ہے! تیری خدائی میں، ربوبیت میں، معبودیت اور قدرت واختیار میں کوئی شریک وسہیم نہیں، تیرے حکم کے آگے کسی کو مجالِ دم زدن نہیں! ذلت اور عزت کا دینے والا تُو ہے، اور دُنیا کا کارخانہ صرف تیرے حکم سے چل رہا ہے!!

اے وہ کہ تیرے جلال وخشیت سے نبی اور رسول لرزاں اور ترساں رہتے تھے، ہم تجھ سے تیرے عفو وکرم اور رحمت کے طالب ہیں، دُنیا میں بھی اور دین میں بھی!

بر ما منگر، بر کرم خویش نگر!!!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيم!

ماہر القادری

۲ شوال ۱۳۷۴ھ

۲۵ مئی ۱۹۵۵ء

ترجمہ: مولانا لطف احمد عثمانی

(البرھان المؤید ملفوظات
حضرت سید احمد کبیر احمد رفاعیؒ)

توحیدِ خالص

توحید خالص یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی پر نظر نہ کرے، کیونکہ وہ یکتا ہے (صمد ہے، سب اُسی کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں) جب تم نے "یا اللہ!" کہا، تو اللہ کو اسم اعظم سے یاد کیا، مگر تم اُس کی عظمت و ہیبت سے ہنوز محروم ہو کیونکہ تم نے اپنی شان کے موافق کہا ہے، اس نام کی شان کے موافق نہیں کہا!

اے عزیز! خدا کی قسم قربِ الٰہی میں نہ وصال ہے نہ جدائی، نہ حلول ہے نہ انتقال، نہ حرکت ہے نہ سکون، نہ چھونا ہے نہ پاس ہونا، نہ مقابلہ ہے نہ برابری، نہ سامنا ہے نہ مماثلت، نہ ہم شکل ہونا ہے نہ ہم جنس ہونا۔ نہ کوئی جسم ہے نہ کوئی تصور، نہ تاثر ہے نہ تغیر و تبدل، یہ تو سب کی سب تیری صفات ہیں۔ حق سبحانہٗ تیری ان صفات و کیفیات سے منزہ ہے، یہ تو اسی کی بنائی ہوئی ہیں۔ پھر وہ ان کے ذریعہ سے یا ان کے اندر کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے، یہ تو خود اسی سے ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ ان سے ظاہر نہیں ہوا، وہ ان شکلوں، صورتوں، اور معانی سے پاک اور منزہ ہے! نہ وہ ان میں چھپا ہوا ہے نہ ان سے ظاہر ہوا، نہ کسی کا فکر اُس تک پہنچا، نہ کسی کی نظر نے اُس کا احاطہ کیا!

گفتگو کا دائرہ حقیقت کے بیان سے قاصر ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس نہ کرو۔ اشارہ کے طور پر صفاتِ الٰہی کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، یہ محض سمجھانے کے لئے ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان صفات کی جو حقیقت تم سمجھے ہو، اللہ تعالیٰ کی صفات ویسی ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کی جاتی ہیں اور جو کچھ اس کی تعریف کی جاتی ہے وہ صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جن کمالات کا مستحق ہے، اُن کو ثابت کیا جائے، اور عیبوں سے اس کو پاک سمجھا جائے۔ مگر درحقیقت وہ جس عظمت کا مستحق ہے، وہ تو علم اور عقل و فہم کے ادراک سے بہت دُور ہے! **ولا یحیطون بہ علماً** لوگوں کا علم اس کو محیط نہیں ہو سکتا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک

اے اللہ! میں آپ کی پوری تعریف نہیں کر سکتا، بس آپ
ویسے ہی ہیں جیسا آپ نے خود اپنی تعریف کی ہے!

دوستو! کیا کہا جائے، کیا بیان کیا جائے؟ خدا کی قسم! زبانیں گونگی، عقلیں حیران اور دل سوختہ ہیں، حیرت اور دہشت کے سوا کسی کے پاس کچھ نہیں ؎

دُور بینان بارگاہ الست ! غیر ازیں پے نہ بردہ اند کہ ہست !
در طریقت آنچہ می آید بدست حیرت اندر حیرت اندر حیرت است !

زدنی فیک تحیراً — اے اللہ! اپنے بارے میں میری حیرت کو اور زیادہ کیجئے کہ یہ حیرت ہی مطلوب ہے، جس کو یہ میسّر

نہیں وہ محروم ہے ؎

مصلحت نیست مراسیری ازاں آبِ حیات　　ن ادنی اللہ بہ کل زمان عطشا !

دوستو! ہم کو ظاہری توحید پر محض رحمت کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا ہے، تاکہ تم دعوتِ توحید کے جھنڈے تلے آجاؤ - چونکہ نرمی کرنا مقصود ہے، اس لئے تمہاری ظاہری طاعت اور دعویٰ توحید پر اکتفا کیا گیا، تاکہ تم اُلٹے نہ لوٹ جاؤ! اسی لئے ظاہری دعویٰ توحید کی بناء پر تمہارا نام مسلم رکھ دیا گیا، اس کی حقیقت کا مطالبہ نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ تو تمہاری طاقت سے باہر ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کو طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتے، پس جس شہادتِ توحید کا تم سے مطالبہ کیا گیا ہے، اسلام سے تمہارا وہی حصہ ہے، اسی سے تم منکرین کے زمرہ سے نکل گئے ! اگرچہ ابھی تک حقیقی مومنوں کے زمرہ میں داخل نہیں ہوئے۔

قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا !

یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، فرمادیجئے تم ایمان نہیں لائے ہاں یوں کہو کہ تابعدار بن گئے !

یہ گمان نہ کرنا کہ کسی کو توحید کی حقیقت کا ادراک ہوگیا ہے۔ بس ہر شخص کی توحید اُس کے درجہ کے موافق ہے، جس کو کشفِ الٰہی سے جتنا حصہ ملا ہے، وہی توحید سے اس کا حصہ ہے۔ ورنہ حقیقتِ توحید کو کون پا سکتا ہے ! متناہی غیر متناہی کا احاطہ نہیں کر سکتا ! حادث قدیم کا ادراک نہیں کر سکتا۔ بس جو کچھ ہے کشفِ الٰہی کی عطائیں ہیں اور اس کی کوئی حد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں نہ کہا جاتا :-

وقل ربّ زدنی علما -

یہ دعا کرتے رہو کہ اے رب میرے علم کو بڑھاتا رہ !

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و معرفت میں برابر ترقی ہوتی رہتی تھی، جب حضورؐ جیسی کامل ہستی بھی برابر ترقی میں ہے، تو کسی دوسرے کی کیا مجال ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں نے قرب الٰہی کے تمام مراتب اور وصول کے تمام درجات طے کر لئے اور ایسی غایت پر پہنچ گیا ہوں جس کے آگے کوئی درجہ اور مرتبہ نہیں رہا۔ اور یہ تمام گفتگو محض لفظی دلائل اور سمجھانے کے عنوانات ہیں۔ ورنہ جن حقیقت شناسوں کو حقیقت کی کچھ خبر ہے، اُن کے پاس تو وہ براہین اور دلائلِ قطعیہ ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان لفظی دلائل اور متکلمانہ عنوانات کی کچھ ضرورت نہیں، وہ اپنی حقیقتِ حال سے جانتے ہیں کہ اُن کا سرمایہ عجز ہے اور انتہا یہ ہے کہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ؎

ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند　　آں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

بندہ کے لئے اپنے پروردگار کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو پہچانے۔ جس نے اپنے کو پہچان لیا اُس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا۔ جس نے یہ جان لیا کہ میں خدا کا ہوں (یہ ہے اپنا پہچاننا) وہ اپنا سب کچھ خدا پر قربان کردے گا (یہ ہے خدا کو پہچاننا) جو اپنے نفس سے اور تمام اغیار سے الگ ہوگیا جس نے طبیعت کے کروفر، ساز و سامان، تکبر و عجب پر لات ماردی، وہ جہل کی قید سے چھوٹ گیا اور عارف ہوگیا، معرفت کی حقیقت یہ نہیں کہ اُونی جُبّہ ہو، سر پر کلاہ ہو، اونچے کپڑے ہوں، بلکہ معرفت یہ ہے کہ خشیت و غم کا جبہ ہو۔ سچائی کا تاج ہو۔ توکل کا لباس ہو۔ اگر ایسا ہو تو بس تم عارف ہوگئے ! عارف کا ظاہر شریعت کی چمک سے اور باطن محبت الٰہی کی آگ سے خالی نہیں ہوتا۔

کار مرداں روشنی و گرمی است !　　کار دوناں حیلہ و بے شرمی است !

وہ علم کے ساتھ ٹھہر جاتا ہے اور راستے سے ہٹنے نہیں پاتا۔ اس کا دل وجد کی چنگاریوں پر لوٹتا رہتا ہے، اس کا وجد ایمان ہے، اس کا سکون یقین ہے (جس کے حاصل کرنے کا طریقہ اتباع سنت اور کثرت ذکر ہے) ذکر اللہ کی پابندی کرو، کیونکہ ذکر وصال کا مقناطیس ہے۔ قرب کا ذریعہ ہے (اور قرب ہی سے توحید کامل ہوتی ہے) جو اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اللہ سے مانوس ہو جاتا ہے اور جو اللہ سے مانوس ہو گیا وہ اللہ تک پہنچ گیا۔ مگر ذکر اللہ عارفین کی صحبت وبرکت سے دل میں جمتا ہے! کیونکہ آدمی اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے (اگر ذاکرین عارفین سے میل جول رکھیگا ذکر ومعرفت سے حصہ پائے گا اور غافلوں کی صحبت میں رہے گا، غفلت میں گرفتار رہیگا) اس علم سے کیا فائدہ جس پر عمل نہیں؟ اور اس عمل سے کیا نفع جس میں اخلاص نہیں۔؟ اور اخلاص کٹھن راستے کے کنارہ پر ہے، اب بتا تجھے عمل کے لئے کون اُبھارے گا؟ ریا کے زہر کا جو تیرے اندر بھرا ہوا ہے کون علاج کرے گا؟ اور اخلاص حاصل ہو جانے کے بعد تجھے بے خوف وخطر راستہ کون بتلائے گا؟ جاننے والوں سے پُوچھو اگر تم نہیں جانتے۔

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون !

امام شافعیؒ نے اُن تمام باتوں کو جو توحید کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں، اپنے اس ارشاد میں جمع کر دیا ہے کہ خالق جل شانہ کے متعلق جس کی معرفت ایسے موجود پر ختم ہو گئی جس تک اس کا ذہن پہنچ سکتا ہے، وہ مشبّہ[1] ہے، اور جس کی معرفت خالص عدم تک پہنچکر ساکن ہو گئی وہ معطل ہے اور جس کے دل کو ایسے موجود پر قرار ہوا جس کی معرفت سے عاجز ہونے کا دل نے اقرار کر لیا تو یہ موحد ہے!

دوستو! اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کے عیوب اور اُن کی جیسی صفات سے پاک سمجھو! اس قسم کی باتوں سے اپنے عقائد کو محفوظ رکھو کہ معاذ اللہ وہ عرش پر اس طرح قرار پکڑے ہوئے ہے، جیسا ایک جسم دوسرے جسم پر قرار پکڑتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ کا عرش میں حلول کرنا لازم آتا ہے اور وہ اس سے بلند وبالا ہے کہ کوئی اس کا احاطہ کر سکے، اور مکان

---

[1] مشبّہ وہ فرقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے مخلوق جیسی صفات ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھی ہاتھ پیر اور مُنہ وغیرہ ہیں، ہماری ہی طرح سنتا، دیکھتا، بیٹھتا، کھڑا ہوتا، اُترتا چڑھتا ہے۔ معطل وہ فرقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے نہ مخلوق جیسی صفات ثابت کرتا ہے، نہ ان صفات کا اقرار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لائق ہیں۔ بلکہ جن صفات کمال کا ذکر قرآن میں آیا ہے اُن کی تفسیر بھی نفی سے کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ عاجز نہیں۔ علیم کا مطلب یہ ہے کہ جاہل نہیں، رحیم کا مطلب یہ ہے کہ ظالم نہیں، یہ نہیں مانتا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم وقدرت ورحمت ثابت ہے۔ موحد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو موجود مانتا اور اُس کے لئے صفات کمال کو ثابت کرتا ہے! مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی حقیقت کو نہ بیان کر سکتا ہوں، نہ سمجھ سکتا ہوں، بس دلائل عقلیہ ونقلیہ سے صانع عالم کے وجود اور وحدت اور صفاتِ کمال کا قائل ہوں، اور دلیل سے دُنیا بھر کو قائل کر سکتا ہوں۔ مگر ذات وصفات کے تعلق کی حقیقت یا کیفیت نہیں بتلا سکتا، کیونکہ انسان خود اپنی حقیقت اور اپنی ذات وصفات کے تعلق کی کیفیت نہیں بتلا سکتا۔ خدا کی ذات وصفات کی حقیقت تو وہ کیا بتلائے گا؟

مکین کو محیط ہوتا ہی ہے۔ پس خدا مکان سے پاک ہے) خبردار! اللہ تعالیٰ کے لئے جہت اور مکان وغیرہ ثابت نہ کرنا۔ نیز اجسام کی طرح اس کے لئے نزول وعروج کے قائل نہ ہونا۔ کتاب وسنت میں اگر کہیں ایسے الفاظ آئے ہیں، تو اسی کتاب وسنت میں دوسری نصوص بھی موجود ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کا مخلوق کی طرح نزول وعروج واستقرار وغیرہ سے پاک ہونا بتلاتی ہیں۔ اب اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ سلف صالحین کی طرح یوں کہا جائے کہ ہم ان متشابہات کے ظاہر پر ایمان لاتے ہیں اور مراد کے علم کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو جہت اور کیفیت اور مخلوقات کے عیوب سے پاک سمجھتے ہیں۔ ہمارا کام متشابہات کو پڑھ لینا اور خاموش رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو اُن کی تفسیر کا حق نہیں۔ متشابہات کو محکم پر محمول کرنا چاہیئے، کیونکہ کتاب اللہ میں اصل وہی آیات ہیں جو محکم ہیں۔ متشابہ محکم کا معارض نہیں ہوسکتا۔ (محکم وہ آیات ہیں جن کا مطلب واضح ہے۔ اعتقاد اُن ہی کے موافق رکھنا چاہیئے۔ اگر متشابہات ظاہر میں اُن کے خلاف ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ حقیقی مراد اُن کی بھی محکم ہی کے موافق ہے۔ گو ہم نہ سمجھے ہوں، کیونکہ متشابہات کے متعلق خود قرآن کا فیصلہ ہے کہ اُن کی اصلی مراد کو اللہ ہی جانتا ہے!)

استماع الملاهی والجلوس علیها وضرب المزامیر والرقص علیها حرام!

(جامع البغدادی)

(لہو ولعب سننا، اور ایسی محفل میں بیٹھنا اور مزامیر کا بجانا اور رقص کرنا، یہ سب باتیں حرام ہیں)

☆

علامہ محمد البشیر الابراہیمی رئیس جمعیۃ العلماء الجزائر
ترجمہ۔ مولانا محمد عادل قدوسی

اسلامی توحید کی حقیقت

تمام آسمانی مذاہب میں اسلام کو جو امتیازی درجہ حاصل ہے وہ اس کے توحید خالص کے نظریہ کی بناء پر ہے، بلکہ درحقیقت خاتم الانبیاء حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کی سب سے بڑی حکمت ہی توحید خالص کا خدائی پیغام تھا۔ کیونکہ پچھلے انبیاء کے مذاہب اُن کی زندگی کے ساتھ ساتھ ختم ہوجاتے تھے۔ اُن کی اُمتیں اُن کے بعد جس طرح چاہتیں اپنی خواہشات کے مطابق نئے نئے عقائد ایجاد کرلیتی تھیں۔ یہاں تک کہ اُن کے انبیاء کی پیش کردہ توحید اُن کے من گھڑت عقائد کے ہجوم میں مغلوب ہوجاتی تھی، اور اُن کی عقلوں پر بُت پرستی چھا جاتی تھی۔

یہ امر بدیہی ہے کہ توحید و شرک دُو متضاد چیزیں ہیں۔ جو کبھی ایک انسان کے قلب میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اگر اس میں توحید داخل ہوجاتی ہے تو شرک بالکل نکل جاتا ہے۔ اور اگر شرک داخل ہوجاتا ہے تو توحید بالکلیہ نکل جاتی ہے! سابقہ اُمتوں کا جنہیں حق تعالیٰ نے آسمانی رسالت و ہدایت سے نوازا تھا، یہی حال رہا! علیٰ ہذا۔

اس دُنیا کے بعض حصوں میں اور باشندگانِ عالم کے بعض فرقوں میں یہ سلسلہ جاری رہا ہے! کہ کبھی کبھی کہیں توحید کی شمع روشن ہوگئی، پھر بُت پرستی کے تصادم سے یہ شمع بُجھ بُجھ گئی ہے! بُت پرستی عوام کے ذہنوں کو جلد اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے، اس لئے کہ وہ اس دُنیا میں قوت و طاقت کے محسوس مظاہر کی عبادت کا نام ہے! اور انسان کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ محسوس طاقت کے سامنے سر جُھکا دیتا ہے! اسی بناء پر شیطان نے آسانی سے انسان کے دماغ میں چاند، سورج نفع بخش جانوروں اور درختوں اور عظیم الشان انسانی ہستیوں کی پرستش کا تصور قائم کردیا۔ اور صدیاں گزر گئیں جب سے انسان برابر اس مسئلہ کے متعلق گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سرگردان و حیران چلا آرہا ہے! کاش وہ اپنی اسی حالت پر مطمئن اور قانع ہوجاتا، مگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ ہمیشہ شکوک و اوہام کا شکار رہا ہے! وہ بُت پرستی کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ اس کے فائدہ بخش یا ضرر رساں ہونے میں متردد بھی رہتا ہے، کیونکہ انسان کا عقلی شعور بالکلیہ فنا نہیں ہوتا —— بلکہ خواہشات نفسانی اس پر صرف ایک عارضی پردہ ڈال دیتی ہیں اور کبھی کبھی وہ بیدار اور متنبہ ہوتا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ بعض قوموں کے سمجھدار اشخاص نے صرف عقل ہی کے ذریعہ اللہ کی توحید کو سمجھا اور تسلیم کیا ہے!

حق تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو ایک ایسی جامع شریعت عطا فرما کر جو انسانوں کے دینی و دُنیوی مفادات اور اُن کے جسمانی و روحانی تقاضوں کو باحسن وجوہ پُورا کرتی ہو، عالم کے تمام انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا۔ یہ جامع شریعت ہی اسلام ہے۔ جس کے دُو خاص وصف ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک جامع و عالمگیر مذہب ہے، دوسرے یہ کہ وہ آنے والے ہر زمانے اور ہر ملک کے ساتھ مطابقت و عمل کی پوری صلاحیت رکھتا ہے!

روح الامین حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن لے کر آئے اور قرآن وہ خدائی کلام ہے، جس کے کسی سمت سے بھی باطل اُس کے پاس تک نہیں پھٹک سکتا، یہی وہ مقدس کتاب ہے جو اصولِ اسلام اور شریعت اسلامیہ کی جامع ہے، یہی کتاب دعوت دینے والوں اور اسے تسلیم کرنے والوں سب کے لئے ایک قطعی حجت ہے اور یہی کتاب تمام فرائض و احکام الٰہیہ کے اصول بیان کرنے والی ہے!

پس قرآن ہی اسلام کی کتاب ہے، اور جب تک روئے زمین پر کوئی مسلم باقی ہے، وہ بھی باقی رہے گی، حق تعالیٰ نے اسے فصیح عربی زبان میں نازل فرمایا ہے، تاکہ اولاً اسے یاد کیا جائے پھر اسے سمجھا جائے، اور پھر اس پر عمل کیا جائے! قرآن پر ایمان لانے والے ہر شخص پر یہ تینوں چیزیں لازم ہیں۔ ورنہ بے سمجھے اور بے عمل کئے صرف اس کا یاد کر لینا چنداں مفید نہیں۔ نہ اس سے یاد کرنے والے کا نفس روشن و پاک صاف ہو سکتا ہے، اگرچہ اس کی محض تلاوت بھی داخلِ عبادت ضرور ہے —!

علیٰ ہذا، اس پر عمل کئے بغیر صرف اس کا یاد کر لینا اور سمجھ لینا بھی کافی نہیں، بلکہ اس طرح اس شخص پر قرآن پر عمل کرنے کی مزید حجت قائم و ثابت ہو جاتی ہے! الحاصل درجۂ کمال یہ ہے کہ بیک وقت ان تینوں حقیقتوں کو جمع کر لیا جائے، یعنی قرآن کریم کی تلاوت، اُس میں تدبّر و تفکر اور اس پر عمل!

اسلام پورے کا پورا خاص مقاصد و اغراض کا مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ احکام حکمتوں پر مبنی ہیں! قرآن کریم اپنے سمجھنے والے کی تربیت اُن ہی حکمتوں پر فرماتا ہے جن کی بناء پر وہ خود بھی ہدایت پاتا ہے اور دوسرے کی بھی ہدایت کرتا ہے! اور اپنے اعمال کی بنیاد اسلام کے عام مقاصد پر رکھتا ہے اور احکام اسلام کو قرآن کریم کی بیان کردہ حکمتوں پر مبنی قرار دیتا ہے —!

یہ امر واضح ہے کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں، جو پانچ مشہور عبادات و فرائض کا مجموعہ ہیں، لیکن یہ ارکان ذاتی و شخصی ہیں۔ یعنی خدا کی طرف سے صرف مکلف کی ذات سے ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے! اگر وہ ان پر عمل نہ کرے تو صرف اُسی کی ذات سے اُن کا محاسبہ کیا جائے گا، اس کے ساتھ کسی دوسرے سے محاسبہ نہ ہوگا۔ بجز اُس سرپرست کے جس نے اس شخص کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی کی ہو یا اُسے ترکِ فرائض سے روکنے میں کمی کی ہو!

باقی وہ ارکان جن پر مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت سے اسلام کا مدار ہے۔ وہ چار ہیں:-

عبادات اور احکام سے متعلقہ عقائد۔ فضائل و آدابِ اسلام

یہ چاروں ارکان اُسی وقت نتیجہ خیز ثابت ہو سکتے ہیں، جب پورا اجتماعی معاشرہ ان پر عمل پیرا ہو — اور یہ اس کے تمام افراد میں شائع و منتشر ہو جائیں۔ اور سب باہم مل جل کر انہیں آپس میں نافذ کریں۔ جیسے کہ کسی مکان کی تعمیری بندش کے پتھر اُس کی تعمیر و استحکام کا باعث ہوتے ہیں!

ہم اولاً عقائد سے ابتداء کرتے ہیں۔ کیونکہ وہی اصل بنیاد ہیں۔ جس پر تمام مذکورہ ارکان قائم ہیں۔ پس اگر عقائد درست ہیں تو ارکان بھی درست رہیں گے، اور اگر عقائد میں فساد و خلل برپا ہوا تو ارکان بھی محتاج رہیں گے!

عقیدہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کا فرمان اس کی توحید اُس کی ذات میں تمام صفات حسنہ اور کمالات کو مرکوز اور نقائص و عیوب سے اس کے بالکلیہ مبرا سمجھنے کا تصور قلب میں پوری طرح مرتسم و منقش ہو جائے، عقیدہ کے باب میں عقلِ انسانی

کو کچھ دخل نہیں ہے، بلکہ عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ قطعی تصریحات قرآنیہ کو سمجھے اور ہر مسئلہ کو اس کی حدود تک محدود رکھے، کیونکہ عقل کا ادراک آنکھ کے ادراک کی طرح محدود ہی ہوتا ہے اگرچہ اس سے کچھ زیادہ وسیع کیوں نہ ہو!

عقائد کے باب میں سب سے بہتر اور محقق حقیقت وہ قطعی نصوص ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اور قرآن کریم نے اللہ کی تمام صفاتِ کمالیہ کو اور عیوب سے اس کی تنزیہ و تقدیس کو وضاحت سے بیان فرما دیا ہے! اور اس صراحت کے بعد پھر ہمیں کسی اور چیز کا مکلف نہیں فرمایا۔ اور نہ کسی ایسی مخفی حقیقت کا مکلف فرمایا ہے جو ہماری عقول کی رسائی سے بالاتر ہو۔ بلکہ اپنے وجود کو پہچاننے کے لئے فطری طریقے بتلائے ہیں، جن میں سب سے اہم طریقہ یہ ہے کہ موجوداتِ عالم کے وجود سے اس کے موجد اور مخلوقات کے وجود سے اس کے خالق کے وجود پر استدلال کیا گیا ہے، جس نے قرآن کے اس طرزِ استدلال کو اختیار کیا، وہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت اس کی توحید خالص، آفرینشِ عالم، رزق رسانی، عدم سے وجود میں لانے اور موت کے بعد دوبارہ پیدا کرنے میں اس کی انفرادیت کے عقیدہ میں اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچ گیا اور یہی توحید کا کمال ہے!

ایک مخلص مومن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ کو ایسا ہی ایک مانے جیسا کہ اس نے خود قرآن کریم میں اپنی توحید بیان فرمائی ہے۔ اس میں زیادتی کرے نہ کمی، کیونکہ اس باب میں کمی بیشی سب یکساں ہے! اور جتنا قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اس پر قائم رہنا ہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے!

معلوم ہونا چاہیئے کہ صرف انسانی عقل توحید کی اصل حقیقت تک اس کی رسائی کے لئے بالکل ناکافی ہے توحید کے مسئلہ میں اصل بنیاد اور مرجع صرف نقل ہے، اور نقل حق تعالیٰ کا قطعی و یقینی کلام ہے، اس مسئلہ اور تمام غیبی امور میں عقل کا کام صرف صحیح فہم اور صحیح نظر ہے اور بس کیونکہ عقل کا ادراک محدود ہے! وہ اپنی قوتِ ادراک کی اس قوت سے جو حد اللہ نے اسے عطا فرمائی ہے تجاوز نہیں کر سکتی، اسی لئے حق تعالیٰ نے ان نازک امور کو بتانے کے لئے انبیاء کرام کو امتوں کی طرف بھیجا، اگر رسول نہ بھیجے جاتے تو اس ذی عقل بنی نوع انسان پر حجت بھی قائم نہ ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور کتب سماوی کے ہمارے پاس بھیجے جانے سے ہم پر اللہ پر ایمان لانا حجت ہو گیا!

بیشک بعض اقوام مثلاً یونان کے حکماء و فلاسفہ نے امور مابعد الطبیعہ کی تحقیق کی ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اس عجیب و غریب منظم و مرتب عالم کے خالق کے وجود کے قائل ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے جیسا چاہیئے تھا اس کی اصل حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اور وہ ہستی جس قدر و منزلت کی مستحق تھی، اس کا احساس نہ کر سکے، اور اس خالق کو جن اوصاف کمال سے متصف کرنا اور جن نقائص و عیوب سے مبرا کرنا ضروری تھا وہ اس حد تک نہ جا سکے۔ کیونکہ ان کی عقلیں انتہائی تیزی اور تنوّر کے باوجود اس درجہ تک نہ پہنچ سکیں۔ بلکہ صرف توحید کے حقائق کے ارد گرد گھومتی رہیں۔ اور تجربہ نے ثابت کر دیا کہ وہ توحیدِ الٰہی جس تک بغیر آسمانی وحی کی ہدایت کے محض عقل کی رسائی ہوتی ہے، وہ شرک کی بعض مخفی اقسام سے ملوث رہتی ہے، جسے محض انسانی عقلیں توحیدِ خالص سے جدا نہیں کر سکتیں—!

قرآن کریم کی بیان کردہ توحید کی دو قسمیں ہیں۔ توحید الوہیت اور توحید ربوبیت۔ پہلی قسم کا مفہوم یہ ہے کہ

اس امر کو دل سے تسلیم کرنا کہ تخلیقِ عالم، رزقِ کائنات، ان کے زندہ کرنے اور فنا کرنے، اور اپنی حکمت، اپنے منشاء اور اپنے علم کے اقتضاء کے مطابق اس تمام کائنات میں مطلق و مکمل تصرّف کا حق صرف ذات باری تعالیٰ ہی کو حاصل ہے ــــ !

دُوسری قسم کا منشا یہ ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے اور کسی کو واجب و فرض بتانے کے احکام کے قانون بیان کرنے کا حق صرف اسی ذاتِ مطلق کو خلق، امر اور حکم اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو سزاوار ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

قُلْ اَرَاَيْتُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَلَالًا وَّحَرَامًا -
قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ !

اے محمدؐ! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ اللہ نے تم پر جو رزق اُتارا ہے تم نے خود ہی اُسے حلال و حرام بنا لیا۔ اُن سے دریافت کیجئے کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی یا تم از خود اللہ پر بہتان تراشتے ہو!

توحید کی اس قسم میں اس اُمت میں سے بہتوں کے قدم ڈگمگا گئے اور اُن کی عقلیں بھٹک گئیں۔ بس وہ کسی صریح آیتِ قرآنی یا صحیح حدیثِ نبوی سے دلیل حاصل کئے بغیر اپنی طرف سے حلّت و حرمت میں تساہل برتنے لگے۔ ہم نے حدیثِ نبوی کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے اس کی اجازت سے شارع قرار پائے، جیسا کہ خود قرآن نے اس کی صراحت فرمائی ہے:-

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى -

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، بلکہ آپؐ کا ہر ارشاد وحی الٰہی ہوتا ہے جو آپؐ پر الہام کیا جاتا ہے !

ایک دُوسری نوعیت سے توحید کی تین قسمیں ہیں:-

توحیدِ ذات ــــ توحیدِ صفات ــــ توحیدِ افعال۔

پس اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے۔ کوئی مخلوق اس کے مشابہ ہے، نہ اس کے شریک ہے، نہ اس کے مانند ہے، وہ بجائے ایک سے دو ہونے سے بھی ایسا ہی پاک ہے جیسا کہ اپنے مثل و شبیہ اور شریک سے منزہ ہے۔ وہ اپنی ان صفات میں بھی یکتا ہے جو اس نے اپنے لئے بیان فرمائی ہیں۔ اور جو اس کی ذات کی قدامت کے مانند ساتھ ساتھ ازلی و ابدی ہیں۔ اُنھیں ہم بالکل ایسا ہی تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ اُس نے خود وضاحت فرمائی ہے! کیونکہ اُن کی حقیقت اس کے حدِ بیان و وضاحت سے تجاوز نہیں کر سکتی اور وہ حقیقت جو ایک حد میں منحصر کر دی گئی ہو، عقلِ انسانی کی اس میں کمی یا بیشی کے تصرّف کا ہرگز اختیار نہیں!

مثلاً حق تعالیٰ فرماتا ہے:-

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً

اللہ کا رنگ ہے اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے !

اس میں ہمیں قرآن کریم میں وارد ہونے والے جملوں پر ہی حصر کرنا چاہیئے۔ اس میں مزید تصرف کر کے لفظ

"صبغة" (رنگ) سے "صابغ" اسم فاعل (رنگنے والا) بنا کر اللہ پر اپنی طرف سے اس کا اطلاق نہیں کرنا چاہیئے!

نیز حق تعالیٰ اپنے افعال میں منفرد اور یکتا ہے، پس کائنات ارضی و سماوی میں جو عمل بھی ہوتا ہے جس میں سے بعض ہمارے علم میں ہوتے ہیں بعض نہیں، اس کے متعلق ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ ان تمام حاضر و غائب ہونے والے امور میں یکتا و منفرد مطلق ہے اس تصرف و عمل میں اُسے کسی شریک و مددگار کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی!

مذکورہ تیسری قسم ہی وہ قسم ہے جس میں بہت سے مسلمان گمراہ ہوگئے ہیں چنانچہ ہم انھیں اللہ کے ساتھ مخصوص افعال کو غیراللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ مثلاً بارش برسانا، بعض مخلوقات کو رزق کی بعض خاص اقسام پہنچانا۔ بعض مخلوقات پر بعض خاص مصائب و امراض نازل کرنا۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جو کمزور عقیدہ والوں کے دلوں میں شرک کو راہ دیتے ہیں۔ لیکن ان تمام مشتبہ و مشکوک امور سے حق تعالیٰ کو بالکلیہ پاک و منزہ سمجھنے اور کائنات میں ہر ہونے والے امر کو اس کائنات کے صرف مالک حقیقی ہی کی طرف منسوب کرنے سے اللہ کی توحید مکمل، خالص اور پاک صاف ہوسکتی ہے، کہ حق تعالیٰ اس کی طرف انسانوں کی غیر توحیدی نسبتوں سے کہیں بلند و بالاتر اور منزّہ ہے! رہا بندوں کے افعال کا اُن کی ذات سے منسوب کیا جانا، سو یہ نسبت بندوں کے ان اعمال کے مکلف ہونے کی حیثیت سے ہے!

الغرض توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان الوہیت کی خصوصیتوں کو صرف ذات باری تعالیٰ کی ذات کے لئے ثابت اور تنہا اسے ہی ان خصائص سے متصف ماننے پر ایسا ٹھوس اعتقاد رکھے جس کی ایک صحیح نظر اور خالص غیر تقلیدی ایمان تائید کرے! تمام عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکراللہ، دعا، الوہیت کی خصوصیات میں سے ہیں۔ دعا بذات خود ایک مستقل عبادت، یا یوں کہیئے کہ عبادت کا مغز ہے، جیساکہ حدیث شریف میں بیان فرمایا گیا ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ کسی بھلائی کے حصول یا برائی کے دفعیہ کے لئے جو بھی دعا کی جائے وہ صرف خدا ہی سے کی جائے!

یہی خدا کا دروازہ وہ دروازہ ہے جس سے لوگوں میں غیر شعوری طور پر شرک داخل ہوگیا۔ چنانچہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں اللہ کے ساتھ دوسروں سے بھی طالبِ دعا ہوتے تھے، یا اللہ کو ترک کرکے دوسرے نئے معبود کو مانتے تھے، چنانچہ قرآن کریم کی کثیر آیات میں ان ہی پر لعنت ملامت کی گئی ہے، جب اسلام آیا اور قرآن کریم نے بندوں پر خدا کے اس حق کی صراحت کردی کہ وہ صرف اسی ایک ذات کو واحد مانیں، تو اُس وقت سے شرک کی تمام قسمیں فنا ہوگئیں۔ ان ہی میں شرک فی الدعاء بھی شامل ہے۔ اُسی وقت سے ایمان والوں کی عقلوں پر خالص توحید کا غلبہ ہوگیا! چنانچہ وہ کسی مضرت کے دفعیہ یا بھلائی کی طلب کے لئے صرف اپنے ایک خدا ہی سے مدد طلب کرنے لگے، اسی طرح آیت ذیل میں حق تعالیٰ کی بتائی ہوئی تہذیب کے مطابق وہ تمام عبادتوں میں توحید کامل کا احترام ملحوظ رکھنے لگے:۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ
اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ !

اے محمدؐ! آپ اعلان کردیجئے کہ میری نماز، میرا حج، میری زندگی اور میری موت سب کچھ صرف جہانوں کے پروردگار خدائے واحد ہی کے لئے ہے۔ جس کا کوئی دوسرا شریک نہیں، مجھے خدا کی طرف سے اسی عقیدہ کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں!

بعد میں جونہی مسلمان قرآنی ہدایات سے دُور ہوتے چلے گئے اور قرآن و حدیث کے سمجھنے سے دُوری اور اُن پر عمل ترک

کر دینے کی بنا پر گمراہی کے سوتے ان کے عقائد میں خلط ملط ہوتے چلے گئے، اسی دعا کے دروازہ سے ان میں بتدریج شرک بھی داخل ہوتا چلا گیا۔ اور وہ اللہ کے ساتھ اس کی بعض مخلوق کو بھی پکارنے لگے۔ جو اپنی ذات کے نفع نقصان تک پر قادر نہ تھے، چہ جائیکہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے، یا ان سے دفع ضرر کر سکتے!

حالانکہ دعا کی آیات میں پیہم اس کا ذکر ہے کہ دعا خاص اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اس میں اس کی مخلوق میں سے کسی کو بھی اس کا شریک بنانا کسی طرح جائز نہیں ہے، آیات ذیل اس پر روشنی ڈالتی ہے:۔

وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۔

بلاشبہ مسجدیں صرف خدا ہی کو پکارنے کے لئے ہیں، اس لئے ان میں خدا کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ پکارو!

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ ۔

اللہ کو چھوڑ کر جن کو تم پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ!

اللہ کو چھوڑ کر جن دوسروں سے لوگ مانگتے ہیں، بلاشبہ وہ سب مل کر بھی صرف ایک مکھی تک کو پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، اور اگر ان سے کوئی مکھی کوئی چیز لے اڑے تو وہ اس سے اسے چھین بھی نہیں سکتے۔ ایسے طالب دعا اور ان کے مطلوب و معبود دونوں انتہائی کمزور و بے بس ہیں!

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۔ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَاۗءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ...

یہی خدا تمہارا پروردگار ہے، اسی کی تمام حکومت ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسرے معبودوں کو تم پکارتے ہو، وہ کسی ادنیٰ چیز کے بھی مالک نہیں ہیں، اگر تم انہیں پکارتے ہو تو وہ تمہاری پکار تک نہیں سنتے اور بالفرض اگر سن بھی لیں تو جواب نہیں دے سکتے، پھر قیامت کے دن یہی معبودان باطل صاف انکار کر دیں گے کہ ہم ان اپنی پرستش والوں کے شرک سے بری الذمہ ہیں —!

اس باب میں بکثرت آیات قرآنی وارد ہوئی ہیں۔ اور وہ سب یہ بتاتی ہیں کہ دعا خالص عبادت ہے اور جس سے تم نے اپنی مراد مانگی، اسی کی پرستش کی اور مومن صرف اپنے خالق ہی کی پرستش کرتا ہے!

اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ (اصطلاح اسلام میں) دعا صرف اس بھلائی کی طلب کے لئے ہوتی ہے جسے کوئی مختار تع

نہ دے سکتی ہو۔ یا کسی ایسے شر کو دفع کرنے کے لئے ہوتی ہے جسے مخلوق دفع نہ کر سکتی ہو۔ خواہ یہ مخلوق کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کسی مخلوق کو جس قدر بھی زیادہ سے زیادہ جسمانی طاقت، وافر عقل، کثیر مال و جاہ، کثیر لشکر اور مددگار عطا کئے گئے ہوں، پھر بھی یہ مخلوق اپنی بیماری یا موت کو نہیں ٹال سکتی، نہ کسی ایک بچہ تک کو پیدا کر سکتی ہے! تو پھر وہ دوسرے کو کیسے فائدہ پہنچا سکتی ہے!

باقی انسان جو باہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، وہ عالم اسباب تک محدود رہتی ہے، اور وہ خدا کی طرف سے مال یا اقتدار وغیرہ جیسی جن نعمتوں کے خود مالک بن گئے ہوں، صرف اُن میں ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ جیسے کہ دولتمند فقیر کو مال دے دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس مال کا مالک ہوتا اور اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔ رہے عالم اسباب کی گرفت سے باہر جو نعمتیں ہیں، اُن میں صرف خدائے واحد ویکتا ہی تصرف فرما سکتا ہے، دوسرا کوئی نہیں۔

الوہیت کے خصائص میں سے مطلق علم غیب بھی ہے، پس اس غیب مطلق کو صرف خدا ہی جانتا ہے، جیسے جنت دوزخ ہماری نسبت سے غیب ہے اور جیسے فرشتگان و شیاطین کے عالم۔ روح کی حقیقت اور بہت سے وہ حقائق، جن کی طرف آیاتِ قرآنی اور احادیث نے اشارہ کیا ہے اور جو موت کے بعد پیش آنے والے ہیں، سب کے سب غیب مطلق ہیں۔ انسانی عقل ان کی پوری حقیقت یا اُن کے جزو تک بھی نہیں پہنچ سکتی! کیونکہ یہ حقائق اس جنس سے ہی بالا ہیں جن کا عقل ادراک کر سکتی یا انھیں سمجھ سکتی ہے!

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ

خدا ہی عالم غیب ہے، اس کے غیب پر کوئی دُوسرا مطلع نہیں ہو سکتا، بجز اُن خاص رسولوں کے جن سے راضی ہو کر خدا نے اُنھیں کچھ علم عطا فرما دیا ہو!

دُوسری جگہ ارشاد ہے:۔

عالِمِ الغیب والشھادۃ ـــــ خدا ہی مغیبات و موجودات کا جاننے والا ہے!

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

لَا یَعْلَمُ الْغَیْبَ اِلَّا اللہ ـــــ غیب پر بجز خدا کے کوئی دوسرا مطلع نہیں!

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

وَیَعْلَمُ الْغَیْبَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ!

خدا ہی غیب کو جانتا ہے، وہی واقف ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے، کوئی دوسرا متنفس یہ نہیں جانتا کہ وہ خود کل کیا کام کرے گا۔ اور جس جگہ مرے گا!

بیشک بعض قرآنی آیات یہ بتاتی ہیں کہ حق تعالیٰ اپنے بعض رسولوں کو اپنی بلیغ حکمت و مصلحت کے تحت بعض غیبی باتوں کی اطلاع دے دیتا ہے، لیکن بعض ناواقف لوگ جن کی عقلیں نورِ قرآنی سے منوّر نہیں ہو سکیں، یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام غیبی امور پر مطلع تھے، لیکن وہ قرآن جس کی سمجھ سے وہ محروم کر دئے گئے ہیں۔

علی الاعلان ان کی تردید کرتا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ اپنے نبی کریمؐ کو ادب سکھاتے ہوئے یہ تعلیم فرماتا ہے:۔

قُلْ لَا اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ !

اے محمدؐ! صاف صاف کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں خدا جو چاہے صرف وہی ہو سکتا ہے!

وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ۔

اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بکثرت بھلائی ہی بھلائی حاصل کر لیتا، کوئی نقصان رساں بات مجھے پیش ہی نہ آتی، میں تو صرف (خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہوں اور بس!

دوسری جگہ یہ تعلیم دی گئی ہے:۔

قُلْ لَّا اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ، وَلَا اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَا اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَکٌ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔

اے محمدؐ! کہہ دیجئے کہ اے اہل قوم! میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب ہی جانتا ہوں۔ اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، میں تو صرف اپنی طرف نازل ہونے والی وحی کا اتباع کرتا ہوں اور بس!

یہ نادان لوگ جو دین میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کرنے کی مصیبت میں مبتلا ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ان کا یہ بدعتی باطل عقیدہ مقام نبوت کی تکمیل ہے، بھلا کبھی باطل بھی حق کی تکمیل ہوا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَھْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۔

حق کو چھوڑ کر دین میں غلو مت کرو۔ اور اس قوم والوں کی خواہشات کا اتباع۔ کرو جو اس سے قبل گمراہ ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے دوسرے بہتوں کو بھی گمراہ کر دیا اور اس طرح راہ مستقیم سے بھٹک گئے!

درحقیقت مومن کا ایمان اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہوتا، جب تک وہ الوہیت اور نبوت کے مقامات میں امتیاز نہ کرے اور ہر مقام کو کسی کمی بیشی کے بغیر اس کی جائز و مناسب عظمت و جلال کا درجہ نہ دے اور ہر دو مقامات کے درمیان حد فاصل کو متعین کرنے کے لئے جو نصوص شرعی وارد ہیں صرف انہی پر اکتفا کر کے ان سے آگے نہ بڑھے! ذیل کی آیت میں ان ہر دو مقامات کے فرق کو واضح کیا گیا ہے:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔

اے محمدؐ! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میں تم ہی جیسا ایک بشر ہوں صرف میری طرف (خدا کی طرف سے) وحی بھیجی جاتی ہے!

دوسری آیت وہ ہے کہ جب کفار قریش نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عاجز کرنا چاہا اور اپنے ایمان لانے کو اس شرط پر محول کر دیا کہ یہ سفینہ لوگ آپ سے جو غیر طبعی معجزات چاہتے ہیں، آپ وہ انھیں دکھا دیں، تو حق تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا

کہ انھیں درج ذیل جواب دے کر اُن کے اس باطل ارادہ کو ختم کر دیں — !

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔

اے محمدؐ! معجزہ کا مطالبہ کرنے والے ان کفار سے کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار پاک و منزہ ہے اور میں صرف ایک بشر اور خدا کے قاصد کے سوا اور کچھ نہیں — !

الوہیت کی خصوصیات میں سے ایک "قسم" بھی ہے۔ پس اسلام میں شرعی قسم وہ ہے جو حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ عالیہ پر کھائی جائے، کیونکہ حق تعالیٰ نے اسلام میں قسم کو انسانی حقوق کو متعین کرنے والی اور اُن کے باہمی جھگڑوں میں فیصلہ کرنے والی بتایا ہے! اس لئے یہ لازمی ہے کہ قسم صرف خدا ہی کے نام کی ہو، کیونکہ کوئی دو جھگڑنے والے خواہ باہم کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھتے ہوں، بہرحال اللہ پر ایمان رکھنے اور اس کی قابلِ احترام حقیقتوں کی تعظیم میں ہرگز اختلاف نہیں رکھتے، اگر یہی اسلام انھیں اُن کی نظر میں قابلِ عظمت موجودات کی قسم کھانے کو جائز قرار دے دیتا تو یہ بجائے کسی صلح کے مزید جھگڑوں کا باعث بن جاتا۔ کیونکہ وہ کسی ایک باعظمت چیز پر کبھی متفق نہ ہو سکتے! کیونکہ ہر فریق کے نزدیک ایک خدا ہی قابلِ عظمت ہستی ہوتی جسے وہ فریق ثانی کی اختیار کردہ ہستی پر ترجیح دیتا۔ اس طرح یہ فتنہ اور اختلاف دائمی شکل اختیار کر لیتا۔ چنانچہ صحیح حدیث میں اپنے بزرگوں کے نام پر قسم کھانے کی مخالفت آئی ہے!

ارشاد ہوتی ہے:-

مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ كَفَرَ — جس نے اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر قسم کھائی اُس نے کفر کا عمل کیا۔

ایک دوسری صحیح حدیث میں وارد ہے:-

مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ اَوْ لِيَصْمُتْ

اگر کسی کو قسم کھانی ہو تو وہ صرف خدا کے نام کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے!

الوہیت کی خصوصیات میں سے جانوروں کے وہ ذبیحے بھی ہیں، جو بطور عبادت خدا کے لئے ذبح کئے جائیں، جیسا کہ وہ ذبیحے جسے حاجی منیٰ یا مکہ میں تقربِ خداوندی کے لئے ذبح کرتے ہیں۔ یا وہ شرعی نذریں جنھیں مسلمان کسی بیماری کی شفا یابی یا گمشدہ کی واپسی کے لئے مان لیتے ہیں۔ پس یہ سب کی سب صرف خدا کے لئے ہوتی ہیں۔ تاکہ محتاج فقراء اُن سے مستفید ہوں۔ عرب زمانہ جاہلیت میں جانوروں کے خون، مذکورہ اغراض کے تحت اپنے بتوں اور دیوتاؤں کے تقرب کی غرض سے اُن کے نام پر بہاتے تھے! مگر اسلام نے اسے حرام اور شرک قرار دے دیا۔ حق تعالیٰ کے اس ارشاد:-

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۔ — اور وہ جانور جنھیں غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو!

سے یہی مقصود ہے۔ امتدادِ زمانہ سے بت پرستی کی رسمیں پھر لوٹ آئیں۔ اور بعید تاویلات کے غلافوں میں لپٹی ہوئی پھر مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہو گئیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر ذبیحے کرنے لگے اور اسے ان اولیاء کے تقرب کا ذریعہ سمجھنے لگے۔ اور انھیں اس کا علم و احساس تک نہ رہا کہ ان کا یہ ذبیحہ بھی غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبیحہ کی قسم میں داخل ہے۔ اور اگرچہ اسے بسم اللہ کہہ کر ذبح کیا گیا ہو، پھر بھی اس غیر اسلامی نیت کی وجہ سے اس ذبیحہ کا کھانا بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ بسم اللہ کا نمبر اولاً عقیدہ کی درستی کے بعد آتا ہے اور تقرب اتی اور عبادتی ذبیحہ صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے! نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے:-

اِنَّمَا الاعمالُ بالنیّات —— حقیقت یہ ہے کہ اعمال کا دار و مدار قلبی نیتوں پر ہوتا ہے!

ذبیحہ کی یہ قسم خالص اللہ کے لئے نہیں ہے، جیسا کہ ہمیں عوام وجہال کے افعال سے اس کا بخوبی علم ہو چکا ہے، نبی کریم علیہ السلام اپنے رب کی طرف سے فرماتے ہیں:-

انا اغنی الشرکاء عن الشرک —— میں الوہیت کے شرکاء سے بہت بے نیاز ہوں!

مسلمانوں میں یہ بلا اُن کے دین کے حقائق سے ناواقفیت، اور قرآنی ہدایت سے دُوری کی بناء پر داخل ہوگئی۔ حالانکہ اسلام پُورا کا پُورا ایک مذہب ہے، اس کے الگ الگ حصے بخرے نہیں ہوسکتے! پس کامل مسلمان وہی ہے جو بیان کردہ وصف کے مطابق اولاً اللہ کی خالص توحید کو مانتا اور اپنے عقیدے میں ہر گمراہی سے بچتا ہو، پھر مسنون و شرعی طریقہ پر اپنے رب کی عبادت کرتا ہو اور بدعتوں سے محترز رہتا ہو۔ کیونکہ سب بدعات بالکلیہ گمراہی ہیں۔ صحیح حدیث میں وارد ہے:-

وَ کُلُّ محدثۃ بدعۃ وکلّ بدعۃ ضلالۃ

دین میں ہر نئی بات کا اضافہ بدعت کہلاتا ہے اور ہر بدعت عین گمراہی ہے!

پھر عبادات کے بعد اللہ کے دیگر احکام کی خود بھی پابندی کرے اور حتی الوسع سعی کرکے دوسروں سے بھی پابندی کرائے۔ پھر تمام اسلامی صفات سے خود کو آراستہ کرے اور دوسروں کو بھی اس طرف بلائے، اور انھیں اس کے خلاف سے روکے۔ حق گوئی میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا مطلق خیال نہ کرے، پھر اس تمام پروگرام میں بھی شرط یہ ہے کہ اس کے یہ تمام افعال خاص خدا ہی کے لئے ہوں!

اب یہ شخص کامل مسلمان اور قرآن کریم کی صراحت کردہ صفات کا جامع مومن صادق کہلائے گا، جیسا کہ قرآن کریم کی درج ذیل آیات میں مذکور ہے:-

الٓمٓ ۔ ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین ۔ الخ

یہ وہ کتاب ہو جس کی صداقت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ یہی متقیوں کی رہنما ہے۔

لَیسَ البِرَّ اَن تولُّوا وُجوھکم قِبَلَ المشرق والمغرب ولٰکنّ البرمن آمنَ باللّٰہ والیوم الآخر!

بھلائی یہ نہیں ہے کہ تم عبادت میں مشرق و مغرب کی طرف اپنا منہ پھراؤ، بلکہ بھلائی یہ ہے کہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاؤ!

اِنَّمَا المؤمنون الّذین اِذا ذکراللہ وجلت قلوبھم وَاِذا تُلیَتْ علیھم آیاتہ زَادَتھُم ایمانًا!

بیشک مومن وہ ہیں کہ جب (اُن کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل اس کے خوف سے کانپ اٹھیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو اُن کے ایمان میں اضافہ ہو جائے!

وعبادُ الرحمان الّذین یمشون علَی الارض ھونا واِذا خَاطبھم الجاھلون قالوا سَلامًا وَالّذین یبیتون لربھم سُجّدًا وقیامًا ——!

اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور اگر جاہل لوگ کبھی انھیں بُری طرح مخاطب کریں تو وہ جواب میں اُن کے لئے سلامتی کی دعا کرتے ہیں! اور جو خدا کی عبادت میں راتیں گزارتے ہیں۔!

یہ آیتیں ان ایمانی شعبوں پر مشتمل ہیں جن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

الایمان بضع وسبعون شعبة اعلاها لا إلٰه الا الله وادناها اماطة الاذى عن الطريق۔ والحياء شعبة من الايمان۔

ایمان کے ستر سے کچھ اُوپر شعبے ہیں، جن میں سب سے اعلیٰ لا الٰہ الا اللہ ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ سے ہر تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے! اور حیا بھی ایمان کا ایک جزو ہے۔

صحابۂ کرام جو ایمان باللہ اور توحید خالص کے اعتبار سے اُمتِ محمدیہ میں کامل مومن تھے، اپنے خدا کو قرآنی توحید کے مطابق ایک مانتے تھے، یہی حال تابعین اور تبع تابعین کا رہا۔ لیکن جب سے ہم میں یونانی فلسفہ اور اس کے عقلی استدلالات نے دخل پایا، مسلم علماء بھی اس فلسفہ سے متاثر ہو گئے! اور وجود باری تعالیٰ پر فلسفیانہ طریق سے استدلال کرنے لگے، حتیٰ کہ جمہور یہ سمجھنے لگے کہ اللہ کی معرفت کے لئے صحیح طریق استدلال یہی ہے اور جس قدر مسلمان اس فلسفہ میں منہمک ہوتے چلے گئے، اسی قدر قرآن کی بتائی ہوئی توحید سے دُور ہوتے چلے گئے! مسلمانوں میں آج جو عقائد کی کتابیں رائج ہیں اُن میں سے اکثر اسی فلسفہ کے قواعد پر مبنی ہیں۔ اللہ کی اس سادہ فطرت پر مبنی نہیں جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے!

ان کتابوں کے اثر سے توحید ان چند فلسفی اصطلاحات والفاظ کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہے، جو اس مقصد کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور جنہیں تین قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے:۔

۱۔ وہ جن کا انتساب اللہ کی طرف واجب ہے!

۲۔ وہ جن کا انتساب ناممکن ہے!

۳۔ وہ جن کا انتساب جائز ہے!

اس طرح یہ فلسفی توحید صرف لفظی توحید ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن توحید کی وہ روح اور اس کی وہ بلند حقیقت جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے، ایمان اور عملِ صالح کے ثمرات صرف اسی سے مرتب ہوتے ہیں۔

والعصر إِنَّ الانسَانَ لَفِي خسرٍ إِلَّا الَّذِيْنَ آمنوا وعملوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

زمانہ کی قسم ہے کہ بلاشبہ انسان گھاٹے میں ہے بامراد و کامران صرف وہی ہوں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور آپس میں ایک دوسرے کو امرِ حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ میں تکالیف پر صبر کرنے کی تلقین کی۔!

☆

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

توحید

انسان سراپا احتیاج، مجسم صورتِ سوال اور ہمہ تن کاسۂ گدائی ہے! اس کی ضرورتیں بے پایاں اور گویا غیر محدود، اس کے جسمانی اور روحانی مطالبے اور تقاضے حد سے بڑھے ہوئے، اس کی فطرت حریص اور غیر قانع ہے، اس لئے وہ کسی ایسی ہستی کے سہارے نہیں جی سکتا، جس کی طاقت و اختیار، جس کی بخشش و رزاقی، جس کی اطلاع و واقفیت، خواہ وہ کتنی وسیع ہو، لیکن محدود ہے!

انسان اپنی فطرت میں شیشہ سے زیادہ نازک اور حباب سے زیادہ کمزور ہے، وہ اپنے وجود و بقا کے لئے صدہا چیزوں کا محتاج ہے اور اس عالم میں ہزاروں موجودات اس کی زندگی کے دشمن ہیں - اس کی حفاظت وہی کر سکتا ہے جو کائنات پر فرمانروائی کرتا ہو، عناصر پر جس کا قبضہ ہو، اشیاء کے خواص و اثرات اس کی مٹھی میں ہوں - وہ ان کا پیدا کرنے والا بھی ہو - اُن کو نظم و ضبط میں رکھنے والا بھی ہو - اور اُن کو سلب کر لینے، تبدیل کر دینے کی قدرت بھی رکھتا ہو - اُس کے دستِ قدرت میں کبھی رعشہ اور اُس کے پایۂ حکومت میں کبھی لغزش و اضطراب نہ ہو - کہ ایک خفیف ارتعاش اور ایک ادنیٰ لغزش و اضطراب آفاق و انفس کی اس کارگہ شیشہ گری کو برباد اور اضداد و متناقضات کے اس کارخانہ کو ٹکرا کر درہم برہم کر سکتا ہے! اس کا علم حاضر اور محیط ہو - وہ ہمہ وقت ہوشیار و بیدار ہو - سہو و نسیان، غفلت اور نیند کا خمار کبھی کبھی اس کے پاس نہ آ سکے! کہ مخلوقات بے شمار اور اُن کی ضرورتیں بے حد و حساب اور ایسی مخفی ہیں کہ اُن کو خود خبر نہیں، وہ طفلِ شیرخوار سے زیادہ پرورش و نگرانی کا محتاج اور محبت و شفقت کا مستحق ہے! اس کو ایسی ہی ہستی کی ضرورت ہے جو ماں باپ سے زیادہ شفیق ہو - لیکن اُس کی شفقت میں رحمت و حکمت دونوں ہوں کہ اس کی تربیت کے لئے دونوں ناگزیر ہیں — !

اگرچہ اس عالم خارجی و داخلی (آفاق و انفس) میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہستی سوائے اللہ کے کوئی نہیں، اور آفاق و انفس کی بکثرت نشانیاں اور دلائل اس حقیقت کی طرف رہبری کرتے ہیں - جیسا کہ خود فرمایا: —

سنریھم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق ط اولم یکف بربک انہ علیٰ کل شیئ شھید (حم السجدہ ع ۶)

ہم اُن کو اپنے نمونے دکھائیں گے دُنیا میں اور خود اُن کی جانوں میں یہاں تک کہ اُن پر یہ حقیقت کھل جائے کہ وہ حق ہے - کیا تمہارا رب ہر چیز پر گواہ ہونے کے لئے کافی نہیں -

اس لئے عبادت و بندگی کی مستحق اُسی کی ذات ہے!

لیکن اس عالم میں موہوم نفع وضرر کا چشمۂ سراب اس طرح متموّج ہے کہ انسان کی نظر بار بار دھوکا کھاتی ہے! اور اپنی جیسی صدہا مجبور و بے اختیار ہستیوں کو نافع وضار اور قادر و مختار سمجھ کر اپنا الٰہ و معبود بنا لیتا ہے اور یہ طلسم بعض اوقات زندگی بھر نہیں ٹوٹتا — !

اس لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ اُن کی اپنی ذات وصفات کا سب سے بڑا اور یقینی علم بخشا۔ اور اس عالم کی حقیقت اُن پر اس طرح منکشف کی کہ اُن کو اس کے متعلق کبھی دھوکا نہیں ہوسکتا۔

وکذٰلک نُرِیْٓ ابراھیم ملکوت السمٰوات والارض ولیکون من الموقنین۔ (الانعام-۹)

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا جلوہ دکھلاتے ہیں اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوجائیں!

ان انبیاء علیہم السلام کو ہمیشہ ایک ہی پیغام دے کر بھیجا گیا:۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحیٓ الیه انه لا الٰه الا انا فاعبدون۔ (الانبیاء-۲)

اور ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے کوئی رسول مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ بات یوں ہے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے میرے سو میری بندگی کرو۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اس طلسم نظر کو توڑنے کے لئے (جس میں ہر زمانہ کے کوتاہ نظر گرفتار ہوجاتے ہیں) دو طریقے اختیار کئے:۔

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بار بار بیان کیا کہ شرک وجہل کے زہر کے لئے اس سے بڑھ کر تریاق نہیں۔ شرک، جہل، خدا سے بیگانگی اور غیر اللہ کی گرفتاری ومشغولی کا اصل سبب، خدا شناسی، اس کی صفات وافعال سے بے خبری، یا غفلت ہے، اسی لئے فرمایا:۔

وَمَا قدروا اللہ حق قدرہ والارض جمیعا قبضته یوم القیٰمة والسمٰوات مطویٰتٌ بیمینه سبحٰنه وتعالیٰ عما یشرکون۔ (الزمر-۷)

اور وہ نہیں سمجھے اللہ کو جتنا کچھ وہ ہے اور زمین ساری مٹھی میں ہے اس کی قیامت کے دن اور آسمان لپیٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں، وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے کہ اُس کا شریک بتلاتے ہیں!

(۲) اللہ کے سوا تمام ہستیوں اور مخلوقات کی اصل حقیقت اور اُن کی صحیح حیثیت بیان کردی تاکہ نگاہ سے پردہ ہٹ جائے اور روشنی میں دیکھ لیا جائے کہ وہ در اصل کیا ہیں اور کسی کے لئے اور خود اپنے لئے وہ کس حد تک مفید و کارآمد ہوسکتے ہیں اور اُن کے ساتھ عبودیت وبندگی کا معاملہ، اُن سے نفع وضرر وکارسازی کی توقع، اُن کی حمایت وسرپرستی پر بھروسہ، اُن کے علم وآگاہی پر اعتماد اور اُن کے سہارے جینا کہاں تک درست اور قرین عقل ہے؟

اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کے سلسلہ میں ان حضرات نے بڑی اصولی اور انقلاب انگیز باتیں کہیں جن سے زندگی کا رُخ اور ذہن وقلب کی سمت بدل جاتی ہے۔ مثلاً وہ صمد ہے، یعنی تمام کائنات اور عالم کا ہر ذرّہ اپنے وجود ومتعلقات وجود میں اس کا محتاج ہے اور وہ قطعاً کسی چیز میں کسی کا محتاج نہیں۔ خلق وپیدائش کے سواد دُنیا کا یہ پورا کارخانہ ہی وہی تنہا

چلا رہا ہے اور آسمان سے لے کر زمین تک اُسی کی حکومت اور اسی کا انتظام ہے - الا له الخلق والامر (اعراف) سُن لو اُسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا کام ہے پیدا فرمانا - یدبر الامر من السماء الی الارض (الم السجدہ ع ۱) کام کا انتظام کرتا ہے آسمان سے زمین تک - اور اس سلطنت میں اس کا کوئی معاون و شریک نہیں - وقل الحمد لله الذی لم یتخذ ولدا ولم یکن له شریک فی الملک ولم یکن له ولی من الذل وکبره تکبیرا (الاسراء - ۱۲) کہو سب تعریفیں اللہ کو جو نہیں رکھتا اولاد اور نہ اس کا کوئی ساجھی ہے سلطنت میں اور نہ کوئی مددگار ذلت کے وقت پر اور اس کی بڑائی کرو بڑا جان کر) وما لهم فیهما من شرک وما له منهم من ظهیر (السبا ع ۳) اور نہ (مشرکین کے معبودوں کا) آسمانوں اور زمین میں کچھ ساجھا ہے اور نہ ان میں سے (اللہ کا) کوئی مددگار ہے - صرف اسی کی سلطنت لامحدود، قدرت غیر متناہی، دریائے کرم بے پایاں اور خزانے غیر مختتم ہیں - ولله خزائن السموات والارض (المنافقون ع ۱) اور اللہ کے ہیں خزانے آسمانوں اور زمین کے - یداه مبسوطتان ینفق کیف یشاءُ (المائدہ) اس کے دست کرم دراز ہیں خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے - یرزق من یشاءُ بغیر حساب (جس کو چاہتا ہے بغیر حساب دیتا ہے) اس لئے حریص انسان کی جھولی وہی بھر سکتا ہے اور اس کی تشفی وہی فرما سکتا ہے صرف اسی کو ظاہر و پوشیدہ اور راز دلی کا علم ہے اور صرف اسی کی ذات ہمہ دان و ہمہ بین ہے، عالم الغیب والشہادہ (پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے) یَعلَمُ خَائِنَةَ الاَعیُنِ وَمَا تُخفِی الصدور (وہ آنکھوں کی چوری اور سینوں کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے) اس لئے صرف اس کے علم و آگاہی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور دل کی مخفی خواہشوں اور زندگی کی غیر محسوس ضرورتوں کو وہی جان سکتا ہے اور وہی پورا کر سکتا ہے! وہی انسان کی حفاظت فرماتا ہے اور اس کے پہرہ دار انسان کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں ـــ!

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ من بَینِ یدیه ومن خلفه یحفظونه من امر الله (الرعد - ۲) اس کے پہرے والے ہیں، بندے کے آگے اور پیچھے اس کی نگہبانی کرتے ہیں اللہ کے حکم سے - پھر وہ نزدیکوں سے زیادہ نزدیک اور یگانوں سے زیادہ یگانہ ہے - وہ انسان سے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے - اور مرنے والے سے اس کے تیمارداروں سے زیادہ نزدیک ہے ـــ! نحن اقربُ الیه من حبل الورید (ق - ۲) ونحن اقرب الیه منکم ولکن لَا تبصرون (الواقعہ ۳) وہ ہر شخص کی دعا و التجا کو ہر وقت اور ہر جگہ سنتا ہے، اس کے اور بندے کے درمیان کوئی دیوار اور آڑ نہیں، نہ اس کے یہاں اظہار مدعا کے لئے کسی ذریعہ اور سفارش کی ضرورت - واذا سالک عبادی عنی فانی قریب - اُجیب دعوة الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلهم یرشدون (البقرہ ۲۳) اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں، قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا جب مجھ سے دعا مانگے تو چاہیئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لاویں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آویں - پھر اس کی محبت و شفقت حد سے بڑھی ہوئی، ماں باپ کی محبت محض اس کی ربوبیت اور رحمت کا ایک کرشمہ اور ایک ادنیٰ نمونہ ہے !

پھر وہ ہمیشہ زندہ اور بیدار ہے، کیونکہ وہ زمین اور آسمان کو سنبھالے ہوئے اور اُن کے زمام انتظام و ضبط و نظام کو ہاتھ میں لئے ہوئے ہے، اس لئے کسی وقت اس کے یہاں غفلت و نسیان نہیں -

الله لا اله الا هو الحی القیوم لا تاخذه سِنَةٌ ولا نوم

اس کے مقابلہ میں انہوں نے اللہ کی تمام مخلوقات کے لئے وہ تمام اوصاف ثابت کئے جو ان صفات الٰہیہ کے

مقابل و مند واقع ہوئے ہیں اور جن کا مجموعہ بندگی و بیچارگی اور ضعف و عجز ہے :-

لہٗ دعوۃ الحق ط والذین یدعون من دونہ لا یستجیبون لھم بشیءٍ الا کباسط کفیہ الی الماء لیبلغ فاہ وما ھو ببالغہ ط وما دعاء الکفرین الا فی ضلل۔ (الرعد۔۲)

اسی کا پکارنا سچ ہے اور جن لوگوں کو کہ پکارتے ہیں اس کے سوا وہ نہیں کام آتے اُن کے کچھ بھی مگر جیسے کسی نے پھیلائے دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آ پہنچے اُس کے مُنہ تک اور وہ کبھی نہ پہنچے گا اُس تک اور جتنی پکار ہے کافروں کی سب گمراہی ہے !

یا ایھا الناس ضرب مثل فاستمعوا لہٗ ط ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذباباً ولو اجتمعوا لہٗ ط وان یسلبھم الذباب شیئاً لا یستنقذوہ منہ ط ضعف الطالب والمطلوب۔ ما قدروا اللہ حق قدرہ ط ان اللہ لقوی عزیز۔ (الحج۔۱۰)

اے لوگو ایک مثل کہی گئی ہے سو اس پر کان رکھو، جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے، ہرگز نہ بنا سکیں گے ایک مکھی اگرچہ سارے جمع ہو جاویں اور اگر کچھ چھین لے اُن سے مکھی، چھڑا نہیں سکتے وہ اس سے بودا ہے چاہنے والا اور جن کو چاہتا ہے۔ اللہ کی قدر نہیں سمجھے جیسی ان کی قدر ہے بیشک اللہ زور آور ہے زبردست !

مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت۔ اتخذت بیتاً ط وان اوھن البیوت لبیت لو کانوا یعلمون۔ (العنکبوت۔۴)

مثال ان لوگوں کی جنہوں نے پکڑے اللہ کو چھوڑ کر اور حمایتی جیسے مکڑی کی مثال بنا لیا اُس نے ایک گھر اور سب گھروں میں بودا سو مکڑی کا گھر اگر ان کو سمجھ ہوتی !

ذٰلکم اللہ ربکم لہ الملک والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیر ط ان تدعوھم لا یسمعوا دعاءکم، ولو سمعوا ما استجابوا لکم ط ویوم القیمۃ یکفرون بشرککم ط ولا ینبئک مثل خبیر ط یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ ج واللہ الغنی الحمید۔ (فاطر۔۲،۳)

یہ اللہ ہے تمہارا رب، اسی کے لئے بادشاہی ہے اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے بھی مالک نہیں اگر تم اُن کو پکارو تو وہ تمہاری پکار نہ سُنیں اور اگر سُنیں تو تمہارے کام کو نہ پہنچ سکیں اور قیامت کے دن تمہارے شریک ٹھہرانے سے منکر ہوں گے۔ اے لوگو! تم ہو محتاج اللہ کی طرف اور اللہ بے پروا ہے سب تعریفوں والا!

واتخذوا من دونہ آلھۃ لا یخلقون شیئاً وھم یخلقون ولا یملکون لانفسھم ضراً ولا نفعاً ولا یملکون موتاً ولا حیوۃ ولا نشوراً۔ (الفرقان۔۱)

مشرکین نے اللہ کے سوائے ایسے معبود ٹھہرائے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے اور خود مخلوق ہیں اور جو اپنے ہی لئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور جن کو موت و زندگی اور دوبارہ

قرآن مجید اس مضمون کی آیات سے لبریز ہے۔ اس کے برخلاف کہیں ان بندگانِ خدا کی قدرت و طاقت اُن کے اختیارات و تصرفات، اُن کی طاقت یا نفع و ضرر کا ذکر نہیں۔ جس سے قرآن مجید کا رجحان صاف سمجھ میں آتا ہے۔!

جہاں تک اللہ کے آسمان و زمین اور بڑی بڑی اشیاء کے خالق و مالک اور پروردگار ہونے، بڑے بڑے واقعات کا ظہور میں لانے، عالم کا فرمانروائے مطلق اور بادشاہِ حقیقی ہونے کا تعلق ہے مشرکین عرب اور دنیا کے عام مشرکین کو اس سے قطعی انکار اور اس بارہ میں کبھی کوئی شبہ نہ تھا۔ جیساکہ قرآن مجید نے بار بار تصریح کی ہے۔ مشرکین عرب کو اللہ کی بہت سی صفات و افعال خلق و صنعت، قدرت و اختیار، علم و ارادہ، غلبہ و تسخیر، عظمت و کبریائی، طاقت و جبروت، اور رحمت و رافت کا اعتراف و اعتقاد تھا۔ قرآن مجید میں جا بجا اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ اس موقع پر سورۂ مومنون کی مندرجہ ذیل آیات کافی ہوں گی:-

قل لمن الارض ومن فیہا ان کنتم تعلمون۔ سیقولون للہ ط قل افلا تذکرون ○ قل من رب السمٰوٰت السبع ورب العرش العظیم۔ سیقولون للہ ط قل افلا تتقون ○ قل من بیدہٖ ملکوت کل شیئٍ وھو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم تعلمون۔ سیقولون للہ۔ قل فانّٰی تسحرون۔ (المومنون۔ ۵)

کہو کس کی ہے زمین اور جو اس میں ہے، بتاؤ اگر تم جانتے ہو، کہیں گے سب کچھ اللہ کا ہے، کہو پھر تم سوچتے نہیں، کہو کون ہے مالک ساتوں آسمانوں کا اور مالک اس بڑے تخت کا۔ بتائیں گے اللہ کو، کہو پھر تم ڈرتے نہیں، کہو کس کے ہاتھ میں ہے حکومت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور اس سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ بتائیں گے اللہ کو، کہو پھر کہاں سے تم پر جادو آ پڑتا ہے!

یہ مشرکین نہ صرف نظری و عملی طور پر اللہ تعالیٰ کے ان صفات کے قائل تھے، بلکہ عملاً اپنے ایمان کا ثبوت بھی دیتے تھے۔ مصیبت کے وقت اللہ ہی کو پکارتے تھے اور دعا کرتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کی دعا و تضرع کا کئی جگہ ذکر کیا ہے! لیکن اس سب کے باوجود وہ مستند و معیاری مشرک تھے۔ اُن سے جہاد کیا گیا اور کہا گیا:-

وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہٗ للہ!

اس شرک کی حقیقت کیا تھی، اس کا آغاز کس طرح ہوا۔ اور اس کی انتہا کیا ہے؟ اس کی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زبان سے سنئے۔ الفوز الکبیر میں فرماتے ہیں:-

عقیدۂ اثبات خدا تعالیٰ و آنکہ خدا خالق آسمان و زمین است و مدبّر حوادث عظام است و قادر بر ارسال رسل و مجازی عباد بر اعمال ایشاں و مقدر حوادث عظام است و قادر قبل از وقوع آں و آنکہ فرشتگان بندگان مقرب خدا اند و مستحق التعظیم اند نیز درمیان ایشاں ثابت بود و اشعار ایشاں دلالت میکنند، اما جمہور مشرکین دریں عقائد شبہات بسیار ناشی از استبعاد آں امور و عدم الفت

خدا تعالیٰ کے اثبات کا عقیدہ اور یہ کہ خدا آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے، بڑے بڑے حوادث کا منتظم و مدبّر ہے۔ پیغمبروں کے بھیجنے پر قادر اور بندوں کو اُن کے اعمال پر جزا و سزا دینے والا، بڑے بڑے واقعات و حوادث کا اندازہ دان اور اُن کا مقرر کرنے والا اور اُن کے وقوع سے پہلے بھی قدرت رکھنے والا ہے! اور یہ کہ فرشتے خدا کے مقرب بندے ہیں اور تعظیم کے مستحق ہیں یہ سب اُن کے یہاں (مشرکین عرب

بادراک آں بہم رسانیدہ بودند و گمراہی ایشاں شرک بود و تشبیہ و تحریف و انکار معاد و استبعاد در رسالت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و فاش بودن اعمال قبیحہ و مظالم درمیان یکدیگر و ابتداع رسوم فاسدہ و مندرس ساختن عبادات۔

شرک آن است کہ غیر خدا را صفات مختصۂ خدا اثبات نمائند مثل تصرف در عالم بارادہ کہ تعبیر ازاں بکن فیکون میشود۔ یا علم ذاتی از غیر اکتساب بحواس و دلیل عقلی و منام و الہام و مانند آں یا بیجاد آں کراہت تنگدست یا بیمار و شقی گردد۔ و رحمت فرستاں بر شخصے تا بسبب آں رحمت فراخ معیشت و صحیح بدن و سعید باشد و ایں مشرکان در خلق جواہر و تدبیر امور عظام ہیچ یک را شریک نمی دانستند و چوں خدائے تعالی بر کارے ابرام فرمائد۔ ہیچ یک را قدرت ممانعت اثبات نمی کردند، بلکہ اشراک ایشاں در امور خاصہ بہ بعضے بندگان بود گمان می کردند کہ مانند آنکہ بادشاہ عظیم القدر بندگان خاص خود را باطراف ممالک می فرستد و ایشاں را در امور جزئیہ تا وقتے کہ حکم صریح بادشاہ صادر نشدہ است مختار و متصرف میدارد، و خود بتدبیر امور جزئیہ بندگان نمی پردازد و حوالہ سائر بندگان بقہرمان میکند و شفاعت قہرمان در باب خادمان و متوسلان ایشاں قبول می نمائید ہمچنیں ملک علی الاطلاق جد مجدہ بعضے بندگان خود را خلعت الوہیت دادہ است و رضا و سخط ایشاں در سائر بندگان اثر می کند، پس واجب می دانستند تقرب بآں بندگان خاص تا شائستگی قبول ملک مطلق حاصل شود و شفاعت برائے ایشاں در مجازی امور درجۂ پذیرائی یابد و بملاحظہ ایں امور سجدہ بسوئے ایشاں و ذبح برائے ایشاں و حلف بنام ایشاں و استعانت امور ضروریہ بقدر کن فیکون ایشاں تجویز می نمودند و صورت ہا از سنگ و صفر و روئیں مثل آں تراشیدہ قبلہ توجہ بآں ارواح ساختند و جاہلاں رفتہ رفتہ آں سنگہا را بذاتہ خود معبود انگاشتند و خلط عظیم راہ یافت ۔۔۔!

کے یہاں، ثابت و مسلّم تھا اور اُن کے اشعار اس پر دلالت کرتے ہیں لیکن جمہور مشرکین کے ان عقائد میں کثرت سے شبہات پیدا ہو گئے تھے، جو اُن امور کو مستبعد سمجھتے اور اُن کے مفہوم سے بیگانہ ہو جانے کے سبب سے تھے، اُن کی گمراہی شرک تھی اور تشبیہ اور تحریف اور قیامت کا انکار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مستبعد سمجھنا۔ اعمال بد اور مظالم کا آپس میں رواج، بُری رسوم و عادات کی ایجاد اور عبادات کی تخریب!

شرک یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے ان صفات کو ثابت کیا جائے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً عالم میں اپنے ارادہ سے تصرف کرنا جس کو کن فیکون سے ادا کیا جاتا ہے، یا علم ذاتی جس میں حواس کے ذریعہ سے یا دلیل عقلی اور خواب والہام وغیرہ کے ذریعہ حصول علم کو دخل نہیں یا کسی بیمار کی شفا کو وجود میں لے آنا یا کسی شخص پر اس طرح لعنت کرنا اور اس سے ناخوش ہونا کہ اس نفرت و ناراضی کی وجہ سے وہ تنگدست یا بیمار بدنصیب ہو جائے اور کسی شخص پر اس طرح رحمت بھیجنا کہ اس رحمت کے سبب سے وہ خوشحال تندرست اور خوش قسمت ہو جائے اور یہ مشرکین جواہر و اجسام کی خلقت میں اور بڑے بڑے امور کی تدبیر و انتظام میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں جانتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ جب خدا کسی کام کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو کسی کو روکنے اور منع کرنے کی قدرت نہیں، اُن کا شرک جو کچھ تھا وہ بعض بندوں کے خصوصی معاملات میں تھا۔ ان کا گمان تھا کہ جس طرح ایک بڑا شان و شوکت کا بادشاہ اپنے مخصوص غلاموں اور تابعداروں کو مختلف اطراف ممالک میں بھیجتا ہے اور اُن کے جزئی معاملات میں جب تک کہ بادشاہ کا فرمان صریح صادر نہ ہو مختار اور تصرف کا مجاز قرار دیتا ہے۔ اپنے غلاموں کے چھوٹے چھوٹے معاملات کا انتظام و انصرام خود نہیں کرتا اور اپنے تمام غلاموں کو اس مختار کے حوالے کر دیتا ہے اور اپنے اس مختار کی

سفارش اُن کے خادموں اور متوسلین کے بارے میں قبول کرتا ہے، اسی طرح بادشاہ جل مجدہٗ نے اپنے بعض بندوں کو خلعت الوہیت سے سرفراز فرمایا ہے، اُن کی رضامندی و ناراضی باقی بندگانِ خدا کے حق میں اثر کرتی ہے، پس انہوں نے اس بنا پر ضروری سمجھا کہ اوّل ان بندگانِ خاص سے قرب حاصل کیا جائے تاکہ بادشاہ مطلق کی قبولیت کی لیاقت پیدا ہو اور ان کی سفارش ان معمولی بندوں کے کاروبار میں درجۂ قبولیت حاصل کرے، ان باتوں کا لحاظ کرکے انہوں نے ان بندگان خاص کے سامنے سجدہ کرنا، اُن کے لئے جانوروں کا ذبح کرنا، اُن کے نام کی قسم کھانا اور ضروری کاموں میں اُن کی قدرت کن فیکون سے مدد چاہنا جائز قرار دیا۔ اور پتھر پیتل اور لوہے کی مورتیں تراش کر اُن کو ان ارواح کی طرف کا قبلہ بنایا جاہلوں نے رفتہ رفتہ ان بُتوں کو بذات خود معبود سمجھ لیا اور بڑی گڑبڑ پیدا ہو گئی!

انبیاء علیہم السلام اور اُن کے جانشینوں کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اللہ سے بندوں کا قوی ترین اور قریب ترین تعلق اور وابستگی پیدا کریں:۔

وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنیفاء -

اُن کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کرکے اس کے واسطے بندگی سب سے کٹ کر اور یکسو ہو کر ابراہیم حنیف کی راہ پر -

" اللہ اور اللہ کے بندوں کے درمیان کوئی حجاب اور روک نہ رہے، الفت و اُنس، محبت وعشق، محویت وشغل، قصد و عمل، سعی و جہد، رجوع و انابت، اطاعت و عبادت، التجا و تضرع، سرگوشی و مناجات، خوف وطمع، غرض قلب و دماغ سب کا قبلہ اُسی کی ذات ہو۔ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے تابعین برحق کی تمام مساعی کا مرکز اور سب سے بڑا مقصد یہی ہوتا ہے۔ اسی کے لئے ان کا جہاد ہے، ان کی ہجرت ہے، ان کی تبلیغ ہے، اور اسی راہ میں اُن کی زندگی اور موت ہے!

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین - (انعام - ۳)

بیشک میری نماز اور حج وقربانی اور میری زندگی وموت سب اللہ کے لئے ہے جو سارے عالموں کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھ کو حکم ہے اور میں سب سے پہلے حکم بردار ہوں!

اور اس مقصد میں باذن اللہ تعالیٰ وہ اپنے حلقہ اور متبعین کی جماعت میں پُورے طور پر کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ دلوں اور دماغوں کو غیر اللہ کی مشغولیت اور گرفتاری سے اور جسموں کو غیر اللہ کی حکومت و قانون سے آزاد کردیتے ہیں۔ لیکن جاہلی اثرات وقتاً فوقتاً اس کے خلاف بغاوت کرتے رہتے ہیں اور شرک، انسانوں میں دب دب کر اُبھرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ خود اُن کے نام لینے والوں اور اُن کی اُمت اور متبعین کہلانے والوں کا حال وہ ہو جاتا ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے:۔

وَمَا یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون (یوسف - ۱۲)

بہت لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر یہ کہ ساتھ ہی ساتھ مشرک بھی کئے جاتے ہیں -!

رفتہ رفتہ اللہ سے بےتعلقی اور غیر اللہ سے تعلق اتنا بڑھ جاتا ہے کہ عملاً کیفیت وہ ہو جاتی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے:-

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ۔ (البقرہ- ۲)

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بنا لیتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو اُن سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ سے ــــ!

غیر اللہ سے دلچسپی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ:-

واذا ذکر اللہ وحدہٗ اشمأزت قلوب الذین لایؤمنون بالآخرۃ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون۔

جب نام لیجئے اللہ کا رُک جاتے ہیں اُن کے دل جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب نام لیجئے اس کے سوا اوروں کا تو وہ کھل جاتے ہیں اور بہت مسرور ہوتے ہیں!

پھر اس عقیدہ کے ماتحت غیر اللہ کے نام پر وہ تمام اعمال کئے جاتے ہیں جو اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً ذبح، نذر، سجود، دعا وغیرہ اور رفتہ رفتہ زندگی کا رشتہ اللہ سے ٹوٹ کر غیر اللہ سے بندھ جاتا ہے۔ قلب کی جہت بدل جاتی ہے، انبیاء کی بعثت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اسلام پر جاہلیت غالب آجاتی ہے!

ہر زمانہ کے مجددین و مصلحین اور علماء حق نے اس صورتِ حال کے خلاف جہاد کیا۔ ہندوستان میں جہاں اسلام کی بنیاد مختلف تاریخی اسباب کی بنا پر ہمیشہ سے کمزور رہی ہے اور جو دنیا کے چند بڑے مشرکانہ مذاہب و اقوام کا مرکز و وطن ہے۔ اسلام کا چشمۂ صافی زیادہ مکدّر ہونے لگا تھا۔ اور اندیشہ تھا کہ یہ چشمۂ حیواں اس تہ ظلمات میں اس طرح گم ہو جائے کہ کسی خضر طریق کو بھی اس کا نشان نہ ملے۔

الف ثانی مجددؒ نے جب اپنا سفر تجدید شروع کیا تو انبیاء کے کام نبوت کی عین ترتیب کے مطابق پہلا قدم یہیں سے اُٹھایا، جہانگیر کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار آپ کی تاریخ تجدید کا روشن عنوان ہے۔ اپنے مکاتیب میں نہایت واضح اور جامع چھوٹے الفاظ میں توحید کی تشریح فرمائی، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اس کے تنہا مستحق عبادت ہونے کے دلائل بیان کئے جو آپ کے رسوخ فی العلم کا نمونہ ہیں۔ شرک کے مراسم و مظاہر کی تردید فرمائی۔ رسومِ جاہلیت، اعمالِ مشرکانہ، تقلیدِ کفار سے اپنے متبعین و معتقدین کو سختی سے منع فرمایا کہ تجدید کا کام [illegible] کے بغیر شروع ہی نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ مکمل ہو!

بالخصوص طریقت کا حاصل و مقصود اور تصوف کا خلاصہ و مطلوب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ سے ایسا تعلق وارتباط پیدا ہو جس میں کبھی کوئی فرق ہی نہ ہو۔ ایسی حضوری جس میں کبھی غیبت اور ایسی یکسوئی جس میں کوئی کشمکش نہ ہو، یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آفاق و انفس کی تمام اشیاء کے متعلق نفع و ضرر، قدرت و اختیار کا خیال زائل نہ ہو جائے، اور قلب و دماغ ان کی محبت و عظمت اور اُن سے خوف و طمع رکھنے سے کامل طور پر آزاد نہ ہو جائیں۔ اور وہ کسی معنی میں بھی مقصود و مطلوب، مرغوب و مرہوب، اور معظم و محبوب اور بالاختصار الٰہ و معبود نہ رہیں۔ یہی مقام اخلاص ہے جس کی طرف انبیاء علیہم السلام اور اُن کے جانشین رہنمائی فرماتے ہیں۔ مجدد صاحب

رحمتہ اللہ علیہ نے مکتوبات میں جا بجا اس کی دعوت دی ہے اور اس کی وضاحت فرمائی ہے:۔

مخدوما بعد از طے منازل سلوک وقطع مقامات جذبہ معلوم شد کہ مقصود ازیں سیر وسلوک تحصیل مقام اخلاص است کہ مربوط بفنائے آلہہ آفاقی والنفسی است۔
(مکتوبات نمبر ۳۲ بنام شیخ محمد خیری)

مخدوم من! سلوک کی منزلوں کے طے کرنے اور جذبہ کے مقامات کو قطع کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس سیر وسلوک کا مقصود مقام اخلاص کا حاصل کرنا ہے جو وابستہ ہے آفاقی وانفسی معبودوں کے فنا کے ساتھ!

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"اس امراض باطنیہ ورئیس علل معنویہ گرفتاری قلب است بما دون حق سبحانہ وتعالیٰ، وتا ازیں گرفتاری بتمام آزادی میسر نشود سلامتی محال است چہ شرکت را در آں حضرت جلّ سلطانہ بارنیست اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِص۔ کیف کہ شریک را غالب ساختہ باشد، بہایت بے حیائی است محبت غیر حق را سبحانہ، بر نہجے غالب ساختن کہ محبت او تعالیٰ در جنب آں معدوم گردد یا مغلوب "الحیاء شعبۃ من الایمان"۔۔۔۔

باطنی بیماریوں کی جڑ اور معنوی امراض کی اصل قلب ماسوی اللہ کے ساتھ گرفتاری اور مشغولی ہے جب تک اس گرفتاری سے مکمل طور پر آزادی میسر نہ آئے سلامتی محال ہے۔ کیونکہ اللہ جل سلطانہ کی بارگاہ اور حضور میں کسی کی شرکت کی کسی طرح گنجائش نہیں۔ قرآن کی آیت ہے۔ یاد رکھو خالص پرستش واطاعت اللہ ہی کا حق ہے، چہ جائیکہ شریک کو غالب بنالیں بڑی بے حیائی ہے کہ غیر اللہ کی محبت کو اس درجہ غالب بنا لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے پہلو میں معدوم یا مغلوب ہو جائے!

غرض جس کا دل توحید سے آشنا ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر بھروسہ کرے گا۔ مصیبت میں اسی کو پکارے گا اور آسودگی وخوشحالی میں اُسی کا شکر بھیجے گا۔ اور نیاز وتذلل اور عبدیت وسرفگندگی کا تعلق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے نہ رکھے گا!

اے الٰہ من والٰہ ہمہ
اے پناہِ من وپناہِ ہمہ
(خسروؒ)

☆

مولانا امین احسن اصلاحی

عقیدۂ توحید کا اثر ہماری عملی زندگی پر

عقیدۂ توحید صرف ایک نظریاتی حقیقت ہی نہیں ہے بلکہ یہ نظریاتی سے زیادہ ایک عملی حقیقت بھی ہے۔ اسلام میں صرف خدا کو مان لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُن صفات کے ساتھ اُس کو ماننا ضروری ہے جو صفات اُس نے خود اپنی گنائی ہیں۔ علاوہ بریں ان صفات کو صرف مان لینا ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ ان صفات سے بندوں پر خدا کے جو حقوق قائم ہوتے ہیں اُن کو تسلیم کرنا اور ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر معاملہ صرف ذات و صفات کے مان لینے ہی تک محدود رہے تب تو عملی زندگی اس سے بہت کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتی، اس سے اگر کوئی عملی گرماگرمی پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ مناظرہ و مجادلہ کی مجلسوں سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن جہاں سے خدا کے حقوق اور عملاً اُن کو ادا کرنے کا سوال سامنے آتا ہے وہاں سے یہ مسئلہ براہِ راست ہماری عملی زندگی سے متعلق ہو جاتا ہے اور پھر اس سے جو مسائل اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ صرف انسان کی انفرادی زندگی ہی میں نہیں بلکہ اس کی اجتماعی زندگی میں بھی ایک ہلچل سی برپا کر دیتے ہیں — !

اسلام کے عقائد میں سے کوئی عقیدہ بھی ایسا نہیں ہے جو صرف اقرار کر لئے جانے کے لئے ہو، بلکہ اس سے اصلی مقصود وہ اثر ہے جو اس کے اقرار سے انسان کے سیرت و کردار اور اس کے اعمال و اخلاق پر پڑنا چاہیئے، اگر یہ اثر نہ پڑے تو یہ چیز دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو آدمی کو اپنے اُس عقیدہ کا پُورا پُورا شعور نہیں ہے، اس لئے جو بات مانی ہے اس کے مضمرات اور اس کے لازمی مطالبات سے وہ بالکل ہی بے خبر ہے، یا شعور تو ہے لیکن نفاق اور بزدلی کے سبب سے وہ اس کے مضمرات سے انجان ہی بنا رہنا چاہتا ہے!

ایک آدمی کے اندر عقیدہ توحید کا اگر شعور ہو تو اس کی زندگی پر چند اثرات پڑنے لازمی ہیں۔

اس عقیدہ کے شعور کا پہلا اثر جو انسان پر پڑتا ہے وہ اس کائنات کے اندر خود اس کے اپنے مرتبہ و مقام کا انکشاف ہے، انسان جب تک توحید سے آشنا نہیں ہوتا، اس وقت تک اور تو اور خود اپنے متعلق اس کے نظریات و خیالات بالکل اُلجھے ہوئے رہتے ہیں۔ بہت سے سوالات، جن کا قطعی اور واضح حل زندگی کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے اور جن کو حل کئے بغیر نہ تو کوئی قدم صحیح سمت میں اُٹھایا جا سکتا ہے اور نہ اوہام و آلام سے رہائی حاصل کی جا سکتی ہے، یا تو اس کے لئے وہ سرے سے لاینحل معمہ بن کر رہ جاتے ہیں یا وہ ان کا کوئی غلط حل ہی قبول کر لیتا ہے۔ وہ روزی کہاں سے پاتا ہے۔ مگر روزی رساں کسی اور کو سمجھ لیتا ہے، زندگی اور موت کسی کے اختیار میں ہے اور وہ مارنے والا اور زندہ کرنے والا کسی کو بنائے بیٹھا ہے۔ بخشنے والا اور چھیننے والا اللہ کوئی اور ہے اور وہ دستِ سوال کسی اور کے سامنے پھیلائے ہوئے ہے! معبود کوئی اور ہے اور یہ ماتھا کسی اور کے آستانہ پر رگڑ رہا ہے، حد یہ ہے کہ جو چیزیں خود اس کی خدمات اور اس کی حاجت براری کے لئے پیدا

کی گئی ہیں اور جو کسی بھی نفع یا ضرر پر کوئی اختیار نہیں رکھتی ہیں، بسا اوقات وہ ان کے متعلق طرح طرح کے اوہام میں مبتلا ہو کر اُن کے آگے نذریں اور چڑھاوے پیش کرتا اور اُن سے التجائیں اور خوشامدیں کرتا ہے، یہ مرعوبیت اس پر اس کائنات کی صرف بڑی بڑی چیزوں ہی سے نہیں طاری ہوتی بلکہ وہ ذہنی پستی کی ایسی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات کسی جھاڑی، کسی درخت اور کسی چکنے پتھر کو ایک مقتدر ہستی مان کر اُنہی کے آگے ڈنڈوت کرنے لگ جاتا ہے!

صرف توحید ہے جو آدمی کو اوہام کی ان تاریکیوں سے نکالتی ہے۔ وہی آدمی پر یہ راز کھولتی ہے کہ صرف ایک ہی ذات ہے جس کے اختیار میں تمام خلق و تدبیر ہے اور جس کے دستِ تصرف میں تمام آسمان و زمین ہیں۔ اسی کے ہاتھ میں زندگی اور موت، اور اسی کے قبضۂ قدرت میں بخشنا اور چھیننا ہے۔ جو چیز بھی آتی ہے اسی کے حکم سے آتی ہے، اور جو چیز بھی لوٹتی ہے، اُسی کی طرف لوٹتی ہے۔ اس کے سوا سب فانی ہیں۔ باقی رہنے والی صرف اسی کی ذات ہے۔ وہی تنہا اس کائنات کا حکمران ہے، باقی سب اس کے آگے مجبور و محکوم ہیں!

یہ عقیدہ جب پُورے شعور کے ساتھ آدمی کے اندر راسخ ہو جاتا ہے تو وہ بیک وقت اپنے اندر دو متضاد حالتیں محسوس کرتا ہے، ایک تو عجز و سرافگندگی کی اور دوسری استغنا اور بے نیازی کی۔ وہ اپنے رب کے آگے تو بالکل عاجز اور اپنے آپ کو اس کا یکسر محتاج پاتا ہے، لیکن ساتھ ہی دُوسروں سے اپنے آپ کو بالکل ہی بے نیاز اور مستغنی بھی محسوس کرتا ہے۔ ایک کا آستانہ اُس کو تمام آستانوں سے بے پروا اور ایک کا ڈر اس کو تمام خطروں اور اندیشوں سے بالکل بے فکر کر دیتا ہے!

اس عقیدہ کا شعور انسان پر جو دوسرا اثر ڈالتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی ما سوا اللہ کے ہر باطل زور و اثر کے مقابل میں باغی بن جاتا ہے، وہ اپنے رب کی مرضی اور اس کے حکم کے مقابل میں کسی کے زور و اختیار اور کسی کے تصرف و استبداد کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کی غیرت و حمیت اس بات کو برداشت نہیں کرتی کہ کوئی اُس کے رب کی راہ میں اُس کا مزاحم بن کر کھڑا ہو۔ وہ اپنے عزیز سے عزیز دوست اور کسی عزیز سے عزیز رشتہ دار کے لئے بھی یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ خدا کی عبادت و اطاعت سے اُس کو روکے اور اگر کوئی اس کو روکنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس کو عزیز اور رشتہ دار سمجھنے کے بجائے اس کو اپنی راہ کا ایک پتھر خیال کرتا ہے اور اس کو ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس کو ہٹانے میں اس کو کامیابی نہیں ہوتی تو وہ خود کترا کر اپنی راہ بدل لیتا ہے!

انسان سے سب سے زیادہ قریب اس کا اپنا نفس ہے، لیکن اس کی خواہشیں بھی اگر اس کا رُخ موڑنا چاہتی ہیں، تو وہ اپنے نفس کو بھی ایک سنگ گراں سمجھتا ہے اور اس کو راہ سے ہٹا کے ہی دم لیتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے درجہ میں اُس کا اپنا کنبہ اور خاندان ہے، وہ اگر اس راہ میں روک بنتے ہیں تو وہ ان کو بھی خدا کے لئے چھوڑ دیتا ہے، قوم اور قبیلہ کے بھی وہ حق تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ مالک حقیقی کے مقابل میں اس سے اپنی کوئی بات منوائیں۔ وہ کسی بڑے سے بڑے جبّار، کسی بڑے سے بڑے سلطان اور کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کو بالِ مگس کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ یہ اس سے خدا کی اطاعت کے مقابلہ میں اپنی اطاعت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس بغاوت کی سزا میں اس کو آروں سے چیر ڈالا جائے، یا آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا جائے، وہ حکمرانِ حقیقی کے حکم کے آگے نہ کسی مُردہ خدا کی پروا کرتا اور نہ کسی زندہ خدا (؟) کو خاطر میں لاتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو ان کے مقابلہ میں مجبور دیکھتا ہے تو خود کو اُن کے حوالے کرنے کے بجائے وہ اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ وہ اُن کے ہاتھ نہیں بلکہ اپنی جان اپنے رب کے حوالے کر دے!!

اس عقیدہ کا تیسرا مظہر اُس وقت ظہور میں آتا ہے جب اس کا شعور رکھنے والے بہت سے افراد ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اس وقت اُن کی سعی اس بات کے لئے ہوتی ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے ایک ہی مالکِ حقیقی کی حکمرانی اپنے اپنے دلوں اور اپنے اپنے نفوس پر قائم کی ہے، اسی طرح وہ اس کی حکمرانی اس زمین کے اُوپر بھی قائم کریں، جس پر وہ بس رہے ہیں۔ یہ توحید کا اجتماعی اور سیاسی مظہر ہے۔ اور حقیقت میں رہنے اور بسنے کے قابل اس کرہ ارضی کا وہی خطہ ہے، جس پر خدا کی حکمرانی اور بادشاہی قائم ہو۔ اگر کسی سرزمین پر توحید کے ماننے والے موجود ہوں۔ وہ با اختیار اور آزاد بھی ہوں اور اپنا ایک سیاسی و اجتماعی نظام بھی رکھتے ہوں۔ لیکن یہ نظام اللہ کی حاکمیت کی اساس پر قائم نہ ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ توحید کے مدعی تو ہیں۔ لیکن یا تو ان کے اندر توحید کا شعور نہیں ہے یا یہ منافق ہیں۔ کہ جس چیز کے ماننے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اس کے اجتماعی تقاضے کو پُورا کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتے ـــــ!!

بھلا طریقت کا شریعت سے کیا تقابل؟ ان دونوں میں مساوات کہاں سے آئی! شریعت تو ایسی قطعی وحی سے ثابت ہوتی ہے، جس میں شک و ریب کی بالکل گنجائش نہیں، اس کے احکام میں نسخ و تبدیلی نہیں، تاقیامِ قیامت یہ احکام باقی رہیں گے۔ شریعت کے تقاضے پر عمل کرنا تمام عوام و خواص کے لئے ضروری ولابدی ہے۔ طریقت کی یہ مجال نہیں کہ وہ شریعت کے احکام کو اُٹھا دے اور اہلِ طریقت کو تکالیفِ شرعیہ سے آزاد کر دے ـــــ!

(خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ)

الوصایا النبویہ
مولانا سید علوی مکی مالکی
ترجمہ :- مولانا ظفر احمد عثمانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیتیں

عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال قلت یا رسول اللہ اوصنی قال اوصیک بتقوی اللہ فانہ ازین لامرک کلہ، قلت زدنی قال علیک بتلاوۃ القرآن و ذکر اللہ فانہ ذکر لک فی السماء و نور لک فی الارض۔ قلت - زدنی قال - علیک بطول الصمت فانہ مطردۃ للشیطان و عون لک علی امر دینک قلت - زدنی قال - ایاک وکثرۃ الضحک فان کثرت الضحک تمیت القلب و تذھب بنور الوجہ۔ قلت - زدنی قال قل الحق وان کان مرا، قلت - زدنی قال - لا تخف فی اللہ لومۃ لائم ۔قلت زدنی قال - لیحجزک عن الناس ما تعلم من نفسک - اخرجہ البیہقی واحمد والطبرانی وابن حبان فی صحیحہ والحاکم واللفظ لہ وقال صحیح الاسناد !

ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا - میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ تمہارے ہر کام کو زینت بخشنے والا ہے - میں نے عرض کیا - کچھ اور فرمائیے - فرمایا - تلاوت قرآن اور ذکر اللہ کی پابندی رکھو کہ اس سے عالم بالا میں تمہارا تذکرہ ہوتا رہیگا - اور زمین میں تم کو (خاص) نور حاصل ہوگا - میں نے عرض کیا کچھ اور فرمائیے - فرمایا - خاموش زیادہ رہا کرو - کیونکہ خاموشی شیطان کو بھگانے والی اور دین کے کاموں میں تمہاری مددگار ہے میں نے عرض کیا - کچھ اور فرمائیے - فرمایا - زیادہ ہنسنے سے بچو - کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہوجاتا اور چہرہ کی رونق جاتی رہتی ہے - میں نے عرض کیا، کچھ اور فرمائیے - فرمایا، حق بات کہو - اگرچہ تلخ ہو - میں نے عرض کیا، کچھ اور فرمائیے - فرمایا، اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرو ـــ میں نے عرض کیا، کچھ اور فرمائیے - فرمایا، کہ جو کچھ تم اپنے بارے میں جانتے ہو وہ تم کو لوگوں (کے درپے ہونے) سے روک دے ! (اس حدیث کو حافظ بیہقی اور امام احمد اور طبرانی و ابن حبان نے روایت کیا ہے نیز حاکم نے بھی اور یہ الفاظ حاکم ہی کی (روایت کے) ہیں، انہوں نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے -

شرح :- تقویٰ کمالِ ایمان کو کہتے ہیں - جو شخص اللہ سے ڈرے گا، دینی احکام کو بھی بجا لائے گا - اور جن کاموں سے منع کیا گیا ہے اُن سے بچے گا - اسی سے ایمان کامل ہوتا ہے - اور اسی سے دنیا بھی سنورتی ہے - اور دین بھی - آج جو مسلمانوں میں جرائم کی کثرت ہے کہ روزانہ اخبارات میں اغوا، قتل، چوری - ڈکیتی، رشوت، ذخیرہ اندوزی، دغا، فریب وغیرہ کے واقعات

چھپتے رہتے ہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دلوں سے خوفِ خدا اور اندیشۂ آخرت اٹھ گیا ہے۔ مسلمانوں نے آجکل یہ سمجھ لیا ہے کہ بس کلمہ پڑھ لینا کافی ہے، عمل کی کچھ ضرورت نہیں۔ اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف کلمہ پڑھ لینے سے اللہ تعالیٰ کی مدد اُن کے ساتھ نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ کی مدد صبر و تقویٰ کے بعد نازل ہوا کرتی ہے۔

بلیٰ ان تصبروا وتتقوا ویأتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسة آلاف من الملٰئکة مسومین۔ ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ولٰکن کذبوا فاخذنٰھم بما کانوا یکسبون۔!

بیشک اگر تم صبر و استقلال اور تقویٰ اختیار کرو اور دشمن دفعتاً تم پر حملہ کردے تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ جو خاص نشان لگائے ہوں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے اور اگر یہ بستی والے ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو یقیناً ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں (نازل کرنے اور رحمت کے دروازے) کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے جھٹلایا۔ (کہ ایمان اور تقویٰ کی ضرورت نہیں، ہماری محنت اور تدبیر ہی سے سب کام بن جائیں گے) تو ہم نے اُن کے اعمال (بد) کے سبب اُن کو پکڑ لیا۔!

چونکہ تقویٰ پر دُنیا و آخرت دونوں کی فلاح موقوف ہے اس لئے قرآن میں بھی اس کی بکثرت تاکید ہے۔ اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی وصیت فرمائی ہے۔ مسلمانوں کو تقویٰ کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ بغیر اس کے ان کی دُنیا درست ہوسکتی ہے نہ دین۔ نہ خدا کی مدد ساتھ ہوسکتی ہے نہ دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوسکتا ہے!

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ جو وصیت میں کرتا ہوں اُس کو غور سے سُنو! ہر صبح اور ہر شام یہ دعا کیا کرو۔ یاحی یا قیوم برحمتک استغیث۔ ایک روایت میں اتنا اور بھی ہے۔ اصلح لی شانی کلہ ولا تکلنی الیٰ نفسی طرفة عین۔ اے حی و قیوم! میں تیری رحمت کی دہائی دیتی ہوں میری حالت کو درست کر دیجئے۔ اور مجھے ذرا سی دیر کو بھی میرے نفس کے حوالے نہ کیجئے!، اس کو ابن السنی اور نسائی اور بزار نے صحیح سند سے روایت کیا ہے اور حاکم نے شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے)

ہمارے اکابر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے متعلقین و احباب کو اس دعا کی تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ جب کوئی مشکل درپیش ہو اس دعا کو صبح و شام کم از کم ستّو بار پڑھا جائے، زیادہ جتنی ہمت ہو۔!

ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا، جب کوئی گناہ تم سے ہوجائے اس کے پیچھے نیکی بھی کرلیا کرو۔ وہ اس گناہ کو مٹا دے گی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! لا الٰہ الا اللہ بھی نیکیوں میں شمار ہے؟ فرمایا۔ یہ تو سب نیکیوں میں افضل ہے۔ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

یہاں گناہ سے مراد صغیرہ ہے، کبیرہ نہیں۔ کیونکہ کبیرہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتا۔ لیکن ہم تو صغائر میں بھی بکثرت مبتلا ہوتے ہیں اس لئے ہر مجلس اور گفتگو کے بعد لا الٰہ الا اللہ کہہ لینا چاہیئے۔ تاکہ گناہ مٹ جائیں۔

---

[1] اور جب مسلمان کسی لغزش اور خطا کے بعد لا الٰہ الا اللہ کہیگا تو اس کلمہ کے دہراتے وقت اس کے دل میں لامحالہ ندامت کا احساس بھی پیدا ہوگا اور اس احساس کے ساتھ توبہ و استغفار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرمادیں گے۔ (م-ن)

(۴) حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ اے معاذ! مجھے تم سے محبت ہے میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد اس دعا کو نہ چھوڑ نا۔

اللّٰھمّ اعنی علیٰ ذکرک وشکرک وحسن عبادتک ۔

اے اللہ! میری مدد کیجئے اپنی یاد پر اور شکر پر اور اچھی طرح عبادت کرنے پر۔

اس کو ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

اس دعا کا مہتم بالشان ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ سے اپنی محبت کا اظہار کرکے اس کی وصیت فرمائی ہے، حدیث سے نمازوں کے بعد دعا کا بھی ثبوت ہوگیا۔ جو تمام مسلمانوں میں ہر نماز کے بعد معمول ہے ـــ!

(۵) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو وصیت فرمائی کہ جب سونے کی جگہ میں جاؤ (یعنی سونے کا قصد کرو) تو سورۂ الحشر پڑھ لیا کرو۔ اگر تم (اس رات میں) مرگئے تو شہید مروگے۔ اس کو ابن السنی نے عمل الیوم واللیلۃ میں روایت کیا ہے۔

ایک روایت میں بجائے سورۂ الحشر کے اواخر سورۂ الحشر ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ سے ختم سورۃ تک پڑھنے کا بھی ثواب آیا ہے!

(۶) حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو وصیت فرمائی کہ جب (سونے کے لئے) خواب گاہ کا ارادہ کرو تو یہ دعا پڑھا کرو:۔

اللّٰھم اسلمت نفسی الیک وفوضت امری الیک ووجھت وجھی الیک والجأت ظھری الیک رغبۃ ورھبۃ الیک لا ملجاء منک الا الیک آمنت بکتابک الذی انزلت ونبیک الذی ارسلت۔

اے اللہ! میں اپنی ذات کو آپ کے حوالہ کرتا ہوں اپنے ہر کام کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اپنے چہرہ کا رُخ آپ کی طرف پھیرتا ہوں، آپ ہی سے پشت پناہی چاہتا ہوں۔ آپ ہی سے امید رکھتا ہوں اور آپ ہی سے ڈرتا ہوں، آپ سے بھاگنے کی اور پناہ کی جگہ آپ کے سوا کوئی نہیں۔ آپ کی اس کتاب پر ایمان لایا جو آپ نے نازل کی ہے اور آپ کے نبیؐ پر بھی ایمان لایا جن کو آپ نے بھیجا ہے ـــ!

حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم رات ہی کو مرگئے تو فطرت (اسلام) پر مروگے اور اگر صبح کو اچھے خاصے اُٹھ گئے تو خیر و برکت پاؤ گے۔ اس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور بین القوسین کا مضمون جمع الفوائد سے ماخوذ ہے۔

(۷) ضرغامہ بن علیہ بن حرملۃ عنبری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ! مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا، اللہ سے ڈرتے رہو، اور جب تم کسی مجلس میں بیٹھو، پھر وہاں سے کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو ایسی باتیں کرتے سنو جو تم کو پسند ہوں، تو اس مجلس میں پھر آؤ۔ اور اگر ان کو ایسی باتیں کرتے سنو جو تم کو ناگوار ہوں تو اس مجلس کو چھوڑ دو۔ اس کو امام احمدؒ اور ابن سعید نے روایت کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اپنے پیچھے بھی اچھی باتوں اور اچھے کاموں میں مشغول پاؤ اُن کو اپنا جلیس بناؤ اور جن لوگوں کو اپنے پیچھے بُری باتوں اور بُرے کاموں میں مشغول پاؤ اُن کو اپنا ہم نشین نہ بناؤ، اُن سے الگ رہنا ہی اچھا ہے !

(۸) حضرت معاذ بن جبل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا اپنے دین میں (اور دین کے کاموں میں) اخلاص پیدا کرو۔ تھوڑا عمل بھی کافی ہو جائے گا۔ (اس کو ابن ابی الدنیا نے کتاب الاخلاص میں اور ابن ابی حاتم اور بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بتایا ہے)!

یہ حقیقت ہے کہ اخلاص کے بغیر کوئی عمل بارگاہ الٰہی میں قبول نہیں ہوتا اور اخلاص کے ساتھ تھوڑا عمل بھی وزنی ہو جاتا ہے۔ حضرات صحابہؓ کو جو اولیا و امت پر فضیلت ہے، وہ زیادہ عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ اخلاص کی وجہ سے ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ میرے صحابی کا ایک مد (آدھ سیر) دوسروں کے اُحد پہاڑ کی برابر سونا خیرات کرنے میں افضل ہے۔ اخلاص کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عمل میں غیر خدا کا قصد نہ کیا جائے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ عمل سے صرف رضاء حق مطلوب ہو اور کچھ مقصود نہ ہو، وبینہما درجات یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اخلاص اور ریا کا مدار مقصد پر ہے اگر ریا کا قصد نہ ہو تو اخلاص حاصل ہے۔ وسوسۂ ریا مُضر نہیں۔ کیونکہ وسوسہ پر بندہ کا اختیار نہیں۔ ولا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔ (از افادات مولانا کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ)

(۹) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ فرمایا۔ نماز کو درستی کے ساتھ ادا کرو۔ زکوٰۃ دیا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو۔ حج اور عمرہ کیا کرو، اپنے باپ ماں کی خدمت کرو۔ (قرابت داروں سے) صلہ رحمی کرو۔ مہمان کی خاطر کیا کرو۔ نیک کاموں کا امر کرو۔ بُرے کاموں سے روکتے رہو۔ اور حق کے ساتھ چلتے رہو جدھر وہ جائے۔ (اس کو حاکم نے روایت کیا اور صحیح بتایا)

(۱۰) حضرت ابوہریرہ اور ابو الدرداء دونوں فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی وصیت فرمائی کہ سفر ہو یا حضر (کسی حال میں) ان کو نہ چھوڑیں۔ (۱) ہر مہینہ میں تین دن کا روزہ — (۲) چاشت کی دو رکعتیں۔ (۳) اور سونے سے پہلے وتر کی نماز پڑھ لینا۔ (اس کو امام بخاری و مسلم و ابوداؤد اور ترمذی و نسائی نے روایت کیا ہے)

اس حدیث کی شرح رحمۃ القدوس ترجمہ بہجۃ النفوس میں ملاحظہ ہو، قابل دید ہے !

(۱۱) حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں۔ مجھے میرے حبیب (سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے چند بہترین خصلتوں کی وصیت فرمائی ہے۔ (۱) دُنیوی امور میں اپنے سے فوق کو نہ دیکھوں، بلکہ اپنے سے کمتر کو دیکھوں، (۲) مساکین سے محبت کروں، اُن کے قریب رہا کروں۔ (۳) صلہ رحمی کروں اگرچہ قرابت دار اعراض ہی کرتے ہوں۔ (۴) اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کروں — (۵) ہمیشہ حق کہوں، اگرچہ اپنے خلاف ہی ہو۔ اگرچہ کڑوا ہی کیوں نہ ہو۔ (۶) لاحول ولا قوۃ الا باللہ

کی کثرت کیا کروں، کیونکہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک (بڑا) خزانہ ہے - اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں!

(۱۲) ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت معاذؓ نے کہا یا رسول اللہ مجھے کچھ وصیت کیجئے - فرمایا - اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو - اور اللہ کے لئے اس طرح کام کرو جیسا تم اس کو دیکھ کر کام کر رہے ہو - اور اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرو اور ہر پتھر ہر درخت کے پاس اللہ کو یاد کرو (تاکہ سب تمہارے واسطے گواہی دیں) اور جب کوئی برا کام صادر ہو جائے تو اس کے پہلو میں (ساتھ ساتھ) نیک کام بھی کر لو — پوشیدہ گناہ کے ساتھ پوشیدہ طور پر نیکی کرو اور علانیہ کے ساتھ علانیہ طور پر - اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے!

اپنے کو مُردوں میں شمار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ موت کو یاد رکھو، ہر وقت موت کے لئے تیار رہو ؏

شاید ہمیں نفس، نفسِ واپسیں بود!

(۱۳) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ مجھے کچھ وصیت کیجئے - فرمایا، اے معاویہ بن حیدہ! غصہ نہ کیا کرو، کیونکہ غصہ ایمان کو ایسا خراب کر دیتا ہے جیسا شہد کو ایلوا، اس کو حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے -

مراد بیجا غصہ ہے، جس کی شریعت سے اجازت نہ ہو اور جہاں شریعت نے غصہ کرنے کی اجازت دی ہے وہاں غصہ کرنا جائز ہے، مگر وہاں بھی حدود کی رعایت ضروری ہے - حد سے تجاوز کرنا جائز نہیں!

(۱۴) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے کچھ وصیت کیجئے اور مختصر کیجئے - فرمایا، لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے امید قطع کر لو اور طمع و حرص سے بچتے رہو کہ یہ نقد احتیاج ہے، (حریص آدمی محتاج ہی ہے گو بظاہر دولت مند ہو) اور ایسی بات اور ایسے کام سے بچو جس سے بعد میں معذرت کرنی پڑے (معافی چاہنی پڑے) اس کو حاکم اور بیہقی اور احمد نے روایت کیا ہے!

(۱۵) اسود بن اصرم حارثی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے کچھ وصیت کیجئے - فرمایا - تمہیں اپنی زبان پر قابو ہے؟ میں نے کہا اگر مجھے اپنی زبان پر بھی قابو نہ ہوا تو کس چیز پر قابو ہوگا؟ فرمایا - تم کو اپنے ہاتھوں پر قابو ہے؟ میں نے کہا اگر میں اپنے ہاتھوں پر بھی قابو نہ رکھوں تو کس چیز پر قابو رکھوں گا؟ فرمایا - تو بس اپنی زبان سے اچھی بات کے سوا کچھ نہ نکالو اور اپنے ہاتھ کو نیکی کے سوا کسی کام کی طرف نہ بڑھاؤ

سبحان اللہ کس خوبی کے ساتھ نصیحت فرمائی ہے کہ پہلے بتا دیا کہ انسان کی زبان اور ہاتھ پیر اس کے اختیار میں ہیں، اُن سے جو گناہ ہوتے ہیں اختیار سے ہوتے ہیں، بے اختیار نہیں ہوتے، پس انسان کو اپنے اختیار سے کام لینا اور زبان، ہاتھ اور پیروں کو گناہوں سے بچانا چاہیئے - اور معلوم ہے کہ زیادہ تر گناہ ان ہی سے ہوتے ہیں - جس نے ان کو بچا لیا اس نے گویا اپنے کو پوری طرح گناہ سے بچا لیا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ وسلم

والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصلحت!

سید ابوالاعلیٰ مودودی

چار اہم سوالات

اور اُن کے جوابات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں "توحید نمبر" کے لئے ہم نے چار سوالات بھیجے تھے،
اپنی شدید مصروفیات اور گرانیٔ صحت کے باوجود مولانا موصوف نے جوابات عنایت فرمائے،
جو ترتیب وار درج کئے جاتے ہیں۔ (م۔ ق)

(۱) کیا "بدعت" کی دو قسمیں ہیں (۱) حسنہ اور (۲) سیئہ! بعض صاحبان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول "نعم البدعۃ" سے بدعت کے "حسنہ" ہونے پر دلیل لاتے ہیں۔ حدیث شریف میں کس قسم کی "بدعت" کو ضلالت کہا گیا ہے؟

جواب:۔ شرعی اصطلاح میں جس چیز کو بدعت کہتے ہیں، اس کی کوئی قسم حسنہ نہیں ہے، بلکہ ہر بدعت سیئہ اور ضلالہ ہی ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔ کل بدعۃ ضلالۃ۔ البتہ لغوی اعتبار سے محض نئی بات کے معنی میں بدعت حسنہ بھی ہو سکتی ہے۔ اور سیئہ بھی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نماز تراویح باجماعت کے بارے میں نعمت البدعۃ ھذا کے الفاظ جو فرمائے تھے۔ ان میں بدعت سے مراد اصطلاحی بدعت نہیں بلکہ لغوی بدعت ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے اسے بدعت کی ایک قسم "حسنہ" قرار دینے کے لئے دلیل نہیں بنایا جا سکتا!

اس بات کو سمجھنے کے لئے پہلے بدعت کا شرعی مفہوم سمجھ لینا چاہیئے۔ پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا نماز تراویح باجماعت کا طریقہ رائج کرنا اس مفہوم کے اعتبار سے بدعت کی تعریف میں آتا بھی ہے؟

عربی زبان میں بدعت کا لفظ قریب قریب اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس میں لفظ "جدت" ہم اردو میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی ایک نئی بات جو پہلے نہ ہوئی ہو۔ یا جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو۔ لیکن شریعت میں یہ لفظ اس وسیع مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا، نہ اس مفہوم میں ہر نئی چیز یا ہر نئے کام اور طریقے کو گمراہی قرار دیا گیا ہے! شرعی اصطلاح میں بدعت سے مراد یہ ہے کہ جن مسائل و معاملات کو دینِ اسلام نے اپنے دائرے میں لیا ہے، اُن میں کوئی ایسا طرزِ فکر یا طرزِ عمل اختیار کرنا جس کے لئے دین کے اصلی مآخذ میں کوئی دلیل و حجت موجود نہ ہو۔ اس تعریف کی رُو سے وہ مسائل و معاملات، یا مسائل و معاملات کے وہ پہلو جن میں دین نفیاً یا اثباتاً کوئی تعرض نہیں کرتا۔ جن کے متعلق صاحب شریعتؐ نے خود فرما دیا کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ بدعت و سنت کی بحث سے خود بخود خارج ہو جاتے ہیں۔ کسی چیز کے بدعت ہونے یا نہ ہونے کا سوال صرف انہی امور میں پیدا ہوتا ہے، جن میں انسان کی رہنمائی کرنا دین نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اور جن میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے احکام دیئے ہیں، یا اصولی ہدایات عطا فرمائی ہیں! خواہ وہ عقائد اور خیالات و تصورات

کے باب سے تعلق رکھتے ہوں، یا اخلاق سے، یا عبادات اور مذہبی رسوم سے، یا معاشرت، تمدن، سیاست، معیشت اور دوسری اُن چیزوں سے جنہیں عام طور پر دُنیوی معاملات سے موسوم کیا جاتا ہے، ان امور میں جب کوئی ایسی بات کی جائے گی جس کے ماخذ کا حوالہ خدا کی کتاب اور اُس کے رسُول کی تعلیم و ہدایت میں نہ دیا جا سکتا ہو۔ یا جس کے حق میں دین کے ان ماخذِ اصلیہ سے کوئی معقول دلیل نہ پیش کی جا سکتی ہو، تو وہ بدعت ہوگی، اور اگر وہ کتاب و سنت کی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہو تو اس پر محض بدعت کا نہیں بلکہ فسق اور معصیت کا اطلاق ہو گا !

بدعت کے شرعی مفہوم کی اس تشریح کے بعد یہ بات محتاجِ کلام نہیں رہتی کہ اس معنی میں جو چیز بدعت ہو اُس کے حسنہ ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، وہ تو لازماً سیئہ ہی ہو گی اور اس کو سیئہ ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ دین نام ہے اُس نظام کا جو خدا اور اُس کے رسُول کی تعلیم و ہدایت پر مبنی ہو۔ اور اس نظام میں بہرحال ایسی کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی جو اس تعلیم و ہدایت پر مبنی نہ ہو۔ ایسی کوئی چیز جب بھی اس میں داخل ہو گی، اس نظام کے مزاج اور اس کی ترکیب کو بگاڑ دے گی۔ پھر کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی بگاڑنے والی چیز حسنہ بھی ہو — !

اب دیکھیے کہ حضرت عمرؓ نے جس چیز کو "اچھی بدعت" کہا تھا۔ کیا وہ واقعی اُسی معنی میں بدعت تھی جس میں کوئی شے اصطلاحِ شرع میں بدعت قرار پا سکتی ہے ؟

جہاں تک نفس تراویح کا تعلق ہے، یعنی رمضان میں نماز عشاء کے بعد قیام لیل، وہ تو صرف جائز ہی نہیں، مندوب اور مسنون بھی ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دی ہے، اس کو دوسرے دنوں کے قیام لیل سے زیادہ اہمیت دی ہے اور خود اس پر عمل فرمایا ہے۔ جہاں تک اس کے جماعت کے ساتھ پڑھنے کا تعلق ہے، اس پر بھی حضور کے زمانہ میں اور حضورؐ کے علم میں عمل ہوا ہے اور آپؐ نے اسے جائز رکھا ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ مسجد نبویؐ میں مختلف مقامات پر مختلف لوگ رمضان میں رات کے وقت نماز پڑھتے تھے! جس کو جتنا قرآن یاد ہوتا وہ اُتنا ہی پڑھتا، اور کسی کے ساتھ ایک، کسی کے ساتھ پانچ، کسی کے ساتھ سات، یا کم و بیش مقتدی کھڑے ہو جاتے تھے، پھر جہاں تک ایک جماعت میں سب کو جمع کر کے ایک امام کے پیچھے تراویح پڑھانے کا تعلق ہے، اس پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کئی مرتبہ عمل فرمایا ہے۔ ترمذی۔ ابوداؤد اور دوسری کتب سُنن میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ایک رمضان کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ کہ مہینہ ختم ہونے میں سات دن باقی تھے کہ رات کے وقت حضورؐ نے ہم کو نماز پڑھائی، یہاں تک کہ ایک تہائی شب گزر گئی، پھر ایک دن چھوڑ کر ایک روز آدھی رات تک پڑھائی اور اس کے بعد ایک دن چھوڑ کر پھر ایک روز سحری کے وقت تک پڑھاتے رہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک اور رمضان کا حال بیان فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے دو یا تین دن مسلسل نماز تراویح پڑھائی، پھر تیسرے یا چوتھے روز جب لوگ جمع ہوئے تو آپؐ نماز پڑھانے کے لئے نہ نکلے، اور بعد میں اس کی وجہ یہ بیان کی کہ کہیں یہ فرض نہ قرار دے دی جائے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ تو مسنون تھا۔ اب جس چیز کو نئی بات کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس طریقہ کو ہمیشہ کے لئے جاری کر دیا۔ اس چیز کو بدعت اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ حضورؐ نے ہمیشہ جماعت کے ساتھ تراویح نہ پڑھانے کی وجہ صرف یہ بیان فرمائی تھی کہ کہیں یہ لوگوں پر فرض نہ قرار دے دی جائے، یہ وجہ خود اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ آپؐ کے نزدیک یہ طریقہ رائج ہونا اور تمام حیثیتوں سے

تو پسندیدہ تھا - البتہ فرض قرار پا جانے کا اندیشہ اس میں مانع تھا - کہ آپؐ اسے رائج فرمائیں، حضورؐ کی وفات کے بعد اس اندیشے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی - کیونکہ کسی دوسرے شخص کا عمل کسی چیز کے شریعت میں فرض ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا - اس لئے حضرت عمرؓ نے حضورؐ کے اُس منشا کو پورا کر دیا جو آپؐ کی اس توجیہ میں مضمر تھا - یعنی یہ کہ یہ طریقہ رائج تو ہو مگر مشروع اور مسنون طریقہ کی حیثیت سے، نہ کہ فرض کی حیثیت سے، اس پر بعض لوگوں کو جب بدعت ہونے کا شبہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اُسے رد کیا کہ "یہ اچھی بدعت ہے" - یعنی یہ نئی بات تو ہے، مگر اس نوعیت کی نئی بات نہیں ہے جسے شریعت میں مذموم قرار دیا گیا ہے - یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ نے بالاتفاق اس طریقے کے رواج کو قبول کیا - اور اُن کے بعد ساری اُمت اس پر عمل کرتی رہی - ورنہ کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ شرعی اصطلاح میں جس چیز کو بدعت کہتے ہیں، اسے رائج کرنے کا ارادہ حضرت عمرؓ کے دل میں پیدا ہوتا! اور صحابہ کی پوری جماعت بھی آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لیتی ——؟

(۲) مشائخ و صوفیاء کے بعض تذکروں میں یہ ملتا ہے کہ فلاں صاحب نے فلاں بزرگ کی قبر پر مراقبہ اور چلّہ کیا؟ اور یہ بھی کہ فلاں بزرگ کا یہ قول اور تجربہ ہے کہ فلاں قبر پر اللہ سے دعا مانگنا قبولیت کا سبب ہوتا ہے؟ اس کی دین میں کیا اصل ہے ——؟

جواب :- اوّل تو دین میں اصل چیز کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ اللہ ہے، نہ کہ بزرگوں کے اقوال و افعال - دوسرے خود بزرگوں کے اقوال و افعال کے متعلق جو مواد تذکروں میں ملتا ہے وہ بھی ایسا مستند نہیں ہے کہ اس کی بناء پر یہ اطمینان کیا جا سکے کہ واقعی ان بزرگوں کے اقوال و افعال وہی تھے، جو اُن کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں - ایسی چیزوں کو ماخذ مان کر ان کی پیروی کرنا میرے نزدیک سخت بے احتیاطی ہے - محفوظ طریقہ وہی ہے جو ہمیں قرآن و حدیث سے ملتا ہے جس کے دورِ صحابہ اور دورِ تابعین میں رائج ہونے کا ثبوت ملتا ہے - اور جس کو امت کے محدثین اور فقہا نے منقح اور مدوّن کر کے رکھ دیا ہے - لہٰذا جو شخص دین کی یقینی اور قابلِ اعتماد راہ پر چلنا چاہتا ہو - اس کو اس محفوظ طریقہ سے تجاوز کا کبھی خیال بھی نہیں کرنا چاہیئے - کیونکہ باہر جو کچھ ہے وہ کم از کم خطرے سے تو خالی نہیں ہے - اب اسی معاملہ کو لیجئے جس کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے - جو تذکرے ہمیں یہ خبر دیتے ہیں کہ فلاں فلاں بزرگوں نے یہ کام کیا ہے، اُن کی روایات کا حدیث کی کسی ضعیف سے ضعیف روایت کے مقابلہ میں بھی آخر کیا پایہ ہے؟ کس سند کی بناء پر یہ اعتماد یا گمان غالب ہو سکتا ہے کہ ان بزرگوں نے واقعی ایسا کیا تھا؟ فرض کیجئے کہ حقیقت میں انہوں نے ایسا نہ کیا ہو - اس صورت میں اُن بے سند روایات کی پیروی کر کے ہم آخرت میں کس چیز کا سہارا لے کر جواب دہی کر سکیں گے؟ اگر عاقبت کی ہمیں فکر ہو اور ہم خود اپنی خیر چاہتے ہوں تو یہ کام کرنے سے پہلے ہم کو دین کے محفوظ طریقہ کی طرف رجوع کر کے اطمینان کر لینا چاہیئے کہ وہاں کسبِ فیض یا قبولیتِ دعا کے لئے یہ راستہ بتایا گیا ہے یا نہیں - صحابہ نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزارِ مبارک پر کبھی چلّہ کھینچا یا مراقبہ کیا؟ تابعین نے کبھی کسی صحابی کی قبر پر یہ کام کیا؟ فقہا و محدثین میں سے کسی نے اس کو مشروع طریقہ بتایا؟ سب سے بڑھ کر خود اللہ میاں نے قرآن میں کہیں یہ تعلیم دی کہ قبروں پر حصولِ فیض یا استجابتِ دعا کے لئے جاؤ؟ یا اللہ کے رسولؐ نے اس طریقِ کار کی طرف کوئی اشارہ کیا؟ ان ذرائع سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہو تو اطمینان کے ساتھ یہ کام کیا جا سکتا ہے - ورنہ یہ بالکل غلط

بہرحال، مشتبہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ ایسا مشتبہ کام کرکے کیا ہیں۔ یہ خطرہ مول نہ لوں گا کہ شاید آخرت میں وہ غلط ثابت ہو اور میں اللہ تعالیٰ کو اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکوں کہ جب دین کی حقیقی راہ معلوم کرنے کے قابلِ اعتماد ذرائع موجود تھے تو میں مشتبہ ذرائع کی طرف کیوں گیا ؟

(۳) کسی بزرگ کی قبر پر جا کر اس طرح کہنا کہ اے ولی اللہ! آپ ہمارے لئے اللہ سے دُعا کریں ؟ کیا درست ہے ؟

جواب :- کسی بزرگ سے اپنے حق میں دعائے خیر کی درخواست کرنا بجائے خود کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے۔ آدمی خود بھی اللہ سے دعا مانگ سکتا ہے، اور دوسروں سے بھی کہہ سکتا ہے کہ میرے لئے دعا کرو۔ لیکن وفات یافتہ بزرگوں کی قبروں پر جا کر یہ درخواست پیش کرنا، معاملہ کی نوعیت کو بالکل ہی بدل دیتا ہے۔ قبر پر یہ بات کہنے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اپنے دل ہی میں، یا چپکے چپکے ایسا کہیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ ان بزرگ کی سماعت کی شان وہی کچھ سمجھ رہے ہیں جو اللہ کی ہے کہ:-

أَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔

تم اپنی بات آہستہ کہو یا زور سے، وہ تو دلوں کا حال بھی جانتا ہے!

دُوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ زور زور سے اُن ولی اللہ کو پکار کر یہ بات کہیں۔ اس صورت میں اعتقاد کی خرابی تو لازم نہ آئے گی، مگر یہ اندھیرے میں تیر چلانا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ پکار رہے ہوں اور وہ نہ سُن رہے ہوں۔ کیونکہ سماعِ موتیٰ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا سماع تو ممکن ہو، مگر اُن کی روح اس وقت وہاں تشریف نہ رکھتی ہو۔ اور آپ خواہ مخواہ خالی مکان پر آوازیں دے رہے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کی روح تشریف فرما تو ہو مگر وہ اپنے رب کی طرف مشغول ہوں، اور آپ اپنی غرض کے لئے چیخ چیخ کر اُن کو اُلٹی اذیت دیں۔ دُنیا میں کسی نیک آدمی سے دعا کرانے کے لئے آپ جاتے ہیں تو مہذب طریقہ سے پہلے ملاقات ہوتی ہے، پھر آپ عرض مدعا کرتے ہیں، یہ تو نہیں کرتے کہ مکان کے باہر کھڑے ہو کر بس چیخنا شروع کر دیا۔ کچھ پتہ نہیں کہ اندر ہیں یا نہیں ہیں۔ ہیں تو آرام میں ہیں یا کسی کام میں مشغول ہیں۔ یا آپ کی بات سننے کے لئے خالی بیٹھے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ وفات یافتہ بزرگوں کے معاملہ میں جب ہمارے لئے اُن کے احوال معلوم کرنے اور اُن سے بالمشافہ ملاقات کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ تو اُن کے مکانوں پر جا کر اندھا دھند چیخ پکار شروع کر دینا آخر کس معقول آدمی کا کام ہوسکتا ہے! دعا کروانے کا یہ طریقہ اگر قرآن وحدیث میں سکھایا گیا ہوتا، یا اس کا کوئی ثبوت موجود ہوتا کہ صحابہ کے عہد میں یہ رائج تھا۔ تب تو بات صاف تھی۔ بڑے اطمینان کے ساتھ یہ کام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب وہاں اس کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا تو آخر ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا جائے جس کی ایک صورت تو صریحاً صفاتِ الٰہی کے تصور سے ٹکراتی ہے۔ اور دوسری صورت علانیہ غیر معقول نظر آتی ہے!

(۴) یہ جو دعاؤں میں "بجاہ فلاں" اور "بحرمت فلاں" کا اضافہ ملتا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ سُنتِ رسُولؐ کیا بتاتی ہے، صحابہ کا کیا معمول رہا ہے؟ اور اس طرح (بجاہ ۔۔ بحرمت) دعا مانگنے سے کوئی دینی قباحت تو لازم نہیں آتی؟

جواب :- دعا میں اللہ تعالیٰ کو کسی کے جاہ وحرمت کا واسطہ دینا، وہ طریقہ نہیں ہے جو اللہ اور اُس کے رسُولِ پاک نے

ہم کو سکھایا ہو۔ قرآن تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس تخیل سے بالکل خالی ہے۔ حدیث میں بھی اس کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے صحابۂ کرام میں سے بھی کسی کے متعلق میں نہیں جانتا کہ انہوں نے اس طرح خود دعا مانگی ہو، یا کسی کو اس طرح دعا مانگنے کی تعلیم دی ہو۔ اب میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں میں یہ تخیل کہاں سے آگیا کہ رب العالمین کے حضور دعا مانگتے وقت اُسے کسی بندہ کی جاہ و حرمت کا حوالہ دیں۔ یا اس سے یہ عرض کریں کہ اپنے فلاں بندے کے طفیل میری حاجت پوری کر دے میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا کرنا ممنوع ہے، میں صرف دو باتیں کہتا ہوں۔ ایک یہ کہ ایسا کرنا اس طریقے کے مطابق نہیں ہے جو رب العالمین نے خود ہمیں دعا مانگنے کے لئے سکھایا ہے۔ اور اُس طریقِ دعا سے بھی مطابقت نہیں رکھتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے براہ راست شاگردوں کو بتایا تھا۔ اس لئے اس سے اجتناب ہی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ حضورؐ اور تمام انبیاء علیہم السلام آخر یہی بتانے کے لئے تو آئے تھے کہ خدا اور بندوں کے درمیان ربط و تعلق کی صحیح صورت کیا ہے اور جب انہوں نے اس کی یہ صورت نہ خود اختیار کی، نہ کسی کو سکھائی، تو جو شخص بھی اسے اختیار کرے گا وہ معتبر چیز کو چھوڑ کر غیر معتبر چیز اختیار کرے گا۔ دوسری بات میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے تو اس طریقِ دعا میں بڑی کراہیت محسوس ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی دوسرا شخص اُس کے معنی سے صَرفِ نظر کر لے اور اُس میں کراہیت کا وہ پہلو محسوس نہ کرے جو مجھے نظر آتا ہے۔ میں جب اس طرزِ دعا کے مضمرات پر غور کرتا ہوں تو میرے سامنے کچھ ایسی تصویر آتی ہے کہ جیسے ایک بہت بڑی سخی داتا ہستی ہے، جس کے دروازہ سے ہر کہ ومہ کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔ جس کا فیض عام ہو۔ جس کا دربار کھلا ہے، جس سے ہر مانگنے والا مانگ سکتا ہے۔ اور کسی پر اُس کی عطا و بخشش بند نہیں ہے۔ ایسی ہستی کے حضور ایک شخص آتا ہے اور اس سے سیدھی طرح یہ نہیں کہتا کہ اے کریم و رحیم! میری مدد کر۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ اپنے فلاں دوست کی خاطر میری حاجت پوری کر دے، مانگنے کے اس انداز میں یہ بدگمانی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنی صفتِ رحم و کرم کی وجہ سے کسی کی دستگیری کرنے والا نہیں ہے۔ بلکہ اپنے دوستوں اور چہیتوں اور مقربوں کی خاطر احسان کر دیا کرتا ہے! ان کا واسطہ نہ دیا جائے تو گویا آپ اس کے ہاں سے کچھ پانے کی امید نہیں رکھتے۔ اور بجاہِ فلاں کہہ کر مانگنے میں تو معاملہ بدگمانی سے بھی آگے نکل جاتا ہے! اس کے معنی تو یہ ہوئے گویا آپ اس پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ کہ میں فلاں بڑے آدمی کا متوسّل آیا ہوں، میری درخواست کو کسی بے وسیلہ آدمی کی سی درخواست سمجھ کر نہ ٹال دیجئے گا۔ اگر یہ اس طرزِ دعا کے مضمرات نہ ہوں تو مجھے سمجھا دیا جائے، بڑی خوشی ہوگی کہ میرے دل کی کھٹک اس معاملہ میں نکل جائے گی۔ لیکن اگر اس کے واقعی مضمرات یہی ہوں تو میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کا صحیح تصوّر رکھتا ہو وہ ایسا طرزِ دعا اختیار کرنے کا خیال بھی کیسے کر سکتا ہے —!

(مولانا مودودی نے اپنے دوسرے خط میں تحریر کیا ہے کہ "پچھلے مضمون میں الٰہی بحق فلاں اور بجاہ فلاں کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کے ساتھ ہدایہ[1] کی یہ عبارت بھی شامل کر دیں :۔

و یکرہ ان یقول الله جل فی دعائه بحق فلان وبحق انبیائک ورسلک لانه لاحق للمخلوق علی الخالق۔

اور یہ مکروہ ہے کہ آدمی اپنی دعا میں بحق فلاں، بحق انبیاؑ و رسل کہے، کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے!

---

[1] فقہ حنفی کی یہ مستند ترین کتاب ہے (ایڈیٹر)

عملی شرک

- اِنِّي كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ - (ابراہیم)

(اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا، میں اُس سے بری الذمہ ہوں)

یہاں پھر شرکِ اعتقادی کے مقابلہ میں شرک کی ایک مستقل نوع، یعنی شرک عملی کے وجود کا ایک ثبوت ملتا ہے، ظاہر بات ہے کہ شیطان کو اعتقادی حیثیت سے تو کوئی بھی نہ خدائی میں شریک ٹھہراتا ہے، اور نہ اُس کی پرستش کرتا ہے، سب اُس پر لعنت ہی بھیجتے ہیں، البتہ اُس کی اطاعت اور غلامی، اُس کے طریقہ کی اندھی یا آنکھوں دیکھی پیروی ضرور کی جا رہی ہے، اور اسی کو یہاں شرک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب جواب میں فرمائیں کہ یہ تو شیطان کا قول ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے! لیکن ہم عرض کریں گے کہ اوّل تو اس کے قول کی اللہ تعالیٰ خود تردید فرما دیتا۔ اگر وہ غلط ہوتا، دوسرے شرک عملی کا صرف یہی ایک ثبوت قرآن میں نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد ثبوت پچھلی سورتوں میں گزر چکے ہیں اور آگے آ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام کہ وہ اپنے احبار و رہبان کو ارباب من دون اللہ بنائے ہوئے ہیں (آل عمران - ۷) جاہلیت کی رسمیں ایجاد کرنے والوں کے متعلق یہ کہنا کہ پیروؤں نے اُنھیں خدا کا شریک بنا رکھا ہے (الانعام) خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنے والوں کے متعلق یہ فرمانا کہ انہوں نے اپنی خواہش نفس کو خدا بنا لیا ہے، (الفرقان - رکوع ۴) نافرمان بندوں کے متعلق یہ ارشاد کہ وہ شیطان کی عبادت کر رہے ہیں (یٰس ۔ رکوع ۴) انسانی ساخت کے قوانین پر چلنے والوں کو ان الفاظ میں ملامت کہ اذنِ خداوندی کے بغیر جن لوگوں نے تمہاری شریعت بنائی ہے، وہ تمہارے "شریک" ہیں۔ (الشوریٰ رکوع ۳) یہ سب کیا اُس عملی شرک کی نظیر نہیں ہیں، جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، ان نظیروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی یہی ایک صورت نہیں ہے کہ کوئی شخص غیر اللہ کو عقیدتاً خدائی میں شریک ٹھہرائے، اس کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ وہ خدائی سند کے بغیر یا احکامِ خداوندی کے علی الرغم، اس کی پیروی اور اطاعت کرتا چلا جائے، ایسا پیرو اور مطیع اگر اپنے پیشوا اور مطاع پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی عملاً یہ روش اختیار کر رہا ہو، تو قرآن کی رُو سے وہ اس کو خدائی میں شریک بنائے ہوئے ہے، چاہے شرع میں اُس کا حکم بالکل وہی نہ ہو، جو اعتقادی مشرکین کا ہے!

(تفہیم القرآن - جلد دوم - ابوالاعلیٰ مودودی)

مولانا قاری محمد طیبؒ

علم غیب

کتاب و سنت اور عقل و نقل کی روشنی میں

مسئلہ علم غیب کے سلسلہ میں سب سے پہلا مرحلہ اس کی تعریف کا ہے کہ وہ کیا ہے اور اس کے معنی کیا ہیں۔ سو اس سلسلہ میں خاتم المحققین حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ علم غیب کی تعریف کرتے ہوئے فتح العزیز میں تحریر فرماتے ہیں:-

"زیراکہ من (یعنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) عالم غیب نیستم و ادعاء این علم نمی کنم چنانچہ سابق ازیں معبودان شما از جنیاں می کردند۔ بلکہ پروردگار من عالم الغیب است و غیر او را ایں علم حاصل نیست زیراکہ غیب نام چیزیست کہ از ادراک حواس ظاہرہ و باطنہ غائب باشد نہ حاضر۔ تا بمشاہدہ راہ آں دریافت شود و اسباب و علامات آں نیز در نظر عقل و فکراں در نیاید تا بہ ہدایت استدلال دریافت شود۔ (فتح العزیز پارۂ تبارک الذی ص۱۷۲)

(کیونکہ میں (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) عالم غیب نہیں ہوں۔ اور اس علم کا ادعا نہیں کرتا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے (فرضی معبود) جنات کیا کرتے تھے۔ بلکہ میرا پروردگار، عالم الغیب ہی، اُس کے سوا کسی کو یہ علم حاصل نہیں۔ کیونکہ غیب نام اس چیز کا ہے جو ظاہری اور باطنی حاسّوں کی دریافت سے غائب ہو۔ اُن سے مستحضر نہ ہو سکے۔ کہ اسے مشاہدہ سے دریافت کر لیا جائے، نیز اس کے اسباب و علامات بھی عقل و فکر کی نظر میں نہیں آ سکتے۔ کہ استدلال ہی سے وہ حاصل ہو جائے)

امام راغب آیت کریمہ یقذفون بالغیب کے تحت لکھتے ہیں:-

قولہ ویقذفون بالغیب من مکان بعید ای من حیث لا یدرکونہ ببصرھم ولا بصیرتھم!

اللہ تعالیٰ کے قول ویقذفون بالغیب میں غیب کے معنی یہ ہیں کہ نہ اس کا ادراک بصر (حاسہ نگاہ) سے کر سکیں گے نہ بصیرت یعنی کسی اندرونی حاسہ سے کر سکیں گے۔

ظاہر ہے کہ بصیرت اندرونی وجدان ہے جو عقل و فکر اور سوچ بچار یا کشف و انکشاف سے بنتا ہے اس لئے حاصل یہ نکلا کہ غیب وہ ہے جو انسان کی اپنی کسی بھی ادراکی قوت سے خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی حاصل نہ ہو سکے۔ پھر وہ کیسے حاصل ہو؟ سو اُس کے بارے میں خود امام راغب ہی لکھتے ہیں کہ:-

والغیب فی قولہ تعالیٰ یومنون بالغیب مالا یقع تحت الحواس ولا تقتضیہ
بداھۃ العقول وانما یعلم بخبر الانبیاء علیہم السلام (مفردات راغب ص۳۶۷)
اور غیب اللہ تعالیٰ کے قول یومنون بالغیب میں وہ ہے کہ جو نہ حواس کی گرفت میں آسکے نہ
عقلی تقاضوں سے دریافت ہوسکے بلکہ وہ صرف انبیاء کی خبر سے جانا جائے !

بہرحال یہاں تک غیب کی تعریف یہ نکلی کہ حواس و عقل اور کشف و انکشاف سے بالاتر ہو۔ صرف پیغمبر کی خبر سے دریافت ہوتا ہو۔ لیکن غیب کے یہ معنی ظاہر ہے کہ ہمارے اعتبار سے ہی ہوسکتے ہیں کیونکہ پیغمبر کی اطلاع کا تعلق ہم ہی سے ہے۔ لیکن اگر خود پیغمبر کے بارے میں سوال ہو کہ انھیں یہ علم کیسے حاصل ہوا تو ظاہر ہے کہ پیغمبر کے لئے خود اسی پیغمبر کی خبر کو ذریعہ علم کہنا تو لایعنی بات ہوگی، اسلئے تدریجی طور پر یہی کہا جائے گا کہ علم غیب کے لئے جو وسائل اُمت کے حق میں منفی ہیں، یعنی عقل و نظر اور فکر و بصیرت وغیرہ کہ اُن سے اُمت کو علم غیب حاصل نہیں ہوسکتا، وہ نبی کے حق میں بھی بدستور منفی رہیں گے۔ کہ انبیاء کو بھی اُن وسائل سے علم غیب حاصل نہیں ہوگا۔ البتہ خبر پیغمبر کے بجائے پیغمبر میں خدا کی خبر ذریعۂ علم غیب بنے گی۔ جس کو وحی کہتے ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ علم غیب کا ذریعہ مخلوق کے لئے صرف وحی ہے۔ جو پیغمبر پر براہ راست پڑتی ہے۔ اور اُمتی کو اس کی نقل بواسطہ پیغمبر پہنچتی ہے اور اس طرح نبی اور اُمتی صرف خدا کی اطلاع ہی سے غیب پر مطلع ہوسکتے ہیں۔ خود اپنی کسی ادراکی طاقت عقل و نظر یا حس و وجدان سے مطلع نہیں ہوسکتے۔!

اب آگے یہ سوال کہ خدائے برحق غیب پر کس طرح مطلع ہے ؟

تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ وہ بلا کسی سبب اور بلا کسی وسیلہ کے خود بخود اُس پر مطلع ہے، اس کا علم وسائل کا محتاج نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی خود ہر کمال کا سرچشمہ ہے اور ساتھ ہی محیط الکل بھی ہے، تو وسیلہ آئے تو کہاں سے آئے۔ مثلاً اگر اس کا علم کسی بیرونی ذریعہ سے حاصل شدہ مانا جائے تو اُس سے باہر ہے کون، جو اُسے علم پہنچائے، وہ خود ہی سب کا باہر کو اس کا لامحدود احاطہ کے ہوتے ہوئے باہر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب اس کا احاطہ ہر جہت میں لامحدود ہے ۔۔۔ واللہ بکل شیءٍ محیط۔ نیز اس کے علمی احاطے سے کوئی چیز باہر رہتی ہی نہیں۔ کہ باہر کسی علمی وسیلہ کی بود و نمود ہو۔ واحاطہ بکل شیءٍ علماً اگر اس سے اوّل کوئی وسیلہ علم مانا جائے تو اس سے پہلا ہے کون۔ جو اسے علم سکھائے، کہ وہی سب کا اوّل ہے، اُس کے بعد اگر کسی کو وسیلہ مانا جائے، تو اس کا بعد ہے کب کہ کوئی اس کے بعد آئے۔ کیونکہ وہی سب کا بعد اور آخر ہے۔ اس کے اُوپر کوئی وسیلہ علم مانا جائے تو اُس سے اُوپر کون ہے۔ کہ اُس پر علم کا اثر ڈالے کہ وہی سب سے اُوپر ہے اور اس کے اندر ذات سے الگ کوئی استعداد اور قوت مانی جائے جو علم قبول کرے، تو اس کے اندر غیر ذات ہے کون، جو باہر کا علمی اثر قبول کرے کہ وہی سب کا اندرون اور باطن ہے !

هو الاول لیس قبله شیءٌ وهو الاخر لیس بعدہٗ شیءٌ وهو الظاهر لیس فوقه شیءٌ
وهو الباطن لیس دونه شیءٌ۔
وہی اوّل ہے اُس سے قبل کوئی شئے نہیں۔ وہی آخر ہے اس کے بعد کوئی شئے نہیں۔ وہی ظاہر ہے
اُس سے اُوپر اور نمایاں کوئی شئے نہیں۔ وہی باطن ہے اس کے اندر کوئی شئے نہیں !

غرض اللہ تعالیٰ ہی کی وہ ذات ہے جو اوّل، آخر، ظاہر و باطن ہے ! جس میں صفات کمال بھری ہوئی نہیں ہیں۔ بلکہ اُس کی

ذات سے صادر ہو رہی ہیں۔ منبع کمال خود ذات ہے، ذات کو صفات کمال سے عروج نہیں ہے بلکہ صفات کمال کو ذات سے عزّت ملی ہے کہ وہ اُس سے اسی طرح پھوٹ رہی ہیں جیسے سورج سے شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ پس جیسے سورج کی عزّت کرنوں سے نہیں بلکہ کرنوں کی عزّت ذات سے ہے۔ کہ اس سے وابستہ ہیں۔ ایسے ہی علمی اور عملی کمالات سے اسے عزت نہیں ملی بلکہ ان کمالات کی عزت اس لئے ہے کہ وہ ذات عزّت کے آثار ہیں۔ اور اس سے سرزد شدہ ہیں !

پس ذات خول نہیں ہے کہ صفات اُس میں پانی کی طرح بھری ہوئی ہیں۔ بلکہ صمد ہے، ٹھوس ہے کہ ہر کمال ذات کا جوہر ہے۔ جو ذات سے سرزد ہو رہا ہے، اس لئے غیب اُس کی ذات کا جوہر ہے۔ کسی خارجی، داخلی یا اوپر نیچے کے وسیلے یا سبب سے حاصل شدہ نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب ذات خود بداہتہ عالم الغیب ہے تو علم غیب اصل میں ذات حق کی چیز ہوئی کسی غیر کی نہ ہوتی۔ کیونکہ جو غیر بھی غیب پر مطلع ہوگا وہ اُس کے واسطہ سے ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ علم کا کسی واسطہ سے آنا ہی اُس کی دلیل ہے۔ کہ وہ علم اپنا نہیں۔ جیسے بلا واسطہ از خود ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ علم اپنا ہے، اس سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ علم غیب صرف حق تعالیٰ کی چیز ہے، وہیں علم غیب کی جامع تعریف بھی نکل آئی کہ:۔

علم غیب وہ ہے جو بلا واسطہ اسباب ہو، جب بھی وہ بلا واسطہ آئے گا تو وہ حقیقی معنی میں علم غیب نہ ہوگا۔ بلکہ علم غیب کی ہو بہو حکایت اور من وعن نقل ہوگی۔ اور سب جانتے ہیں کہ علم کے عادی وسائل میں سے وحی الٰہی بھی ایک وسیلہ ہے، بلکہ اوّلین وسیلہ ہے، جس کے توسط سے عالم بشریت کے علم کی ابتداء ہوئی ہے !

کشف ہو یا الہام، فراست ہو یا وجدان، سب بعد کے وسائل اور وحی کے دست نگر توابع میں سے ہیں۔ خود اصل نہیں۔ اس لئے عادتاً حصولِ علم کا سب سے پہلا، سب سے زیادہ، قطعی اور یقینی وسیلہ یہی وحی الٰہی ہے! جس کے ذریعہ سے انسان علم سے آشنا ہو کر عالم کہلاتا ہے۔ پس جیسے سمع، بصر، عقل وخرد، حدس وتجربہ، کشف والہام، علم کے کھلے اور چھپے ذرائع ہیں۔ جن کے واسطہ سے عالم الغیب والشهادة اس ظلوم وجہول انسان کو علم سے سرفراز فرماتا ہے۔

ایسے ہی وحی بھی ایک رفیع المنزلت اور لطیف ترین وسیلہ علم ہے، جو صرف انبیاء علیہم السلام جیسے لطیف الاجسام، لطیف الارواح لطیف القلوب اور لطیف الاسرار مقدس گروہ کو عطا ہوتا ہے اور وہ اُس کے واسطہ سے علومِ الٰہیہ، مرضیاتِ خداوندی اور شرائع ربّانی کو جذب کرتے ہیں! یا اُن کی پاکیزہ ارواح غیب کے عالم کی طرف رُخ کرتی ہیں جو عام نگاہوں سے اوجھل اور تمام علوم و کمالات کا سرچشمہ ہے۔ وہاں اُنھیں حقائق اور ملکوت کا رُوحانی مشاہدہ ہوتا ہے اور وہ اُن سے علم اخذ کرکے دُنیا کو دیتی ہیں۔ جن سے دُنیا میں علم کی روشنی پھیلتی ہے اور جن و بشر عالم کہلائے جانے کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وحی کے سوا دُوسرے وسائل کسبی ہیں، جنہیں مشق ومحنت اور ریاضت ومجاہدہ سے حاصل کرکے حصولِ علم کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن وحی الٰہی نبوّت کے بغیر نہیں ہوتی اور نبوّت محض ایک موہبتِ الٰہی ہے جو بہ انتخاب خداوندی منتخب افرادِ بنی آدم کو دی جاتی ہے۔ اس لئے وحی بھی ایک موہبتِ ربّانی ہے جو بلا کسب ومجاہدہ محض عطاءِ الٰہی سے مخصوص نفوسِ قدسیہ کو دی جاتی ہے !

اللہ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ

اس لئے وحی کا علم قطعی اور یقینی ہوتا ہے جس میں شک کی ادنیٰ گنجائش نہیں ہوتی کہ اُن کی بُنیاد انتخابِ الٰہی اور عطاءِ ربّانی کی طاقتوں پر ہے۔ جس میں زوال یا اضمحلال کی کوئی صورت نہیں۔ اور وحی کے سوا ہر وسیلہ علم سے حاصل شدہ یقینی اور غیر یقینی دونوں جہتوں میں منقسم ہو سکتا ہے کہ اُس کی بُنیاد خود بشری قوّت پر ہوتی ہے۔ جو کمزور بھی ہے اور ممکن الزوال بھی ہے !

لیکن اس کسب اور وہب کے فرق سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وحی اور غیر وحی دونوں علم کے وسائل ہیں۔ جو عادتاً بنی آدم کو دیئے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض وسائل بلا استثناء ہر انسان کو حسب لیاقت عطا ہوئے، جیسے سمع، بصر اور عقل و خرد وغیرہ اور بعض مخصوص طبقات کو ملے ہیں۔ جیسے کشف و الہام وغیرہ۔ اور بعض اخص خواص طبقہ کو دیئے گئے۔ جیسے وحی خداوندی جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ہم علم غیب کی تعریف کی روشنی میں عرض کر چکے ہیں۔ کہ اس کے معنی بلا واسطہ سبب علم کے ہیں۔ اس لئے پیغمبروں کی خبر سے ہمیں اگر وہی علم حاصل ہو جو اُن کو ہوتا ہے۔ تو وہ علم غیب نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ ایک عادی سبب یا واسطہ سے پہنچا اس لئے اسے حکایت و بیان علم غیب کہا جائیگا حقیقی علم غیب نہیں کہا جائیگا۔ کیونکہ علم وحی کے سبب سے پہنچا ہے اور علم غیب وہ ہے جو عادی اسباب کے واسطہ سے سامنے نہ آئے !!

اس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ علم غیب کے معنی لغت میں تو کسی مخفی شے کے جان لینے کے ہیں۔ لیکن شریعت میں علم غیب کا لفظ لغت نہیں بلکہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی چھپی ہوئی یا غائب اشیاء کے جان لینے کے نہیں بلکہ اُس علم کے ہیں جو عادی وسائل کے واسطہ کے بغیر خود بخود حاصل ہو۔ یعنی وہ اسباب عادیہ سے غائب ہو اور جو اُن کے ذریعہ نمایاں نہ ہو۔

مثلاً ۔ ہم حواس خمسہ کے ذریعہ محسوسات کا علم حاصل کریں تو اسے علم غیب نہیں کہا جائے گا۔ گو علم سے پہلے یہ محسوسات ہم سے غائب اور مخفی تھیں اور بلحاظ لغت اُن کے علم کو علم غیب کہنے کی گنجائش ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اصطلاحی علم غیب نہ ہوگا۔ کیونکہ ان محسوسات کا علم ہم نے اُن اسباب کے ذریعہ حاصل کیا جو عادتاً اس علم کے حصول کے قدرتی اسباب ہیں۔ یا مثلاً ہم نے سوچ بچار، عقل و تدبر اور فکر و نظر سے چند نامعلوم نتائج معلوم کر لئے جو بلاشبہ ہمارے لحاظ سے غیب تھے۔ لیکن نہیں کہا جائے گا کہ ہمیں علم غیب حاصل ہو گیا۔ کیونکہ ان نتائج کا ادراک ہمیں فکر و نظر اور سوچ بچار کے وسیلہ سے ہوا۔ جو اس علم کے حاصل کرنے کے طبعی اسباب مانے جاتے ہیں اور اسباب طبعیہ کے توسط سے جو علم حاصل ہوتا ہے اصطلاح میں علم غیب نہیں کہا جاتا !

یا مثلاً تجربہ سے ہمیں بہت سی مخفی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، جو ناتجربہ کاروں کو معلوم نہیں ہوتیں، مگر پھر بھی ان مخفیات کے علم کو علم غیب نہیں کہیں گے۔ کیونکہ تجربہ خود آلاتِ علم میں سے ہے، جو عادتاً تجرباتی علوم کے لئے بطور سبب اور وسیلہ کے استعمال ہوتا ہے۔

یا مثلاً اہل اللہ اور اولیائے کرام کو کشف و الہام کے ذریعہ کسی بات کا علم ہو جائے جو یقیناً ایک مخفی امر تھا تو لغتاً تو اُسے علم غیب کہہ سکیں گے کہ غیبی امور کا انکشاف ہوا۔ لیکن شرعاً علم غیب نہ کہیں گے۔ کیونکہ کشف و الہام بھی بہرحال حصولِ علم کا ایک قدرتی اور عادی وسیلہ ہے۔ جو مخصوص افراد کو دیا جاتا ہے اور وہ اُس کے ذریعہ بڑے بڑے اسرار پر مطلع ہو جاتے ہیں !

بہرحال علم کے حسّی وسائل ہوں یا معنوی، کھلے ہوئے ذرائع ہوں یا چھپے ہوئے، اُن سے حاصل شدہ علم کو شرعاً علم غیب نہیں کہا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جب اصطلاحاً علم غیب وہی ہوگا جو عادی وسائل سے بالاتر ہو کر بلا توسط اسباب از خود ہو۔ تو حاصل یہ نکل آیا کہ علم غیب بجز ذات بابرکات خداوندی اور کسی کے لئے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ غیر خدا کو جب بھی علم ہوگا اور جیسا بھی ہوگا۔ وہ عطاء الٰہی ہوگا۔ اور مذکورہ وسائل میں سے کسی نہ کسی وسیلہ کے واسطہ سے ہوگا، خواہ

وحی سے ہو یا کشف الہام سے، تجربہ سے ہو یا حواس سے ہو، یا عقل و خرد سے۔ یعنی ظاہری وسائل کے راستہ سے ہو یا باطنی اور معنوی اسباب کے طریق سے — !

اس لئے علم غیب خاصۂ خداوندی نکل آتا ہے اور یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی بھی بشر کو علم غیب حاصل نہیں۔ جبکہ کوئی بھی غیر اللہ بلا توسط اسباب خود بذاتہٖ عالم نہیں ہو سکتا۔ خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء۔ ملائکہ ہوں یا ارواح قدسیہ۔ یہ الگ بات ہے کہ انبیاء، اور بالخصوص سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مخلوقات کے علوم سے بدرجہا زائد اور فائق ہے۔ لیکن پھر بھی وہ حاصل شدہ علم بہرحال وحی سے ہے، جو اسباب عادیہ میں سے علم کا ایک سبب اور اعلیٰ ترین سبب ہے۔ اس لئے کسی پیغمبر پر بھی عالم الغیب کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے علم غیب کو حصر کے ساتھ جگہ جگہ صرف اللہ ہی کی ذات کی طرف منسوب اور اُسی کے ساتھ مخصوص بتلایا ہے۔ فرمایا :-

فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ۔ — تُو کہہ دے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے سو منتظر رہو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ۔ — تُو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ — ! — اور اللہ کے پاس ہر چھپی بات ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور اور اُسی کی طرف رجوع ہے !

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ۔ — اور اُسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی کہ اُن کو کوئی نہیں جانتا، اُس کے سوا — !

وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ — اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی۔

پہلی آیت میں مثبت انداز میں اِنَّمَا کے ساتھ علم غیب کا اثبات صرف اللہ کے لئے کیا گیا جو حصر کا کلمہ ہے، دوسری میں نفی عام کے بعد استثنائیہ کلمہ سے علم غیب کو صرف اللہ کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا جو حصر کی ترکیب ہے۔ تیسری آیت میں تقدیم خبر تاخیر مبتدا کے ساتھ مرجع الامر اور عالم الغیب صرف ذات حق کو بتلایا گیا جو حصر کا اسلوب ہے۔ اور چوتھی آیت میں سید الاولین و الآخرین نے حکماً اور مامور ہو کر اپنے سے علم غیب کی نفی فرمائی اور جب آپ کو ہی علم غیب نہیں جو کمالات بشری کے منتہا اور خاتم ہیں۔ تو مخلوقات میں کون رہ جاتا ہے جس کے لئے یہ کمال ثابت کیا جائے !

اس لئے نتیجتاً علم غیب کا استحقاق اور ثبوت حصر کے ساتھ صرف حق تعالیٰ کے لئے ہی رہ جاتا ہے اور حاصل یہ نکل آیا کہ عطائے علم حقیقی علم غیب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ثابت ہوا کہ قرآنی تصریحات کے مطابق علم غیب صرف اللہ رب العزت کو ہے اور کسی کو نہیں !

اس سے دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ علم غیب کا لفظ مختفیات اور مغیبات ہی کے ساتھ خاص نہ ہوگا، جبکہ اس کے معنی ہی مخفی شئے کے جاننے کے نہیں، بلکہ بلا سبب بالذات جاننے کے ہیں، خواہ وہ چھپی ہوئی ہو یا کھلی ہوئی۔ اس لئے آسمان و زمین کا جاننا، ذرّوں اور ستاروں کا علم اور ساری کی محسوسات کا علم بھی علم غیب ہو سکتا ہے، اگر بلا توسط اسباب عادیہ ہو یعنی عطاء غیر نہ ہو۔ بلکہ ذاتی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ بالذات ہر شئے کا ادراک کما ہی حق تعالیٰ کے سوا دوسرے کو نہیں۔

کیونکہ اس کا علم کسی وسیلہ اور ذریعہ کا محتاج نہیں، بلکہ ذاتی ہے، اس لئے جو اپنے ذاتی علم سے جو چیز بھی جانتا ہے شرعاً اُسے علم غیب کہیں گے، خواہ وہ شے معلوم لغوی غیب ہو یعنی مخفی ہو یا لغوی شاہد ہو یعنی مشاہد ہو۔ غرض نہاں و عیاں سب کے علم کو علم غیب کہیں گے، جبکہ وہ بالذات ہو، نہ کہ محض مخفی شے کے علم کو علم غیب کہا جائے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کسی شے کا غیب یا مخفی ہونا ہمارے لحاظ سے ہے نہ کہ حق تعالیٰ کے لحاظ سے کہ اس کے سامنے تو ہر چیز ہمہ وقت حاضر اور عیاں ہے، اگر چھپی ہوئی اور اوجھل شے کے جاننے کا نام علم غیب ہوتا تو حق تعالیٰ کو کسی وقت بھی عالم الغیب نہ کہہ سکتے کہ وہاں کوئی چیز بھی غیب یعنی مخفی اور اوجھل ہے ہی نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ ذاتِ حق میں علم غیب کے معنی مخفیات کے علم کے نہیں بلکہ بالذات علم کے ہیں جو اسباب عادیہ کے واسطے کے بغیر اور ان سے بالاتر ہو کر محض ذات سے ہو اور ذات ہی علوم کے لئے منشاء انکشاف ہو اور یہ صرف اُسی کی ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص ہے!

بخلاف بشر کے کہ بہت سی مخفیات اور امور غائبہ کے بعد بھی اُس سے غائب ہی رہتی ہیں، جیسے جنت و نار، عرش و کرسی ہے۔ لوح و قلم وغیرہ کا قطعی علم اور حتمی عقیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ اشیاء ہم سے غائب ہیں۔ اس لحاظ سے لغوی توسعات سے اگر عالم الغیب کہلایا جا سکتا تھا تو صرف انسان نہ کہ ذاتِ حق۔ لیکن جبکہ شرعاً علم غیب کے معنی بھی یہ نہیں کہ مخفی شے کو جان لیا جائے، بلکہ یہ ہیں کہ اشیاء کو بلا توسط وسائل ذاتی طور پر جانا جائے تو اس لحاظ سے اللہ کے سوا کوئی غیر اللہ عالم الغیب نہیں ہو سکتا۔ صرف خدا ہی کو عالم الغیب کہنے کا حق ہوگا۔ اس لئے اس کی عمومی شان فرمائی گئی:۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَاءٌ مِّنكُم مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَن جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ۔

جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا۔ سب سے بڑا برتر۔ برابر ہے تم میں جو آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر اور جو چھپ رہا ہے، رات میں اور جو گلیوں میں پھرتا ہے دن کو۔

پس وہ غیب و شہادۃ کو بطور علم غیب کے جانتا ہے، یعنی بلا توسط اسباب بذاتہ اس پر مطلع ہے۔ خواہ اُس کی یہ معلومات ہماری نظر سے چھپی ہوئی ہوں یا ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں۔ پس غیب و شہود ایک تو معلوم کی صفت ہے۔ وہ تو لغت ہے یعنی آنکھ، ناک، کان وغیرہ حواس سے اوجھل چیز تو غیب ہے اور ان مدرکات کے سامنے آئی ہوئی چیز مشاہد ہے۔ اور ایک غیب صفت علم کی ہے، وہ اصطلاح شریعت ہے جس سے مراد حسب معروضہ سابق وہ علم ہے جو حواس ظاہرہ و باطنہ اور عادی اسباب علم سے بالاتر ہو کر خود ذات میں موجود ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ ذات بجز اللہ کے دُوسری نہیں کیونکہ اُس کا علم خود اپنا اور اپنی ذات سے ہے، کسی کا دیا ہوا یا کسی کے واسطے سے نہیں۔ کہ اسے وسیلہ اور سبب کی ضرورت پڑے۔ ہاں اس کے سوا جسے بھی کچھ علم ہے جو اُس کے دینے سے ہے از خود نہیں اور اس کا دینا ہی بالواسطہ علم کا آنا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی عطا یا اسباب ظاہرہ سے ہوگی جیسے حواس ظاہرہ یا اسباب باطنہ سے ہوگی، خواہ وہ اسباب خفیہ ہی ہوں جیسے عقل و فکر کشف، الہام اور وحی۔ چنانچہ شق اوّل کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:۔

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔

اور اللہ نے تم کو نکالا، تمہاری ماں کے پیٹ سے۔ نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو۔ اور دیئے تم کو کان آنکھیں اور دل تاکہ تم احسان مانو!

شقِ ثانی کی نسبت فرمایا:-

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ -

اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے، تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور ایمان - ولیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی اس سے راہ سجھا دیتے ہیں جس کو ہم چاہیں اپنے بندوں میں سے - اور بیشک تو سیدھی طرف رہنمائی کرتا ہے - !

دوسری جگہ فرمایا:-

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ - !

یہ خبریں غیب کی ہیں جو ہم بھیجتے ہیں تجھ کو - اور تو نہ تھا اُن کے پاس جب ڈالنے لگے اپنے قلموں کو کہ کون پرورش میں لے مریم کو اور تو نہ تھا اُن کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے !

بہرحال ذاتی علم کی نفی جیسے عام انسانوں سے کی گئی جو ماؤں کے پیٹ سے نکالے ہوئے ہیں، ایسے ہی سید الاولین والآخرین سے بھی کی گئی اور عطائی علم کا اثبات جیسے عام بشر کے لئے آیت اولیٰ میں کیا گیا ہے جیسے اپنے جعل اور اپنے خلق کی طرف منسوب کر کے صرف اپنی عطا فرمایا گیا، ایسے ہی سید الاولین والآخرین کے علم کو بھی اپنی ہی عطا کہا گیا - اور اپنے جعل کی طرف منسوب کیا گیا - فرق اتنا ہی ہے کہ وحی عطا محض ہے، جو بلا کسب و ریاضت کے ہے، کیونکہ رسالت کے تابع ہے اور رسالت کو حیثیت بجعل رسالتہ فرما کر موہبت الٰہی قرار دیا گیا ہے ! اور سمع و بصر یا فوادی حرکت کسبی ہے، جس میں سوچ بچار، تجربہ، حدس، اور سارے اکتسابی وسائل آجاتے ہیں -

لیکن قدرِ مشترک دونوں میں یہ ہے کہ انسان خواہ مشاہدات کا علم حاصل کرے یا مخفیات کا - چونکہ وہ اسباب عادیہ کے تابع ہے خواہ وہ حسّی ہوں یا معنوی، اس لیے اس کا علم ذاتی نہ ہوگا، عطائی ہوگا اور عطائی علم چونکہ اسباب عادیہ کے تحت تھے - اس لئے اس کے حامل کو " عالم الغیب " نہ کہیں گے، ہاں حق تعالیٰ کا علم ان چیزوں کے متعلق خواہ وہ کھلی ہوئی ہوں یا لغتاً چھپی ہوئی ہوں - علم غیب ہوگا — کہ سارے اسباب سے بالاتر محض ذاتی ہے جس میں عطائی ہونے کا شائبہ تک نہیں !

اس لئے عالم غیب صرف اللہ کی ذات با برکات ثابت ہوتی ہے جیسے عالم الغیب والشہادۃ کہہ کر علی الاطلاق، عالم غیب منوایا گیا ہے، پس جہاں غیب و شہادۃ کو تقابل کے ساتھ لایا گیا ہے، وہاں یہ شہادۃ و غیب علم کی صفت نہیں ہوگی بلکہ معلومات کی صفت ہوں گی، جو علم الٰہی میں آئی ہوئی ہیں - جس کو لغتاً شاہد و غائب کہیں گے - لیکن جہاں غیب خدا کے برحق کے علم کی صفت بن کر آیا ہے - وہاں وہ لغت نہیں بلکہ اصطلاح ہوگا - جس کے معنی وہی بلا توسط اسباب ذاتی علم کے ہوں گے، جو از خود کسی کی عطا سے نہ ہو - چنانچہ ایک موقع پر فرمایا گیا:-

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ -

اور کوئی چیز نہیں جو غائب ہو آسمان اور زمین میں مگر موجود ہے کھلی کتاب میں — !

یہاں غائبہ اشیاء معلومہ کو کہا گیا ہے جو صرف ہمارے اعتبار سے غائب ہیں، اور نہ اُس پروردگار کے لحاظ سے کوئی چیز غائب نہیں۔ سب اُس کے سامنے حاضر ہے ۔ !

لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ اِلَّا فِی كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ

غائب نہیں ہو سکتا اس سے کچھ ذرّہ بھر آسمانوں اور نہ زمین میں، اور کوئی چیز نہیں اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی جو نہیں کھلی کتاب میں!

قرآن کی اس تصریح کے باوجود کہ کوئی چیز بھی اُس سے کسی وقت بھی غائب نہیں، ہر چیز ہمہ وقت اُس کے سامنے حاضر ہے۔ کہ اس کا علم ہی حضوری ہے حصولی نہیں، پھر بھی اُسے عالم الغیب کہا جا رہا ہے، تو اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ عالم الغیب ہونے کے معنی اشیاء غائبہ کے جان لینے کے نہیں بلکہ تمام اشیاء کو ذاتی طور پر جاننے کے ہیں۔ جس میں اسباب و وسائل کا ادنیٰ دخل نہ ہو۔ جس سے واضح ہے کہ یہ غیب کسی غائب کی صفت نہیں جو لغت ہے بلکہ اسباب سے بالاتر اور بالذات کے معنی میں ہے جو اصطلاح شریعت ہے۔ اس لئے کوئی بشر باصطلاح شریعت اور بمعنیٰ مذکور عالم الغیب بن ہی نہیں سکتا۔ کہ اُس کے لئے علم غیب کلی یا جزئی کا سوال پیدا ہو۔ بلکہ غیب بایں معنی (علم بالذات) خاصۂ خداوندی ہوگا کہ اُسے کسی نے معاذ اللہ وحی والہام سے یہ باتیں نہیں بتائیں۔ نہ اُس نے کسی تجربہ یا حدس سے یہ علم فراہم کیا۔ کہ یہ سب صورتیں علم بالوسائل کی ہیں۔ علم بالذات کی نہیں۔ اور ان تمام طرق علم میں علم سے پہلے جہل رہنا ضروری ہے، جس سے ذاتِ حق بری اور منزّہ ہے !

بہرحال یہاں تک علم غیب کے معنی اور اس کے شرعی حکم کے بارے میں کتاب و سنّت کی تشریحات پیش کی گئیں، جن سے علم غیب کا شرعی نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اب آگے علم غیب کے اس معنی کی تشریح و توضیح اور اس سلسلہ میں کئے گئے شبہات کی مدافعت کی ضرورت رہ جاتی ہے، جنہیں سطور ذیل میں ملاحظہ کیا جائے ۔ !

علم غیب کی تشریح اور متعلقہ شبہات کا ردّ

علم غیب کے مسئلہ میں جامع ترین ہدایت نامہ آیت اظہار غیب ہے، جس میں مختلف پہلوؤں سے علم غیب کا حکم، اُس کے اجزاء ترکیبی اور اُس کے راستے سے نہ صرف حق تعالیٰ کی وحدانیت ہی کا ثبوت پیش کر دیا گیا ہے، جس سے علم غیب کی تخصیص اُس کی ذات بابرکات کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے ! بلکہ دفاعی طور پر آیت کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک انداز بیان سے غیر اللہ سے علم غیب کی کلی نفی اور اس سے متعلق ہر ہر شبہ کا حل اور ہر ایک ذہنی خلجان کا جواب بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ آیت مُثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے علم غیب کے مسئلہ کا جامع حکم اور معجزانہ بیان ہے۔ جس سے اس دائرہ کے تمام شرک آمیز تصورات کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ ارشادِ حق ہے:۔

عالم الغیب فلا یظہر علیٰ غیبہ احداً الّا من ارتضیٰ من رسول فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصداً لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربّہم واحاط بما لدیہم واحصیٰ کل شیٔ عدداً ۔ !

اور غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ ان مگر اپنے کسی برگزیدہ

پیغمبر کو، تو اس پیغمبر کے آگے پیچھے پہرہ چوکی بٹھلا دیتا ہے (محافظ فرشتے بھیجتا ہے اور خفیہ قوتوں کی ناکہ بندی کر دیتا ہے) تاکہ اللہ جان لے (واضح کر دے) کہ رسولوں نے (رسول ملکی نے نبی تک اور رسول بشری نے اُمت تک) اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیئے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن تمام باتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جو ان (رسل) کے پاس ہے۔ اور اُس کو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے!

ترجمہ سے آیت کا مفہوم ظاہر ہے، غور اس پر کیجئے کہ اس معجزانہ کلام میں حق تعالیٰ کو یکہ و تنہا، بلا شرکت غیرے عالم الغیب ثابت کرنے کی بناء اس پر رکھی گئی ہے کہ وہی تنہا بلاشرکت غیرے اطلاع دہندۂ غیب ہے۔ اسی کے بتانے اور ظاہر کرنے سے کسی کو غیب کی اطلاع ہو سکتی ہے، ورنہ کوئی صورت نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ کسی شئے کا پتہ دینے والا وہی ہو سکتا ہے جس کے علم میں وہ شئے ہو اور پتہ لینے والا وہی ہو سکتا ہے جو اُس شئے اور اس کے علم سے خالی ہو۔ ورنہ اگر پتہ دینے والا اس سے بے بہرہ تھا تو اس نے پتہ کس چیز کا دیا؟ اور پتہ لینے والا اگر اس سے خالی نہ تھا تو اُسے لینے اور دوسرے کے آگے اپنے احتیاج ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس لئے حق تعالیٰ کا اطلاع دہندۂ غیب ہونا اُس کے عالم الغیب ہونے کی دلیل نکلتا ہے۔ گویا ابتداءِ آیت میں کلمۂ "عالم الغیب" ایک دعویٰ ہے اور "فلا یظہر" اس کی دلیل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب یہ اطلاع دہی اسی کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ آیت کا نظم اور انداز بیان بتلا رہا ہے تو عالم الغیب ہونا بھی لامحالہ اُسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہونا چاہیئے جو آیت کا مدعا ہے!

پس آیت کے مفاد کا حاصل یہ نکلا کہ وہی یکہ و تنہا عالم الغیب ہے اور وہی بلاشرکت غیرے اطلاع دہندۂ غیب ہے غور کیا جائے تو اس دعوے اور دلیل کو قرآن نے ایسے اعجازی اسلوب بیان سے ادا کیا ہے کہ اس دعوے پر جس قدر بھی شبہات و سوالات وارد ہو سکتے تھے، ان سب کا جواب اور دفعیہ بھی اسی آیت کے کلمات میں مہیا کر دیا ہے۔ کہیں باہر سے جواب لینے کی ضرورت نہیں!

(۱) مثلاً شبہ یہ ہو سکتا تھا کہ اطلاع دہندۂ غیب ہونے کی تخصیص حق تعالیٰ کے ساتھ کس طرح قابل تسلیم ہو سکتی ہے۔ جبکہ بہت سی اُن اشیاء سے بھی ہم غیبی علوم پر مطلع ہو سکتے ہیں، جن کا عالم الغیب ہونا تو بجائے خود ہے سرے سے باشعور ہونا بھی ضروری نہیں، جیسے کتابوں کے اوراق، رسائل و اخبارات کے پرچے۔ ریڈیو، لاسلکی اور گراموفون وغیرہ کی مشینوں سے بھی کتنے ہی مخفی معلومات اور شرعی و طبعی حقائق کی ہمیں اطلاع ہوتی رہتی ہے۔ تو کیا ان اشیاء کو عالم الغیب کہنے کی اس لئے جرأت کی جائے گی کہ وہ غیبی علوم کی اطلاع دہی کرتی ہیں اور کیا غیب کی یہ اطلاع دہی خاصۂ خداوندی باقی نہ رہے گی؟ سو اس شبہ کا مسکت اور قاطع جواب اس آیت کے کلمۂ "فلا یظہر" میں دیا گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اظہار یا اطلاع غیب اختیاری فعل ہے۔ جو کسی صاحب اختیار ہی سے سرزد ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ روئی کے کاغذ اور لوہے کی مشینیں با اختیار اشیاء نہیں ہیں کہ ارادہ سے اطلاع دہی کا فعل کر دکھائیں۔ یعنی یہ اشیاء وسائل اطلاع ہیں، اطلاع کنندہ نہیں۔ کہ اُن کی غیر ارادی اور غیر شعوری نشاندہی کو اطلاع غیب کہا جائے۔ چہ جائیکہ اُن کے بارے میں غیب دانی کا کوئی سوال پیدا ہو۔ اس لئے ان مثالوں سے حق تعالیٰ کی اطلاع دہندگیٔ غیب کی خصوصیت پر کوئی حرف نہیں آسکتا!

(۲) مگر اس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اگر اطلاع کنندۂ غیب کے لئے با اختیار اور باشعور شخصیت ہونا ہی ضروری ہے کہ اس کے بغیر اُس پر عالم الغیب کا اطلاق کسی طرح نہیں آسکتا تو اس سے اُن با اختیار اشخاص کا عالم الغیب ہونا

لازم آئے گا۔ جو اپنے ارادہ واختیار سے غیبی باتوں کی اطلاع دیتے ہیں۔ گو وہ اس غیب کا خود کوئی شعور نہیں رکھتے۔ مثلاً حدیث نبوی میں فرمایا گیا ہے کہ:-

رب حامل فقہ غیر فقیہ — کتنے ہی حاملانِ فقہ خود فقہ سے نابلد ہوتے ہیں!

اندریں صورت یہ غیبی علوم کی اطلاع وخبر رسانی پھر حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ رہی، جو اس آیت کا سب سے بڑا مقصد اور مفاد تھا۔ سو اس شبہ کو زائل کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے اس اطلاعِ غیب کی آیت کو اپنے ذاتی نام (اللہ) سے شروع کرنے کے بجائے اپنی صفت عالم الغیب سے شروع فرمایا۔ تاکہ پہلی ہی نظر میں واضح ہو جائے کہ اطلاع دہندہ غیب وہی ہو سکتا ہے جو خود بھی غیب دانی کی صفت سے متصف اور عالم الغیب ہو - نہ کہ محض اطلاع کنندہ اور ذریعہ خبر رسانی ہو -

الغرض وحی الٰہی میں مہبطِ وحی یعنی نبیؐ کے ذاتی تفکر اور تجربہ اور سعی وجستجو کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا اور نہ خطرات ووساوس کی مخفی قوتیں (شیاطین) ذرہ برابر دراندازی کر سکتی تھیں کہ اُن پر پہرہ چوکی بٹھا دیا جاتا تھا۔ قبولِ وحی کے لئے نبی کی وہ فطرتِ ملکی مہبط بن جاتی تھی جو صرف انبیاء کے لئے مخصوص ہے۔ جو علم کا قطعی اور غیر مشتبہ واسطہ اور وسیلہ ہے۔ لیکن وسیلہ پھر وسیلہ ہی ہے، اس لئے وسائل سے حاصل شدہ علم کے حامل کو "عالم الغیب" نہیں کہہ سکتے کہ "عالم الغیب" صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ جس کا علم عطائی نہیں، ذاتی ہے اعلم کا اطلاع دہندہ نہیں کہا جائے گا کہ حق تعالیٰ کی اطلاع دہی غیب میں کسی قسم کے شرک کا واہمہ پیدا ہو۔ پس علم غیب کی اطلاع دہی کی شان صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص رہی جبکہ وہی عالم الغیب بھی رہا۔ اور وہ اطلاع دہندہ غیب بھی — !

(۳) ہو سکتا تھا کہ اس پر کوئی یوں کہے کہ اگر اطلاع دہی غیب کے لئے خود کا غیب سے باخبر ہونا ضروری ہے تو یہ شان تو غیر اللہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ منجم، جفار، رمال، کاہن، طبیب، پامسٹ وغیرہ بہت سی پیشین گوئیاں کرتے اور مستقبل کی خبریں اپنے علم ومہارت اور ظن وتخمین سے دیتے ہیں اور وہ بسا اوقات پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ نیز اولیاء اللہ اپنے کشف وفراست سے بہت سے غیبی حقائق واسرار پر مطلع ہو کر دوسروں کو مطلع کر دیتے ہیں۔ اور وہ اکثر وبیشتر صحیح اور واقعہ کے مطابق ہوتی ہیں۔ جو اُن کے غیب داں ہونے کے ساتھ ساتھ اطلاع دہندہ غیب ہونے کی بھی بیّن دلیل ہے تو پھر اطلاعِ غیب اور علمِ غیب کی تخصیص ذاتِ حق کے ساتھ کہاں باقی رہی ؟

اس شبہ کا جواب بھی فلا یظھر ہی کے کلمہ میں موجود ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت کی رُو سے غیب کی خبر خدا کی اطلاع کے بغیر ممکن نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان خبر دینے والوں میں سے کسی کو بھی یہ باتیں خدائی اطلاع یعنی وحی سے حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ یہ لوگ فنی طور پر قواعدِ فن سے استدلال کر کے ان معلومات تک پہنچتے ہیں۔ جو ظن وتخمین کی حدود سے آگے نہیں بڑھتیں اور سب جانتے ہیں کہ ظنی امور جیسے اتفاقی طور پر واقعہ کے مطابق ہو سکتے ہیں، ایسے ہی خلاف واقعہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں کہ اُن میں نہ قطعیت کی شان ہوتی ہے نہ یقینی ہونے کی۔ اس لئے جب تک انھیں کسی یقینی میزان میں تول کر اُن کے صحیح وغلط ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے، وہ یقین کے قابل نہیں ہوتے۔

ایسے ہی اولیاء اللہ کا کشف، اُن کے ریاضت ومجاہدہ کا ثمرہ ہوتا ہے نہ کہ اطلاعِ حق کا نتیجہ۔ اس لئے وہ شرعی حجت نہیں ہوتا کہ اس سے اشتباہ والتباس کلیتہً رفع نہیں ہوتا۔ جس سے وہ کتاب وسنت کی طرح قطعی یقین کے لائق ہو جائے

جب تک وحی الٰہی پر پرکھ کر اس کا کھرا کھوٹا معلوم نہ کر لیا جائے۔ اس لئے اُن کی پیشین گوئیوں کو بھی جو اُن کے کسب و محنت کے ثمرہ کے طور پر خود اُن ہی میں سے نکلی ہوتی ہیں نہ کہ اطلاعِ حق سے ظاہر شدہ ہیں، نہ علمِ غیب کہیں گے نہ اطلاعِ غیب۔ چہ جائیکہ خود اُن پر عالم الغیب یا اطلاع کنندۂ غیب کا اطلاق کیا جائے۔ پس عالم الغیب اور اطلاع دہندۂ غیب ہونا صرف حق تعالیٰ ہی کی ذات بابرکات کی خصوصیت رہ جاتی ہے جس میں کوئی اس کا سہیم و شریک نہیں ہو سکتا!

(۴) اگر اس پر یہ شبہ کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کا علم تو بہر حال اطلاعِ خداوندی سے حاصل ہوتا ہے، جس سے وہ غیب پر مطلع ہو کر دُوسروں کو اطلاع دیتے ہیں اور ساتھ ہی اُن کا یہ علم ظنی بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ قطعی ہوتا ہے کہ وحی سے زیادہ قطعی اور یقینی اور کیا چیز ہو سکتی ہے ؟

اس لئے وہ تو کم از کم اصولِ مذکورہ پر اطلاع دہندۂ غیب اور عالم الغیب کہلائے جانے کے ضرور مستحق ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں یقیناً عالم الغیب کی صفت حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص باقی نہیں رہتی، جو اس آیت کا مفاد اور منشاء تھا۔ سو اس شبہ کا ازالہ حق تعالیٰ نے علیٰ غیبہ کے لفظ سے فرما دیا ہے۔ یعنی علیٰ غیبہ کے کلمہ سے غیب کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرما کر اور بالفاظِ دیگر غیب کو اپنی ذاتی چیز بتلا کر واضح فرما دیا کہ وہ اطلاع دہندۂ غیب اور عالم الغیب اس لئے ہے کہ اس نے کسی سے اطلاع پا کر غیب کی اطلاع نہیں دی اور وہ کسی کے بتلانے سکھلانے سے غیب دان نہیں ہوا۔ بلکہ غیب اس کی اپنی ذاتی چیز ہے اور وہ بذاتہٖ عالم الغیب ہے۔ بخلاف انبیاء و رسل کے کہ وہ اگر غیب کی باتیں اُمت کو بتاتے ہیں، تو نہ اس لئے کہ یہ غیب اُن کی ذات میں تھا یا وہ از خود اُس پر ازل سے مطلع تھے۔ بلکہ اللہ کے بتلانے اور سکھانے پر انہوں نے غیبی حقائق پر اطلاع پائی اور اطلاع دی، اس لئے انبیاء کرام کو "عالم الغیب" نہیں کہہ سکتے کہ اُن کا یہ علم بالواسطہ ہے، گو قطعی اور یقینی ہے، اس لئے علیٰ غیبہ کے کلمہ سے واضح ہو گیا کہ ذاتِ خداوندی غیب دان اور اطلاع دہندۂ غیب اس لئے ہے کہ غیب اس کی ذاتی چیز ہے اور وہ غیب پر بذاتہٖ مطلع ہے۔ جس میں کوئی دُوسرا اس کا شریک نہیں — !

(۵) لیکن اس پر بھی اگر کوئی خفیف العقل یہ کہے کہ اگر علمِ غیب کے لئے بالذات ہونا ضروری ہے جو بلا کسی واسطے کے اور بغیر کسی کی اطلاع کے از خود ذات سے اُبھرے تو ہمارے محسوسات اور معقولات کا علم بھی علمِ غیب ہونا چاہیئے، کیونکہ حواسِ خمسہ، آنکھ، کان، ناک، زبان اور جلد سے دیکھ کر، سُن کر، سونگھ کر، چکھ کر اور چھو کر جو کچھ علم ہمیں ہوتا ہے وہ خود ہماری ہی ذات سے ہم میں اُبھرتا ہے۔ جس میں کسی دُوسرے کی مدد شامل نہیں ہوتی۔ ہم ہی دیکھتے، سُنتے ہیں۔ کوئی دُوسرا ہماری آنکھ کان سے نہیں دیکھتا، سُنتا، کہ اس کے دیکھنے سُننے کو ہم اپنا علم بنا لیں۔ یا خالص عقلی اکتشافات میں خود ہماری ہی عقل و قوتِ فکریہ یا قوتِ خیالیہ ایک علم کا انکشاف کرتی ہے، جو کسی سے مانگ کر نہیں لایا جاتا۔ نہ کسی دُوسرے کی عقل ہم میں گھس آتی ہے۔ جس سے ہمیں یہ علم ہوا ہو۔ بلکہ یہ خود ہماری ہی عقل کی تگ و دو ہوتی ہے۔ اس لئے یہ علم ہمارا ذاتی علم ہوا، جو از خود ہے از غیر نہیں۔ اس لئے اسے علمِ غیب کہنا چاہیئے، اور اس کی اطلاع دہی کو اطلاعِ غیب!

سو اس وسوسہ کا جواب کلمہ فلا یظہر اور کلمۂ رَصَدًا کے مجموعہ میں موجود ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ عقل و سمع یا سوچ بچار کا علم اطلاعِ خداوندی سے نہیں، بلکہ تخلیقِ خداوندی سے ہے اور خلقی شعور یا خلقی سوچ بچار کو اطلاعِ خداوندی نہیں کہہ سکتے کہ علمِ غیب کا سوال پیدا ہو۔ بلکہ سوچ سوچ کر کوئی بات پیدا کر لینا خود اس کی دلیل ہے کہ

وہ ہم میں پہیں تھی، کہیں سے لائی گئی ہے، اگر وہ ہم میں ہوتی تو اُس میں اس کاوش اور دماغ سوزی کی ضرورت نہ پڑتی، بلکہ اُسے ہمارے ذہن میں ہر وقت موجود رہنا چاہیئے تھا، جیسے خود ہماری ذات کا علم ہمیں سوچ سوچ کر لانا نہیں پڑتا ہر وقت ہم میں قائم رہتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہماری ذات ہی چونکہ عارضی ہے۔ اس لئے وہ علم بھی عارضی ہو، دوامی نہ ہو۔ جس پر علم غیب کا شبہ ہو — !

دوسرے یہ کہ محسوسات اور معقولات کا علم گو بظاہر ذات کی قوتوں سے اُبھرنے کی وجہ سے ذاتی جیسا نظر آتا ہے مگر یہ قوائے ذات جبکہ خود ذات کی اپنی قوتیں نہیں، بلکہ ذات میں ودیعت شدہ ہیں کہ ودیعت رکھنے والا جب چاہے رکھ دے اور جب چاہے نکال لے، اس لئے وہ گھٹتی بڑھتی اور آتی جاتی رہتی ہیں، تو اُن سے حاصل شدہ علم بھی اپنا یا اپنی ذات کا نہیں کہلایا جائے گا۔ اُسے بھی ودیعت شدہ ہی کہا جائے گا کہ جب چاہے ودیعت کرنے والا ہم میں ڈال دے اور جب چاہے نکال لے۔ چنانچہ اس سمع و بصر اور فؤاد کے علم کی انسانی عمر کی ابتداء میں بھی اس سے نفی کی گئی ہے۔ کہ[1] لا تعلمون شیئاً۔ اور انتہا میں بھی نفی کی گئی ہے کہ لکیلا یعلم[2] بعد علم شیئاً جس سے واضح ہے کہ اس ابتداء و انتہاء کے درمیان گھری ہوئی محدود مدت کے لئے یہ عقل و حس کا علم آجاتا ہے اور آخر میں اوّل کی طرح رخصت ہو جاتا ہے، جو اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ علم انسان کا اپنا نہیں جسے ذاتی کہہ کر اُس پر علم غیب کا لیبل چپکا دیا جائے — !

پھر اگر یہ حواس و عقل انسان میں دوامی بھی ہوتے تب بھی اُن کے واسطہ سے حاصل شدہ علم بالواسطہ ہی ہوتا جو علم غیب نہیں کہلایا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ ابتداء مضمون میں اُس کے اصطلاحی معنی عرض کئے جا چکے ہیں۔ اور جبکہ یہ وسائل بھی خود ذات اور نفس کے قبضہ کے نہیں جنہیں ہماری ذات نے اپنے اندر خود وضع کر لیا ہو، بلکہ جہاں سے ہماری ذات نے جنم لیا ہے، وہیں سے یہ قویٰ اور وسائل ادراک و شعور بھی آئے ہیں۔ تو خود وسائل بھی بالذات نہ رہے، بلکہ بالواسطہ ہو گئے۔ اس لئے ترتیب یوں ہو گئی کہ ان سے حاصل شدہ علم تو عقل و حس کے واسطہ سے ہوا اور عقل و حس وغیرہ ذات کے واسطہ سے ہوئے اور خود ذات خالق کے واسطہ سے نمودار ہوئی۔ تو یہ علم بہ واسطہ ہم میں پہنچا۔ سو ایسے واسطہ در واسطہ علم کو اپنا علم یا ذاتی علم کہنے کی جرأت وہی کرے گا جسے علم و عقل سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ چہ جائیکہ اس علم پر علم غیب کا عنوان قائم کیا جائے — !

یہی وجہ ہے کہ وحی کے وقت ان تمام ظاہری وسائل علم فکر و خیال اور حدس و تجربہ وغیرہ نیز تمام قوائے

---

[1] اشارہ ہے آیت کریمہ واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئاً وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون۔ کی طرف، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے اور اُس نے تم میں سننے دیکھنے اور سمجھنے کے آلات رکھے !

[2] اشارہ ہے آیت کریمہ ثم یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم بعد علم شیئاً۔ کی طرف۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ انسان پھر (انجام کار) لوٹا دیا جائے گا ایک ذلیل ترین عمر کی طرف، تا کہ جاننے کے بعد کچھ بھی جانکار نہ رہے !

حسیہ، سمع وبصر، ذوق و مذاق وغیرہ، اور پھر تمام جذبات طبیعیہ شہوت و غضب اور سرور و حزن وغیرہ پر پہرہ چوکی بٹھا دیا جاتا تھا۔ کہ نزولِ وحی کے وقت اُن کی آمیزش سے وحی کا علم قطعی مشتبہ نہ ہونے پائے۔ بلکہ ان طبعی وسائل سے حاصل شدہ معلومات بھی جو پہلے سے قوتِ حافظہ میں محفوظ ہوتی ہیں، یا عام طبعی عادات و اخلاق جو خلقتاً طبیعت میں بطور جوہر نفس کے پڑے ہوئے ہوتے ہیں، وحی کے وقت سب پیچھے ہٹا دیئے جاتے تھے۔ اور انھیں وحی اُترنے کے اوقات میں سبقت کرنے اور آگے بڑھنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ زبان کی حرکت تک کے بارے میں یہ فرمایا گیا:۔

لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرآنہ ثم ان علینا بیانہ

(اے پیغمبر) اپنی زبان نہ ہلائیے کہ (وحی کو یاد کرنے میں) جلدی کرنے لگیں، ہمارے ذمہ ہے
اُس کا (آپ کے سینہ میں) جمع کردینا اور (آپ کی زبان سے) پڑھوا دینا، پھر اُس کو
کھول دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے ۔۔!

(۶) یہاں پہنچکر ایک خلجان یہ دامنگیر ہوتا ہے کہ عالم الغیب صرف خدا ہی کی ذات سہی - اور یہ بھی مسلّم کہ تنہا وہی اطلاع دہندۂ غیب بھی ہے، اُس کے سوا نہ کوئی عالم الغیب ہے نہ اطلاع دہندۂ غیب، خواہ وہ رسول بشری ہو یا رسول ملکی - لیکن جبکہ اللہ نے خود بھی انھیں اپنے غیب پر مطلع کردیا جیسا کہ یہ آیت اس کا واضح اعلان کر رہی ہے تو نفسِ علم میں تو کم از کم اللہ تعالیٰ سے مماثلت ہوگی جس کا علم "ماکان وما یکون" پر حاوی ہے۔ تو اس آیت کی رُو سے "علم ماکان و یکون" اللہ کی طرح رسولوں کے لئے بھی ثابت ہوا - گو یہ فرق بھی مسلّم سہی کہ اللہ کا علم ذاتی ہو اور رسولوں کا عطائی یا ایک کا علم اصطلاح میں علم غیب کہلائے اور ایک کا مطلق علم مگر مقدارِ علم میں تو کم از کم خالق و مخلوق کی مساوات لازم آگئی، حالانکہ مساوات سے بڑھ کر اور کیا شرک ہوسکتا ہے اور وہ بھی علم میں کہ بقیہ ساری صفات اسی اصلی صفت کے تابع ہیں، اس میں برابری نتیجۃً ساری ہی صفات میں برابری ہے - پس یہ آیت جس شرک دفع کرنے کے لئے آئی تھی اسی شرک کے اثبات کا اس طرح ذریعہ بھی بنا دی گئی - بلکہ اوپر سے کئی آیتوں کی تردید بھی اسی سے لازم آگئی - ایک طرف افمن یخلق کمن لا یخلق[1] کی تردید ہوگئی اور دوسری طرف لیس کمثلہ شیٔ[2] کی تکذیب لازم آگئی - (العیاذ باللہ)

تو اس عظیم خلجان کو اسی آیت کریمہ کے لفظ "من رسول" نے دفع کردیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے اس استثنائی ترکیب میں اطلاع غیب کے سلسلہ میں کسی پیغمبر کا نام نہیں لیا کہ فلاں فلاں کو غیب پر مطلع کیا گیا - کہ اس سے ان مقدسین کی ذوات مستحق اطلاع غیب سمجھی جاتیں، بلکہ "من رسول" کا لفظ لاکر وصف رسالت کا تذکرہ کیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ اطلاع غیب کی مستحق اور مقتضی کسی رسول کی ذات نہیں بلکہ وصف رسالت ہے۔ بالفاظ دیگر اس اطلاع غیب کا تحمل صرف وصفِ رسالت ہی کرسکتا ہے، کسی بشر کی ذات یا وصف بشریت حتیٰ کہ بشریت کے اونچے اونچے کمالات تقویٰ و طہارت، زہد و قناعت اور صلاح و رشد وغیرہ میں سے

---

[1] کیا خالق اور مخلوق برابر ہوسکتے ہیں؟ یعنی کبھی نہیں -
[2] کوئی چیز اس کی مانند نہیں ہوسکتی - (برابر تو کیا ہوتی)

بھی کوئی وصف نہیں کر سکتا۔ خلاصہ یہ کہ جیسے علم غیب اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، جس میں کوئی غیر اللہ شریک نہیں، ایسے ہی اللہ کی جانب سے غیب پر مطلع ہونا رسولوں کے ساتھ مخصوص ہے، جس میں کوئی غیر رسول شریک نہیں۔ پس اطلاع غیب کا استحقاق ذاتِ رسول کے ساتھ نہیں، بلکہ وصفِ رسالت اور عہدہ و منصبِ نبوت کے ساتھ مخصوص نکلا، جو لفظ "مِنْ رَّسُوْلٍ" کا طبعی تقاضا ہے۔ ورنہ اس موقع پر مِنْ رَّسُوْلٍ کا لفظ لانا عبث اور بے معنی ہو جاتا!

اور ظاہر ہے کہ رسول کی رسالت کا موضوع اور مقصد اصلاح خلق اللہ اور بندگانِ خدا کی رہنمائی اور تربیت و تکمیل ہے۔ اس لئے وصفِ رسالت کا فطری تقاضا وہی علوم غیب ہو سکتے ہیں جو ہدایت و اصلاح میں کار آمد ہوں۔ جن علوم غیبیہ کا اصلاح و تربیت میں دخل نہ ہو تو خود وصفِ رسالت ہی اُن سے کنارے کنارے رہیگا۔ مثلاً مغیبات میں سے قیامت کے وقت اس کی تاریخ و سنہ یا اُس کی مدت کے قرب و بُعد کی اگر رسولوں کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ اسی آیت کی ابتداء میں رسول سے اس علم کی نفی کرائی گئی ہے کہ:۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْ اَمَدًا

تُو کہہ میں نہیں جانتا کہ نزدیک ہے جس چیز کا تم سے وعدہ ہوا ہے یا کر دے
اُس کو میرا رب ایک مدت کے بعد!

یا وہ مفاتیح غیب پر مطلع نہ ہوں، یا اُن بے شمار کائناتی حوادث و جزئیات کا اُنھیں علم نہ ہو، جو روزمرہ دُنیا میں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ جیسا کہ احادیث میں بکثرت اس کی تصریحات موجود ہیں۔ تو یہ اُن کے حق میں نہ صرف یہ کہ ادنیٰ نقص نہیں بلکہ ان امور کا علم نہ ہونا ہی اُن کے وصفِ رسالت کا ایک طبعی اقتضاء ہے، جیسے یوں کہا جائے کہ فلاں دیکھنے والے کو ہم نے سب کچھ بتا دیا ہے، یا فلاں سُننے والے کو ہم نے سب کچھ پتہ دے دیا ہے۔ تو اس کا صاف مطلب یہی ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو دیکھنے کی چیزوں کا اور سُننے والے کو سُننے کی چیزوں کا پتہ دیا ہے۔ کیونکہ یہ دیکھنے اور سُننے کا عنوان اپنے ہی مناسبِ حال معلومات کا تقاضا کر رہا ہے، پس دیکھنے والے سے اگر سُننے کی باتوں کی اور سننے والے سے اگر دیکھنے کی باتوں کی نفی کی جائے تو یہ اس دیکھنے سُننے کے وصف ہی کا تقاضا ہو گا، نہ کہ اپنی طرف سے کوئی اضافہ۔ ورنہ اس وصف کا لایا جانا ہی عبث اور بے معنی ہو کر رہ جائے گا، جس سے بُلغاء کا کلام بری ہوتا ہے۔

اسی طرح کلام الٰہی کے اعجازی نظم میں جبکہ "مِنْ رَّسُوْلٍ" کی قید کے ساتھ وصف رسالت کا عنوان لاکر یہ کہا گیا کہ ہم نے رسول کو غیب پر مطلع کر دیا ہے، تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اس وصفِ رسالت اور منصبِ رسالت سے متعلق امورِ غیب بتلا دیئے ہیں۔ خلق کی تکوین و تدبیرِ امر کی باتیں نہیں بتلائیں، کہ وصفِ رسالت کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ جیسے اس آیت میں لفظ "مِنْ رَّسُوْلٍ" کا تقاضا یہ ہے کہ اطلاع غیب کا متقاضی اور مستحق رسالت کا وصف ہے اور یہ کہ اطلاعِ غیب منجانب اللہ رسول ہی کو ہونی چاہیئے، نہ کہ غیر رسول کو، ایسے ہی لفظ "مِنْ رَّسُوْلٍ" ہی اس کا بھی متقاضی ہے کہ وہ اطلاع کردہ غیب وصفِ رسالت کے حسبِ حال بھی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ رسالت کے حسب حال غیب وہی ہو سکتا ہے، جو شرعی احکام اور انھیں مؤثر بنانے والے حوادث سے تعلق رکھتا ہو، نہ کہ اگلے پچھلے دُنیا کے روزمرہ کے تمام حوادث اور جزئی جزئی قصوں سے متعلق ہو۔ پس وصفِ رسالت ایسے غیر متعلق علوم کا متقاضی نہیں ہے!

اس سے صاف نکل آیا کہ "من رسول" کے لفظ کا فطری تقاضا اور قواعد فن کا اقتضاء یہ ہے کہ رسولؐ جمیع غیب پر مطلع نہ ہوں بلکہ اطلاع خداوندی سے صرف اتنے ہی غیب سے باخبر ہوں جو ہدایت و رہنمائی کے لئے ضروری ہو۔ خواہ وہ حوادث کا علم ہو یا احکام کا، تکوین کا ہو یا تشریع کا۔ اس لئے خدا و رسول کے علم کی برابری کا تخیل خواہ وہ کسی بھی نوعیت سے ہو اور خواہ اس پر ذاتی کا عنوان رکھا جائے یا عطائی کا لیبل چسپاں کیا جائے، لفظ "من رسول" کے تقاضوں کے خلاف بلکہ ان تقاضوں کی تردید کرنے کے مترادف ہے، جس کا منصوبہ وہی باندھ سکتا ہے جو قرآنی اسلوب بیان اور شریعت خداوندی کے مزاج سے ناآشنا اور وصف رسالت کے فطری تقاضوں سے بے خبر ہو۔ اس لئے خدا و رسولؐ میں یہ علمی مساوات کا تخیل اور رسولؐ کے لئے علم ماکان وما یکون کا منصوبہ اس آیت سے پادر ہوا ہو جاتا ہے جو اسی آیت کو آڑ بنا کر قائم کیا گیا تھا — !

(۶) ہاں! اتنی بات باقی رہ جاتی ہے جو دلوں میں کھٹک سکتی ہے کہ یہ مسلّم کہ رسولؐ علم غیب کلّی پر مطلع نہیں، جس سے علم الٰہی کے ساتھ اُن کے علم کی برابری کا وسوسہ دلوں میں گزرے، لیکن جس قدر بھی علم انہیں دے دیا گیا ہے، کم از کم اتنے حصہ میں تو جزئی کا علم، خدا کے علم کے مماثل ٹھہر گیا، اور یہ کہہ دیا جانا درست ہو گیا کہ فلاں فلاں امور میں جتنا علم خدا کا ہے، اتنا ہی رسولؐ کا بھی ہے۔ حالانکہ اولاً تو اس عنوان ہی سے شرک کی بُو آتی ہے اور ساتھ ہی اتنے حصہ علم میں مخلوق کا خالق سے استغنا بھی لازم آتا ہے۔ درحالیکہ مخلوق کو کسی آن اور کسی مرحلہ پر بھی خالق سے برابری یا غنا میسر آنا ممکن نہیں، ورنہ مخلوق کی عبدیت و محتاجگی اور خالق کا غنا و صمدیت ختم ہو جائے، جو محال عقلی بھی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے اور محال شرعی بھی ہے، کیونکہ آیت ذیل کھلی تردید ہے:-

يا ايها الناس انتم الفقراء الى الله والله هو الغنى الحميد۔

اے لوگو! تم محتاج ہو اللہ کی طرف اور اللہ غنی حمید ہے!

تو قرآن حکیم نے اس کھٹک کو بھی فلا یظہر ہی کے کلمہ سے رفع دفع کر دیا ہے، جس کی تشریح یہ ہے کہ تعلیم غیب کو اظہار غیب اور اطلاع غیب کے عنوان سے تعبیر فرمایا، عطاء غیب سے نہیں۔ جس میں لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ رسولوں کو علم کا یہ حصہ بعینہٖ سپرد نہیں کر دیا جاتا، صرف اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے۔ جس کے معنی یہ نکلے کہ رسولوں کا یہ علم ذاتی تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ علم غیب کہلائے، عطائی بھی نہیں بن سکتا بلکہ صرف اطلاعی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اول تو اظہار کے معنی لغت ہی میں عطاء کے نہیں کہ اظہار غیب کو عطاء غیب کہا جائے اور رسولوں کے علم کو عطائی علم کا عنوان دیا جائے۔ دوسری یہ کہ عطاء علم کے معنی مخلوق میں اس لئے بھی نہیں بن سکتے کہ عطاء دے دینے کو کہتے ہیں اور دے دینے کی حقیقت کسی شے کو اپنے سے جدا کر کے منتقل کر دینے کے ہیں! اپنے پاس رکھ کر اس کی اطلاع کر دینے کو عطاء نہیں کہتے۔ اور ظاہر ہے کہ علم حق تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے، اس کا حق تعالیٰ سے جدا ہو کر منتقل ہو جانا محال ہے، ورنہ بصورت منتقلی وہ صفت ذات باقی نہیں رہ سکتی۔ جو عقلاً اور شرعاً محال ہے!

پس حق تعالیٰ بلاشبہ معطی اور عطا کنندہ ہیں۔ مگر اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کی حد تک جو ذات کے اندر نہیں ہوتیں، خود اپنی ذات یا ذاتیات کے حق میں معطی نہیں ہیں۔ کہ اپنی ذات دوسرے کو دے کر خدا بنا دیں اور خود معاذ اللہ خدا نہ رہیں۔ یا اپنی صفات اسے دے دیں اور خود معاذ اللہ معرّیٰ عن الصفات رہ جائیں، اسے فلاسفہ اور بندگان عقل گوارا کریں تو کریں

بندگانِ خدا کبھی برداشت نہیں کرسکتے۔ ہاں ذات اور ذاتیات کی اطلاع فرما دینا اُن کی شانِ کریمی سے بعید نہیں۔ سو اطلاع کی صورت میں اطلاع کردہ شے اُن سے جدا نہیں ہوتی اور دُوسرے تک بعینہٖ نہیں پہنچ جاتی، بلکہ اُس شے کی مثال اور تصویر پہنچتی ہے، جس کے معنی یہ نکلے کہ اطلاعی علم حکایتِ علم ہوتا ہے، عینِ علم نہیں۔ عین علم اصل عالم کی ذات ہی میں قائم رہتا ہے۔ کیونکہ عین علم یا اصل علم کے معنی یہ ہیں کہ عالم میں اُس کی جڑ اور اس کا منشاء قائم ہے۔ اور وہ اس کی ذات کا جوہر اور عین ہی ہے! جو بلا وسیلہ اور بلا توسط اسباب خود بخود اس میں موجزن، ہمہ وقت اس کے سامنے حاضر اور اُس میں سے اُمنڈتا رہتا ہے! جس میں نہ نسیان کا دخل ہے، نہ بھول چُوک کا خلل، نہ کہیں سے اُسے لانے کی ضرورت ہے، نہ منتقل کرانے کی۔ جیسے کوئی اپنی ذات کو نہیں بھول سکتا، ایسے ہی اپنی خُو بُو اور اپنی صفاتِ نفس کو بھی نہیں بھول سکتا۔ کیونکہ بھول چُوک ہمیشہ باہر سے حاصل شدہ چیزوں میں ہوتی ہے، جو اپنی اور اپنے قبضہ کی نہ ہو۔ خود اپنی اندرونی چیزوں میں نہیں ہوتی! یہی شان خالق کے علم کی بھی ہے کہ وہ ذات میں جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ یعنی خود ذات ہی منشاء انکشاف ہے! جس سے علم اس کی ذاتیات میں سے ہے!

ظاہر ہے کہ مخلوق کے علم کی یہ شان کبھی نہیں ہو سکتی، اگر مخلوق کا علم بھی اُس کا اپنا اور خانہ زاد ہوتا یعنی اُس کی ذات ہی منشاء انکشاف ہوتی جس سے یہ علم ہمیشہ اُس کے سامنے حاضر رہا کرتا تو اس میں بھول چُوک، نسیان و ذہول اور خطاءِ فکری و اجتہادی کبھی ممکن نہ ہوتی، حالانکہ وہ نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہے اور انبیاء علیہ السلام تک کے حق میں شاذ صورتوں میں وقوعی امکان کے ساتھ ممکن ہے۔ جس سے واضح ہے کہ خالق کی طرف سے مخلوق میں علم اس طرح نہیں آسکتا کہ اپنے اصل چشمے سے جُدا ہو کر یہاں پہنچ جائے اور مخلوق کا جوہرِ ذات بن جائے!

اس لئے یہی ایک صورت متعین ہو جاتی ہے کہ رسولوں کو جو علم بھی ہو وہ بعینہٖ ذاتِ حق سے منتقل ہو کر اُن میں نہ آئے بلکہ علم کے مخفی وسائل و اسباب (جیسے وحی و الہام) کے راستہ سے اُس کی حکایت اور شباہت اُن میں ڈال دی جائے۔ جو علم خداوندی کا عکس و ظل اور پرتو ہو اور اس طرح یہ پاکباز بندے اور اُن کے مصفّا قلوب نورِ علم سے منور ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے طلوعِ آفتاب کے بعد مثلاً شفاف آئینہ منور اور روشن ہو جاتا ہے، لیکن اصل نور آفتاب کی ذات ہی کے ساتھ قائم رہتا ہے، صرف اس کی ضیاء اور چمک یا اس کا عکس آئینہ پر پڑتا ہے۔ جس سے وہ روشن نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی یہ چمک دمک آئینہ کی ذاتی چیز نہیں بن جاتی۔ کہ وہ اُسے سُورج سے جُدا کر کے اپنے پاس رکھ لے اور کسی حال میں اپنے سے جُدا نہ ہونے دے!

پس انبیاء علیہم السلام کے آئینۂ قلوب میں جس قدر بھی علم آتا ہے وہ ذاتِ حق سے منتقل اور جُدا ہو کر نہیں آتا کہ یہ محال ہے، بلکہ اطلاعِ حق سے اس کا پرتو اور ظل اُن میں سما جاتا ہے۔ جس سے اُن کے قلوب جگمگا اُٹھتے ہیں مگر یہ علمی چمک دمک بحالتِ اطلاع بھی ذاتِ حق ہی کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ جیسا کہ وہ قبل از اطلاع ذاتِ حق کے ساتھ قائم تھی۔ اس لئے حضور کی ذاتِ بابرکات اس علمِ خاص کی حد تک بھی خود منشاء انکشاف نہیں ٹھہرتی کہ وہ کُل کا کُل ہر وقت آپ کے سامنے رہتا ہو اور آپ علمِ شرائع کی حد تک گویا حاضر و ناظر ہوں۔ اس لئے کبھی کبھی "اِنسا" یعنی کسی آیت کا ذہن سے فراموش کر دیا جانا) یا کسی ماحول کے باہمی نزاع سے کسی علم کا قلبِ مبارک سے اُٹھا لیا جانا بھی واقع کر دیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ رسولوں کو جتنا علم دیا جاتا ہے، وہ بھی جوہرِ ذات نہیں ہو جاتا کہ کبھی زائل نہ ہو سکے، یہ الگ بات ہے کہ حق تعالیٰ اپنے فضل سے اِلقاء فرمودہ علم رسولوں سے کبھی زائل نہیں ہونے دیتے۔ یہ نسیان طرازی یا رفعِ علم کی چند مثالیں محض

اس لئے واقع کی جاتی ہیں کہ علم سے نابلد لوگ رسولوں کو اس القاشدہ علم میں بھی خدا کا شریک یا اُس سے بے نیاز نہ سمجھ بیٹھیں۔ بلکہ اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے حضورؐ پر شریعت کے مختلف مُہمات و مسائل کی وحی الگ الگ اور وقتاً فوقتاً کی گئی ہے۔!

یہ صورت نہ تھی کہ آپؐ کو نبوت کے مقامِ رفیع پر پہنچا کر بیکدم اور اچانک ذاتِ پاک نبوی کو منشارِ علم بنا دیا گیا ہو اور ضرور نزول یا حوادث کے وقت خود بخود آپؐ کے اندر سے علم اُبھر آتا ہو! اگر یہ صورت ہوتی تو تیئیس ۲۳ برس تک تدریجی وحی نازل نہ ہوتی اور مسائل پوچھے جانے کے وقت آپؐ وقتاً فوقتاً یُوں نہ فرماتے کہ "مجھ پر ابھی تک اس کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا"۔ نیز آپؐ کبھی کبھی کسی حکم کی وحی کے انتظار میں بار بار چہرۂ مبارک اُٹھا کر آسمان کی طرف نہ دیکھتے، جیسا کہ تحویلِ قبلہ کے بارے میں آپؐ نے کئی بار ایسا ہی کیا!

بہرحال حضورؐ کا یہ علمِ خاص (علم شرائع و احکام) بھی علمِ غیب نہیں ہے۔ اس لئے خدا و رسُولؐ میں اس علمِ خاص کی نوعیت کی حد تک بھی مساوات یا شرکت کا خیال باندھ لینا کہ یہ مخصوص علم جو خدا کو ہے وہی رسُولؐ کو ہے۔ فرق صرف ذاتی اور عطائی کا ہے۔ محض ایک خیالِ فاسد رہ جاتا ہے، جس کی کوئی سند کتاب و سنّت سے نہیں نکلتی!

پس قرآنی کلمہ "فلا یظھر" نے اس جزوی مساوات کے شبہ کو بھی رد کر دیا اور واضح ہو گیا کہ مسئلہ علم میں کسی نہج سے بھی خدا و رسُولؐ میں کوئی مساوات یا شرکت نہیں، علم ہمہ وقت صرف اللہ تعالیٰ کو ہے!

اس حقیقت کی مزید تائید اس آیت کے جملہ و احاط بما لدیھم سے بھی ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر رسُولؐ کی طرف اللہ کا یہ علم بعینہٖ منتقل ہو جاتا تو رسُولؐ کا یہ علم خدا کے علمی احاطہ سے نکل جاتا۔ حالانکہ اطلاعِ غیب کے بعد احاطہ کا لفظ بولا جانا اس کی واضح دلیل ہے کہ رسُولؐ جس علم پر مطلع ہیں اور اُن کے پاس جو بھی علمی سرمایہ ہے، وہ اب بھی بدستور خدا ہی کے علمی احاطہ میں ہے، اُس سے باہر نہیں، ظاہر ہے کہ کسی چیز کا کسی کے احاطہ میں گھرا ہوا ہونا اُس کے اپنے ہاتھ میں ہونے اور اپنے قبضہ میں رہنے کی دلیل ہے، اگر اپنے پاس سے جُدا ہو جائے تو اُسے اندرونِ احاطہ نہیں کہہ سکتے!

پس اس اطلاعی علم میں (جس کا شرعیات یا متعلقاتِ شرعیات سے تعلق ہے) یہ محدود مساوات کا باطل تخیل — اَحاطَ بما لدیھم سے بھی رد ہو جاتا ہے، پس اس مساوات کے شبہ کا جواب اولاً فلا یُظھر سے دیا گیا کہ یہ علم سرے سے منتقل شدہ ہی نہیں کہ مساوات کا سوال پیدا ہو، بلکہ صرف اطلاعی ہے اور پھر اَحاطَ بما لدیھم سے دیا گیا - کہ اطلاع کے بعد بھی وہ اُسی علیم و خبیر کے احاطہ میں گھرا ہوا اور اُسی کے قبضہ میں آیا ہوا ہے۔ لہٰذا اس علم کو نہ رسُولؐ کا ذاتی علم کہہ سکتے ہیں، نہ عطائی۔ بلکہ صرف اطلاعی کہیں گے!

پس کہاں رسُولؐ کے لئے مدعیانِ عشقِ رسُولؐ کی طرف سے علمِ کلّی اور علمِ مَاکان و مایکون کے بلند بانگ دعاوی اور کہاں قرآن کا یہ اعلان کہ وہ علم بہ نسبت علمِ الٰہی کے علمِ جزوی ہے اور وہ بھی صرف اطلاع کی حد تک ہے۔ جو ذاتِ حق سے کسی طرح جُدا نہیں کہ مخلوق میں بعینہٖ چلا آئے!

اس مرحلہ پر پہنچکر ممکن ہے کہ کوئی خارج از عقل انسان، خدا اور رسُولؐ کے علم میں برابری ثابت کرنے کے لئے یہ کہنے کی جرأت کرے کہ جتنے علم پر خدا نے رسُولؐ کو مطلع فرمایا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا سارے کا سارا علم یہی ہو، اس سے زائد کچھ نہ ہو تو اس صورت میں صورتِ مساوات پھر وہی پیدا ہو جاتی ہے، جس کو رفع دفع کیا گیا تھا۔ سو اس وسوسہ کے دفعیہ

کے لئے اسی آیت میں "اَحَاطَ بِمَا لَدَیْھِم" کے بعد "وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْئٍ عَدَدًا" کا بھی اضافہ فرما دیا گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جو علم رسُول کے پاس ہے، وہ تو اس کے احاطہ میں ہے ہی، اس کے علاوہ بھی ہر ہر چیز اور ہر ہر ذرّہ گِن گِن کر اُس کے علم میں ہے۔ اگر خدا کا سارا علم وہی ہوتا جس پر رسُول کو مطلع کیا گیا تھا تو مساوات کے تخیّل کے دفعیہ کے لئے اَحَاطَ بِمَا لَدَیْھِم ہی کا جملہ کافی تھا۔ (احصیٰ کل شیئٍ کے اضافہ کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس کے بعد کل شیئٍ کے لفظ سے احصاء اور ذرّہ ذرّہ کے علمی احاطہ کا اعلان کیا جانا اس کی کھلی دلیل ہے کہ یہ کل شیئٍ کا علم اس ما لدیھم کے علم کے علاوہ ہے جو رسُول کی اطلاع میں آیا ہوا ہے، جسے غیر ما لدیھم کہنا چاہیئے۔ پس ایک ما لدیھم کا احاطہ ہے اور ایک کل شیئٍ کا احاطہ ہے اور ایک کا دُوسرے پر عطف کیا ہوا ہے جو قواعد عربیہ کی رُو سے باہمی تغائر اور مغائرت کی دلیل ہوتی ہے۔ تو اس سے واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ ما لدیھم کا علم اور ہے، جس پر رسُول مطلع ہیں۔ اور کل شیئٍ کا علم اس کے علاوہ بھی ہے۔ جو رسولوں کی اطلاع میں لایا جا چکا ہے اور پھر وہ لامحدود بھی ہے۔ جس میں ذرّہ ذرّہ شمار اور گنتی کے ساتھ علم ازلی میں آیا ہوا ہے کیونکہ اسے کل شیئٍ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے احاطۂ کلّی صرف خدا ہی کے علم کا ثابت ہوتا ہے اور علم خدا و رسُول میں اس جانبی مساوات کا اب کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ جس کے داخل کرنے کی باطل سعی کی جاتی ہے، بلکہ علم خداوندی ہر مشرکانہ تصوّر سے بالاتر ثابت ہو جاتا ہے!

اس موقع پر یہ خلجان ہو سکتا ہے کہ اطلاعِ غیب جبکہ رسُول کے ساتھ مخصوص ہوئی اور رسالت کا مفہوم چاہتا ہے کہ یہ غیب دُوسروں کو بھی پہنچے، یعنی رسُول اُس کی تبلیغ کریں، تو پھر اطلاعِ غیب محض رسولوں تک کہاں محدود رہی اور اس کی تخصیص رسُول کے ساتھ کہاں باقی رہی، جبکہ رسُول کی اطلاع سے ہم بھی اُس پر مطلع ہو گئے۔ پس اس طرح آیت میں استثناء کی یہ تخصیص بے معنی رہ گئی، جو رسُول کے ساتھ کی گئی تھی۔ سو اس کا جواب بھی اسی فلا یظھر کے کلمہ ہی سے نکل آتا ہے، اور وہ یہ کہ اظہارِ غیب یعنی اطلاعِ غیب کو استثناء، ترکیب کے ساتھ رسولوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اُمت کو اس غیب کی خبر اُس اطلاع یعنی وحی و القاء کے ذریعہ نہیں ہوتی، جس سے رسُول کو ہوتی ہے۔ کیونکہ اُمت اوّلاً نبی کو اُن کی نشانیوں سے نبی مان کر پھر اُن کی خبر کو تسلیم کرتی ہے، تو اُمت کا یہ علم استدلالی ہو جاتا ہے اطلاعی نہیں رہتا!

پس رسُول اور اُمتِ رسُول اس حد تک تو مشترک ہیں کہ دونوں کو علم غیب نہیں۔ یعنی بالذات دونوں علم نہیں رکھتے کہ یہ علم خاصۂ اُلوہیت ہے اور رسُول و اُمتِ رسُول ظاہر ہے کہ دونوں از جنسِ بشر ہیں۔ تو اُن میں خاصۂ اُلوہیت آ جانا کیسے ممکن ہے؟ البتہ اس میں الگ الگ اور باہم ممتاز ہیں کہ یہ علم رسُول تک تو اطلاعِ خداوندی یعنی وحی و الہام سے پہنچتا ہے، جس کی حفاظت کے لئے پہرہ چوکی بٹھا دیا جاتا ہے اور اُمت تک یہ علم استدلال سے آتا ہے کہ فلاں ذات بدلائل قطعیہ رسُول خدا ہے اور رسُول کی خبر واجب التسلیم ہے اور واجب القبول ہے۔ البتہ رسُول تک اس غیب کی اطلاع کا سلسلہ چونکہ مخفی اور غیبی ہے، اس لئے یہاں پہرہ چوکی بھی علم کے تمام مخفی وسائل پر جو انسان کے اندر ہوں بٹھلایا جاتا ہے۔ تاکہ وحی الٰہی غیر مشتبہ طریق سے رسُول تک پہنچے۔ مگر اُمت کو یہی خبر چونکہ ظاہری وسائل سے پہنچتی ہے اور پیغمبر سے لے کر ہم تک اطلاع دہندہ سب انسان ہیں، جو خبر کی سند کے سلسلہ میں جُڑے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے یہاں پہرہ چوکی استدلالی رنگ کا ان ظاہری وسائل یعنی خبر کی سند اور طریق پر بٹھلایا گیا کہ راوی ثقہ ہوں، معلوم الحال ہوں، عادل ہوں، متقی ہوں، اور پھر ہر قدم میں اتنے ہوں کہ عادتًا اور عقلًا اُن کا جھٹلا دیا جانا محال اور فطرت کے خلاف ہو۔ پس اُمت کے اس اخبارِ غیب کی سند کا کم از کم متواتر ہونا ضروری ہے۔

تاکہ یہ غیبی حکایت بلا اشتباہ پہنچے اور واجب القبول بن سکے۔ سو اصل اطلاع غیب جو سارے علوم شرعیہ کی جڑ بنیاد ہے، یعنی قرآن کریم حضورؐ تک تو باطنی تواتر کے ساتھ انتہائی تحفظ سے پہنچا کہ جس میں بعض بعض آیتوں کے ساتھ علاوہ جبریل علیہ السلام کے ستر ستر ہزار فرشتوں کا لشکر ہوتا تھا، جو مل کر اُس کی حفاظت کرتے تھے، جس میں تمام غیبی موانع یعنی جنات و شیاطین وغیرہ پر پہرہ چوکی بٹھلایا ہوا تھا، اور ہم تک بھی قرآن ظاہری تواتر کے ساتھ پہنچا کہ ہر ہر قرن میں دس بیس نہیں ہزاروں ہزار مستند حفاظ سینوں میں لے کر اس کی روایت اور کتابت سے اُس کی حفاظت کرتے رہے، جن میں تمام ظاہری موانع اور انسانی تلبیس کے ممکن سے ممکن پردے اصولِ روایت کی رُو سے چاک ہوتے رہے اور کسی درانداز کو موقع نہ مل سکا کہ کہ اُس کے الفاظ یا معنی میں کوئی ادنیٰ تحریف یا تلبیس کر سکے۔ وہاں رسولوں کو معصوم کہا گیا کہ عصمت ہر دراندازی سے حق کو بچاتی رہے، یہاں اُمت کو مجموعی حیثیت سے "محفوظ" رکھا گیا کہ بحیثیتِ مجموعی اس سے حق منقطع نہ ہو اور یہ حق کا سرچشمہ (قرآن حکیم)، بہرحال اپنے الفاظ و معانی اور اپنی شئون و کیفیات کیساتھ کلیتہً محفوظ رہے!

رہی قرآن کی اولین شرح اور تفسیر یعنی حدیث رسولؐ جو ناگزیر ہے، اس کا کوئی حصہ تواتر سے ثابت ہے کوئی شہرت سے کوئی ندرت وغیرہ سے ثابت ہے اور کوئی غرابت سے، سو اس کے درجات ثبوت ہی کی قدر، اُس کی قبولیت اور حجیت کے مراتب ہیں۔ جو فن میں محفوظ ہیں اور اس طرح قرآن اور حدیث اپنے اپنے درجہ میں کلیتہً اُمت میں محفوظ ہیں۔ جن پر ظاہری اور باطنی پہرے چوکی لگے ہوئے ہیں کہ کسی درانداز کو اُن کی تبدیل و تحریف کا موقع نہیں مل سکتا۔ چنانچہ اُمت کی تیرہ سو سالہ تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے درانداز برساتی کیڑوں کی طرح بارہا اُبھرے اور مختلف رُوپوں میں نمایاں ہوئے۔ مگر بالآخر موسم نکل جانے پر خود ہی اپنی موت مر گئے، جن کا آج نشان پتہ تک نہیں ملتا۔ اور قرآن و حدیث اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ زندہ اور درخشندہ ہیں اور تا قیامت رہیں گے!

اس پاک و صاف مسئلہ میں بظاہر اب شبہات کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ لیکن پھر بھی اس موقع پر ممکن ہے کہ کسی شکی دماغ اور حیلہ جُو کو جسے توحید سے زیادہ شرک سے لگاؤ ہو، یہ وسوسہ گزرے کہ آیت اظہار غیب کی ان ساری مدافعتوں کے باوجود وہ شرک جسے علمی شرک کہا جا رہا ہے، پھر بھی جوں کا توں موجود ہے۔ کیونکہ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو علم الٰہی کے دوام و استمرار اور ہمیشگی پر دلالت کرتا ہو۔ پس ہو سکتا ہے کہ عالم الغیب کا یہ علم غیب دوامی نہ ہو بلکہ وقتاً فوقتاً ذات کو ہوتا ہو اور تدریجی طور پر ذات کے سامنے آتا رہتا ہو (جیسا کہ بعض جہلاء فلاسفہ اس طرف گئے بھی ہیں)

اندریں صورت ذات پر کچھ اوقات ایسے بھی کٹنے ممکن ہوں گے، جن میں علم کا کوئی حصہ ذات سے اوجھل ہو اور اُس کے سامنے نہ آئے۔ مگر یہ حصہ عالم سے تو گم ہو نہیں سکتا، کیونکہ عالم کی عمارت پورے ہی علم پر کھڑی ہوئی ہے۔ ایک حصہ بھی گم ہو تو ساری کائنات درہم برہم ہو جائے اس لئے سارے کا سارا علم کائناتِ عالم میں ہمہ وقت رہنا ضروری ہے۔ جس میں یہ حصہ بھی شامل ہے اور یہ حصہ جو معاذ اللہ ذاتِ حق سے اوجھل ہے جبکہ صفت ہے اور صفت ذات سے الگ ہو کر پائی نہیں جا سکتی۔ تو لامحالہ ذاتِ حق کے علاوہ کسی اور ذات کے ضمن میں پائی جائے گی۔ تو علم غیب میں ذاتِ حق کا شریک نکل آیا۔ اگر شریک مستقل نہیں تو کم از کم ہنگامی اور عارضی شریک تو ضرور پیدا ہو گیا۔ معاذ اللہ!

اس لئے اس آیت کی رُو سے یہ دعویٰ کس طرح قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے کہ اللہ کا علم دوامی ہے اور کسی لمحہ بھی اُس کا کوئی علمی شریک نہیں ہو سکتا؟ جبکہ آیت میں کوئی ایک کلمہ بھی اس علم کے دوام و استمرار پر دلالت

کرنے والا موجود نہیں — !

تو اس وسوسہ کو بھی آیت کے کلمہ "عالم الغیب" نے دفع کر دیا ہے، کیونکہ اس موقع پر آیت نے حق تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے کو فعل کے صیغہ سے ذکر نہیں فرمایا۔ بلکہ صفت کے صیغہ سے ذکر کیا ہے (یعنی یوں نہیں کہا کہ یعلم الغیب (وہی جانتا ہے غیب کو) بلکہ یوں کہا گیا "عالم الغیب" (وہی جاننے والا ہے غیب کا) کیونکہ فعل زمانی ہوتا ہے جو کسی نہ کسی زمانہ ہی کے ساتھ مقید اور مخصوص ہو کر پایا جاتا ہے، ماضی کا فعل ہے تو وہ مستقبل و حال نہیں ہوتا اور مستقبل ہے تو ماضی اس سے خالی ہوتا ہے اور حال ہے تو ماضی و مستقبل دونوں اس سے بے تعلق ہوتے ہیں۔ غرض فعل ہمہ وقت نہیں ہوتا، کسی وقت ہوتا ہے اور کسی وقت نہیں۔ یعنی جس وقت کا وہ فعل ہے اسی وقت میں پایا جائے گا دوسرے اوقات میں نہیں۔ اس لئے اگر علم غیب کے اثبات کے لئے فعل ماضی کا صیغہ لا کر یوں کہا جاتا کہ "اس نے غیب جان لیا" تو مستقبل میں علم غیب ثابت نہ ہوتا اور اگر مستقبل کا عنوان دے کر یوں کہا جاتا کہ "وہ غیب کو جان لے گا" تو ماضی میں اس کا عالم الغیب ہونا نہ نکلتا اور اگر حال کا عنوان رکھ کر یوں کہتے کہ "وہ جانتا ہے غیب کو" تو فی الحال تو وہ عالم الغیب ثابت ہو جاتا مگر ماضی و مستقبل دونوں اس فعل سے خالی ثابت ہوتے اور علم غیب دوامی نہ ثابت ہوتا۔ اس لئے فعل کے بجائے صفت کے صیغہ سے علم غیب کا اثبات کیا گیا جو کسی زمانہ کے ساتھ مقید اور مخصوص نہیں ہوتی، بلکہ ذات کے ساتھ وابستہ اور تا قیام ذات دوامی ہوتی ہے — !

اصطلاحی الفاظ میں اس حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ علم غیب کے اثبات کے لئے جملہ فعلیہ نہیں لایا گیا جو تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے بلکہ جملہ اسمیہ استعمال کیا گیا ہو جو استمرار و دوام پر دلالت کرتا ہے اور فرمایا گیا عالم الغیب "وہ جاننے والا ہے غیب کا"۔ یعنی ماضی و مستقبل اور حال کی قید سے بالاتر ہو کر وہ ہمہ وقت غیب کا جاننے والا ہے، جس سے علم غیب کا دوام واضح ہو گیا۔ کہ وہ ازل میں بھی عالم الغیب ہے اور ابد میں بھی ہے اور اس پر کوئی لمحہ ایسا نہیں آ سکتا کہ وہ عالم الغیب نہ ہو اور اس لمحہ میں کسی ہنگامی شریک کی گنجائش نکلے جو اس بوجھ کو اٹھائے۔ اس لئے وہ اپنے علم لامحدود میں دواماً و استمراراً، ازلاً و ابداً عالم الغیب اور اس ذاتی صفت میں ہمہ وقت وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے، نہ اس کا کوئی شریک مستقل ہے نہ شریک عارضی و ہنگامی !

بہرحال قرآن حکیم نے اپنے اعجازی نظم اور معجزانہ اسلوب بیان سے مسئلہ علم غیب کو نکھار کر صاف کر دیا ہے اور اس میں کسی شرک پسند کے لئے مشرکانہ توہموں کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ بالخصوص آیت اظہار غیب اس بارے میں ایک جامع ترین ہدایت نامہ ہے، جس نے اس مسئلہ کو ہر قسم کے زمانی، مکانی، ذاتی، عرضی، دوامی اور ہنگامی شرکا، سے بری کر کے اور اللہ کی علمی توحید کو ہر شک و شبہ سے پاک کر کے مسئلہ کے ہر مثبت اور منفی پہلو کو کھول دیا ہے۔

کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاً اس نے :-

(۱) لفظ عالم الغیب سے ابتدا کر کے اللہ کے عالم الغیب ہونے کا اعلان کیا۔

(۲) پھر اسے "اطلاع دہندہ" غیب بنا کر علم غیب کو اس کا خاصہ ثابت کیا۔ جس سے ہر غیر اللہ سے علم غیب کی نفی ہو گئی — !

(۳) پھر "علیٰ غیبہٖ" کے لفظ سے علم غیب کو اس کا ذاتی علم ثابت کیا۔ جس سے ہر مخلوق کے حق میں ذاتی علم کی نفی ہو گئی !

(۴) پھر [illegible] کو "اطلاع غیب" کا عنوان دے کر [illegible] علم [illegible] کیا۔ جس سے عطائی علم کی [illegible] مخلوق سے نفی ہو گئی، تاکہ خالق کی ذات [illegible] بھی ہو جائے!

(۵) پھر حق تعالیٰ کے علم غیب کے اثبات کے لئے [illegible] صفت کا صیغہ (عالم الغیب) استعمال کر کے علم خداوندی کو ازلی ابدی [illegible] ثابت کیا، جس سے [illegible] اللہ کے علم [illegible] کی نفی ہو گئی اور مخلوق کا علم ہنگامی [illegible]

(۶) پھر [illegible] غیب کی اطلاع دینے میں فاعلِ مختار ثابت کیا، جس سے تمام وسائل علم غیب کے اطلاع [illegible] غیب ہونے کی نفی ہو گئی — !

(۷) پھر علوم غیب کو "اطلاع خداوندی" کے ساتھ مقید اور اُس میں منحصر ثابت کر کے ہر استدلالی علم کو علم غیب ہونے سے خارج کیا، جس سے فنی طور پر مستقبل کی باتیں بتلانے والوں کے غیب دان ہونے کی نفی ہو گئی!

(۸) پھر کلمہ "مِن رَّسُولٍ" کے اقتضاء سے رسول کے لئے علم کلی کی نفی ہو گئی۔ اور بشر کے لئے علم ما کان وما یکون کا سوال ختم ہو گیا — !

(۹) پھر اسی مِن رَّسُولٍ کے کلمہ سے رسول کے لئے علم جزئی ثابت کر کے خدا و رسول کے علم کا فرق واضح کیا کہ خدا کا علم محیط اور کلی ہے اور رسول کا اس کے لحاظ سے جزئی اور محدود[ل] جس سے خدا و رسول کے علم میں مساوات کا تخیل منفی ہو گیا — !

(۱۰) پھر اس علم کو پیغمبر کے حق میں اطلاعی کہہ کر "مِن رَّسُولٍ" ہی کے کلمہ سے اُمت کے حق میں اسے "رسالاتی" علم ثابت کیا، جس سے اُمت کے حق میں اُس کے اطلاعی علم ہونے کی بھی نفی ہو گئی، بلکہ یہی غیبی علم اُس کے حق میں استدلالی ہو گیا — !

(تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ)

غرض آیت کریمہ کے بلیغ بیان اور اس کے ایک ایک لفظ سے علم غیب کا مثبت اور منفی پہلو دونوں ساتھ ساتھ نکھرتے چلے گئے ہیں۔ اثباتی پہلو سے تو ذات حق کے لئے اس علم کے تمام مراتب و شئون تخصیص کے ساتھ ثابت ہوتے گئے ہیں اور منفی پہلو سے غیر اللہ سے اس علم کے تمام شئون و مراتب منفی ہوتے گئے ہیں۔ اور اس طرح بہ اعجازی آیت مسئلہ علم غیب کے تمام مہمات اور اُس کے تمام مالہ وماعلیہ کا جامع ترین بیان ثابت ہوتی ہے، جس سے توحید خداوندی کا یہ اہم ترین رکن (علم غیب) ہر ایک شرک آمیز تصور اور منافی توحید زعم سے منزہ مقدس اور بے غبار ہو کر نمایاں ہو گیا۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ!

ان قرآنی تصریحات و تلمیحات کے ہوتے ہوئے حضرت سید الاولین والآخرین کے لئے علم غیب کا دعویٰ اور وہ بھی علم کلی اور علم ما کان وما یکون کی قید کے ساتھ نہ صرف بے دلیل اور بے سند بلکہ مخالف دلیل معارض قرآن اور اس توحیدی شریعت کے مزاج کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابلِ التفات ہے — !

ل رسول کا علم جزئی اور محدود اللہ تعالیٰ کے علم کی نسبت سے ہے۔ مگر اُمت کا مجموعی علم بھی رسول کے علم سے کوئی نسبت نہیں رکھتا — !

مگر اس سے اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ تمام کائنات جن و بشر اور روح و ملک میں سب سے زیادہ، سب سے وسیع تر اور بے نظیر و بے مثال علم حضرت اعلم الاولین والآخرین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہے۔ عالم میں نہ اتنا بڑا عالم باللہ اور عارفِ حق پیدا ہوا، نہ ہوگا۔ اگر کوئی حضور کے اس علم کی عظیم وسعت و کثرت اور زیادت و جامعیت میں شک کرے اور آپ کے اعلم الخلائق ہونے میں اسے تامل ہو تو وہ اپنے ایمان کی فکر کرے۔ لیکن اس یقینی اور ناقابل تامل علمِ عظیم کی وسعت ثابت کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ رسولوں کو خدا کہا جائے۔ مخلوق کو خالق کے برابر کر دیا جائے اور انھیں ذرّہ ذرّہ کا عالم اور ماکان و مایکون کا جاننے والا کہہ کر ان کے علومِ ہدایت و اصلاح میں زید، عمر، بکر کی خانگی جزئیات، دُنیا بھر کے انسانوں کے تمام ذہنی وساوس و خطرات اور حوادث عالم کے روزمرہ کے تمام افسانے اُن کے علم کا جزو قرار دے دیئے جائیں۔ کہ اس سے نہ صرف سلیم طبائع ہی انکاری ہیں، بلکہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انکار و اعراض فرما رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ جزئی جزئی قصّے اور دُور از کار معلومات آپ کے ظرفِ علم میں بھرے جائیں — !

چنانچہ حضورؐ نے اپنے پاکباز صحابہ کو ہدایت فرمائی کہ لوگوں کی کمزوریاں میرے سامنے لاکر نہ رکھو۔ میں چاہتا ہوں کہ دُنیا سے سلیم الصدر رخصت ہوں۔ گویا اس قسم کی معلومات سے قلب مبارک خود کنارہ کش رہنا چاہتا تھا، جو اصل مقصدِ نبوت سے تعلق نہ رکھتی ہوں اور اُوپر سے قلب کی یکسوئی اور جمعیۃ میں خلل انداز بھی ہوں۔ بلکہ "دُنیا سے سلیم الصدر رخصت ہونے" کے جملہ سے اور بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اس قسم کی معلومات رُخصتی کے آخری لمحات میں بھی حضورؐ کو گوارا نہیں تھیں۔ کہ وہ ذہنِ مبارک میں آئیں، جنہیں زبردستی مدعیانِ عشقِ رسُول ان آخری لمحات میں حضورؐ کی مرضی کے خلاف حضورؐ کے لئے تجویز کرنے سے نہیں شرماتے — !

صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دن ایک منقش مصلےٰ بچھا دیا تو آپ نے اسے اٹھا دیا اور فرمایا کہ "اس کے گل بُوٹوں نے مجھے مشغول کر لیا (یعنی نماز کی یکسوئی اور دل جمعی میں فرق آگیا) جس سے واضح ہے کہ اس قسم کی جزئیاتی معلومات و محسوسات کو جن کا ارشاد و ہدایت سے کوئی تعلق نہ ہو، آپؐ اپنے خزانۂ خیال میں جمع فرمانا بھی پسند نہیں فرماتے تھے، اس لئے کہ شانِ رسالت کے لئے موزوں اور مناسب ہی یہ تھا اور یہی اس شانِ اقدس کا فطری تقاضا بھی تھا۔ کہ آپ کو صرف اُنہی مقاصد و احکام کا علم دیا جائے جو بنی نوعِ انسان کے لئے حصولِ سعادت کا ذریعہ اور شقاوت سے بچاؤ کا وسیلہ ہوں اور خود آپ کے نفسِ طیّبہ کے لئے ہمہ وقت ترقی اور قربِ خداوندی کی بیشی کا ذریعہ ہوں۔ اب اگر انبیاء علیہم السلام کو علومِ شرعیہ کے علاوہ علومِ طبعیہ، علومِ ریاضیہ، علومِ فلسفیہ، علومِ منطقیہ، مثل سائنس، فلسفہ ریاضی، ہیئت، ہندسہ، جغرافیہ، شعر و شاعری، سحر و ساحری، کہانت، نجوم اور زید، عمر، بکر کے گھریلو قصے معلوم نہ ہوں تو علم کی یہ تحدید اُن کے لئے نقص نہیں بلکہ عین کمال اور اُن کی پاک فطرتوں کا عین مقتضاء ہے — !

چنانچہ حدیث نبوی میں خبر دی گئی ہے کہ آپ نے کسی موقع پر ایک ہجوم دیکھا جو کسی شخص کے اردگرد جمع تھا۔ پوچھا یہ کیسا مجمع ہے؟ عرض کیا گیا کہ رَجُل عَلّامہ۔ ایک بڑا عالم ہے جس پر لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور وہ علم کی باتیں لوگوں کو بتلا رہا ہے۔ فرمایا۔ کیسا علم؟ عرض کیا گیا کہ شعر اور انساب کا علم۔ تو ارشاد فرمایا:۔

علم یا ینفع وجھل لا یضر انما العلم آیۃٌ محکمۃٌ او سنۃٌ قائمۃٌ او فریضۃٌ عادلۃٌ !

یہ وہ علم ہے کہ نہ تو اس کا جاننا کچھ نافع ہی ہے اور نہ اُس کا نہ جاننا ہی کچھ مُضر ہے، علم تو
(حقیقتاً) آیت محکمہ (قرآن) یا سنت قائمہ (حدیث) یا فریضۂ عادلہ (جو اِن دو جیسا
ہو یعنی اجتہاد، مجتہد یا اجماع) ہے!

اس سے واضح ہے کہ نبوت کی نگاہ میں نہ ہر علم مطلقاً نافع ہی ہے اور نہ ہر علم علی الاطلاق مطلوب۔ ورنہ علم کی تقسیم نافع اور مُضر کی طرف لغو اور فضول ہو جاتی۔ درحالیکہ قرآن حکیم نے بھی اس تقسیم کو قبول فرمایا اور اس پر متنبہ کیا ہے، سحر و ساحری کے بارے میں فرمایا:-

وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ!

شعر و شاعری کو اپنے رسول سے دُور رکھتے ہوئے گویا اس کے مُضر ہونے کی طرف اشارہ فرمایا کہ:-

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ!

اور ہم نے اسے شاعری نہیں سکھائی اور وہ اس کے لئے مناسب (یعنی شایان شان) بھی نہیں ہے!

ظاہر ہے کہ جس علم کو حق تعالیٰ اپنے رسول کے لئے غیر موزوں بتلائے اور جس کے مُضر ہونے کی صراحت فرمائے اُس کا شوق رسولِ پاک کے ذہنِ مبارک میں کیسے آسکتا تھا اور اُس پاک ظرف میں یہ دُور از کارِ نبوت معلومات کیسے ڈالی جاسکتی تھیں!
بہرحال اس قسم کے غیر رسالاتی علوم بلاشبہ ظرفِ نبوت میں پہنچکر اُلجھن ہی کا باعث ہوتے کہ مقصد سے بے تعلق تھے اس لئے قابلِ قبول نہ ٹھہرے، تو اُن سے ظرفِ نبوت کا خالی رہنا ہی نبوت کا کمال ہو سکتا ہے، نہ کہ اُس کا نقص۔ اندریں صورت اللہ کے اس عظیم الشان رسول کے لئے علم ماکان وما یکون ثابت کرنے کی لاحاصل سعی کرنا اُن کے وصفِ رسالت کے تقاضوں کو بے اثر دکھلانا ہے جو وصفِ رسالت کی توہین ہے نہ کہ تعظیم!

اس لئے اگر نبی کریم علیہ افضل الصلوات والتسلیم خود ہی اپنے سے علم غیب کی کلی نفی اور علم کل کا صاف اور واضح انکار فرمائیں اور مامور من اللہ ہو کر فرمائیں تو یہ نفی ایک حقیقت ہوگی نہ کہ تواضع و انکسار۔ چنانچہ قرآن کی زبان میں۔ آپ نے فرمایا اور مامور من اللہ ہو کر فرمایا:-

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ
إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ -

تو کہہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس خزانے ہیں اللہ کے، اور نہ میں جانوں غیب کی بات
اور نہ میں کہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اُسی پر چلتا ہوں جو میرے پاس اللہ کا
حکم آتا ہے!

وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ

اور میں تو صرف (کھلے طور پر) ڈرانے والا ہوں!

اس میں اپنے سے علم غیب کی علی الاطلاق نفی ہے، جس میں کلی کی قید ہے نہ جزئی کی۔ جس کا حاصل یہی ہے کہ میں کچھ بھی علم غیب نہیں رکھتا۔ جس کی وجہ آگے ذکر فرمائی گئی ہے کہ میرا منصب انذار اور انجام کی ہلاکت اور عذابِ خداوندی سے ڈرانا ہے۔ جس کے لئے علم غیب کی ضرورت نہیں، صرف اُن امور کے علم کی ضرورت ہے جن کو اس ڈرانے میں دخل ہو اور

اس انداز و تعبیر میں ہو کر ثابت ہوں۔ کو سامنے رکھ کر علم کی تقسیم یوں نہ ہوگی کہ اللہ کا علم ذاتی
اس لئے اب ان عرض کردہ آیات و احادیث یعنی کتاب و سنت
اور رسول کا علم عطائی یعنی نوعی فرق کے ساتھ دونوں کا برابر ہو یا ایک حقیقی خدا اور ایک مجازی خدا۔ یا بقول عیسائیوں
کے ایک الٰہ مجرد اور ایک الٰہ مجسّم، معاذاللہ۔ بلکہ یوں ہوگی کہ ایک علم علم غیب ہے یعنی علم ذاتی جو بلا وسیلہ و اسباب
ذات سے ابھرے اور بالذات ہو بالغیر نہ ہو۔ یہ علم کلیۃً حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ غیر اللہ کو اس علم کا نہ کلّی
حاصل ہے، نہ جزو، نہ کلّی نہ جزوی!

دوسرا علم اطلاعی اور حکائی ہے جو وسائل سے حاصل شدہ ہو یعنی علم غیب نہ ہو، وہ بندوں کو ہو سکتا ہے۔ اب اگر
وہ قطعی یقینی اور غیر مشتبہ وسائل سے ہو۔ جس میں کسی شک و شبہ یا التباس کی گنجائش نہ ہو۔ جیسے وحی خداوندی، جسے
آیت اظہار غیب میں اطلاع خداوندی کہا گیا ہے، تو یہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اگر ظنی وسائل سے
ہو، جس سے اشتباہ و التباس کلیۃً مرتفع نہ ہو جیسے کشف و الہام تو یہ اولیاء کو بھی ہو سکتا ہے!
اور اگر طبعی وسائل سے ہو، جیسے عقل و خرد، ذوق و تجربہ اور فکر و تدبّر وغیرہ تو یہ اذکیاء و عقلاء کو بھی ہو سکتا ہے
اور اگر حسّی وسائل سے ملے، جیسے سمع و بصر اور عام حواس، تو یہ عام انسانوں کے لئے بھی ممکن ہے، پس یہ سب قسمیں وہبی
اطلاعی علم کی ہوں گی۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وحی کا علم وہبی ہے جو محض موہبت الٰہی سے ملتا ہے، کسبی و اکتسابی
نہیں۔ کہ جس کا جی چاہے محنت کر کے وحی حاصل کر لیا کرے اور نبی ہو جایا کرے۔ اور غیر وحی کے تمام علوم کسبی ہیں، جنہیں خود
اپنی توجہ اور محنت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان سب علوم میں علم اعلیٰ وہی ہوگا۔ جو وحی الٰہی سے ہوگا۔
اس لئے نبی کے لئے وجہ افضلیت یہی علم ہوگا نہ کہ وہ کسبی اور اکتسابی علوم و فنون جو ہر انسان اپنی محنت سے حاصل
کر سکتا ہے — !

رسولِ پاک کے لئے اس قسم کے علم کا دعویٰ رکھنے والے اپنے دعوے میں مخلص ہوں اور بزعم خود محبت رسول میں غرق
ہو کر خوش اعتقادیوں سے ہی وہ یہ دعویٰ کرتے ہوں۔ سو اُن کی نیت اور جذبہ پر حملہ مقصود نہیں۔ مگر یہ گذارش ضرور ہے کہ
یہ دعویٰ خواہ کتنا ہی جوش عقیدت و عظمت اور ولولۂ شوق و محبت سے کیا گیا ہو۔ مگر ہم مسلمان صرف عقائد و احکام ہی
میں آسمانی ہدایات کے پابند نہیں بنائے گئے، بلکہ عشق و محبت کے جذبات اور اظہار عقیدت و محبت میں بھی شرعی
حدود و قیود کے پابند کئے گئے ہیں۔ کیونکہ ہم سے عقلی محبت مطلوب ہے، جس کا نام ایمان ہے اطبعی محبت مطلوب نہیں
جو غیر اختیاری اور بے شعور محبت ہے، اوّل کا تعلق عقل و شعور سے ہے اور ثانی کا جذبات سے۔ بحالتِ صحتِ شعور
و حواس ہمیں اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ ہم ایک اصولی اور شعوری محبت کو محض جذباتی محبت بنا کر شرعی آداب سے
بے نیاز اور بالاتر ہونے لگیں۔ اور اپنے کو عارف باللہ اور علیٰ البصیرت بنانے کی جگہ بے شعور اور جذباتی ثابت کرنے
لگیں۔ یا بتکلف جذباتِ عشق کی آڑ لے کر تمام شرعی حدود و قیود اور تہذیب نفس کی تمام دینی پابندیوں سے
آزاد ہو جائیں — !

بہرحال مدعیانِ عشق میں تو ممکن ہے کہ مدحِ رسول کی یہ دفعہ مل جائے کہ علمِ رسول، علم خدا کے برابر ہے۔ لیکن خود
خدا کے کلام میں اس دفعہ کا کوئی وجود نہیں اور کسی ایک آیت میں بھی رسولِ کریم کے عالم الغیب ہونے یا عالم ما کان

وما یکون ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا - اور کیا گیا ہے تو اس علم کی کلی نفی کا۔ جیسا کہ ان مذکورہ اوراق سے کافی روشنی میں آچکا ہے۔ حتیٰ کہ کسی صریح حدیث میں بھی یہ دفعہ نہیں مل سکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ حدیث کے کسی متشابہ کلام کی آڑ لی جائے اور محض اپنے دعوے کی لاج رکھنے کی سعی کی جائے۔ چنانچہ اس کے لئے سب سے زیادہ نمایاں کرکے حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ جو مشکوٰۃ میں روایت کی گئی ہے، شاید اسی کے ایک ذو معنی لفظ سے حضورؐ کے علم کلی کا تخیل قائم کیا گیا ہے۔ مضمون حدیث کا حاصل یہ ہے کہ:-

"ایک دن سرورِ دو عالم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ دیر سے کھلی - قریب تھا کہ آفتاب طلوع ہو جائے اور نماز صبح قضا ہو جائے کہ آپؐ گھبرائے ہوئے باہر تشریف لائے اور مختصر سی نماز پڑھا کر لوگوں کو بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور دیر سے آنے کی وجہ ارشاد فرمائی کہ نماز تہجد میں مجھے اونگھ سی آگئی، بدن بوجھل ہو گیا تو اچانک میں نے اپنے رب کو نہایت ہی پاکیزہ صورت میں خواب میں دیکھا اور یہ حق تعالیٰ نے مجھے تین دفعہ خطاب فرما کر پوچھا کہ اے محمدؐ! ملاء اعلیٰ کس چیز میں جھگڑتے ہیں؟ میں نے تینوں دفعہ لا ادری کہہ کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر جناب باری عز اسمہ نے اپنی ہتھیلی (جیسی ہتھیلی اس کی شان کے مناسب ہو) میرے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھ دی۔ تا آنکہ میں نے اس کے پوروؤں کی ٹھنڈک سینہ کے درمیان محسوس کی"

فتجلّٰی لی کلُّ شیءٍ عرفتُ

تو ہر چیز مجھ پر منکشف ہو گئی اور میں پہچان گیا!

یہی کلُّ شیءٍ کا مبہم کلمہ ہے جو علم غیب کلی کے لئے بطور دلیل کے پیش کیا جاتا ہے!

لیکن اول تو قرآن حکیم کی اتنی صاف وصریح اور غیر مبہم تصریحات کے ہوتے ہوئے جو پیش کی گئیں ایک خبر واحد کے ایک مبہم جملہ کو ان کے خلاف پیش کرنا اور قطعیات کو ظنی کے تابع بنانا مطلب برآری کے سوا اور کس عنوان کا مستحق ہو سکتا ہے؟ دوسرے عقیدہ کے لئے نص قطعی کی ضرورت ہے، ظنی سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا، جو ایمان کا جزو بنایا جائے اور اس کے خلاف کو کفر کہا جائے، پھر یہ کہ ظنی ہی طور پر اگر کسی نص ظنی سے کوئی شرعی نظریہ قائم کیا جائے تو کم از کم نص کے الفاظ کو قطعی الدلالت اور متعین المراد ہونے چاہئیں۔ جس کے مفہوم اور مراد میں بھی کئی کئی احتمالات ہوں تو اس کی بنیاد پر تو کسی نظریہ کی بھی عمارت نہیں اٹھائی جا سکتی، چہ جائیکہ عقیدہ کی عمارت کھڑی کی جائے!

(۱) سو اول تو کل شیءٍ سے ذرہ ذرہ اور ما کان و ما یکون مراد لئے جانے کی کوئی دلیل نہیں۔ بالخصوص جبکہ اطلاع غیب کی آیت کے کلمہ مِن رَّسُولٍ سے ابھی واضح ہو چکا ہے کہ شرعیات اور ان کے متعلقات کے علم کے سوا باقی معلومات وصف رسالت کا مقتضا ہی نہیں ہیں کہ یہاں دور از کار اشیاء کا علم کل شیءٍ کے عموم میں داخل کیا جائے، اس لئے کل شیءٍ سے موضوع رسالت ہی کی کل اشیاء مراد لی جائیں گی اور وہ وہی اشیاء ہو سکتی ہیں جن کا اس حدیث میں حضورؐ سے سوال کیا گیا - (یعنی ملاء اعلیٰ کے جھگڑنے کی چیزیں) اور آپؐ نے ان سے اپنی لاعلمی ظاہر فرمائی - مقام کا تقاضا ہے کہ وہی کل اشیاء آپ پر منکشف ہوئیں

اور آپ کو اُن کی کامل معرفت حاصل ہوگئی۔ جس کا سبب حق تعالیٰ کا ید قدرت آپ کے سینۂ مبارک کے درمیان رکھ دینا ہوا، جو تصرف تھا حضورؐ کی روحانیت میں اور وہ بھی انتہائی قرب کے ساتھ۔ کیونکہ ہاتھ رکھ دینا کمالِ قرب کی انتہا ہے — !

یہ تصرف ایسا ہی تھا جیسا کہ پہلی وحی میں۔ جبکہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ظاہر ہو کر آپ سے تین مرتبہ اقرأ کہا اور آپ نے تینوں دفعہ ما انا بقارئٍ فرماکر اپنی لاعلمی کا اظہار فرمایا تو انہوں نے تین مرتبہ حضورؐ کو سینہ سے لگا کر دبایا اور سخت دبایا۔ جس کا تعب آپ کو محسوس ہوا۔ یہ درحقیقت ملکیّت کے ساتھ آپ کو انتہائی طور پر قریب کر کے بلکہ ملاکر روح پاک میں تصرف کرنا تھا! جس کا اثر علم و انکشاف کی صورت میں ظاہر ہوا اور آپ نے اقراء کے جواب میں قرأتِ وحی شروع فرمادی۔ اور حقیقتِ حال کا انکشاف ہوگیا۔

ایسے ہی یہاں بھی حق تعالیٰ نے تین بار اختصام ملاء اعلیٰ کا سوال فرمایا اور آپ نے تینوں بار لاعلمی کا اظہار کیا۔ تو براہ راست یدِ قدرت سے انتہائی قرب بخش کر بلکہ اپنے سے ملاکر تصرف فرمایا۔ جس سے وہ لاعلمی ختم ہوگئی۔ علوم مقصودہ کا انکشاف ہوگیا۔ اور اس سوال کے جواب اور جواب کے تمام مضمر علوم کی استعداد آپ میں دفعتاً پیدا ہوگئی۔ جنہیں زبان و بیان سے آپ نے کھولنا شروع فرمادیا۔ گویا جتنی باتوں کا سوال کیا گیا تھا آپ کو اُنہی کے کل معلومات کا انکشاف ہوا اور اسی کو کلِ شیئٍ سے تعبیر فرمایا گیا پس اس کلِ شیئٍ کے مفہوم کو ذرّہ ذرّہ پر محیط مان کر علم ما کان وما یکون مراد لیا جانا ایک بے دلیل دعویٰ ہے، جس کی اس روایت میں کوئی سند نہیں — !

(۲) لیکن اگر مذکورہ شرعی قاعدہ اور قرآنی اصول کو (کہ حضورؐ کے لئے ما ینبغی لہٗ یعنی مناسبِ شانِ نبوت ہی علوم مراد لئے جائیں) نظر انداز کر کے محض حدیث کے الفاظ ہی پر جمود کیا جائے، اور کلّ شیئٍ کو ذرّہ ذرّہ کے لئے عام ہی مانا جائے۔ تو پھر اس پر بھی غور کر لینا چاہئے۔ کہ تجلّی کے معنی علم کے نہیں بلکہ کسی چیز کے پرتو اور عکس وظل کے سامنے کر دینے کے ہیں جیسے فلمّا تجلّٰی ربہ للجبل میں تجلّی کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ حق تعالیٰ نے شجرہ مبارکہ پر اپنے نورانی ظل وعکس سے جلوہ گری فرمائی اور اپنی کسی شان کو نمایاں فرمادیا، ورنہ ظاہر ہے کہ کسی مادی ظرف میں اُس کی لطیف وخبیر ذات کا بعینہٖ اُتر آنا قطع نظر اُس کی بے انتہا لطافت اور پاکیزہ شان کے لائق نہ ہونے کے یہ ممکن بھی کب ہے کہ محدود میں لامحدود سما جائے، جیسے آئینہ میں آفتاب کے اُتر آنے کا مطلب یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ اس چھوٹے سے ظرف میں یہ زمین سے گیارہ کروڑ گنا بڑا نورانی جسم خود اُتر آیا کہ یہ ناممکن ہے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ آفتاب کا عکس یا پرتو اُس میں آگیا مگر مجازاً کہا یہی جاتا ہے کہ آفتاب آئینہ میں اُتر آیا — !

اسی طرح تجلّی اشیاء کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا کہ اچانک عالم کی کل اشیاء مجھ پر منکشف ہوئیں یعنی اُن کی صورت مثالی میرے سامنے آگئی، سو اسے کشف کہیں گے، علم نہیں کہیں گے اور اگر علم کا لفظ بھی بولا جائے گا تو مناسب مقام اس کے معنی بھی انکشاف اور کشف ہی کے ہوں گے۔ کیونکہ جس چیز کا کشف ہوا اُس کا علم تو پہلے سے تھا، ہم نے اگر سورج کو آئینہ میں دیکھا تو یہ علم نہیں کیونکہ علم تو سورج کا پہلے سے تھا

ایسے ہی موسیٰ علیہ السلام نے اگر شجرہ کے پردہ میں اللہ کو دیکھا تو یہ رویت انکشافی تھی علم نہ تھا کہ علم تو پہلے سے تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حدیث کسوف شمس میں ہے کہ بحالت نماز حضورؐ نے جنت و دوزخ دونوں کو دیوار قبلہ میں دیکھا تو یہ وہی جنت و دوزخ کی صورت مثالی کا انکشاف تھا۔ علم نہ تھا۔ علم تو ان دونوں کا پہلے ہی سے حضورؐ کو تھا،

بہرحال اس تجلّی مثالی کا نام کشف ہے، علم نہیں، اور کشف آنی ہوتا ہے کہ اچانک سارا عالم سامنے آجائے۔ مگر جب وہ کشفی حالت رفع ہو تو وہ بھی اوجھل ہو جائے۔ حضرت معاذؓ بن جبل کا ضغطہ قبر (قبر کا آپ کو دبانا) حضورؐ پر منکشف ہوا جو وقتی حال تھا۔ بعض اہل قبور کا عذاب آپؐ پر منکشف ہوا۔ جو ایک ہنگامی حال تھا بعد میں نہیں رہا۔ یہ نہیں کہ آپؐ اُسے ہر وقت دیکھتے ہی رہے، یا جہان بھر کی تمام قبروں کے حالات حضورؐ پر ہمہ وقت منکشف رہتے تھے!

بہرحال کشف، احوال و مواجید میں سے ہے جو ہمہ وقت نہیں رہتا۔ بخلاف علم کے کہ وہ رنگ نفس بن کر پائدار ہوتا ہے۔ پس حق تعالیٰ کے ید قدرت قدرت کے تصرف کا یہ قدرتی اثر تھا کہ قلب نبوتؐ اکرم چمک اٹھا اور اس میں کائنات کی ساری اشیاء اپنی مثالی صورتوں کے ساتھ اچانک زیر نظر آگئیں۔ لیکن یہ تجلّی مقصود نہ تھی۔ صرف تصرف حق کی خصوصیت تھی۔ اس سے مقصد اصلی قلب نبوت کو چمکا کر وہ علوم اس میں پیدا کرنے تھے، جن کا سوال حق تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ کہ فیم یختصم الملاء الاعلیٰ (ملاء اعلیٰ والے کس چیز میں جھگڑتے ہیں) چنانچہ وہ روشن ہوئے تو اسی کو آپ نے فرمایا وعرفت، یعنی میں حقیقتِ حال پہچان گیا۔ اور اس کے بعد ہی آپ نے اس سوال کے جواب پر اپنے بیان سے روشنی ڈالنی شروع کر دی — !

اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہی ہے، جیسے کہ کوئی شخص کتاب کا مطالعہ کرنے کے لئے چراغ جلائے اور سارا گھر روشن ہو جائے۔ اور مقابل کی ہر چیز نظر آنے لگے۔ لیکن یہ انکشاف اشیاء خانہ چراغ جلنے کی خاصیت ہوتی ہے، خود ان اشیاء کا سامنے لانا اور دیکھنا مقصود نہیں ہوتا۔ مقصود اصلی مطالعہ کتاب ہوتا ہے، تاکہ مسائل کا علم ہو، ٹھیک اسی طرح تصرّفِ خداوندی جو قلب مبارک پر ہاتھ رکھنے کی صورت سے ہوا، چراغ روشن کرنے کے مشابہ ہے۔ جس سے شفاف لطیفۂ نبوت اکرمؐ چمک اٹھا۔ اس چمک میں اشیاء کائنات کا ایکدم متجلّی اور منعکس ہو جانا گھر کی چیزوں کے روشن ہو جانے کے مشابہ ہے اور اس روشنی میں مطالعہ کتاب جو اصل مقصد ہے۔ سوال خداوندی کا جواب ذہن میں آجانے کے مشابہ ہے۔ اس لئے حدیث میں تجلّی اشیاء سے تو کشف مراد ہے، جو خود مقصود نہیں اور معرفت سے علوم مقصودہ کا کھل جانا مراد ہے۔ جو اس تصرّف الٰہی کا اصل مقصود تھا۔ پس کل اشیاء کائنات کا اچانک آپ کے سامنے کھل جانا کشف تھا، علم نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ کشف اگر ساری کائنات کا بھی ہو جائے تو وہ آنی اور دفعی ہوتا ہے جس میں استقرار نہیں ہوتا، گویا وہ ایک حال ہوتا ہے، جو آتا ہے اور چلا جاتا ہے، بسا اوقات اہل حال، اہل اللہ پر ایسے واردات کا ورود دفعتہً ہوا ہے کہ کل کا کل عالم فرش سے عرش تک اور اس سے بھی اوپر کے اور بڑے بڑے جہان اُن پر اچانک منکشف ہو کر سامنے آگئے جیسا کہ فتوحات مکیہ میں رئیس الصوفیاء حضرت شیخ اکبرؒ[1] نے خود اپنے مکاشفات کے سلسلہ میں

---

[1] مگر انہی شیخ اکبر کے کشفی مسائل لفظ و بیان میں آ کر اس قدر نازک، دقیق اور متشابہ ہو گئے ہیں کہ اہل شریعت صوفیؒ ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کو رفع کرتے کرتے تھکے جاتے ہیں مگر حالت یہ ہو کہ ایک پیچ کھلتا ہے اور دو پیچ اور پڑ جاتے ہیں، اس کے برخلاف "انا الحق" والے صوفی فتوحات مکیہ اور خصوص الحکم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ "ایمان" لرز اٹھتا ہے، اللہ کی رحمت نازل ہو مجدد الف

ایسی خبریں دی ہیں کہ اُن پر دُنیا و ما فیہا اور فرش سے تا عرش منکشف ہوا۔ لیکن نہ اُنھیں عالم الغیب کہا جاتا ہے، نہ عالم ماکان و مایکون کہ یہ علم نہیں بلکہ اجمالی مشاہدہ ہے۔ جس میں کُل کائنات اچانک سامنے آجاتی ہے اور فوراً ہی یہ مشاہدہ ختم ہوجاتا ہے اگر ہم ہوائی جہاز پر سوار ہوکر دلّی کے اُوپر پرواز کریں اور یہ کہیں کہ اس وقت کُل دلّی ہمارے سامنے ہے تو دعویٰ صحیح ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے دلّی کی جزئی جزئی تفصیل کے ساتھ دیکھ لی اور ہماری نگاہیں اُس کے ایک ایک گھر میں گھُسیں اور اُس کے ذرّہ ذرّہ کا مشاہدہ کرآئیں۔ اور جتنی بھی مشاہدہ میں آئیں وہ مشاہدہ صفتِ نفس بن گیا اور مرنے دم تک قائم رہا۔ یہی صورت پورے عالم کے کشفِ کلّی کی ہوتی ہے کہ اس وقت یہ دعویٰ صحیح ہوتا ہے کہ اس کی کُل اشیاء سامنے آگئیں مگر یہ ایک دفعی اور اجمالی مشاہدہ ہوتا ہے، جس میں نہ استقرار ہوتا ہے نہ جزئی، جزئی کی تفصیل اس لئے اسے علم نہیں کہتے چہ جائیکہ علم غیب اور وہ بھی علم غیب کل، اسی قسم کے انکشاف غیب کے بارے میں روح المعانی میں غیب کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

ومن ھٰھنا قیل الغیب مشاھدۃ الکل بعین الحق فقد یمنح العبد قرب النوافل فیکون الحق سبحانہ بصرہٗ الذی یبصر بہ وسمعہ الذی یسمع بہ ویرقی من ذالک الیٰ قرب الفرائض فیکون نوراً فھناک یکون الغیب لہٗ شھوداً والمفقود لدنیا عندہ موجوداً ومع ھذا لایسوغ لمن وصل الیٰ ذالک المقام ان یقال فیہ انہ یعلم الغیب۔ قل لا یعلم من فی السمٰوات والارض الغیب الا اللہ۔ (روح المعانی جلد اول ص۱۱۱)

اور ایسے ہی مواقع پر کہا گیا ہے کہ غیب مشاہدۂ کُل کا نام ہے جو عین حق سے ہو، چنانچہ کبھی بندہ پر احسان کیا جاتا ہے کہ اُسے نوافل کے ذریعہ قربِ خداوندی عطا کیا جاتا ہے تو حق تعالیٰ ہی اُس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے اور وہی اُس کا کان بن جاتا ہے جس سے وہ سُنتا ہے، پھر اس سے ترقی کرکے جب وہ فرائض کے ذریعہ قربِ الٰہی پاتا ہے تو نورِ مجسّم بن جاتا ہے اور اس وقت یہ غیب اس کے لئے شہود ہوجاتا ہے اور جو چیزیں ہم سے مفقود ہیں۔ اس کے سامنے موجود ہوجاتی ہیں (گویا اشیاء کائنات اُس کے مشاہدہ میں آجاتی ہیں) مگر اس کے باوجود جو بھی اس مقام پر پہنچے، اُس کے لئے یہ گنجائش نہیں ہے کہ اُسے عالم الغیب کہا جائے ارشاد حق ہے کہ "اے پیغمبرؐ! فرما دیجئے کہ کوئی بھی زمین میں ہو یا آسمان میں غیب نہیں جانتا، بجز اللہ کے۔"

اس سے واضح ہے کہ اس قسم کا مشاہدۂ کُل علم ہی نہیں۔ چہ جائیکہ علم کلّی ہو اور نہ ایسے صاحب کشف پر عالم الغیب کا اطلاق ہی آسکتا ہے، بلکہ یہ ایک دفعی انکشاف ہے جو غیر نبی کو بھی بطفیل انبیاء میسّر آسکتا ہے!

بہرحال "تجلّی لی کُلُّ شیئٍ" میں تجلّی سے کشف مراد ہوگا جو تجلّی کی حقیقت ہے۔ اب اگر کُلُّ شیئٍ سے اس خاص دائرہ کی کل اشیاء کا کشف مراد لیا جائے۔ جن کا حق تعالیٰ نے سوال فرمایا تھا تو یہ مسائل کا کشف ہوگا۔ جسے فنی اصطلاح میں کشفِ الٰہی کہتے ہیں۔ کہ حقائق شرعیہ منکشف ہوجائیں۔ اور اگر کُلُّ شیئٍ سے کائنات کی تمام اشیاء کا کشف مراد لیا جائے تو کشف کونی ہوگا مگر ان میں افضل ترین کشف مسائل کا ہے۔ جو مقصود ہیں نہ کہ اشیاء کائنات کا جو بذاتہٖ مقصود

بھی نہیں - پس اول تو اس حدیث سے کشف کو نبی پر زد دینا اور کشف الٰہی سے باوجود اس کے ممکن ہونے کے یکسو ہوجانا مرتبۂ نبوت کی عظمت اور جلالت قدر سے قلیل المعرفتی کی علامت ہے۔ اور اوپر سے اس تجلی کشفی سے علم غیب پر استدلال کرنا اور وہ بھی علم ماکان ومایکون پر کلماتِ حدیث کو اُن کے مواضع سے ہٹا دینا ہے، جو تحریف کے ہم معنی ہے، کیونکہ تجلی کے معنیٰ نہ لغت میں علم کے آتے ہیں نہ شریعت کی یہ اصطلاح ہے ـــــ!

پھر کشف تو کشف" وہ علم بھی انبیاء کے لئے مدارِ افضلیت نہیں بن سکتا جو خصائص نبوت میں سے نہ ہو - یعنی غیر نبی کو بھی ہوسکتا ہو - اور بعض تجرباتی اور طبیعیاتی قسم کے امور - جیسے کھجوروں کے پیوند باندھنے کے بارے میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا :-

انتم اعلم بامور دنیاکم (مسلم)

(اپنی دنیا کے امور کے بارے میں تم ہی لوگ زیادہ جانتے ہو)

ظاہر ہے کہ جس علم میں اُمتی کو نبی سے زیادہ جاننے والا فرمایا جائے وہ علم یقیناً خصائص نبوت میں سے نہیں ہوسکتا - ورنہ نبی کے واسطے کے بغیر کسی امتی کو کبھی مل ہی نہ سکتا۔ پس ایسے علوم و فنون پر نہ نبوت کی بنیاد ہے اور نہ وہ اس مقدس اور پاکباز طبقہ کے لئے سبب فضیلت ہیں، اُن کے پیغمبرانہ کمالات کی بنیاد علوم شرائع و احکام ہیں - تکوینی علوم اس مقصد کی ضرورت کی حد تک بقدر ضرورت دیئے گئے ہیں - بنیادِ نبوت نہیں ہیں کہ اُن کے گھٹنے بڑھنے سے نبوت میں کوئی فرق آجائے !

پھر اس حدیث "تجلی لی" کے ساتھ اگر ان بے شمار روایات و نصوص کو بھی ملا لیا جائے جن میں حضورؐ نے خود ہی اپنے سے بہت سے معلومات کی نفی فرمائی ہے، تو پھر اس حدیث "تجلی لی" سے حضورؐ کے لئے علم محیط ثابت کرنے کی وہی جرأت کریگا جو علم کے حصہ کی بھی جرأت ہی رکھتا ہو - مثلاً آپ مدینہ کے بہت سے منافقین کو نہیں جانتے تھے، جیسے قرآن نے فرمایا :-

لا تعلمهم نحن نعلمهم

آپ نہیں جانتے ہم انھیں جانتے ہیں !

آپ علم شعر نہیں جانتے تھے جیسا کہ قرآن نے فرمایا :-

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشعر وما ينبغي له

ہم نے انہیں (پیغمبر کو) نہ شعر کی تعلیم دی اور نہ یہ اُن کے مناسبِ شان ہی ہے !

حتیٰ کہ آخر عمر شریف تک بھی یہ فن آپ کے علم میں نہیں لایا گیا - کیونکہ آیتِ بالا نے صرف اس علم ہی کی آپ سے نفی نہیں کی بلکہ آپ کی شانِ اقدس کے لئے اس کی ناپسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا - اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ نامناسب اور خلافِ شان باتوں کی آپ کو کسی وقت بھی تعلیم دی جاتی -

آپ کا کسی میت کے بارے میں سوال فرمانا کہ یہ کب مرا ہے، آپ کا بعض قبروں میں عذاب کا مشاہدہ کرکے یہ فرمانا کہ یہ کن لوگوں کی قبریں ہیں؟ لاعلمی کا اظہار ہے۔ فتح خیبر کے موقع پر آپ کے سامنے زہر آلود کھانا پیش کیا گیا اور لاعلمی کے سبب آپ نے اسے زبان پر رکھا اور کچھ اثر بھی اندر پہنچا - جس نے عمر بھر تکلیف پہنچائی - اس قسم کی تمام مضرت رساں چیزوں کے بارے میں آپ کا قرآنی زبان میں یہ فرمانا کہ :-

وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ !

اگر میں عالم الغیب ہوتا تو خیر کثیر جمع کرلیتا اور مجھے بُرائی نہ چھو سکتی - میں تو صرف ایک ڈرانے والا اور بشارت سُنانے والا ہوں ایمان والوں کے لئے !

یہ آیت ظاہر ہے کہ محکم اور دوامی ہے منسوخ شدہ نہیں - اور واقعات میں نسخ ہو بھی نہیں سکتا - اس لئے یہ آیت تا قیامت یہی اعلان کرتی رہے گی کہ آپؐ کو علم غیب نہ تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت تک آپؐ کو علم غیب نہیں ہوگا - ورنہ اگر اس آیت کے نزول کے بعد قیامت سے قبل قبل اس کے خلاف کوئی بھی واقعہ پیش آتا تو خود قرآن اسے بیان کرتا اور اس آیت کا کوئی محمل تلاش کیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا - تو اس کا یہ قطعی ثبوت ہے کہ آپؐ کا عالم الغیب نہ ہونا قیامت تک کے لئے ہے !

اگر یہ کہا جائے کہ علم غیب ذاتی علم کو کہتے ہیں تو اس نفی سے زیادہ سے زیادہ ذاتی علم کی نفی نکلی - کہ میں بالذات علم نہیں رکھتا - مگر اس سے بالغیر علم کی نفی نہیں نکلی - تو ہو سکتا ہے کہ آپؐ ان غیبی امور کو بتعلیم الٰہی جانتے ہوں - بالذات نہ جانتے ہوں تو آپؐ کا عالم الغیب ہونا بھی ثابت ہوگیا اور آیت کے خلاف بھی نہ ہوا - اس لئے مستقبل کا یہ علم اس آیت کے خلاف نہیں -
جواب یہ ہے کہ :-

اولاً تو قرآن نے جب صراحتاً علم غیب کے عنوان ہی کو آپ کے لئے نہیں رکھا اور اس عنوان ہی کی مستقلاً نفی کر دی تو اُسی عنوان کا آپ کے لئے ثابت کرنا قرآنی عنوان کا معارضہ ہے جو انتہادرجہ کی گستاخی اور شوخ چشمی ہے -

دُوسرے یہ کہ اس شبہ کو خود یہ آیت ہی رد کررہی ہے - کیونکہ اس میں غیب سے لاعلمی کا ثمرہ، یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مجھے اذیت و کلفت کبھی نہ چھوتی - لیکن سب جانتے ہیں کہ اذیت و مصائب نے آپ کو چھوا - تو نتیجہ ظاہر ہے کہ آپ ان مصائب سے لاعلم رہے - ورنہ پیش بندی فرما لیتے - اور ظاہر ہے کہ . . . مصائب کا چھونا مطلقاً لاعلمی سے ہو سکتا ہے - یہ نہیں کہ اگر آپؐ بالذات عالم ہوتے تب تو مصائب نہ چھو سکتے - مگر جبکہ بالعرض عالم تھے تو مصائب نہ رُک سکیں کیونکہ مصائب کا دفعیہ نہ ہوسکنا لاعلمی پر مبنی ہوتا ہے - جس میں ذاتی اور عرضی کی کوئی قید نہیں - نوکہ علم کی خاص نوعیت کی نفی پر -

حاصل یہ نکلا کہ بالذات تو مجھے علم ہے ہی نہیں کہ میں عالم الغیب کہلاؤں - اور مصائب کی پیش بندی کر لوں - تمام مصائب کے بارے میں یہ علم مجھے بالعرض بھی نہیں کہ تمام مصائب کا پہلے سے کوئی بندوبست سوچ لوں - یعنی ہر ہر مصیبت کے بارے میں مجھے پہلے سے کوئی اطلاع نہیں ہوتی - کہ میں پہلے سے پیش بندی کر لیا کروں ،

حاصل وہی علم کل اور علم ماکان ومایکون کی نفی نکلا - کہ اس قسم کی روزمرّہ کی جزئیات اور زمانہ کے حوادث سب کے سب میرے علم میں نہیں، نہ حال کے نہ مستقبل کے، نہ ذاتی طور پر نہ عرضی طور پر، بجز اس کے کہ حق تعالیٰ جب مناسب جانیں اور جس حد تک مناسب جانیں - مجھے اطلاع فرمادیں !

مگر ساتھ ہی ان کوئی جزئیات کی لاعلمی سے کوئی ادنیٰ نقص بارگاہ نبوت میں لازم نہیں آتا کیونکہ ان امور کا جاننا نبوت کی غرض و غایت نہیں ہے -

اگر یہ کہا جائے کہ اس قسم کی جزئیات کا علم وفات کے وقت دے دیا گیا تھا، جیسا کہ کہا جاتا ہے، اور اس طرح حضورؐ کو عالم ماکان ومایکون ثابت کرکے گویا اپنے نزدیک نبوت کی عظمت بیان کی جاتی ہے، تو پہلا سوال تو یہ ہے کہ اس دعوے کی دلیل کتاب وسنت سے کیا ہے ؟ اور جب نہیں تو دعویٰ خارج اور ناقابلِ سماعت ہے !

دُوسرے یہ کہ یہ ماکان ومایکون کے تمام امور جو عین وفات کے وقت دیئے گئے ، اگر ان کا منصب نبوت سے کوئی

تعلق تھا تو ایسے وقت میں اُن کا دیا جانا جبکہ کارِ نبوت اور عملِ تبلیغ ختم ہو رہا ہے عبث اور بے نتیجہ ہی نہیں بلکہ بعد از وقت ہو جانے کی وجہ سے خلافِ حکمت بھی ہے۔ جس سے اللہ و رسول بری ہیں۔ اس لئے نہ یہ عقیدہ ہی بن سکتا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی نصِ قطعی موجود نہیں، بلکہ ہے تو اس کے مخالف ہے۔ جیسا کہ بکثرت ایسی نصوص پیش کی جا چکی ہیں۔ اور نہ یہ کوئی شرعی نظریہ ہی ہو سکتا ہے، جبکہ کسی نص سے وہ ماخوذ اور مستنبط بھی نہیں۔ اور نہ ائمہ اجتہاد ہی میں سے کوئی ادھر گیا ہے کہ اسے اجتہادی نظریہ مان لیا جائے۔ اور ساتھ ہی جن امور کی لاعلمی سے دُنیا میں تکالیف پہنچ جانا ممکن تھا اور وہ پہنچ بھی گئیں، اُن کا عین وفات کے وقت دیا جانا جبکہ ان واردشدہ اور افراد اختہ مصائب کا وقت بھی گزر چکا تھا اور اب اُن سے بچاؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا، لاحاصل اور بعد از وقت نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ کیا اس قسم کے خلافِ عقل و نقل دعوے کرنے والے حق تعالیٰ کے حکیمانہ کاموں کو بھی مشتے از جنگ کا مصداق بنانا چاہتے ہیں ــــ نعوذ باللہ من ذٰلک الھفوات!

یہ لوگ چلتے ہیں نبوت کی تعظیم کے نام سے اور اُتر آتے ہیں حق تعالیٰ کی توہین پر، جس سے نبوت کی توہین پہلے ہو جاتی ہے!

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا -

لیکن اس کے ساتھ جب ان روایات کو بھی سامنے رکھ لیا جائے، جن میں صراحتاً بہت سے امور کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ نہ وفات سے قبل آپ کے علم میں تھے اور نہ وفات کے بعد آپ کے علم میں آئے، نہ قیامت کے دن تک بھی آپ کے علم میں آئے اور بعض قیامت کے میدانوں میں بھی علم میں نہ آسکے، تو پھر یہ دعویٰ کہ حضورؐ کو علم محیط وفات کے وقت دے دیا گیا تھا، محض افترا علی اللہ اور افترا علی الرسول ہی ہو گا -

مثلاً آپ نے فرمایا کہ:-

"میں شفاعتِ کبریٰ کے وقت مقامِ محمود پر پہنچ کر اللہ کے اتنے محامد اور محاسن بیان کروں گا جو نہ کسی نے اب تک بیان کئے ہوں گے اور نہ آئندہ کوئی کرے گا۔ اور وہ اس وقت بھی میرے علم میں نہیں، اُسی وقت میرے قلب پر القاء کئے جائیں گے۔"

جس سے واضح ہے کہ اِن محامد الٰہیہ کا علم آپؐ کو وفات کے وقت بھی نہیں دیا گیا۔ کیا یہ مَا یَکُوْن میں داخل نہیں ہے؟ جس کے علم کی آپؐ خود اپنے سے نفی فرما رہے ہیں۔

یا مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ:-

"حوضِ کوثر سے ملائکہ بعض لوگوں کو کوڑے مار مار کر ہٹائیں گے، اور میں کہوں گا اُصیحابی، اُصیحابی" یہ تو میرے لوگ ہیں میرے ہیں، تو جواباً ملائکہ کہیں گے انک لا تدری ما احدثوا بعدک (آپ کو پتہ نہیں ہے کہ انہوں نے آپؐ کے بعد کیا کیا نئی بدعتیں ایجاد کی تھیں)"

اس سے واضح ہے کہ ان مبتدعین کے کرتوت کا علم آپؐ کو وفات کے وقت تک نہ تھا جو یقیناً مَا یَکُوْن میں شامل ہے۔ اسی طرح مثلاً آپ کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور آپ اپنی دانست میں اُن تک، کو جہنم سے نکال لائیں گے جن کے دلوں میں ادنیٰ، ادنیٰ مثقال ذرّہ کے برابر بھی ایمان ہو گا۔ اور یہ سمجھ کر مقامِ شفاعت سے واپس ہوں گے کہ اب ایمان والا جہنم میں کوئی باقی نہیں رہا جس کی شفاعت کی جائے۔ تب حق تعالیٰ دو لپیں (دو مٹھیاں) بھر کر اَن گنت انسانوں کو جہنم سے

نکالیں گے۔ ان کے گلوں میں تختیاں ڈال دی جائیں گی۔ جن پر عُتَقَاءُ اللّٰہ لکھا ہوا ہوگا۔ یعنی اللہ کے آزاد کردہ لوگ۔ اس سے واضح ہے کہ ان لوگوں کا ایمان اس درجہ خفی ہوگا کہ اللہ کے سوا اسے کوئی بھی حتیٰ کہ سید الاوّلین والآخرین بھی نہ جان سکیں گے۔ اس سے نمایاں ہوگیا کہ بعض ایسے امور بھی ہیں کہ وقت وفات تو بجائے خود ہے عرصات قیامت میں بھی آپؐ انھیں نہ جان سکیں گے، بلکہ اس مخلوق کے جہنم سے نکال لئے جانے کے بعد آپؐ کو علم ہوگا کہ اُن میں بھی ایمان کی کوئی رمق موجود تھی۔ اسی طرح آپؐ کا یہ ارشاد کہ:۔

"لوگوں کی کمزوریاں میرے سامنے لاکر مت رکھو، میں چاہتا ہوں کہ تم سب سے ٹھنڈے سینہ سے رخصت ہوں"

جس پر صحابہؓ جیسے حقیقی عشاق نے عمل کیا۔ اور حضورؐ کی مجلسِ مبارک اور صحابہ کی زبان مبارک ہر غیبت سے پاک رہی، تو کیا عین وفات کے وقت ایسی کمزوریوں کا علم ظرفِ نبوت میں ڈال دیا گیا ہوگا کہ معاذ اللہ آپ عین رخصت کے وقت صحابہ سے ٹھنڈے سینہ رخصت نہ ہوں اور دل تنگی یا غم و الم اور ضیق لے کر جائیں، جس سے بچنے کا پوری عمر شریف میں اہتمام فرمایا۔ بلاشبہ یہ ایک فاسد تخیل ہے جو نادان دوست ہی باندھ سکتا ہے، جسے نہ قرآن کی پروا ہو، نہ حدیث کی، نہ رسولِ پاک کے مزاجِ پاک کی ورنہ اس حدیث کا سیدھا مفہوم یہ ہے اور یہی ہو بھی سکتا ہے کہ اس قسم کے امور وفات کے وقت بھی سامنے نہیں لائے گئے۔ حتیٰ کہ حوضِ کوثر پر پہنچکر بھی سامنے نہیں آئے، بعض امور کا علم ملائکہ کے فرمانے سے اور وہ بھی لوگوں کی ذاتیات کے بارے میں نہیں، بلکہ عقائد کے بارے میں، جو بدعات کی صورت سے لوگوں نے دین میں ایجاد کرلی تھیں۔

بہرحال عقل و نقل دونوں اس پر کھلے بندوں اپنی پوری عدالت کے ساتھ شاہد ہیں کہ سیّد البشر کو اگرچہ ساری مخلوقات سے زیادہ علم تھا مگر علم محیط نہ تھا۔ جو خاصۂ خداوندی ہے، نہ وفات سے قبل نہ وفات کے بعد۔ نہ برزخ میں نہ عرصاتِ قیامت میں۔ ہاں آپؐ کو علم تھا امورِ دین کے بارے میں، یعنی اصلاح بشر کے سلسلہ کا کوئی قانون اور کوئی اصول ایسا نہ تھا جو آپ کو عطا نہ کردیا گیا ہو۔ کیونکہ آپ خاتم النبیّین اور عالمی رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ دُنیا کی ہر قوم کے لئے آپؐ مصلح اور مربّی تھے۔ اسلئے اصولاً اقوامِ عالم کی جتنی ذہنیتیں ہوسکتی تھیں اُتنے ہی رنگ کے قوانینِ اصلاح بھی ہوسکتے تھے اور آپ جبکہ ان ساری رنگ برنگ ذہنیتوں اور صد الوان مزاجوں کی قوموں کے لئے مصلح بنا کر بھیجے گئے تھے، تو اُن کے حسب حال الوانِ ہدایت کا بھی آپؐ کو جامع ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے ہدایت و ارشاد کے سلسلہ کا کوئی اصولی قانون اور کلّی ضابطہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس کے آپ جامع نہ ہوں۔ پس علم محیط اگر مانا جائے گا تو انواعِ ہدایت و ارشاد کا اور قوانینِ شریعت کا۔ نہ کہ انواعِ کائنات، اقسامِ تجربیات، اصنافِ طبیعیات و ریاضیات اور عالم کے حوادث و جزئیات وغیرہ کا۔ کیونکہ انبیاء کی بعثت محسوسات کے دکھلانے یا ان میں صنعت گری کا عمل جاری کرانے کے لئے نہیں ہوتی کہ یہ سب معلومات طبعی اور تجرباتی ہیں۔ جو بہ تقاضائے وقت خود ہی طبائع میں اُبھر آتی ہیں اور طبائع کو اُن کی طرف مائل کردیتی ہیں۔ نبوت کے آنے یا اس کے تبلیغ کرنے پر موقوف نہیں — !

آج اور آج سے پہلے دُنیا کی اقوام نے مادیات میں ترقی کرکے بڑے بڑے تمدن پیدا کئے اور آج کی مغربی اقوام نے تو تمدن کو مشینی بنا کر انتہائی عروج پہ پہنچا دیا ہے۔ لیکن ان کی ایجادات کا استناد کون سی نبوت کی طرف ہے۔ اور کس نبی کے حکم سے انہوں نے برق و بخار کی یہ مشینیں تیار کی ہیں؟ اگر نبوت کا کوئی فیضان ان مادہ پرستوں کے قلوب پر ہوتا تو اُن کے تمدن کی صورت ہی کچھ اور ہوتی اور وہ اس طرح دُنیا کے حق میں نِکلے مُفسد اور نمایاں فاسد ثابت نہ ہوتے !

بہرحال ان چند کلمات سے علمِ غیب کے معنی اس کا شرعی حکم، اس کے موضوع کی پوری وضاحت اور اس پر کئے گئے خدشات وشبہات کا کافی وشافی رد کتاب وسنت سے واضح ہوگیا اور نمایاں ہوگیا کہ علمِ غیب یعنی یعنی علم ذاتی اور علم کلی یعنی علم ماکان ومایکون، خاصۂ خداوندی ہے۔ جس میں کوئی بھی غیراللہ اس کا شریک نہیں ہوسکتا۔ حضرت سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام عالمِ بشریت عالم ملکیت اور عالمِ ارواح سے فائق اور بدرجہا بڑھ چڑھ کر ہے۔ مگر علمِ الٰہی سے آپ کے علم کو کیا نسبت! یہی نصوصِ شرعیہ کا مقتضا، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوی ہے! پس ہر مسلم اور ہر عاشقِ رسول کو اس علمی توجیہ کا اقرار اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے! اس لئے مسئلہ علم غیب کے بارے میں اس قسم کے مبالغہ آمیز دعووں کو بہ نام عشقِ رسول اتنا سہل اور غیر اہم نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ جیسا کہ سمجھا جا رہا ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کا تعلق چونکہ عقیدہ سے ہے، اس لئے کلیتہً رائے، ذوق، جذبات اور طبعی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر صرف کتاب وسنت کی تصریحات اور ائمہ اہلِ سنت والجماعت کی تشریحات میں محدود ہوجانا چاہیئے۔ واللہ الموفق!

وبوسہ دادن قبر را وسجدہ کردن آنرا وکلّہ نہادن حرام وممنوع است ودر بوسہ دادن قبر والدین روایت فقہی نقل می کنند وصحیح آنست کہ لایجوز۔

(قبر کو بوسہ دینا اور سجدہ کرنا، رُخسار رکھنا حرام وممنوع ہے اور والدین کی قبر کو بوسہ دینے کے بارے میں فقہی روایت نقل کرتے ہیں۔ مگر ٹھیک بات یہ ہے کہ (یہ بھی) جائز نہیں ہے!

(مدارج النبوۃ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ)

ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔

توحید اُلوہیّت

جن وانس کی تخلیق کی غایت صاف وسلیس الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے:۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ!

عبادت کے معنی ہیں "توحید"۔ چنانچہ امام المفسرین حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ قرآن کریم میں جس جگہ بھی عبادت کا ذکر آیا ہے اس کے معنی "توحید" کے ہیں۔ گویا محاورہ قرآن میں عبادت ہر جگہ توحید کے معنی میں آئی ہے۔ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے معنی ہوں گے نوحدک ونطیعک اور "ایای فاعبدون" کا مفہوم ہوگا کہ میری ہی توحید تمہارے سینوں میں بس جائے۔ عبادت کی تعبیر توحید کے لفظ سے کرنے میں خوبی یہ ہے کہ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عبادت صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس سے شرک کی قطعی نفی ہو جاتی ہے۔ جس کو کسی دوسری جگہ کھول کر اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا [1] (پارہ ۵ ع ۳)

تمام پیغمبروں کے پیغام کا یہی نچوڑ تھا کہ یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ یعنی اے قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوائے تمہارا کوئی معبود ورب نہیں۔ یا اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہ۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ۔ اور یہ عبادت اسی توحید وتقویٰ واطاعت پر مشتمل ہے!

حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ نے بھی انہی الفاظ سے کہ یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ سے اپنی قوم کو توحید کی طرف بلایا!

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو یوں مخاطب کیا اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اور مشرکین سے اپنی برأت اس طرح ظاہر فرمادی۔ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ [2]! انہوں نے اور حضرت یعقوبؑ علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہ وصیت فرمادی تھی کہ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ [3]۔

---

[1] تم اللہ ہی کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شریک مت کرو۔

[2] میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے!

[3]۔ اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا!

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اہلِ فرعون کو یہی بات پہنچائی تھی کہ:۔
"تم صرف اللہ ہی کو پوجو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں!"
اسی تعلیم، اسی دعوتِ توحید کے ساتھ ہمارے نبی النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور حق تعالیٰ نے آپؐ کی ذات پر اس دعوت الی التوحید کو ختم فرمادیا۔ آپؐ کو ارشاد ہوا:۔

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاْ ۨالَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ (پ۹ ع ۹)

آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی ہے تمام آسمانوں اور زمین میں اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر!

غرض توحید الوہیت پر سارے انبیائے اوّلین و آخرین کا اجماع ہے۔ جو بھی رسول آیا وہ توحید کی دعوت لے کر آیا:۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِىْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔ (پ۱۷۔ ع ۲)

ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہیں بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، بس میری عبادت کیا کرو!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے کہا تھا کہ:۔
"اگر تم ایک کلمہ کا اقرار کر لو تو تمام عرب تمہارا مطیع ہو جائے اور تمام عجم تمہاری خدمت گزاری کرنے لگے"۔

ابو جہل نے خوش ہو کر کہا کہ "بتلایئے وہ کلمہ کیا ہے۔ ہم ایسے دس کلمے ماننے کے لئے تیار ہیں"۔
فرمایا۔ "دس نہیں بس ایک ہی کلمہ ہے کہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔
یہ سنتے ہی ان سب کو طیش آ گیا کہنے لگے۔ "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عُجَابٌ۔ یعنی اس نے تو اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے"۔ (ترمذی شریف کتاب التفسیر)

توحید فی العبادت کی ضد تشریک فی العبادت! موحد اللہ ہی کو اِلٰہ مانتا ہے۔ یعنی اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے۔ اور مشرک غیر اللہ کو بھی اِلٰہ مانتا ہے اور اس کی بھی عبادت کرتا ہے۔ سورۂ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر یعنی ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، نوحؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ، اسمٰعیلؑ، یسعؑ، یونسؑ علیہم السلام کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ نفوسِ قدسیہ حق تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک کرتے تو ان کی ساری طاعتیں باطل ہو جاتیں، کیونکہ شرک کے ساتھ کوئی عمل مقبول نہیں!

وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (پ۷ ع ۱۶)

خوب سمجھ لو کہ شرک واقع ہوتا ہے عبادت کے ان ہی افعال اور عقائد میں، بنی نوع انسان کے اکثر افراد عبادت ہی کے معاملہ میں شرک میں گرفتار رہتے رہے۔ انہوں نے غیر اللہ کو اپنا اِلٰہ یا معبود قرار دیا۔ اپنے نفع کے لئے ان کی مرضی کا

اتباع کیا یعنی اپنا نافع وضار سمجھا۔ باعتقاد نفع وضرر اُن کی تعظیم کی۔ وقت حاجت اُن سے فریادرسی چاہی۔ اُن سے استعانت کی، اُن کو پکارا، اُن سے التجا کی۔ استغاثہ کیا۔ رجاؤ خوف کا تعلق اُن سے رکھا۔ اُن کی نذرو نیاز میں اپنے مال کا ایک حصہ صرف کیا اور ذبح ونحر سے اُن کا تقرب چاہا۔ غرض فقر وذلت کی نسبت اُن سے جوڑی۔ اُن کے سامنے خضوع کیا اور جب انبیاءکرام نے انھیں افراد عبادت اللہ کی دعوت دی، توحید فی العبادت کی تلقین کی انھیں للکارا کہ ؎

تاچند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگذر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی!

تو ان مشرکین نے از راہ تکبر و عناد پلٹ کر پوچھا:۔

اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۤؤُنَا ؟ (پ ۱۶۶)

کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہم سے یہ کہو کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے اور اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ، اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (پ ۲۳ ع ۱۰)

یعنی بڑے تعجب کی بات ہے کہ سب معبودوں کو اس شخص نے تو ایک معبود کر ڈالا!

دیکھو ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کیا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے قائل تھے، مقر تھے، اُس پر ایمان رکھتے تھے، اُن کو اس بات کا بھی اقرار تھا کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے۔ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (پ ۲۵ ع ۱۳) زمین و آسمان کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ - رزاق بھی وہی ہے، محی ومیت بھی وہی اور مدبّر امر بھی وہی۔ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۤءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پ ۱۱ ع ۹) اسی کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہی ہر شے کی پناہ گاہ ہے!۔ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ط قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (پ ۱۸ ع ۵) وہی آسمانوں کا اور عرش عظیم کا مالک اور رب ہے۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ - سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ، قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پ ۱۸ ع ۵) زندگی گزارنے کے قانون میں اپنے کو آزاد سمجھتے تھے ہدایت رب کا محتاج نہ جانتے تھے!

فرعون جس کو کفر میں اتنا غلو تھا اس کے متعلق بھی حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی زبانی کہلوایا ہے:۔

لقد علمت ما انزل ھؤلاء الا رب السموات والارض بصائر (پ ۱۵ ع ۱۲)

تو یہ خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات خاص آسمان وزمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے ذرائع ہیں۔ اور تمام مشرکین کے بارے میں ابلیس لعین تک نے کہا۔ انی اخاف اللہ رب العالمین۔ نیز رب انظرنی اور رب بما اغویتنی؟

صاف ظاہر ہے کہ ان مشرکین کا جرم "اشراک فی الذات" نہیں تھا۔ یعنی یہ اللہ کی ذات کے برابر کسی غیر کو واجب الوجود یا ازلی وابدی نہیں مانتے تھے۔ اور نہ ان کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے انکار تھا سوائے ثنویہ کے دُنیا میں

کوئی فرقہ اس کا قائل ہی نہیں ملتا۔ مشرکینِ مکہ توحیدِ ربوبیت تک کے مقر تھے، وہ حق تعالیٰ کی خالقیت اور رزاقیت، مالکیت وحاکمیت وربوبیت کو مانتے تھے اور غیر اللہ کو حق تعالیٰ ہی کا مربوب، مرزوق، مخلوق، مملوک ومحکوم جانتے تھے، چنانچہ وہ اپنے تلبیہ میں کہتے تھے:۔

لبیک لا شریک لک الا شریک ھولک تملکہ وما ملک ۔

اے اللہ! میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر
وہ شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی شے کا مالک نہیں !

اس طرح وہ نہ صرف حق تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر رہے ہیں بلکہ اسی کو مالک وحاکم قرار دے رہے ہیں۔ اور اسی کی ربوبیت کے قائل ہو رہے ہیں۔ لیکن باوجود اس اعترافِ وجودِ باری اور اس کی الوہیت وربوبیت کے انھیں کافر ومشرک کیوں ٹھیرا یا گیا؟ اُن کے تمام نیک اعمال کیوں حبط اور برباد قرار دیئے گئے؟ خلود فی النار کی وعید ان کو کیوں سُنائی گئی؟ ان کا یہ "ایمان باللہ" کیوں ان کی جان و مال کو مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ کرسکا؟ اس ایمان کے باوجود "اعداء اللہ" کیوں قرار پائے؟ اُن کو کذاب، مسحور، ظالم کیوں کہا گیا؟ اُن کا شمار "جاہلین" میں کیوں ہوا؟ اُن کو بے عقل حیوان بلکہ اُن سے بدتر کیوں ثابت کیا گیا؟ اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا؟ کا فیصلہ اُن کے متعلق کیوں فرمایا؟

اس کا جواب تم اُوپر پڑھ چکے ہو، وہ ایک لفظ میں صرف یہ ہے۔ اشراک فی العبادۃ! ہر قوم اور ہر اُمت کے لئے ایک نبی مبعوث ہوا، اور اُس نے "توحید فی العبادت" ہی کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی:۔

ولقد بعثنا فی کل اُمۃ رسولا ان اعبدوا اللہ۔!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کو افرادِ عبادت الٰہی کی طرف بُلایا کہ جس طرح تم افرادِ ربوبیت کے مُقر ہو، اللہ ہی کو رب جانتے ہو، اسی طرح اللہ ہی کو معبود مانو! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے قائل ہو جاؤ! اس کے معنی ومقتضیٰ پر عمل کرو، اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو، تمہاری ساری عبادت سراً وعلانیۃً قلبی و قالبی طور پر خالص اللہ کے واسطے ہو۔ یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت، یا پرستش کی کوئی سی شکل، صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہو۔ اس وقت غیر کا تصور بھی تمہارے ذہن میں نہ آئے، تم اللہ ہی کے فقیر ہو۔ ذل و افتقار کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لو! جھوٹے معبودوں سے اپنی بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لو۔ اُن سے نفع وضرر کی توقع مطلقاً چھوڑ دو۔ اللہ تمہارے لئے بہر حال کافی ہے! اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔ تمہیں صرف اللہ ہی کا ہو کر رہنا چاہیئے!

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ !

با خلق آشنا نہ شود مبتلائے تو بیگانہ باشد از ہمہ کس آشنائے تو
میخواہم از خدا بدعا صد ہزار جان تا صد ہزار بار بمیرم برائے تو

مشرکین نے اس پیغام کو سُن کر کہا:۔

" دیکھو ہم اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں۔ اس کا انکار نہیں کرتے۔ اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں جانتے، بلکہ اُن کو اللہ ہی کا مخلوق اور بندہ مانتے ہیں۔ اللہ ہی کو مالک

وحاکم ورب سمجھتے ہیں مستقل معبود بھی اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے بتوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں۔ ہم ان کو محض اپنا "شفیع" (وکیل اور سفارشی) جانتے ہیں، ہم اُن کی عبادت اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی وجاہت کی وجہ سے ہماری سفارش یا "شفاعت" اللہ تعالیٰ کے پاس کر سکتے ہیں۔ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (پ۱۱ ع ۵) اُن کی عبادت ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی وخفگی سے چھڑا کر اس کا قرب عطا کر سکتی ہے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (پ۲۳ ع ۱۵)

یہی اُن کا کذب، کفر اور شرک تھا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (پ ۶) سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (پ ۶)

اب ذرا اسی موقع پر تحقیق کر لو کہ ان مشرکین کے یہ معبود کون تھے، جن کو وہ شفیع اور مقرب سمجھ رہے تھے؟ امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے، اُن کی تحقیق کی رُد سے بت پرستوں (عابدانِ اوثان) کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں، کیونکہ انبیاء میں سب سے پہلے نبی جن کی تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ اور جب انہوں نے ان بت پرستوں کو توحید معبودیت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا اعبدوا اللہ واتقوہ واطیعون (پ ۱۹ ع ۹) تو ان بت پرستوں نے ان کی دعوتِ شب وروز کے جواب میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ:-

لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا۔

"تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ وَدّ کو اور سُواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا۔"

اب ان کے یہ معبودانِ باطل وَدّ وسُواع وغیرہ کون تھے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نشان دہی کی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے چند نیک بخت اور بزرگ لوگ تھے، اُن کی موت کے بعد اُن کے بیٹھنے کی جگہ پر اُن کے نشان قائم کئے گئے، اُن کا بھی وہی نام رکھا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ان نشانوں کی پرستش شروع کر دی گئی۔ اعتقاد یہ تھا کہ جس طرح یہ بزرگ زندگی میں مجاب الدعا رہے ہیں، روزِ حشر بھی مقبول الشفاعت رہیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ ان ہی کے حال کی خبر ہمیں اس آیت میں دی گئی ہے:-

يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (پ ۱۱ ع ۷)

یعنی لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع پہنچا سکیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو خدا کو نہیں معلوم! نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے!

اس تحقیق سے صاف ظاہر ہے کہ بُت پرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بالاستقلال بُتوں کو معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن کی بُت پرستی کا منشاء اولیاء، انبیاء وغیرہ کی تعظیم تھی۔ انہوں نے اپنے بتوں کو اُنہی کی صورت پر تراشا۔ اور اُنھیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع سمجھ کر اپنا سر نیاز اُن کے سامنے جھکاتے تھے، اس طرح وہ اصل میں ولی پرست، صالح پرست، اور نبی پرست تھے۔ اب ذرا فخر رازیؒ کی عبارت بھی سُن لو، جو اُوپر کی آیت کی توجیہ و تفسیر میں انہوں نے لکھی ہے:۔

انھم وضعوا ھذہ الاصنام والاوثان علی صور انبیائھم واکابرھم وزعموا انھم متی اشتغلوا بعبادۃ ھذہ التماثیل فان اولئک الاکابر تکون شفعاءھم عند اللہ تعالیٰ ونظیرہ فی ھذا الزمان اشتغال کثیر من الخلق بتعظیم قبور الاکابر علی اعتقاد انھم اذا عظموا قبورھم فانھم یکونون شفعاء لھم عند اللہ [1]

یعنی بت پرستوں نے یہ اصنام و اوثان اپنے انبیاء و اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہوں گے تو یہ اکابر اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے، اس کی نظیر اس زمانے میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں سے مشغولیت ہے، اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے۔

اُوپر کی توضیحات سے مندرجہ ذیل چار امور صاف طور سے لازم آتے ہیں۔ انھیں خوب ذہن نشین کر لو۔

(۱) زمانۂ قدیم کے بُت پرست حقیقت میں انبیاء پرست اور اولیاء پرست تھے، حق تعالیٰ نے اُنھیں "مشرک" قرار دیا ۔۔۔!

(۲) وہ خود اس امر کے قائل تھے کہ بُت ہمارے بالاستقلال معبود نہیں بلکہ بالاستقلال ہمارا معبود اللہ ہی ہے اور یہ صرف ہمارے سفارشی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو شفیع یا سفارشی جان کر بھی اس کی عبادت کرنا موجبِ شرک ہے (یعنی کسی کو سفارشی یا شفیع سمجھنا یہ شرک نہیں ہے، بلکہ ان کی عبادت اس لئے کرنا کہ ہماری سفارش کریں گے، یہ شرک ہے)

(۳) جو افعالِ عبادت ان مشرکین سے صادر ہوئے اگر کسی کلمہ گو سے بھی صادر ہوں تو اُس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائے گا۔ اور اس کا دعوئے اسلام اور اس کی کلمہ گوئی اطلاقِ شرک سے مانع نہ ہو گی۔ چنانچہ اسی وجہ سے امام رازیؒ نے گور پرستوں کو بُت پرستوں کی نظیر قرار دیا ۔۔۔!

(۴) جب غیر اللہ کو شفیع جان کر اُن کی عبادت کرنا شرک ہوا تو پھر اُن کو بالاستقلال عالم میں متصرف جان کر پُوجنا تو بدرجہ اولیٰ شرک ہو گا۔ مثلاً اولیاء و انبیاء سے اولاد مانگنا، رزق کی کشادگی چاہنا۔

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۵۵۲ سورۂ یونسؑ تحت آیہ ھٰؤلاء شفعاءنا عند اللہ ۔۔۔!

قضاءِ حاجات کی دعا کرنا وغیرہ۔

مشرکین کی عبادت بس یہی تھی کہ وہ اپنے اصنام و اوثان (غیر اللہ) کو "مقرب" و "شفیع" اور نافع و ضار جان کر اُن کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے اور۔

(۱) اُن سے وقتِ حاجت فریادرسی چاہتے تھے، یعنی اُن کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے!

(۲) اپنے مال کا ایک حصہ اُن کی نذر و نیاز کے لئے صرف کرتے تھے، اُن سے منتیں مانگتے تھے، اُن کے لئے جانور ذبح کرتے اور اُن کے اردگرد پھرتے یا طواف کرتے تھے، گو وہ حق کی ربوبیت کے قائل تھے اور اسی کو خالق و رازق، محی و ممیت، مدبرِ زمین و آسمان مانتے تھے۔ مایؤمن اکثرھم باللہ إلا وھم مشرکون!

اب قرآن کریم کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ ندا، دعا، استغاثہ، استعانت، نذر، طواف وغیرہ سب افعالِ عبادت ہیں، جب حق تعالیٰ ہی معبود و رب، واحد و احد ہے تو پھر ان افعال کا تعلق صرف اُسی سے ہونا چاہیئے اور کسی غیر سے نہیں۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا (پ ۵ ع ۳) یہی ہے افرادِ عبادت للہ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ[۱] (پ ۲۳ ع ۱۵) مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روا رکھا تھا اور اسی لئے اُنھیں تہدید کی گئی تھی۔ کہ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی تم جانتے ہو کہ حق تعالیٰ کا کوئی نِد، ہمسر نہیں، پھر تم کیوں غیر اللہ کی عبادت کرکے اُن کو معبود قرار دے کر انھیں حق تعالیٰ کا ہمسر بناتے ہو؟ تمہارا یہ عقیدہ کہ اگر تم ان کا تقرب، ندا و دعا، نذر و نیاز، ذبح و نحر، طواف و عکوف کے ذریعہ حاصل کروگے تو یہ تمہیں حق تعالیٰ کے "قریب" کر دیں گے اور تمہارے شفیع بن جائیں گے، قطعاً باطل ہے!

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ط (پ ۱۱ ع ۱۶)

مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ نقصان، پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اُسی وقت ظالموں میں ہو جائے گا!

جلبِ منفعت و دفعِ مضرت کے لئے غیر اللہ کو زور زور سے پکارنا، اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو اُن سے عرض کرنا اور اس طرح اُن کی پرستش کرنا، بڑے ظلم و ستم کی بات ہے، کیونکہ جس اللہ کی قدرت میں بندہ کا نیک و بد، نفع و نقصان سب کچھ ہے، اُس پروردگار کو چھوڑ کر، اس سے مُنہ موڑ کر ایسی ہستیوں کی طرف متوجہ ہوتا اور ذلت و فقر کی نسبت اُن سے جوڑتا جو نہ کسی کے نفع پر قادر ہیں اور نہ نقصان پر۔ اس سے بڑھ کر دُنیا میں ظلم و ستم کیا ہو سکتا ہے، شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (پ ۲۱ ع ۱۱)

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض مفسرین نے "دُون اللّٰہ" اور "غیر اللّٰہ" کی توجیہ میں اصنام و اوثان کا ذکر کر دیا ہے، اس لئے بعض شرک پسندوں نے یہ سمجھ لیا کہ شرک اُس وقت ہوگا جب بتوں سے دعا کی جائے۔ انبیاء و اولیاء سے دعا کرنا، مرادیں مانگنا شرک نہیں، یہ صریحاً غلط ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں:۔

---

[۱] سو آپ خالص اعتقاد کرکے اللہ کی عبادت کرتے رہیئے۔ یاد رکھو عبادت جو کہ خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے!

(۱) علمِ اصول کا یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ "العبرت بعموم الالفاظ لا بخصوص الموارد" یعنی اعتبار عمومِ الفاظ کا ہوتا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ موارد کا، غیر اللہ اور دون اللہ دونوں عام الفاظ ہیں۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوقات ہیں۔ سب اُن میں داخل ہیں، خواہ ولی، نبی ہو، یا جن اور پری۔ چنانچہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں کہ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِهٖ لکھتے ہیں کہ قل ادعوا الذین زعمتم انہم الھۃ من دونہ کالملٰئکۃ والمسیح وعزیر۔ یعنی ان لوگوں کو پکارو جن کو تم نے معبود سمجھ رکھا ہے اللہ کے سوا جیسے ملائکہ، مسیح و عزیر۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو ملائکہ اور انبیاء کو پکارے وہ بھی مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی ویسی ہی زجر و توبیخ کی ہے، جیسی کہ بُت پرستوں کی کی ہے۔ اس عمومِ الفاظ کے اعتبار سے صاحبِ جلالین نے اکثر مقامات پر دُوْنَ اللّٰہ کا ترجمہ غیر اللہ سے کیا ہے!

(۲) جیسا کہ ہم نے اُوپر تصریح کی ہے، کفار نے اپنے بُت اپنے اکابر (انبیاء و اولیاء) ہی کے نام پر تراشے تھے اور اُن کی بُت پرستی کا منشاء اُن ہی اکابر کی تعظیم تھی۔ لہٰذا وہ در اصل پتھروں اور درختوں کی عبادت نہیں کر رہے تھے بلکہ انبیاء و اولیاء اور صلحاء کو پُوج رہے تھے!

غرض غیر اللہ و دُوْنَ اللّٰہ سے مراد نہ صرف بُت ہیں بلکہ انبیاء، اولیاء سب اس میں شامل ہیں۔ اعتبار عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ موارد کا۔ اور عقلاً غور کرو کہ انبیاء و اولیاء غیر اللہ ہیں کہ عین اللہ؟ جب غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تو صنم و وثن، نبی و ولی، پیر، شہید، جن، پری، سب حرمتِ عبادت میں مساوی ہیں اور اُن میں تفریق باطل ہے۔ اگر ہم تفریق کے قائل ہو جائیں، کہیں کہ عبادت من دون اللہ کی حرام و شرک ہے، بخلاف عبادت اولیاء و انبیاء کے تو لازم آتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء عین اللہ ہیں اللازم باطل فالملزوم مثلہ!

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (پ ۹ ۱۴۶)

واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں سو تم اُن کو پکارو! پھر اُن کو چاہیئے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو!

اس آیت میں اس امر کی صاف طور پر تصریح ہے کہ مشرکین اللہ کے سوا بعض اولیاء، انبیاء اور ملائکہ کو دفعِ مضرت و جلبِ منفعت کے لئے پکارا کرتے تھے۔ اس لئے اُن سے کہا گیا کہ جن کو تم امداد کے لئے پکارتے ہو وہ بھی تمہارے مانند بندے ہیں۔ محض اصنام و اوثان پر عباد کا اطلاق نہایت بعید معلوم ہوتا ہے اور اگر مجازاً اصنام بھی مراد لیں تو امثالکم کا لفظ اس سے ابا کرتا ہے، اسی لئے مقاتلؒ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ:-

"مراد ان عباد سے ملائکہ ہیں اور اس آیت کے مخاطب وہ ہیں جو ملائکہ کو پُوجتے تھے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقبول بندوں سے دعا کرنے والا بھی مشرک ہے اور مردود! اس لئے کہ وہ "مِنْ دُوْنِ اللّٰہ" سے دعا کرتا ہے اور مِنْ دونِ اللہ عام ہے اور اس میں تمام مخلوقات شامل ہیں، مقبول ہوں یا مردود!

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ

رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا -

جن کو تم خدا کے سوا (معبود) قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو سہی، سو وہ تم سے نہ تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، نہ اس کے بدل ڈالنے کا۔ یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں !

اس آیت میں اس امر کی خوب تصریح کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں کہ کسی کی مصیبت اور تکلیف کو دور کر سکے یا اس کو راحت و نعمت میں بدل دے۔ کوئی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کسی کی مصیبت و تکلیف کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور یہ احمق مشرک جن ہستیوں کو ایسے بڑے کا مختار جان کر پکارتے ہیں، ان کا خود یہ حال ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے امید رکھتے ہیں اور اسی کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان سے مراد صرف مقبول بندے ہیں۔ کہ اصنام و اشرار عباد، کیونکہ حق تعالیٰ سے امید رکھنا اور قرب کا طالب ہونا اشرار سے ممکن نہیں اور اصنام سے تو اور زیادہ غیر ممکن ہے۔ جب مقبول بندوں کو پکار کر ان سے اپنے مصائب کو دفع چاہنے والوں پر حق بیان ہو رہا ہے تو مردود ہستیوں کے پکارنے والوں کا کیا حال ہوگا !

تفسیر بیضاوی میں اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے :-

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ انهم آلهة من دونه كالملائكة والمسيح وعزير فلا يملكون فلا يستطيعون كشف الضر عنكم كالمرض والفقر والقحط ولا تحويلا ولا تحويل ذلك منكم الى غيركم -

دیکھو بیضاوی نے صراحت کر دی ہے کہ ملائکہ اور مسیح اور عزیر بھی "کشف ضر" یعنی مرض، فقر و قحط یا مصائب و آلام کے رفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس کو بطور خود پھیر سکتے ہیں۔ جب ان ابرار کا یہ حال ہو تو ان سے کم درجے کے لوگوں کا کیا پوچھنا۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ط اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ط وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ - ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ - مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ - اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ -

اے لوگو ! ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے، اس کو کان لگا کر سنو - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کو تم لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ ایک مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے - گو سب کے سب بھی جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے - ایسا عابد بھی لچر اور ایسا معبود بھی لچر - ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہیے تھی وہ نہ کی، اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے !

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ط وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ط وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِيْنَ

إِلَّا فِیْ ضَلَالٍ (پ۱۳ع۸)

سچا پکارنا اُسی کے لئے خاص ہے، اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا کہ پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہے کہ وہ اس کے منہ تک آجائے اور وہ اُس کے منہ تک آنے والا نہیں اور کافروں کی جتنی پکار یا درخواست ہے سب گمراہی ہے!

یعنی پکارنا اسی کو چاہیئے، اور مصیبت میں دعا اسی سے کرنی چاہیئے۔ جو ہر قسم کے نفع و ضرر کا مالک ہو۔ عاجز و حقیر کو پکارنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے سے کیا حاصل ؟ حق تعالیٰ کے سوا کون ہے جو کسی کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع و ضرر ہے۔ غیر اللہ کو اپنی مدد کے لئے بلانا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کے منہ پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کرے کہ میرے منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے کہ قیامت تک پانی اس کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں۔ بلکہ اگر پانی اس کی مٹھی میں ہو تب بھی خود چل کر منہ تک نہیں جا سکتا ۔۔۔!

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی پر غور کرو۔ جب ان پر مصائب کا نزول ہوتا (اور ظاہر ہے اشد الناس بلاءً الانبیاء۔ مصائب انہی پر زیادہ نازل ہوتی ہیں۔) تو اُن کا رُخ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پلٹتا۔ اُن کے ہاتھ حق تعالیٰ ہی کے سامنے پھیلتے۔ اُن کا سر حق تعالیٰ ہی کے قدموں پر جھکتا تھا۔ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش سے واقف ہو کر انتہائی حزن و الم کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم کو جور و ستم سے عاجز اور تنگ آکر حق تعالیٰ ہی سے فریاد کی کہ :۔

اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (پ۲۷ع۸) میں درماندہ ہوں میرے پروردگار آپ انتقام لیجیے!

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی کشمکش، عجز و درماندگی کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کی اور پکارا:۔

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (پ۲۰ع۶)

اے میرے پروردگار جو نعمت بھی آپ مجھے بھیج دیں میں اُس کا حاجت مند ہوں!

غمناکم و از در تو با غم نہ روم / جز شاد و امیدوار و خرم نہ روم
از درگہ ہمچو تو کریمے ہرگز / نومید کسے نرفت و من ہم نہ روم

اور حضرت ایوب علیہ السلام نے ہجوم غم و الم کے وقت حق تعالیٰ ہی کو اپنی پناہ گاہ سمجھا اور التجا کی:۔

اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (پ۱۷ع۶)

مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں!

یا رب کرم تو گر نباشد مددم / خون جگر از دیدہ رود تا ابدم!

اور حضرت یونس علیہ السلام نے غم و اندوہ کی تاریکیوں میں حق تعالیٰ ہی کو پکارا کہ :۔

لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (پ ۱۷ ع ۶)

(حق تعالیٰ) آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ پاک ہیں، میں بیشک قصوروار ہوں!

اور حضرت یونسؑ ہی کے متعلق ارشاد ہے:۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (پ ۲۳ ع ۹)

اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتے!

دیکھو "لبث" کو لام تاکید سے مؤکد فرمایا گیا ہے اور مناط نجات تسبیح الٰہی کو قرار دیا گیا ہے، نہ کسی نبی، ولی کے نام کا ختم پڑھنے، اُن کو پکارنے اور اپنا درد و غم ان کے سامنے رکھنے کو!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب بھی کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تو نماز پڑھتے۔ چنانچہ مروی ہے ——

اذا حزنه امر فزع الی الصلوٰۃ (رواہ احمد) اور ظاہر ہے کہ نماز میں سوائے تسبیح و تہلیل، تحمید و تقدیس کے اور کیا ہوتا ہے۔

ترمذی میں ہے کہ آپؐ کو جب کوئی سخت کام پیش آتا تو فرماتے:۔

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ

اور دوسری حدیث میں ترمذی کی مذکور ہے کہ جب کسی امر کے متعلق فکر ہوتی تو آسمان کی طرف نظر کرتے اور کہتے:۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ!

جب دعا میں کوشش کرتے تو فرماتے یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ - آپؐ نے فرمایا کہ غمگین کی دعا یہ ہے:۔

اللّٰهُمَّ رحمتك ارجو فلا تكلنی الی نفسی طرفة عین و اصلح لی شانی كله

لا اله الا انتَ!

اے اللہ مجھے بس تیری رحمت ہی کا آسرا ہے، تو مجھے پل بھر کے لئے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر اور میرے سب کام درست کر دے! تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں!

عمیس کی صاحبزادی اسماء (جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن تھیں) کو فرمایا۔ کہ تجھے چند ایسی باتیں بتلا دوں جو غم کے وقت کہا کرے؟ کہ اللہ اللہ رَبِّی لا اشرك به شیئًا (سات بار) آپؐ نے ایک انصاری کو جن کا نام ابو امامہ تھا۔ غیر وقت نماز مسجد میں دیکھ کر پوچھا کہ اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ قرض کے بار کے نیچے دبا جا رہا ہوں، متفکر اور پریشان ہوں، فرمایا، صبح و شام اس دعا کو پڑھا کرو:۔

اللّٰهُمَّ اِنّی اعوذ بك من الهمّ والحزن و اعوذ بك من العجز والكسل و اعوذ بك من الجبن والبخل و اعوذ بك من غلبة الدین وقهر الرجال!

ایک مرتبہ فرمایا:۔

من لزم الاستغفار جعل الله له من كل همّ فرجا و من كل ضیق مخرجا و رزقه من حیث لا یحتسب!

یعنی جو ہمیشہ استغفار پڑھا کرے تو اللہ اس کی ہر مصیبت کو دفع کر دیتا ہے اور ہر تنگی سے اس کو نکال لیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان تک نہ ہو (رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ عن ابن عباس) ایک اور موقع

پھر فرمایا کہ جب کسی پر غم و مشکل ٹوٹ پڑے تو کہا کرے:۔
لَاحول وَلَا قوۃ اِلَّا باللّٰہ (کذافی المشکوٰۃ)
دیکھو حضور الزصلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہو کہ ما اوذی بنی ما اوذیت۔ یعنی جتنی اذیت مجھے پہنچی اتنی کسی بنی کو نہیں پہنچی مگر کیا کسی اذیت یا تکلیف کے وقت آپؐ نے کسی بنی کو یاد کیا کہ یا آدم ابونا، یا نوح نبینا، یا ابراہیم خلیل اللہ؟ یا ہر وقت اسی ذات پاک سے فریاد کی جو تمام مشکلات کو دفع کرتی ہے۔ جو "دافع رنج تم" ہے، "کاشف غم" ہے، جو "مجیب دعوت المضطرین" ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو آپؐ نے تعلیم فرمائی تھی کہ:۔

"یا غلام احفظ اللہ یحفظک احفظ اللہ تجدہ تجاھک، واذا سألت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ واعلم ان الامۃ لو اجتمعت علی ان ینفعوک بشئ لم ینفعوک الا بشئ کتب اللہ لک ولو اجتمعوا علی ان یضروک بشئ لم یضروک الا بشئ قد کتبہ اللہ علیک رفعت الاقلام وجفت الصحف (اخرجہ الترمذی عن ابن عباس)"

اے لڑکے اللہ کو یاد رکھ وہ تجھ کو یاد رکھے گا۔ اللہ کو یاد رکھ کہ تو اس کو اپنے سامنے پائے گا اور جب تو کچھ مانگے تو اللہ ہی سے مانگ اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے چاہ (ایاک نعبد وایاک نستعین) اور یہ یقین کرلے کہ اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے فائدہ پہنچائیں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا۔ اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہیں کی تو اس پر قدرت نہ پائیں گے، قلم اٹھالئے گئے اور خشک ہوگئیں کتابیں۔"

دیکھو اس حدیث میں کس وضاحت و صراحت کے ساتھ استعانت عن غیراللہ سے منع کیا گیا ہے اور کس طرح سبھوں سے توڑ کر صرف حق تعالیٰ ہی سے جوڑا گیا ہے! اکفی باللہ وکیلاً!

ازخدا خواہم و زغیر نخواہم بخدا!!
کہ نیم بندۂ دیگر نہ خدائے دگرست!

کیا یہ آزادی، بے خوفی یا استقلال ان شرک پسند بت پرستوں یا گور پرستوں کو حاصل ہوسکتا ہے جو ہر پیر اور شہید کو نافع و ضار سمجھ کر ان سے اپنے فقر و احتیاج کی نسبت کو جوڑتے ہیں۔ ان ہی کے آگے سرنیاز خم کرتے ہیں اور ان ہی کے سامنے دست سوال پھیلاتے ہیں اور اپنے رسولؐ کی اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ:۔

یسأل احدکم ربہ حاجتہ کلھا حتی یسأل الملح وحتی یسألہ شسع نعلہ اذا انقطع۔ (اخرجہ الترمذی عن انسؓ)

ہر کسی کو چاہیئے کہ اپنی ساری حاجتیں اپنے پروردگار ہی سے مانگے یہاں تک کہ نمک بھی اسی سے مانگے اور جوتی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جنہیں افسوس ہے کہ قادریہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنا معبود مقرر کر رکھا ہے، مصائب میں انہی کو پکارتی ہے، آفات کے دُور کرنے کے لئے اُن ہی کے نام کا جھنڈا اپنے گھروں میں کھڑا کرتی ہے) حدیث ابن عباسؓ کو جو اُوپر مذکور ہوئی اپنی فتوح الغیب میں نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں کہ:-

فینبغی لکل مؤمن ان یجعل ھذا الحدیث مرآۃ لقلبه وشعاره ودثاره وحدیثه فیعمل به فی جمیع حرکاته وسکناته حتی یسلم فی الدنیا والآخرة ویجد العزة فیهما برحمة الله تعالیٰ۔

یعنی ہر مومن کو چاہیئے کہ اس حدیث نبوی کو اپنے قلب کے لئے آئینہ بنا لے تاکہ اس کے مضمون میں اپنے دل کا حال دیکھے اور اس کی خرابی و درستی، راستی و کجی کو معلوم کرے، بلکہ اس حدیث کو اپنے اندر اور باہر کا جامہ بنا لے اور ہر وقت کے لئے اس کو ایک غذا و حکایت ٹھہرا لے کہ اپنے واسطے اس کی تکرار کرتا رہے اور اپنے تمام حرکات و سکنات میں اس پر عمل کرے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات نفسی و آفاقی سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے!

درد و مصیبت کے وقت اولیاء اللہ کو اس عقیدے سے پکارنا کہ یہ ہر جگہ سے ہماری ندا سنتے اور دکھ سن لیتے ہیں اور ہماری اعانت کرسکتے ہیں، یہ قطعاً اشراک فی العلم و اشراک فی التصرف ہے، تمام فقہاء نے اس کو کفر کہا ہے قرآن کریم اور احادیث نبوی سے اس کا تفصیلی ثبوت اُوپر دیا جا چکا ہے!

اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر اُن کو پکارنا، اس کی دو صورتیں ہیں:-

(۱) قبر کے نزدیک جا کر اُن سے یہ کہنا کہ "آپ میری فریاد کو سنئے، میری بلا کو ٹال دیجئے، میری حاجت کو روا کیجئے"۔ یہ استغاثہ و استعانت، دعا اور طلب حاجت ہے، خواہ قریب سے کی جائے یا دُور سے اور یہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ دعا کی تفصیل میں اوپر اس کا ثبوت دیا جا چکا ہے!

(۲) قبر کے نزدیک جا کر اُن سے یہ کہنا کہ "آپ میرے لئے دعا کیجئے کہ اللہ میری بلا کو ٹال دے اور میری حاجت کو روا کرے"۔ یہ قطعاً بدعت ہے، قرون مشہود لہا بالخیر میں کسی نے ایسا نہیں کیا!

امام ابوحنیفہؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صالحین کی قبروں پر آکر کہہ رہا ہے کہ:-

"ھل لکم من خبر وھل عندکم من اثر انی اتیتکم ونادیتکم من شھور ولیس سوالی منکم الا الدعاء، فھل دریتم ام غفلتم"

اے اہل قبور! کچھ تم کو خبر بھی ہے اور کیا تم پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے کہ کئی ماہ سے میں تمہارے پاس آتا ہوں اور تم کو پکارتا ہوں؟ میرا سوال تم سے صرف اتنا ہے کہ تم میرے لئے دعا کرو۔ کیا تم کو میرے حال کی خبر بھی ہے یا تم غافل ہو میرے حال سے۔

یہ سن کر امام اعظمؒ نے اس شخص سے پوچھا "ھل اجابوا لک"؟ کیا انہوں نے تجھ کو کوئی جواب دیا۔ اس نے کہا

"نہیں" آپ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا:-

"سحقاً لک وتربت یداک! کیف تکلم اجساداً لا یستطیعون جواباً ولا یملکون شیئاً ولا یسمعون صوتاً"

پھٹکار ہو تجھ پر، خاک آلود ہوں تیرے دونوں ہاتھ! ایسے جسم سے بات کرتے ہو جو جواب کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جو کسی شئے کے مالک نہیں، جو کوئی آواز بھی نہیں سن سکتے!

پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: "وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ" یعنی حق تعالیٰ حضور انور صلعم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: "آپ ان لوگوں کو جو قبروں میں ہیں کچھ نہیں سنا سکتے"

امام اعظم کے اس عتاب سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہو رہی ہے:-

(۱) اولیاء و صالحین کی قبروں پر آکر ان سے خطاب کسی طرح جائز نہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو بد دعا دی ہے جو اہل قبور سے دعا کے طالب ہوتے ہیں۔

(۲) مردے نہ سن سکتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ پھر بلاؤں کا ٹالنا، مصیبتوں کا دور کرنا، ان سے کیا ہو سکتا ہے اور جب یہ نزدیک سے سن نہیں سکتے تو دور کی کیسے سن سکیں گے؟ محققین حنفیہ سماع موتیٰ کے قائل نہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتگان بدر سے جو خطاب فرمایا تھا اس کی توجیہ مختلف طریقوں سے کی گئی، بہترین توجیہ یہ ہے کہ یہ آپ کا معجزہ تھا۔ حق تعالیٰ نے آپ کی بات کفار موتیٰ کو سنا دی تھی۔ چنانچہ کفایہ میں ہے:-

من اجوبتہم انہ صح ذلک معجزۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

کافی شرح وافی میں صراحت کی گئی ہے کہ:-

والمقصود من الکلام الافہام وذا بالاسماع وذا لا یتحقق بعد الموت!

یعنی مقصود کلام سے افہام ہے اور یہ سماع کے ذریعہ ہوتا ہے اور سماع موت کے بعد محقق نہیں۔

اسی طرح عینی شرح ہدایہ میں ہے:-

قولہ لان المقصود من الکلام الافہام ای افہامہ فلاناً والموت ینافیہ ای ینافی الکلام الاسماع والمیت لیس باہل الاسماع الا تری الی قولہ تعالیٰ انک لا تسمع الموتیٰ والی قولہ تعالیٰ وما انت بمسمع من فی القبور!

شرح مواقف میں تشریح کی گئی ہے کہ علم وقدرت و ارادہ، سمع بصر میت کے لئے ثابت کرنا فرقہ صالحیہ کا عقیدہ ہے جو معتزلہ کا ایک گروہ ہے:-

"الصالحیہ اصحاب الصالحی ومذہبہم انہم جوزوا قیام العلم والقدرۃ والارادۃ والسمع والبصر بالمیت ویلزمہم جواز ان یکون الناس مع اتصافہم بہذہ الصفات امواتاً وان لا یکون الباری تعالیٰ حیاً"

یعنی صالحیہ گروہ ہے صالحی کا اور مذہب ان کا یہ ہے کہ انہوں نے میت کے لئے علم و قدرت و ارادہ و سمع و بصر کو جائز قرار دیا ہے، ان کے مذہب کی رو سے تو یہ لازم آتا

ہے کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں، وہ سب مردہ ہیں اور حق تعالیٰ بھی زندہ نہیں۔"
اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر گور پرست مشائخ اسی فرقۂ ضالہ کے عقیدہ پر قائم ہیں - نعوذ باللہ من ذلک !
یہاں غلط فہمی دُور کرنے کے لئے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر دُور سے درود بھیجتا ہے اُس کو آپؐ تک فرشتے پہنچاتے ہیں، آپؐ اس کو نہیں سنتے ۔ البتہ بزرگانِ دین اور محققین شرع متین نے اس امر کی تصریح کی ہے اور روایات مرفوعہ میں بھی یہ امر مذکور ہے کہ جو شخص آپؐ کے مزار مبارک کے قریب درود بھیجتا ہے اس کو آپ بخوبی سُنتے ہیں - چنانچہ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی نے شعب الایمان میں ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ :-

" قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علیّ عند قبری سمعتہ ومن صلی علیّ نائیًا ابلغتہ ۔"

یعنی جو درود بھیجتا ہے میری قبر کے نزدیک اُس کو میں خود سُنتا ہوں، اور جو درود بھیجتا ہے مجھ پر دُور سے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے ۔ یعنی بذریعہ ملائکہ اور میں خود براہ راست نہیں سُنتا، ورنہ پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی - جیسا کہ قبر کے پاس کے درود کے متعلق پہنچانے کا ذکر نہیں کیا -

اسی طرح ابن حجر مکی نے شرح ہمزیہ میں ذکر فرمایا ہے :-

اذا صلی وسلم علیہ عند قبرہ سمعہ سماعًا حقیقیًا ویرد علیہ من غیر واسطۃ وان صلی وسلم علیہ من بعید لایسمعہ الا بواسطۃ یدل علیہ احادیث کثیرۃ !

یعنی جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس سے آپؐ پر درود وسلام بھیجتا ہے۔ تو آپؐ اس کو حقیقت میں سُنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اس کا بلا واسطہ - اور اگر کوئی دُور سے آپؐ پر درود وسلام بھیجتا ہے تو آپؐ اُس کو نہیں سُنتے مگر بواسطہ (یعنی فرشتے آپؐ تک پہنچاتے ہیں[1]) بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔

جن لوگوں کے قلوب میں غیر اللہ سے مدد سما گئی ہے اور یہ اُن کی طبیعتوں میں رچ گئی ہے وہ ایک حدیث اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں - "حصن حصین میں حضرتؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اُس شخص کے متعلق جو راہ گم گشتہ ہو فرمایا کہ پکارے اعینونی یا عباد اللہ ۔" اے بندگانِ خدا تم میری مدد کرو۔" اس حدیث سے استنادکر کے کہا جاتا ہے کہ " ہم راہ گم گشتہ ہیں، ہم پکارتے ہیں - اعینونی یا عباد اللہ ! یا غوث ! یا خواجہ ، یا نقشبند ! یا بدوی ! یا شاذلی ہماری مدد کرو !

حصن حصین کے الفاظ یہ ہیں :-

ان اراد عونا فلیقل یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی (رواہ طبرانی)

[1] ان اللہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغون عن امتی السلام (سفیان ثوری کی حدیث عبد اللہ بن مسعود سے، رواہ النسائی وابوحاتم فی صحیحہ)

اس حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اُس پر علماء حق نے جو تنقید کی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن حسان ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے اور ہیثمی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے!

(۲) اس کی سند منقطع بھی ہے، بیچ میں ایک راوی (ابن بریدہ اور ابن مسعودؓ کے درمیان) چھوٹ گیا ہے اور منقطع کا حکم مثل مرسل ہے اور محدثین اور اہلِ اثر کی جماعت کے نزدیک یہ حجت نہیں!

(۳) اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی عتبہ بن غزوان ہے وہ مجہول الحال ہے، یعنی اس کا تقویٰ اور عدل معلوم نہیں۔ چنانچہ تقریب ابن حجر میں اسی بناء پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب اس حدیث کا ایک راوی ضعیف اور مجہول الحال ہو تو یہ نہ قابلِ اعتماد ہے اور نہ لائق استدلال!

(۴) جرح سے قطع نظر کر کے اگر ہم اس حدیث کو تسلیم بھی کر لیں، تو ہم عقلِ سلیم کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اموات سے استعانت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ عباد اللہ سے مراد تو فرشتے ہیں جو حفاظت کے لئے معین و مقرر ہو ۔۔۔!

اس حدیث کے مخالف و معارض دوسری حدیث بھی اسی کتاب حصن حصین میں ملتی ہے، جس کو طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے:-

اذا ضاع لہ شیئاً اوابق فلیقل۔ اللّٰھم رادالضالۃ وھادی الضلالۃ انت تھدی من الضلالۃ اردد علیّ ضالتی بقدرتک وسلطانک فانہا من عطائک وفضلک ۔۔۔!

یعنی جب آدمی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا اُس کا غلام بھاگ جائے تو یُوں دعا کرے۔ "اے خدا جو پھیر لاتا ہے گم ہوئی چیز کو، اے بھُولے بھٹکے کی راہ بتلانے والے تُو ہی راہ بتلاتا ہے بھُول اور گمراہی سے۔ واپس دلا دے مجھ کو میری گم ہوئی چیز اپنی قدرت اور غلبہ سے کہ وہ چیز تیری بخشش اور احسان سے تھی۔

علاوہ بریں ابن عباسؓ سے جو حدیث مروی ہے اور جس کا ذکر ہم نے اُوپر کیا ہے، اُس میں صاف طور پر حکم دیا ہے فاذا استعنت فاستعن باللہ یہ معارض و مخالف ہے، حدیث اعینونی کے اور ظاہر ہے کہ حدیث ابن عباسؓ موافق ہے نحوائے کلام مجید کے لہٰذا اس کو دوسری حدیث پر ترجیح ہونی چاہیئے!

ندا اور استعانت کی تائید میں اہلِ استمداد ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں۔ سوال خود پیش کر کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے:۔ "یا رسولؐ اللہ! یا غوث! پکارنا بھی کیا ناجائز نہیں؟ شرک نہیں؟ ترمذی، نسائی، طبرانی، ابن خزیمہ، حاکم، بیہقی نے یہ روایت کی ہے:-

اللّٰھم انی اسألک واتوجہ الیک بحبیبک المصطفٰی عندک یاحبیبنا یا محمدؐ انا نتوسل بک الی ربک فاشفع لنا عند المولی العظیم یانعم الرسول الطاھر اللّٰھم شفعہ فینا بجاھہ عندک ۔۔۔!

اس دعا میں یا محمدؐ! کی ندا ہے اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی اس دعا کو صحابہؓ نے خود پڑھا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔ تو سوال کا جواب یہ ہوا کہ یا رسولؐ! یا غوث! پکارنا شرک نہیں، جائز ہے اور ادھر بھی دو حدیثوں سے استدلال کرکے اہل استمداد نے اپنی دانست میں ثابت کر دیا ہے کہ یا خواجہ! یا بدوی! یا شاذلی! یا نقش بند! پکارنا جائز ہے!

اس حدیث کی تحقیق یہ ہے:-

(۱) مروی ہے کہ ایک اندھے نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپؐ میرے لئے حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ مجھے اس مرض سے شفا دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو میں دعا کروں اور چاہے تو نابینائی پر صبر کر، کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہے! اس نے عرض کیا کہ میرے لئے دعا ہی کیجئے۔ آپؐ نے خود دعا نہیں فرمائی۔ بلکہ حکم دیا کہ وضو کرے اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دعا پڑھے:-

اللّٰھم انی اسئلک واتوجہ الیک بنبیک نبی الرحمۃ یا محمد انی اتوجہ بک الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی فشفعہ فی! (ترمذی)

یا اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں اپنی حاجت اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں بذریعہ تیرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ نبی رحمت ہیں۔ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں متوجہ ہوتا ہوں اپنے پروردگار کی طرف آپ کے ذریعہ سے اپنی اس حاجت میں تاکہ میرے حق میں حاجت روائی کی جائے، الٰہی! تو ان کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما!

نسائی، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کی کہ اس نے یہ دعا پڑھی اور بینا ہو گیا۔ (کذا فی المشکوٰۃ)

(۲) یہ حدیث اعتقاد کے بارے میں قابل استدلال نہیں۔ کیونکہ اس کا ایک راوی عثمان بن خالد متروک الحدیث ہے۔ فقہا و محدثین کے نزدیک ایسے راوی کی نقل قابل حجت نہیں۔ چنانچہ نووی کی تقریب اور اس کی شرح تدریب الراوی میں یہ مسئلہ مصرح ہے! (قرآن اور تعمیر سیرت)

ترجمہ و ترتیب:-
مولانا مفتی محمد شفیع

بدعات و محدّثات

حضرات صوفیائے کرام کی نظر میں

بدعات و محدثات کے ایجاد کرنے والے اور ان پر عمل کرنے والے عموماً حضرات صوفیائے کرام اور مشائخ طریقت کی پناہ لیتے ہیں۔ اور انہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت سے عوام اس خیال میں ہیں کہ طریقت و شریعت دو متضاد چیزیں ہیں۔ بہت سے احکام جو شریعت میں ناجائز ہیں، اہل طریقت اُن کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ ایک خطرناک غلطی ہے۔ کہ اس میں مبتلا ہونے کے بعد دین و ایمان کی خیر نہیں۔ کیونکہ انسان کو تمام گمراہیوں سے بچانے والی صرف شریعت ہے۔ جب اُس کی مخالفت کو جائز سمجھ لیا گیا۔ تو پھر ہر گمراہی کا شکار ہو جانا سہل ہے!

اسی لئے مناسب معلوم ہوا کہ حضرات صوفیائے کرام اور مشائخ کے ارشادات بدعات کی مذمت اور اتباع سنت کی تاکید میں بقدر کفایت جمع کر دیئے جائیں! تاکہ عوام اس دھوکہ سے بچ جائیں کہ مشائخ طریقت بدعات کو مذموم نہیں سمجھتے۔ یا اتباع سنت میں متساہل ہیں۔

اس سلسلے کے لئے علامہ شاطبیؒ اپنی کتاب الاعتصام ص۱۰۶ جلد اوّل میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے جس میں صوفیائے متقدمین کے ارشادات در بارہ مذمت بدعات جمع کئے ہیں۔ ہمارے لئے اُن کا ترجمہ کر دینا کافی ہے۔!

امام طریقت حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں:-

"جو شخص کسی بدعتی کے پاس بیٹھتا ہے، اُس کو حکمت نصیب نہیں ہوتی"

حضرت ابراہیم بن ادھم:-

آپ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دعا قبول فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔ فرمایا:- اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ مگر ہم بعض اہم کاموں کے لئے زمانہ دراز سے دعا کر رہے ہیں۔ قبول نہیں ہوتی اس کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا۔ تمہارے قلوب مر چکے ہیں۔ اور مُردوں کی دعا قبول نہیں ہوتی اور موت قلوب کی دس سبب ہیں:-

اوّل یہ کہ تم نے حق تعالیٰ کو پہچانا۔ مگر اُس کا حق ادا نہیں کیا!

دوسرے تم نے کتاب اللہ کو پڑھا اور اس پر عمل نہیں کیا!

تیسرے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ تو کیا۔ مگر آپ کی سنّت کو چھوڑ بیٹھے۔

چوتھے۔ شیطان کی دشمنی کا دعویٰ کیا۔ مگر اعمال میں اُس کی موافقت کی!

پانچویں۔ تم کہتے ہو کہ ہم جنّت کے طالب ہیں۔ مگر اس کے لئے عمل نہیں کرتے !

اسی طرح پانچ چیزیں اور شمار کرائیں ۔ غرض اس حکایت کی نقل سے یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ابن ادھمؒ ترکِ سنت کو موتِ قلب کا سبب قرار دیتے ہیں !

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

حق تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ ہو کہ اخلاق و اعمال اور تمام امور اور سنن میں حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا جائے اور فرمایا کہ لوگوں کے فساد کا سبب چھ چیزیں ہیں :-

اوّل یہ کہ عملِ آخرت کے متعلق اُن کی ہمتیں اور نیتیں پست اور ضعیف ہوگئیں -

دُوسرے یہ کہ اُن کے لئے نفوس اُن کی خواہشات کا گہوارہ بن گئے !

تیسرے یہ کہ اُن پر طولِ اَمَل غالب آگیا ۔ یعنی دُنیوی سامان میں قرنوں اور برسوں کا انتظام کرنے کی فکر میں رہتے ہیں حالانکہ عمر اُن کی قلیل ہے !

چوتھے یہ کہ انہوں نے مخلوق کی رضا کو حق تعالیٰ کی رضا پر ترجیح دے رکھی ہے !

پانچویں یہ کہ وہ اپنی ایجاد کردہ چیزوں کے تابع ہوگئے - اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم کی سنّت کو چھوڑ بیٹھے !

چھٹے یہ کہ مشائخ سلف اور بزرگانِ متقدمین میں سے اگر کسی سے کوئی لغزش صادر ہو گئی، تو اُن لوگوں نے اُسی کو اپنا مذہب بنا لیا اور اُن کے فعل کو اپنے لئے محبت سمجھا - اور اُن کے باقی تمام فضائل و مناقب کو دفن کر دیا !

ایک شخص کو آپ نے نصیحت فرمائی کہ تمہیں چاہیئے کہ سب سے زیادہ اہتمام اللہ تعالیٰ کے فرائض و واجبات کے سیکھنے اور اُس پر عمل کرنے کا کرو - اور جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں منع کیا ہے، اُس کے پاس نہ جاؤ - کیونکہ حق تعالیٰ کی عبادت کا وہ طریقہ جو اُس نے خود تعلیم فرمایا ہے، اُس طریقے سے بہت بہتر ہے، جو تم خود اپنے لئے بناتے ہو - اور یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے لئے اس میں زیادہ اجر و ثواب ہے - جیسے بعض لوگ، خلافِ سنّت رہبانیت کا طریقہ اختیار کر لیتے ہیں !

بندہ کا فرض یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے آقا کے حکم پر نظر رکھے، اور اسی کو اپنے تمام معاملات میں حَکَم بنائے - اور جس چیز سے اُس نے روک دیا ہے، اُس سے بچے !

آجکل لوگوں کو حلاوتِ ایمان اور طہارتِ باطن سے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ وہ فرائض و واجبات کو معمولی باتیں سمجھ کر اُن کا اتنا اہتمام نہیں کرتے، جتنا کرنا چاہیئے !

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

میں ایک مرتبہ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا - آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اے بشر! تم جانتے ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے سب اقران پر فوقیت و فضیلت کس سبب سے دی ہے - میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ! میں واقف نہیں - آپؐ نے فرمایا کہ اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ تم میری سنّت کا اتباع کرتے ہو - اور نیک لوگوں کی عزت کرتے ہو اور اپنے بھائیوں کی خیر خواہی کرتے ہو - اور میرے صحابہؓ اور اہلبیت سے محبت رکھتے ہو —— !

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-
لوگوں کے تمام اختلافات کی اصل تین چیزیں ہیں۔ اور اُن تینوں کی تین ضدیں ہیں۔ جو شخص ایک اصل سے علیحدہ ہے، اُس کی ضد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔
وہ تین اصل یہ ہیں:-
ایک توحید اور اُس کی ضد شرک ہے۔
دوسرے سنّت اور اس کی ضد بدعت ہے۔
تیسرے طاعت، اُس کی ضد معصیت ہے۔ !

حضرت ابوبکر دقاق رحمۃ اللہ علیہ:-
حضرت ابوبکر دقاق قدس سرہ جو حضرت جنیدؒ کے اقران میں سے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اُس میدان میں گزر رہا تھا، جہاں چالیس سال تک اسرائیل قدرتی طور پر محصور رہے۔ اور نکل نہ سکتے تھے۔ جس کو وادی کہا جاتا ہے، اس وقت میرے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ علمِ حقیقت علم شریعت سے مخالف ہے۔ اچانک مجھے غیبی آواز آئی:-

کل حقیقۃ لا تتبع الشریعۃ فہی کفر !
جس حقیقت کی موافقت شریعت نہ کرے وہ کفر ہے !

حضرت ابوعلی جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-
بندہ کی نیک بختی کی علامت یہ ہے کہ اُس پر خدا اور رسولؐ کی اطاعت آسان ہوجائے! اور اُس کے افعال مطابق سنّت ہوجائیں۔ اور اس کو نیک لوگوں کی صحبت نصیب ہوجائے۔ اور اپنے احباب واخوان کے ساتھ اُس کو حُسنِ اخلاق کی توفیق ہو اور خلق اللہ کے لئے اُس کا نیک سلوک عام ہو۔ اور مسلمانوں کی غمخواری اس کا شیوہ ہو! اور اپنے اوقات کی نگہداشت کرے، یعنی ضائع ہونے سے بچائے!
کسی نے آپ سے سوال کیا کہ اتباعِ سنّت کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا کہ بدعات سے اجتناب اور اُن عقائد اور احکام کا اتباع، جس پر علمائے اسلام کے صدرِ اوّل کا اجماع ہے اور اُن کی اقدار کو لازم سمجھنا !

حضرت ابوبکر ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-
کمال ہمّت اس کے تمام اوصاف کے ساتھ سوائے اہلِ محبت کے کسی کو حاصل نہیں ہوئی اور یہ درجہ اُن کو محض اتباعِ سنّت اور ترکِ بدعت کی وجہ سے حاصل ہوا۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق سے زیادہ صاحبِ ہمّت اور سب سے زیادہ ساعی الی اللہ تھے!
ہمّت اصطلاح صوفیہ میں توجہ اور تصرف کو کہتے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی تخیل کی قوّت کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے کی طرف جمع کرے، اس جگہ ممکن ہے کہ یہی مراد ہو مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تصرف اور ہمت اصطلاح کے استعمال کا صدور کہیں صراحۃً ثابت نہیں۔ اس لئے غالباً اس جگہ ہمّت کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی دین کے کاموں میں چستی اور مضبوطی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم !

حضرت ابو الحسن ورّاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

بندہ اللہ تک صرف اللہ ہی کی مدد اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء فی الاحکام کے ذریعے سے پہنچ سکتا ہے اور جو شخص وصول الی اللہ کے لئے سوائے اقتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے تو ہدایت حاصل کرنے کی خاطر گمراہ ہو گیا ___!

حضرت ابو محمد عبد الوہاب ثقفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

اللہ تعالیٰ صرف وہی اعمال قبول فرماتے ہیں۔ جو صواب و درست ہوں۔ اور صواب و درست میں بھی صرف وہی اعمال مقبول ہیں جو خالص اسی کے لئے ہوں اور خالص میں بھی صرف وہی مقبول ہیں جو سنّت کے مطابق ہوں ___!

حضرت ابراہیم بن شیبان رحمۃ اللہ علیہ۔

یہ بزرگ حضرت ابو عبد اللہ مغربی اور حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہما کے اصحاب میں سے تھے، بدعات سے سخت متنفر اور مبتدعین پر سخت رد کرنے والے کتاب و سنت کے طریقہ پر مضبوطی سے قائم اور مشائخ ائمہ، متقدمین کے طرز کا التزام کرنے والے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عبد اللہ بن منازل اُن کے متعلق فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن شیبانؒ تمام فقراء اور اہلِ آداب و معاملات پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک حجت ہے!

حضرت ابو عمر زجاجی رحمۃ اللہ علیہ

یہ عُبّاد و زُہّاد کے مشہور امام حضرت جنیدؒ اور سفیان ثوریؒ کے اصحاب میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:-

زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اُن چیزوں کا اتباع کرتے تھے جن کو اُن کی عقلیں مستحسن سمجھتی تھیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، تو آپ نے اُن کو اتباع شریعت کا ارشاد فرمایا۔ پس عقل صحیح و سلیم وہی ہے جو مستحسنات شرعیہ کو اچھا اور مکروہات شرعیہ کو ناپسند سمجھے__!

حضرت ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

میں نے تین سال مجاہدات کئے مگر مجھے کوئی مجاہدہ علم اور اتباع علم سے زیادہ شدید نہیں معلوم ہوا۔ اور اگر علماء کا اختلاف نہ ہوتا تو میں مصیبت میں پڑ جاتا۔ بلا شبہ علماء کا اختلاف رحمت ہے (مگر وہ اختلاف جو تجرید توحید میں ہو کہ وہ رحمت نہیں ہے) اور اتباع صرف اتباع سنت کا نام ہے۔ کیونکہ علم سنت کے علاوہ دوسری چیز علم کہلانے کی مستحق نہیں__!

ایک مرتبہ ایک بزرگ اُن کے وطن تشریف لائے۔ شہر میں اُن کی ولایت و بزرگی کا چرچا ہوا۔ حضرت ابو یزیدؒ نے بھی زیارت کا قصد کیا۔ اور اپنے ایک رفیق سے کہا کہ چلو اُن بزرگ کی زیارت کر آئیں۔ ابو یزید اپنے رفیق کے ساتھ اُن کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہ بزرگ گھر سے نماز کے لئے نکلے، جب مسجد میں داخل ہوئے تو جانب قبلہ میں تھوک دیا۔ ابو یزیدؒ یہ حالت دیکھتے ہی واپس ہو گئے اور اُن کو سلام بھی نہ کیا۔ اور فرمایا۔ یہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب میں سے ایک ادب پر مامون نہیں کہ اس کو ادا کر سکے، اس سے کیا توقع رکھی جائے کہ یہ کوئی ولی اللہ ہو!

امام شاطبیؒ اس واقعہ کو کتاب الاعتصام میں نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت ابو یزیدؒ کا یہ ارشاد ایک

اصل عظیم ہے، جس سے معلوم ہوا کہ تارک سنت کو درجۂ ولایت حاصل نہیں ہوتا۔ اگرچہ ترک سنت بوجہ ناواقف ہونے کے ہوا ہو — !

اب آپ اندازہ کریں کہ جو علانیہ ترک سنت اور احداث بدعت پر مُصر ہوں، اُن کو بزرگی اور ولایت سے کوئی دُور کا واسطہ بھی ہو سکتا ہے ؟

نیز ابویزیدؒ کا ارشاد ہے کہ اگر تم کسی شخص کی کُھلی کُھلی کرامات دیکھو۔ یہاں تک کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگے، تو اُس سے ہرگز دھوکا نہ کھاؤ۔ اور اُس کی بزرگی و ولایت کے اس وقت تک معتقد نہ ہو، جب تک کہ یہ نہ دیکھ لو کہ امر و نہی اور جائز و ناجائز اور حفاظتِ حدود اور آدابِ شریعت کے معاملہ میں اُس کا کیا حال ہے — !

حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

بندہ جو فعل بغیر اقتداء (رسول) کے کرتا ہے، خواہ وہ (بصورت) طاعت ہو یا معصیت، وہ عیشِ نفس ہے۔ اور جو فعل اقتداء و اتباع سے کرتا ہے۔ وہ نفس پر عتاب اور مشقت ہے۔ کیونکہ نفس کی خواہش کبھی اقتداء و اتباع میں نہیں ہو سکتی۔ اور اصل مقصود ہمارے طریق (یعنی سلوک) کا یہی ہے کہ اتباع ہوا سے بچیں !

نیز فرمایا کہ ہمارے (یعنی صوفیائے کرام کے) اصول سات ہیں :۔

۱۔ کتاب اللہ کے ساتھ تمسک۔
۲۔ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء
۳۔ اکلِ حلال (یعنی کھانے پینے اور استعمال کرنے میں اس کا لحاظ کہ کوئی چیز حرام و ناجائز نہ ہو)
۴۔ لوگوں کو تکلیف سے بچانا۔
۵۔ گناہوں سے بچنا۔
۶۔ توبہ — !
۷۔ ادائے حقوق — !

نیز ارشاد فرمایا کہ تین چیزوں سے مخلوق مایوس ہو گئی :۔

۱۔ توبہ کا التزام !
۲۔ سنتِ رسولؐ کا اتباع !
۳۔ مخلوق کو اپنی ایذا سے بچانا !

نیز کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ فتوت (عالی ظرفی) کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ اتباعِ سنت — !

حضرت ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :۔

بسا اوقات میرے قلب میں معارف و حقائق اور علوم صوفیاء میں سے کوئی خاص نکتۂ عجیبہ وارد ہوتا ہے اور ایک زمانۂ دراز تک وارد ہوتا رہتا ہے۔ مگر میں اس کو دو عادل گواہوں کی شہادت کے بغیر قبول نہیں کرتا۔ اور وہ عادل گواہ کتاب و سنت ہیں — !

حضرت احمد بن ابی الحواری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :۔

جو شخص کوئی عمل بلا اتباعِ سنت کے کرتا ہے، اُس کا عمل باطل ہے!

حضرت ابو حفص حداد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

جو شخص ہر وقت اپنے احوال وافعال کو کتاب وسنت کی میزان میں وزن نہیں کرتا اور اپنے خواطر (واردات قلبیہ) کو متہم (ناقابلِ اطمینان) نہیں سمجھتا - اس کو مردانِ راہ تصوف میں شمار نہ کرو- نیز آپ سے بدعت کی حقیقت دریافت کی گئی، تو فرمایا- کہ احکام میں تعدی، یعنی شرعی حدود سے تجاوز کرنا- اور تہاون فی السنن یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے اتباع میں سستی کرنا - اور اتباع الآراء والاھواء یعنی اپنی خواہشات اور (غیر معتبر) آراء رجال کی پیروی اور ترک الاتباع والاقتداء یعنی سلف صالح کے اتباع واقتداء کو چھوڑنا اور کبھی کسی صوفی کو کوئی حالتِ رفیعہ بغیر امر صحیح کے اتباع کے حاصل نہیں ہوتی!

حضرت حمدون قصار رحمۃ اللہ علیہ:-

آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ لوگوں کے اعمال پر احتساب اور داروگیر کسی شخص کے لئے کس وقت جائز ہوتی ہے؟ فرمایا- جب وہ یہ سمجھے کہ یہ احتساب اور امر بالمعروف مجھ پر فرض ہو گیا ہے - فرض ہونے کی صورت یہ ہے کہ جس کو امر بالمعروف کیا جائے، وہ اس کا ماتحت اور تحت القدرت ہو، یا یہ یقین ہو کہ وہ ہماری بات مان لے گا- وغیر ذالک- یا یہ خوف ہو کہ کوئی انسان بدعت میں مبتلاء ہو کر ہلاک ہو جائے گا - اور اس کو یہ گمان ہے کہ ہمارے کہنے سننے سے اُس کو نجات ہو جائے گی!

نیز ارشاد فرمایا کہ جو شخص سلف صالح کے احوال پر نظر ڈالتا ہے - اُس کو اپنا قصور اور مردانِ راہ خدا کے درجات سے اپنا پیچھے رہنا معلوم ہو جاتا ہے!

علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ غرض اس کلام کی (واللہ اعلم) یہ ہے کہ لوگوں کو سلف صالح کی اقتداء کی ترغیب دیں کیونکہ یہی حضرات اہلِ سنت ہیں-!

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ-

آپ کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ عارفین پر ایک حالت ایسی آتی ہے کہ وہ تمام حرکات واعمال چھوڑ کر تقرب الی اللہ حاصل کرتے ہیں- حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ یہ اُن لوگوں کا قول ہے، جو اسقاطِ اعمال کے قائل ہیں - اور فرمایا کہ میں تو اگر ایک ہزار سال بھی زندہ رہوں، تو اپنے اختیار سے اعمال (طاعات وعبادات) میں سے ایک ذرّہ بھی کم نہ کروں - ہاں مغلوب ومجبور ہو جاؤں تو وہ دوسری بات ہے!

اور فرمایا کہ وصول الی اللہ کے جتنے راستے عقلاً ہو سکتے ہیں- وہ سب کے سب بجز اتباعِ آثارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مخلوق پر بند کر دیئے گئے ہیں- (یعنی بغیر اقتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی شخص ہرگز تقرب الی اللہ حاصل نہیں کر سکتا اور جو دعویٰ کرے وہ کاذب ہے)

اور فرمایا کہ ہمارا یہ مذہب (یعنی سلوک وتصوف) کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے۔

نیز ارشاد فرمایا کہ جو شخص قرآن مجید کو حفظ نہ کرے اور حدیث رسول کو نہ لکھے- اس معاملہ (یعنی تصوف) میں اُس کی اقتداء نہ کرنی چاہیئے- کیونکہ ہمارا علم کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے- اور فرمایا کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت ابوعثمان جلیسری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ معیت و صحبت تین چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک حسنِ ادب۔ دوسرے دوامِ ہیبت، تیسرے مراقبہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحبت و معیت اتباع وسنّت اور ظاہر شریعت کے التزام سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اولیاء اللہ کی صحبت ادب و احترام اور خدمت سے حاصل ہوتی ہے۔ آپ کی وفات کے وقت آپ کا حال متغیر ہوا۔ تو صاحبزادہ نے بوجہ شدّتِ غم و الم کے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ ابو عثمانؒ نے آنکھ کھولی۔ اور فرمایا۔ بیٹا! ظاہر اعمال میں خلاف سنّت کرنا یہ باطن میں ریا ہونے کی علامت ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنے نفس پر قول و فعل میں سنّت کو حاکم بنائے گا، وہ حکمت کے ساتھ گویا ہوگا۔ اور جو قول و فعل میں خواہشاتِ ہوا کو حاکم بنائے گا، وہ بدعت کے ساتھ گویا ہوگا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وان تطیعوا تھتدوا۔ یعنی اگر تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤگے!

حضرت ابوالحسین نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

جس کو تم یہ دیکھو کہ تقرب الی اللہ میں وہ کسی ایسی حالت کا مدعی ہے جو اس کو علم شرعی کے حد سے نکال دے تو تم اُس کے پاس نہ جاؤ۔

حضرت بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

اسلام کا زوال چار چیزوں سے ہے:۔

۱۔ لوگ علم پر عمل نہ کریں۔

۲۔ علم کے خلاف عمل کریں۔

۳۔ جس چیز کا علم ہو، اس کو حاصل نہ کریں۔

۴۔ لوگوں کو علم حاصل کرنے سے روکیں۔

علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تو اُن کا ارشاد ہے اور ہمارے زمانہ کے صوفیوں کا عام طور سے یہی حال ہوگیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ معرفت رکھنے والا وہ شخص ہے، جو اُس کے اوامر کے اتباع میں سب سے زیادہ مجاہدہ کرتا ہو۔ اور اس کے رسُول کا سب سے زیادہ متبع ہو!

حضرت شاہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

جو شخص اپنی نظر کو محارم سے محفوظ رکھے۔ اور اپنے نفس کو شبہات سے بچائے اور اپنے باطن کو دوام مراقبہ کے ساتھ معمور کرے اور ظاہر کو اتباعِ سنّت سے آراستہ کرے اور اپنے نفس کو اکلِ حلال کی عادت ڈالے۔ تو اُس کی فراست میں کبھی خطا نہیں ہوسکتی۔

ابوسعید خرازؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔ ظاہر شریعت جس باطنی حالت کا مخالف ہو، وہ باطل ہے۔

ابوالعباس ابن عطا، رحمۃ اللہ علیہ:۔ جو سید الطائفہ حضرت جنیدؒ کے اقران میں سے ہیں، فرماتے ہیں:۔

جو شخص اپنے نفس پر آداب الٰہیہ کو لازم کرلے، اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو نورِ معرفت سے منوّر فرما دیتا ہے۔ اور کوئی

مقام اُس سے اعلیٰ واشرف نہیں ہے، کہ بندہ حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر اور اعمال واخلاق میں اُن کا متبع ہو۔
نیز فرمایا کہ سب سے بڑی غفلت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے غافل ہو۔ اور یہ کہ اُس کے اوامر واحکام سے غافل ہو۔ اور یہ کہ اُس کے آداب معاملہ سے غافل ہو!

ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

علم کثرت روایت کا نام نہیں۔ بلکہ عالم صرف وہی شخص ہے جو اپنے علم کا متبع ہو اور اس پر عمل کرے۔ اور سنت نبوی کی اقتدا کرے۔ اگرچہ اس کا علم تھوڑا ہو۔ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ عافیت کیا چیز ہے۔ فرمایا:۔

"دین بلا بدعت وعمل بلا آفت وقلب بلا شغل و نفس بلا شہوت!"

دین بغیر بدعت کے اور عمل بغیر آفت کے یعنی بدعات ومخترعات کی آفتیں اُس میں شامل نہ ہوں
اور قلب فارغ جس کو (غیر اللہ کا) شغل نہ ہو۔ اور نفس جس میں شہوت کا (غلبہ) نہ ہو!

اور فرمایا کہ حقیقی صبر یہ ہے کہ احکام کتاب وسنت پر مضبوطی سے قائم رہو!

حضرت بنان حمال رحمۃ اللہ علیہ:۔

آپ سے دریافت کیا گیا کہ احوالِ صوفیہ کی اصل کیا ہے۔ فرمایا۔ چار چیزیں:۔
اول۔ جس چیز کا حق تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ اُس میں اُس پر اعتماد وتوکل کرنا (یعنی رزق)
دوم۔ احکام الٰہیہ پر مضبوطی سے قائم رہنا۔
سوم۔ قلب کی حفاظت (لایعنی تفکرات سے)
چہارم۔ کونین سے فارغ ہو کر توجہ محض ذات حق کی طرف رکھنا!

حضرت ابوحمزہ بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:۔

جس شخص کو حق کا صحیح راستہ معلوم ہو جاتا ہے اُس کو اُس پر چلنا بھی سہل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستے کے لئے کوئی رہبر ورہنما بجز سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احوال وافعال و اقوال میں متابعت کے نہیں ہے!

ابواسحاق رقاشی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:۔

اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ میں حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہوں، یا نہیں۔ تو علامت اللہ تعالیٰ کی محبت کی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کو سب کاموں پر ترجیح دے۔ اور دلیل اس کا حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ !

حضرت ممشاد دینوری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:۔

آداب مرید کا خلاصہ یہ ہے کہ مشائخ کے احترام وعظمت کا التزام کرے اور اخوانِ طریقت کی حرمت کا خیال رکھے۔ اور اصحاب کی فکر میں (زیادہ) نہ پڑے اور آداب شریعت کی اپنے نفس پر پوری حفاظت کرے!

ابوعلی روزباری قدس سرہٗ۔

آپ سے کسی نے ذکر کیا۔ بعض صوفیا، غنا ومزامیر سنتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ میرے لئے حلال ہے، کیونکہ میں

ایسے درجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مجھ پر اختلافِ احوال کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا کہ اس نے یہ تو سچ کہا کہ وہ پہنچ گیا ہے مگر اللہ تعالیٰ تک نہیں، بلکہ جہنم تک!

ابو محمد عبداللہ بن منازل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

جو شخص فرائض شرعیہ میں سے کسی فریضہ کو ضائع کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ سنن کی رضاعت میں مبتلا فرما دیتا ہے۔ اور جو شخص سنن کی اضاعت میں مبتلا ہوتا ہے وہ بہت جلد بدعات میں مبتلا ہو جاتا ہے!

ابو یعقوب نہر جوری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:-

صوفی کا افضل ترین حال وہ ہے، جو علم شریعت سے زیادہ قریب ہو!

ابو عمرو بن نجید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

جو حال علم کا نتیجہ نہ ہو، اس کا ضرر نفع سے زیادہ ہے!

حضرت بندار بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

اہل بدعت کی صحبت حق سے اعراض پیدا کر دیتی ہے!

ابو بکر طمستانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

طریق تصوف کھلا ہوا ہے۔ اور کتاب وسنت ہمارے درمیان قائم ہے۔ اور فضیلت صحابہ کرام کی بوجہ سبقت فی الہجرت اور صحبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معلوم ہے۔ پس ہم میں سے جو شخص کتاب وسنت کا ساتھ دے۔ اور اپنے نفس اور مخلوق سے جدا ہو جائے اور اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کرے، صرف وہی شخص صادق اور مصیب ہے!

ابو القاسم نصر آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

تصوف کی اصل صرف کتاب وسنت کا التزام اور بدعات وہوا سے اجتناب اور مشائخ طریقت کی عظمت و احترام اور خلق اللہ کے اعذار پر نظر، اور اوراد پر مداومت اور تاویلات اور رخصتوں کا ترک ہے!

احقر مترجم عرض کرتا ہے کہ یہ چالیس سے زائد مشائخ صوفیہ کے اقوال اس بارہ میں نقل کئے گئے ہیں۔ جو سمجھدار کے لئے کافی سے زائد ہیں۔ اس لئے انہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ورنہ اس مقدس جماعت کے اکثر افراد سے اسی قسم کے اقوال منقول ہیں۔ جن کے جمع کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ حق تعالیٰ ان حضرات کی برکت سے اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائیں اور بدعات و مخترعات سے بچائے اور اس ناکارہ کو بھی ان حضرات کے زمرہ میں محشور فرمائے۔ (آمین!)

مولانا محمد اسمٰعیل سلفی (گوجرانوالہ)

زیارتِ قبور

قبر کے متعلق جاہلی اور اسلامی تصوّرات

"قبور" گہری زمین کو کہتے ہیں۔ دفن میت کے لئے جو گڑھا کھودا جاتا ہے اس لئے اُسے بھی قبر کہتے ہیں۔ قرآن عزیز میں قبر کا ذکر مختلف مقاصد کے لئے آیا ہے۔ ثم اماته فاقبره (۸۰-۲۱) انسان کو اللہ تعالیٰ نے موت دی اور قبر بنانے کی تعلیم دی، یہاں تحدث بالنعمہ مقصود ہے، انسان کی لاش ذلت سے بچ گئی!

کہیں دوسرے واقعہ میں ضمناً ذکر آگیا ولا تقم علی قبرہ (۹-۸۵) منافق کی قبر پر بھی آپ مت جائیں حتی زرتم المقابر (۱۰۲-۲) یبعث من فی القبور (۲۲-۷) اذا القبور بعثرت (۸۲-۴) ان مقامات میں قبر کا ذکر تذکرتاً حادثہ کے طور پر آیا ہے، اس میں نہ اعزاز ہے نہ استخفاف!

ابتداءِ آفرینش میں سب سے پہلا ناحق قتل ہابیل کا ہوا۔ قاتل حیران تھا کہ لاش کس طرح ٹھکانے لگائے، ایک کوّے کی رہنمائی سے علم ہوا کہ لاشیں اس طرح سنبھالی جاتی ہیں۔ اس واقعہ سے انسان کی عجلت پسندی اور کم علمی کا پتہ چلتا ہے۔ ہابیل ایک نیک آدمی تھا، نہ اُس کا قبہ بنانے کا حکم فرمایا نہ کسی دوسرے اعزاز کا اس کے ساتھ۔ وہ مظلوم بھی تھا!

اصحابِ کہف

اس کے قریب قریب اصحاب کہف کا واقعہ ہے۔ یہ نوجوان اللہ کی راہ میں ہجرت کے لئے نکلے، ظالم حکومت سے بچ بچا کر ایک غار میں پناہ لی، اُن پر غنودگی کی کیفیت طاری ہوگئی تحسبهم ایقاظا وهم رقود۔ وہ سو گئے، غار خطرناک تھا، لوگوں نے نشان کے لئے وہاں مسجد بنادی، اہلِ بدعت نے اسے کھینچ تان کر قبروں پر مسجد بنانے کے لئے جواز کی دلیل قرار دیا ہے۔ لیکن یہ استدلال قطعاً بے محل ہے۔ جب نص قرآن کے مطابق اصحابِ کہف پر متعارف موت طاری ہی نہیں ہوئی، زندہ آدمی سو رہے ہیں، قبر ہے نہ موت، اس لئے اسے اعزازی قبر سے تعبیر کرنا قطعاً غلط اور بے معنی ہے!

سابق انبیاء علیہ السلام

قرآن حکیم میں انبیاء کے قصص کا تذکرہ ضروری تفصیل سے فرمایا گیا، ان میں اکثر کا انتقال زمین پر ہوا۔ اور یہیں دفن ہوئے، وَمَا جعلنا هم جسدا لا یاکلون وما کانوا خالدین! وہ کھانا بھی کھاتے اور ہمیشہ زندہ بھی نہیں رہے۔ دُنیا کا قانون یہی بنایا گیا۔ منها خلقنا کم وفیها نعید کم ومنها نخرجکم تارة اخری "اسی زمین میں ہم نے تمہیں زندگی عطا کی، اسی میں تم دفن ہوگے، اسی سے تمہارا حشر ہوگا!

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں اس لئے باوجود کسی کی صحیح قبر کا علم نہیں، کبھی اُن پر میلا

نہیں لگا، کسی نبی سے منقول نہیں کہ وہ دوسرے نبی کی قبر پر زیارت کے لئے گیا ہو۔ یا اپنے امتیوں کو حکم دیا ہو۔ کہ اس کی قبر سے یہ معاملہ کیا جائے یا کسی دوسرے نبی کی قبر پر اس قسم کی نذر تیار کی جائے، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اس باب میں واضح ہے کہ کسی قبر کو وہ کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ شرائع میں بھی انبیاء علیہم السلام سے یہ رسم منقول نہیں!

قبل اسلام کی رسوم!

صحیح دین میں تو قبور کو کوئی غیر معمولی مقام نہیں دیا گیا۔ مگر عوام اور مخالفین انبیاء نے اس معاملہ میں جو غلطیاں کیں۔ اس کی تفصیل احادیث سے معلوم ہوتی ہے اور اُن چور دروازوں کا پتہ چلتا ہے جو شیطان اور اس کے رفقاء نے ایجاد کئے مشرکین کی ہمیشہ یہ عادت رہی کہ زندگی میں انبیاء علیہم السلام اور اہل حق کی مخالفت کرتے رہے، جب یہ لوگ دنیا سے رخصت ہو گئے تو اُن کے بُت بنانے شروع کر دیئے، اُن کی تصویریں بنائیں، اُن کی قبروں کو کسب معاش کا ذریعہ بنا لیا۔ احادیث قیمہ سے قبور کے متعلق مندرجہ ذیل خرابیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اسے جاہلی زیارت سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا:-

۱۔ قبروں کو پختہ بنانا اور اُن پر بلا ضرورت مال صرف کرنا!
۲۔ اُن پر سجدہ کرنا، اُن سے حاجات طلب کرنا!
۳۔ قبروں کے پاس مساجد اور عبادت گاہیں تعمیر کرنا، مجاورت کے طریق سے دُنیا کمانا۔
۴۔ قبروں پر میلے لگانا، عرس کرنا اور اُن پر اجتماعات منعقد کرنا اور اسے "عید" اور مسرت تصور کرنا!

احادیث سے جہاں ان بیماریوں کا علم ہوتا ہے، وہاں اُن سے کراہت اور نفرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پُرانی خرابیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے پہلی قوموں پر اُن کا جو اثر ہوا اپنی امت کو اس سے بچانا چاہتے ہیں۔ امت کو ان غلط اثرات سے محفوظ فرمانا چاہتے ہیں۔ جو ان رسوم اور عادات کی وجہ سے پہلی قوموں پر ہوا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قبور کے ساتھ اس طرح وابستگی مشرکانہ عقائد کا موجب ہے!

آنحضرتؐ کے ارشادات کا انداز ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ کو اہل کتاب پر کتنا رنج تھا، اسی وجہ سے آپؐ نے لعنت فرمائی۔ ان میں ایک سبب قبور کی زیارت کا مروجہ طریقہ بھی ہے:-

آنحضرتؐ کے ارشادات!

(۱) عن جابر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يجصص القبر وان يبنى عليه وان يقعد عليه وروى "ان يكتب عليها (احمد مسلم)

حضرت جابرؓ نے فرمایا۔ آنحضرتؐ نے قبر پر چونہ لگانے اس پر بنا کرنے قبر پر بیٹھنے اور اس پر لکھنے سے منع فرمایا۔

(۲) عن عائشة ان ام سلمة ذكرت لرسول الله صلى الله عليه وسلم كنيسة رأتها بارض الحبشة وذكرت له ما رأت فيها من الصور فقال رسول الله صلعم اولئك قوم اذا مات فيهم العبد الصالح او الرجل الصالح بنوا على قبره مسجدا وصوروا فيه تلك الصور اولئك شرار الخلق عند الله (متفق عليه)

ام سلمہؓ نے آنحضرتؐ کے پاس حبشہ کے ایک معبد کا ذکر فرمایا۔ جس میں بڑی خوبصورت تصویریں تھیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا، اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس میں اس کی تصویریں بنا دیتے۔ یہ لوگ اللہ کی بدترین مخلوق ہیں۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ آنحضرتؐ کی آخری علالت میں ہوا۔ اور ان احادیث سے ظاہر ہے کہ قبر کو پختہ نہیں بنانا چاہیئے۔ اس کے قریب کوئی عبادت گاہ نہیں بنانا چاہیئے۔ قبر پر کوئی عمارت قبر کے احترام کے لئے نہیں بنانی چاہیئے!

آنحضرتؐ کی نظر میں یہ فعل شرارت آمیز ہے۔ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ایسے لوگ شرار الخلق (تمام مخلوق سے بدتر) ہیں!

عن عطاء یسار قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللھم لا تجعل قبری وثنا یعبد اشتد غضب اللہ علی قوم اتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد (رواہ مالک مرسلا ورواہ البزار عن زید عن عطاء عن ابی سعید الخدری مرفوعاً)

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ اے اللہ! میری قبر کو وثن نہ بنانا۔ ان لوگوں پر خدا تعالیٰ از بس ناراض ہے جن لوگوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔ مالکؒ نے اسے مرسل روایت فرمایا ہے۔ اور بزار نے ابو سعید خدری سے مرفوعاً ذکر کیا ہے!

تواتر

اس مضمون کی احادیث آنحضرتؐ سے بتواتر مروی ہیں۔ بعض احادیث میں آنحضرتؐ نے ایسے لوگوں پر لعنت فرمائی ہے:-

فقد تواترت النصوص عن النبی صلعم بالنھی عن ذالک والتشدید فیہ۔

(اقتضاء الصراط المستقیم صفحہ ۶۹ مطبوعہ انصاری دہلی)

یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، ابوحاتم، ترمذی، نسائی، منتقی وغیرہ کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، عبداللہ بن عباسؓ، جندب بن عبد اللہ البجلی اور بعض دوسرے صحابہ سے مروی ہے!

حدیث کا مطلب صاف ہے کہ قبر کی طرف رخ کر کے سجدہ کرنا، قبر کو قبلہ کی طرح سامنے رکھنا شرعاً حرام ہے۔ جندب بن عبداللہؓ کی روایت میں ہے:-

الا وان من کان قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیائھم وصالحیھم مساجد الا فلا تتخذوا القبور مساجد فانی انھاکم عن ذالک (مسلم)

تم سے پہلے لوگ انبیاء اور صلحاء کی قبروں کو سجدے کرتے تھے، تم قبروں کو ہرگز سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تم کو اسی سے منع کرتا ہوں۔

اس حدیث میں انبیاء کے ساتھ صلحاء کا ذکر بھی آیا ہے اور سختی سے منع فرمایا کہ قبر کو سجدہ گاہ نہ بنایا جائے! ایسی قبور جن کی اس طرح پرستش کی جائے، آنحضرتؐ کی نظر میں وثن کے حکم میں ہیں۔

عن ابی مرثد الغنوی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تجلسوا علی القبور
ولا تصلوا الیہا (مسلم)

قبروں پر مت بیٹھو اور نہ اُن کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھو!

اگر قبر کا نشان مٹ جائے، زمین صاف ہوجائے تو نماز درست ہوگی، چنانچہ مسجد خنیف، حرم مکہ اور مسجد نبوی کے متعلق مروی ہے کہ ان میں سے بعض میں مشرکین کی قبریں تھیں اور بعض میں انبیاء علیہم السلام کی۔ لیکن اب وہ سب ناپید ہیں۔ اس لئے شرک کا شائبہ نہیں، ان مساجد میں نماز جائز ہے!

شریعت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت گاہ قبروں سے بالکل الگ رہے، نہ مسجد میں قبر ہو، نہ قبروں پر مسجد۔ قبر اور مسجد دونوں کے احترام کی نوعیت الگ الگ ہے۔ ان دونوں کو جمع نہیں کرنا چاہیئے!

قبروں کے پاس مسجد

عام طور پر مشہور مزاروں اور استھانوں کے پاس لوگ مسجد بناتے ہیں۔ اُن سے یہ ذہن پیدا ہوتا ہے کہ اس مسجد میں نماز افضل ہے، گویا قبر کی وجہ سے مسجد کو فضیلت حاصل ہوئی، خدا کے گھر کو فضیلت کسی دوسرے ذریعے سے حاصل ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خالق کی طرف نسبت سے وہ فضیلت نہ حاصل ہوسکی جو مخلوق کی وجہ سے حاصل ہوتی۔ دراصل مسجد اپنے مقام کے لحاظ سے اتنی ہی بے نیاز ہے، جس طرح خدا تعالیٰ مخلوق سے بے نیاز ہے اس لئے آنحضرتؐ نے قبروں کے پاس مسجد کی تعمیر کو بھی ناپسند فرمایا۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت جابرؓ کی روایت میں اس کی تصریح فرمائی۔ اذا مات فیھم الرجل الصالح بنوا علی قبرہ مسجداً۔ حضرت جابرؓ کے الفاظ یہ ہیں۔ نھی ان یجصص القبور ان یبنی علیہ۔ قبر پر مسجد بنانا، قبر پر بنا کرنا، یہ فعل ممنوع ہیں۔ ایسی مساجد میں نماز مکروہ ہے، بلکہ اگر خیال ہو کہ اس مسجد میں قبولیت زیادہ ہوتی ہے یا اسی میں نماز دوسری مساجد سے افضل ہے، تو اس میں نماز نادرست ہوگی!

قبروں پر عرس اور میلے

قبر سے شارع کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں دیرانی ہو، اس کے دیکھنے سے موت کا تصور آنکھوں میں پھر جائے۔ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا یقین ہو۔ دنیا کی زیب و زینت سے بے رغبتی پیدا ہو۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہاں شہری انداز کی عمارتیں نہ ہوں، خوبصورتی اور شان و شوکت نہ ہو۔ سنگ مرمر اور سنگ رخام کی گلکاریاں نہ ہوں! تاج محل ایسی عمارتیں دیکھنے سے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا، وہاں تو دنیا اور اہل دنیا کی ثروت اور اسراف ہی کا خیال ذہن پر غالب ہوگا!

قبروں پر شور وشغف، میلے اور ہنگامے بھی اس مقصد کے منافی ہیں، اس لئے آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول لا تجعلوا بیوتکم قبوراً ولا تجعلوا قبری عیداً وصلوا علی فان صلاتکم تبلغنی حیث کنتم (نسائی، ابوداؤد)

آنحضرتؐ نے فرمایا، گھروں کو قبرستان نہ بناؤ (نوافل گھر میں پڑھو) میری قبر پر میلا مت لگاؤ۔ تمہارا درود تم کہیں بھی پڑھو، مجھے پہنچ جاتا ہے!!

بُت پرستوں کی زیارت

اہل کتاب آسمانی تعلیمات کے پابند تھے، ان میں قبر پرستی کا رواج کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اور توحید کا مسئلہ تمام شرائع میں مشترک ہے، قبر پرستی اور مشرکانہ زیارت آسمانی تعلیمات اور توحید انبیاء کے منافی ہے! مگر سابقہ احادیث سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب آسمانی تعلیم سے انحراف کر چکے تھے اور اوہام پرستی کی بدولت ان میں قبر پرستی، مشائخ پرستی، استھانوں پر عرس اور اجتماعات ان میں رواج پا چکے تھے!

بت پرست قوموں میں قبر پرستی کا رجحان اتنا زیادہ معلوم نہیں ہوتا، جس قدر ہونا چاہیئے۔ اس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بتوں پر قناعت کی وجہ سے قبروں پر زیادہ اعتقاد نہیں رکھتے تھے، جو لوگ کھڑے بزرگوں کے پوجنے کے عادی ہوں وہ لیٹے ہوئے بزرگوں کی پرستش کیوں کریں۔ جب کھلے اور ظاہر بزرگوں کی عبادت ممکن ہو تو قبروں میں غائب اور مستور خداؤں سے کیوں ربط پیدا کیا جائے!

اصل مرض!

بُت پرستی اور قبر پرستی میں اصل مرض یہ ہے کہ مشرک غائب خدا پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ اسے یقین نہیں آتا کہ غیر مرئی اور نہ دیکھنے والا معبود اس کی مزدوریں کیونکر پوری کرسکیگا۔ وہ بڑے خلوص اور دل سوزی سے محسوس کرتا ہے کہ کائنات کا اتنا بڑا انتظام نظروں سے غائب اور اکیلا خدا کیسے چلائے گا۔!

اجعل الآلهة الها واحداً ان هذا لشئ عجاب (سورہ ق)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام الٰہ کو ایک بنا دیا، یہ بڑے تعجب کی بات ہے!

ماسمعنا بهذا فی الملة الآخرة ان هذا الا اختلاق!

ہم نے تو یہ توحید کسی پہلے مذہب میں نہیں سنی، یہ تو قطعاً جھوٹ ہے!

اسی لئے زندوں کا توسّل، مُردوں کا توسّل، قبروں کی سیڑھیاں بُتوں کے واسطے گھڑے گئے۔ تاکہ نظر کے سامنے کوئی تو سہارا ہو، کچھ تو نظر آئے، مستقل نہ سہی غیر مستقل ہی سہی۔ اس قسم کے عطائی الٰہ کچھ زیادہ ہو جائیں تو بلا سے۔ خدا کی حکومت سیکرٹریٹ سے کیوں بے نیاز ہو؟

ساری یہ مصیبت علم بالغیب سے پیدا ہوئی۔ انبیاء غائب خدا کی دعوت دیتے ہیں، ارباب توسّل کی تسکین ظاہری شفاء اور عطائی بزرگوں کے سوا ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے یہ تشنگی کبھی قبروں سے پوری کی جاتی ہے کبھی بتوں سے!

بُت پرستوں نے ان کھڑے کھلے مرئی بُتوں سے ایک تسکین حاصل کی، اس لئے اُن کو قبروں کی کچھ زیادہ ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مگر شرک کی ذہنیت میں ایک گونہ مساوات پائی جاتی ہے، اس لئے قبر پرستی کے تھوڑے بہت آثار اُن میں بھی پائے جاتے ہیں۔ سورۂ نجم کی تفسیر میں ابن جریرؒ فرماتے ہیں ابن عباسؓ مجاہد اور ابوصالح لات کی تاکو مشدّد پڑھتے تھے اور فرماتے:۔

فان رجلا یلت السویق للحاج فمات فعکفوا علی قبرہ فعبدوہ (ابن جریر پ ۲۷ ص ۳۵)

یہ بزرگ حاجیوں کو ستو بھگو کر پلایا کرتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو اُن کی قبر پر لوگوں نے اعتکاف کیا اور اُس کی پرستش کی!

حافظ ابن کثیر نے یہی قول ربیع بن انس سے نقل فرمایا ہے۔ ابن کثیر ص۲۵۳ جلد ۴۔ علامہ بدر الاسلام عینی شرح صحیح بخاری ص۱۷۵ جلد ۹، تفسیر مظہری ص۱۱۶ جلد ۹۔ صاحب روح المعانی نے بروایت ابن المنذر ابن جریج سے نقل فرمایا ہے۔

انہ کان رجل بن ثقیف یلت السویق بالزیت فلما توفی جعلوا قبرہ وثنا (روح المعانی ص۵۵)

اور جب یہ پرستو شاہ فوت ہوگئے تو عمرو بن یحییٰ نے کہا کہ یہ ولی پتھر میں سما گئے ہیں، مرے نہیں۔ لوگوں نے پتھر کی عبادت شروع کردی۔ اور اس پر ایک مکان بنادیا۔ (روح المعانی ص۵۵ الاصنام کلبی)

ان آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں بھی بت پرست تھوڑا بہت قبر پرستی کا شوق فرمالیا کرتے تھے!

اسلام نے ایمان بالغیب کی برکت سے ان ساری پرستشوں کا قلع قمع فرمادیا اور خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کو اس طرح ذہن نشین فرمایا کہ اہل ایمان کو نہ کسی بت کی ضرورت محسوس ہوئی، نہ قبر کی، وہ اپنے اعمال یا اپنی بے بضاعتی کا واسطہ لے کر براہ راست بارگاہ الٰہی میں پیش ہوئے اور کامیاب ہوئے!

اذا سئلک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (البقرہ)

جب میرے بندے میری بابت دریافت کریں تو کہہ دو میں قریب ہوں جب کوئی مجھے بلائے

میں سنتا ہوں ادعونی استجب لکم۔ مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا!

مومن اس غائب خدا پر ایمان لانے کے بعد ان تمام بناوٹی وسیلوں سے بے نیاز ہوگئے، جن میں ظاہر بین بت پرست اور قبر پرست مبتلا ہو چکے تھے!

پختہ قبر

آج کی طرح قدیم قبر پرستی میں بھی عقیدت مندی کے ساتھ دکانداری کو بھی دخل تھا، نیک اور صالح حضرات کی جگہ اسنخوان فروشوں نے لی اور چند ہفتوں یا مہینوں میں ایک خانقاہ نے اچھی خاصی دکان کی صورت اختیار کرلی۔ اور بیوپاریوں نے از بس فائدہ بخش بزنس شروع کرلیا۔

شارع حکیم نے پختہ قبروں کو ممنوع قرار دے دیا۔ جیسا کہ حضرت جابر کی حدیث میں گزر چکا، بلکہ اگر قبر پر تعمیر ہوچکی ہو تو اسے گرانے کا حکم فرمایا۔ صحیح مسلم میں حضرت علیؓ سے مروی ہے۔ آنحضرتؐ نے اُن کو حکم فرمایا۔

ان لا تدع تمثالا الا طمسته ولا قبرا مشرفا الا سویته۔

تمام بت مٹادو اور تمام اُونچی قبریں برابر کردو!

حضرت علیؓ نے اپنی حکومت میں اس عہد کو قائم رکھا اور ابو الہیاج اسدی کو اس پر مقرر فرمایا۔

قبروں کے متعلق اس بے احتیاطی کا یہی اثر ہے کہ بعض مقامات پر بد کردار عورتوں تک کی قبریں معبد بنی ہوئی ہیں۔ ان پر چراغ جلائے جاتے ہیں، مجاور وہیں سے روٹی کما لیتے ہیں۔ اعاذنا اللہ من ذالک!

امام شافعی فرماتے ہیں۔

واحب ان لا یبنی ولا یجصص فان ذالک للزینۃ والخیلاء ولیس الموت موضع واحد منھما ولم ار قبور المھاجرین والانصار مجصصۃ (قال الراوی) عن طاؤس ان رسول اللہ صلعم نھی ان تبنی القبور او تجصص (قال الشافعی) وقد رأیت

من الولاة من يهدم بمكة ما تبنى فيها فلم ار الفقهاء يعيبون - (الام للشافعی ص۲۴۶ ام جلد۱)

مجھے پسند ہے کہ قبر پر نہ بناء کی جائے، نہ چونہ لگایا جائے، عمارت، زینت، یہ تکبر کا نشان ہے اور موت کے لئے ان میں سے کوئی بھی مناسب نہیں اور انصار اور مہاجرین کی قبروں کو میں نے پختہ نہیں دیکھا، طاؤس فرماتے ہیں آنحضرتؐ نے قبر پر بناء اور تجصیص سے منع کیا۔ شافعی فرماتے ہیں۔ میں نے امراء کو دیکھا وہ قبروں کو گراتے تھے اور اہل علم اسے معیوب نہیں سمجھتے تھے — !

امام مالکؒ فرماتے ہیں:۔

اکره تجصيص القبور والبناء عليها وهذا الحجارة التى يبنى عليها -

میں قبر کو گچ کرنا ناپسند کرتا ہوں اور اس پر عمارت بنانا اور پتھر وغیرہ لگانا بھی !

چند آثار مزید اس معنی میں ذکر فرمائے:۔

قال سحنون فهذه آثار فى تسويتها فكيف بمن يريد ان يبنى عليها (ص۱۸۹)

سحنون فرماتے ہیں ان آثار کا مطلب یہ ہے کہ قبر اس کے برابر ہونی چاہئے اور جو اس پر عمارت بنانا چاہے اُن کا کیا حال ہوگا !

علامہ شامی ارشاد فرماتے ہیں:۔

واما البناء عليه فلم ار من اختار جوازه - (شامی ص۹۳۷ جلد۱)

میری نظر میں کوئی ایسا آدمی نہیں، جس نے قبر پر عمارت کو جائز کہا ہو !

اس کے بعد حضرت امام ابوحنیفہؒ سے نقل فرماتے ہیں:۔

وعن ابى حنيفة يكره ان يبنى عليه بناء من بيت او قبة ونحو ذالك لما روى جابر نهى رسول الله صلعم - (ص۹۳۷ جلد۱)

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ قبر پر قبہ یا مکان بنانا منع ہے۔ جیسے صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔

علامہ کاسانی البدائع والصنائع میں فرماتے ہیں:۔

وكره ابوحنيفة البناء على القبور وان يعلم بعلامة وكره ابو يوسف الكتابة (ص۳۲۰ ج۱)

امام صاحب نے قبر بناء کو منع فرمایا۔ اور ابو یوسف نے کتابت کو !

مسنون زیارت

جاہلی زیارت اور اس کے متعلق آنحضرتؐ کے ارشادات آپ ملاحظہ فرما چکے، اب مسنون زیارت اور اس کے مقاصد پر غور فرمائیے:۔

عن ابن مسعود ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فانها تزهد فى الدنيا وتذكر الاخرة - (ابن ماجہ، مسلم، ابوداؤد، ابن حبان، حاکم، ترمذی !

آنحضرتؐ نے فرمایا میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے روکا تھا، اب ان کی زیارت کرو۔ اس سے دنیا کی رغبت کم ہوتی ہے اور آخرت یاد آتی ہے!

علامہ کاسانی حضرت جابرؓ کی روایت بیان فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:۔

کان ذالک من باب الزینة ولاحاجة بالمیت الیھا ولانه تضییع المال بلا فائدة فکان مکروھا البدائع والصنائع ۔ (ص۳۲۰ ج ۱)

قبر پر عمارت اور چونہ وغیرہ لگانا زینت ہے اور میت کو اس کی ضرورت نہیں، اس سے بے فائدہ مال برباد ہوتا ہے، اس لئے یہ مکروہ ہے۔ شامی کی عبارت میں یہ صراحتاً موجود ہے!

اس لئے قبرستان میں کوئی ایسی چیز بنانا جس سے دنیا کی زیب و زینت ظاہر ہو بالاتفاق ائمہ ناجائز ہے، قبرستان ویران ہونا چاہیئے۔ جن قبور پر عمارات بنائی گئی ہیں، فقہاء کے نزدیک اُن سے زیارت کا مقصد حاصل نہیں ہوتا مسنون زیارت کے لئے ضروری ہے کہ اس سے زہد نمایاں ہو اور آخرت یاد آئے۔ علماء اور اہل اللہ کی قبروں پر جو یہ قبے اور عمارتیں بنائی گئی ہیں، شریعت کی رُو سے یہ قطعاً پسندیدہ کام نہیں ہے، بلکہ باتفاق ائمہ نادرست ہے!

مسنون دعا

جب قبر کی زیارت کرے تو قبر پر سلام کہے اور جنازہ کی طرح میت کے لئے دعا کرے:۔

السلام علیکم اھل دیار قوم مومنین وانا انشاء اللہ بکم لاحقون!

اس کے سوا اور ادعیہ کے جملے آنحضرتؐ سے مروی ہیں، جو اہل سنت سے مخفی نہیں!

قبر پرستی کب شروع ہوئی؟

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے قبر پرستی کا زیادہ رواج یہود اور نصاریٰ میں تھا۔ مشرکین میں بھی شرک کی یہ قسم موجود تھی لیکن کم۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق لتتبعن سنن من کان قبلکم حذو النعل بالنعل (الحدیث) تم پہلے لوگوں کے قدم بقدم چلوگے جس طرح جوتے کے تلے باہم برابر ہوتے ہیں۔ قبر پرستی کا رجحان تیسری صدی میں شروع ہوا۔

امام شافعیؒ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے انصار اور مہاجرین کی قبروں کو دیکھا اُن پر کوئی عمارت نہیں تھی، وہ بالکل سادہ تھیں۔ امام کا انتقال ۲۰۴ھ میں ہوا، اس وقت جنت المعلیٰ اور جنت البقیع کے مشاہد سادہ تھے۔ اہل علم کی کثرت تھی، اس جہالت کا رواج ممکن ہی نہ تھا!

اسلام کی فتوحات جب دُور تک پہنچیں، فارس اور روم کے علاقے فتح ہوئے، اسلامی تعلیمات نے مفتوحہ اقوام کو متاثر کیا، مفتوحہ اقوام کی عادات اور رسوم نے بھی مسلمانوں کو متاثر کیا۔ اسلام میں تصوف، دنیا سے بے رغبتی، اللہ تعالیٰ پر توکل، اس کے قانون، اسباب کی پابندی کا نام تھا، مسلمان پوری کوشش اور محنت کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل فرماتے۔ دراصل خالص ایک نظام تھا۔ اور نہ عقیدہ مندی کا یہ غلو!

یہود، نصاریٰ، مصری اقوام اور ہندوستان کے اثرات جب اسلامی تعلیمات سے آمیز ہوئے تو اس لئے خانقاہی نظام کی صورت پیدا ہو گئی، کم کھانا، دم کشی، چلّے کرنا، مرید اور شیخ کے آداب کا ایک معیار، اس نئے تصوف کے

اجزائے ترکیبی قرار پائے شیخ کا تصور، وظائف کے مخصوص شرائط، بھوکے رہنا، نفس کشی، بعض قویٰ کو معطل کر دینا اور بعض اعضا کو ضائع کر دینا، یہ سب اسی خانقاہی تصوف کے کرشمے تھے۔ جو یہودی فقرا اور ہندوستان کے سادھوؤں سے اخذ کئے گئے۔ معمولی تبدیلیوں سے انھیں اسلام کا ہم رنگ بنا دیا گیا، ان مشقتوں میں کچھ فائدے بھی تھے، کچھ نفسیاتی اثرات بھی۔ جس نے ایک فن کی شکل اختیار کر لی، قبر پرستی کی موجودہ صورت اسی خانقاہی نظام، اسی پس منظر کی پیداوار معلوم ہوتا ہے!

شیخ اور پیر کے ساتھ بے پناہ عقیدت نے شیخ کو خدا اور رسولؐ کا نائب بنا دیا گیا، اس پر تنقید ناجائز قرار دی گئی ؎

به مے سجاده رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
که سالک بے خبر نبود ز راه و رسم منزل ہا

خانقاہی نظام میں یہ خوبی تھی کہ اس میں اطاعت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا تھا، حسن بن صباح کی ساری باطنی تحریک کا مدار اسی جذبۂ اطاعت پر تھا۔ اسی جذبۂ اطاعت کا یہ غلو تھا کہ شیخ اور پیر کی کسی خلاف شریعت قول و فعل پر بھی لب کشائی کی اجازت نہ تھی، بس سنو، دیکھو اور اطاعت کرو!

یہ عیب آج بھی خانقاہی نظام کا لازمی جزو ہے، قبر پرستی اور انسان پرستی کے خلاف جتنے بھی دلائل دیں کتاب و سنت سے شواہد و براہین لائیں مگر یہ لوگ کتاب و سنت کے مقابلہ میں اپنے مشائخ اور اصحاب سلسلہ کے اقوال و اعمال کو ترجیح دیتے ہیں اور طرح طرح کے نکتے پیدا کرتے ہیں!

وقت کا تعین تو مشکل ہے، کیونکہ مرض تدریجا آیا ہے، لیکن چھٹی ساتویں صدی ہجری میں یہ بیماری زوروں پر تھی۔ نام نہاد صوفیوں کے کئی گروہ اپنی دکانیں سجائے ہوئے تھے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا مقابلہ رفاعی فرقہ کے ایک فقیر سے ہوا جس نے حکومت اور اس کے عمال کو متاثر کر رکھا تھا۔ اس نے شیخ الاسلام سے کہا کہ آپ بھی آگ میں کود جائیں، میں بھی کودتا ہوں جس کو آگ نہ جلائے، وہ سچا ہوگا، شیخ نے فرمایا کہ آگ میں کودنے سے پہلے میں اور تم دونوں نمک اور سرکہ سے غسل کریں گے۔ اس شرط پر وہ فقیر صاحب رہ گئے اور شیخ الاسلام کامیاب رہے۔ شیخ نے یہ پورا مکالمہ اپنے رسالۃ الصوفیہ والفقراء میں لکھا ہے!

چراغ جلانا

قبر پر عمارت جس طرح شرک کے دواعی سے ہے، اسی طرح چراغ جلانا بھی ممنوع اور شرک کے دواعی سے ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

لعن اللہ زوارات القبور والمتخذین علیہ السراج!

اس سے ظاہر ہے عرب قبروں پر چراغ جلاتے تھے، اس سے آنحضرتؐ کو روکنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اسے ناپسند فرمایا۔ اور جس فعل پر حضورؐ "لعنت" فرمائیں، اس کی دینی معصیت اور اخروی خسران کی بھلا کوئی انتہا ہے!

قبر پر پھول چڑھانا

ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ حضرات کی ذہنی کیفیت عجیب ہے، جو چیز یورپ سے آئے اسے تو آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہیں اور اسلام کے مسائل سامنے آجائیں تو ازسرتا پا بحث بن جاتے ہیں!

یورپ میں رواج ہے کہ قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ ان حضرات میں دینی شعور تو کم ہے، مگر یہ حضرات اہل مغرب کی

تقلید سوچے سمجھے بغیر کر رہے ہیں۔ جہاں جاؤ قبروں پر پھول چڑھ رہے ہیں، حالانکہ معلوم ہے کہ اس سے میت کو کوئی فائدہ نہیں۔ جیسے چراغ کی روشنی سے میت کو روشنی نہیں مل سکتی، پھول کی خوشبو سے میت کو کوئی فائدہ نہیں لیکن چونکہ یورپ سے یہ سنت (؟) آئی ہے، اس لئے بابو لوگ اس پر ضرور عمل کریں گے۔ عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ ان رسوم کو جذبات سے بالاتر ہو کر دانشمندی سے ان پر غور کیا جائے، اب بڑھتے بڑھتے یہ رسم یہاں تک عام ہو گئی ہے کہ بادشاہوں اور وزراء کے دوروں میں مرنے والوں کی قبروں پر پھول چڑھانا خیر سگالی کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ اب یہ رسم ان حلقوں میں خالص دنیاداری بن چکی ہے۔ لیکن خانقاہی حلقوں میں اسے دین اور شریعت سمجھا جاتا ہے!

عوام جن کی نظر سنت کے ذخائر اور تاریخ پر نہیں ہے، وہ کربلا، نجف، اور بغداد وغیرہ شہروں میں مزارات پر قبے دیکھ کر یہی محسوس کرتے ہیں کہ یہ قبے یقیناً شرعی احکام کے ماتحت بنے ہوں گے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے!

انہی مزارات کو دیکھ کر امام حاکمؒ صاحب مستدرک نے فرمایا:۔

هذه الاسانيد صحيحة وليس العمل عليها فان ائمة المسلمين من الشرق والمغرب مكتوب على قبورهم وهو عمل اخذ به الخلف عن السلف !

(مستدرک حاکم ص۳۷ ج۱)

قبر پر لکھنے کے خلاف تمام اسانید صحیح ہیں، مگر ان پر عمل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ مشرق سے مغرب تک ائمہ کی قبروں پر لکھا گیا ہے اور یہ خلف نے سلف سے لیا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل نہ آنحضرتؐ سے ثابت ہے، نہ صحابہ سے، بلکہ بعد کے لوگوں نے ایسا کیا، جن کا قول و فعل حجت نہیں، حدیث کا ناسخ ہونا تو بڑی بات ہے، آنحضرتؐ کا ارشاد تو آنحضرتؐ کے ارشاد ہی سے منسوخ ہو سکتا ہے۔ امام ذہبی تلخیص مستدرک میں فرماتے ہیں:۔

قلت ما قلت طائلا ولا نعلم صحابيا فعل ذالك وانما شيئ احدثه بعض التابعين فمن بعدهم ولم يبلغهم النهى۔ (ص۳۷ ج ۱)

امام حاکم نے کوئی کام کی بات نہیں فرمائی۔ یہ فعل کسی صحابی نے نہیں کیا، یہ بعض تابعین اور ان کے بعد والوں کی ایجاد ہے۔ جن کو آنحضرتؐ کی نہی کا علم نہیں ہوا!

روضہ نبویہ علیٰ صاحبہا الف صلوٰۃ و تحیہ

آنحضرتؐ کے انتقال کے بعد جسم اطہر کو حجرہ مقدسہ میں دفن کیا گیا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی یہیں دفن ہوئے حضرت عمرؓ کی تدفین کے بعد حضرت عائشہؓ نے حجرہ میں ایک دیوار بنا کر قبور کا حصہ الگ کر دیا۔ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے حجرہ مبارکہ کی مرمت کرائی، اُس وقت قبریں اپنی حالت پر کچی تھیں۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں مغربی دیوار گر گئی۔ خلیفہ نے ابن مزاحم کو حکم دیا۔ حجرہ صاف کرایا گیا اور دیوار بنا دی گئی۔ اس وقت حجرہ شریفہ مربع تھا۔ خلیفہ عبد الملک نے حکم دیا کہ حجرہ مسجد میں شامل کرایا جائے۔ مدینہ منورہ کے علماء اسے ناپسند کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ قبور مسجد میں نہ آئیں۔ بلکہ الگ رہیں۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے شمال کی طرف ایک زاویہ بڑھا کر حجرہ کی مربعہ عمارت کو مخمس

کردیا - قبلہ جنوب کی طرف ہے - خیال تھا کہ زاویہ شمال کی طرف ہونے سے قبر شریف کو سجدہ نہیں ہو سکیگا - ابن قیمؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

فاجاب رب العالمین دعاءہ — واحاطہ بثلاثۃ الجدران
حتی غدت ارجاءہ بدعاءہ — فی عزۃ وحمایۃ وصیان

آنحضرتؐ کی دعا کا اثر اس طرح ظہور پذیر ہوا کہ حجرہ مقدسہ میں تین دیواریں بنادی گئیں اور اس کے اطراف اہل شرک کے سجدوں سے محفوظ ہوگئے - شمال کی طرف صرف کونہ ہے جسے سجدہ کرنا ممکن نہیں !

اس کے بعد حجرہ کی ہمیشہ ترمیم ہوتی رہی - آنحضرتؐ کے آثار کو قائم رکھنے کے جذبہ کی وجہ سے اکثر مرمت پر کفایت کی گئی - علامہ علی بن عبداللہ سمہودی نے "وفاء الوفاء باخبار دار المصطفٰیؐ" میں اسے تفصیل سے ذکر فرمایا ہے !

حجرہ مسجد میں شامل ہونے کے بعد حجرہ پر پختہ اینٹوں کی جالی لگادی گئی - حجرہ کی چھت مسجد کی چھت سے مل گئی - اس کے منصور بن قلادون صالحی ۶۷۸ھ نے جالی کی جگہ لکڑی لگادی، لکڑی کا جنگلہ نیچے سے مربع تھا اوپر سے مثمن (آٹھ کونہ) کردیا گیا - اسے قبہ زرقاء کہتے تھے - یہ کمال الدین بن احمد بن برہان عبد القوی کے مشورہ سے کیا گیا - مگر اس وقت کے اہل علم نے اسے ناپسند کیا - چنانچہ جب کمال الدین کو معزول کیا گیا تو عوام نے اسے قبہ سازی کی پاداش سمجھا !

جب یہ خستہ ہوگیا تو ملک ناصر حسن بن محمد قلادون نے اس کی مرمت کی - پھر ۷۶۵ھ میں ملک اشرف بن حسین شعبان نے کی اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا - یہاں تک کہ موجودہ گنبد خضراء کی تعمیر عمل میں آئی - ان ترمیمات کا مفصل تذکرہ علامہ سمہودی نے قریب ایک سو صفحات میں کیا ہے !

یہ تغیرات ملکی اور تعمیری مصالح کی بناء پر ہوتے رہے، ان کی بنیاد حضورؐ کے کسی ارشاد یا وصیت کی بناء پر نہیں تھی اور نہ صحابہ کرام کے آثار میں کوئی اثر اس کے ثبوت میں پایا جاتا ہے - گنبد خضریٰ کی عمارت کو دوسری قبروں کے گنبدوں اور قبوں کے لئے دلیل بنا کر پیش کرنا عقل ونقل کسی اعتبار سے درست نہیں - قبہ مبارک کے یہ تغیرات کوئی شرعی سند نہیں ہیں !

محققین علماء احناف نے قبروں کے ساتھ اس معاملہ کو صراحۃً ناجائز فرمایا ہے، چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے فرمایا :-

"مسئلہ قبور اولیاء بلند کردن وگنبد برآں ساختن وعرس وامثال آں وچراغاں کردن ہمہ بدعت است بعضے ازاں مکروہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر شمع افروزاں نزد قبر وسجدہ کنندگان را لعنت گفت وفرمودہ قبر مرا عید ومسجد نکنید ودروں مسجد سجدہ نکنید وروز عید برائے مجمع درسال مقرر کردہ شدہ ورسول کریم علی رضی اللہ عنہ را فرستاد کہ قبور مشرفہ را برابر کنند ہر جاکہ تصویر بیند محو کند !" (ارشاد الطالبین ص۲۰)

انبیاء کی قبروں کو اونچا کرنا، ان پر گنبد بنانا، عرس کرنا، چراغ جلانا، بدعت ہے - ان میں بعض بدعات مکروہ (تحریمی) ہیں - آنحضرتؐ نے قبر پر چراغ جلانے والے اور سجدہ کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے - اور فرمایا - نہ میری قبر پر میلہ لگے - نہ اس پر مسجد بنائی جائے، نہ ایسی مساجد میں نماز ادا کی جائے - نہ کسی مقررہ تاریخ میں وہاں اجتماع کیا جائے — !

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ اُونچی قبروں کو برابر کردیں اور جہاں تصویر دیکھیں اُسے مٹادیں!

زیارت کے آداب

عام قبروں کی زیارت مسنون ہے، قبر پر جائے تو دعاءِ مسنون پڑھے۔ دعاءِ مسنون کے جس قدر الفاظ آنحضرت سے منقول ہیں، اختلاف کے باوجود اُن میں ایک چیز قدر مشترک ہے۔ اُن میں صاحبِ قبر کے لئے دعا کی گئی ہے، صاحبِ قبر سے کچھ نہیں مانگا گیا۔ اس ادب کا ملحوظ رکھنا از بس ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے اپنے یا کسی دوسرے کے لئے دعا کرنا عبادت ہے، جب یہ دعا کسی دُوسرے سے کی جائے گی تو یہ اُس کی عبادت ہوگی، آنحضرتؐ کا ارشادِ گرامی ہے "الدعاء مخ العبادۃ" دعا عبادت کا مغز ہے، ایک حدیث میں آیا ہے" الدعاء ھو العبادۃ "دعا ہی عبادت ہے۔ اللہ کے سوا غیر کی عبادت کرنا بھی حقیقتاً شرک ہے!

عبادت اللہ تعالیٰ کا خاص حق ہے۔ اس میں اُس کے ساتھ نہ کوئی ولی شریک ہوسکتا ہے نہ کوئی نبی۔ جس نے کسی نبی سے دعا کی یا ولی سے، اُس نے اُسے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا۔ اس لئے قبر کی زیارت کے وقت صاحبِ قبر کیلئے اگر اللہ سے دعا کی تو یہ عبادت ہوگی، ایسا کرنے والا ثواب کا مستحق ہوگا۔ اور اگر اس نے خود صاحبِ قبر سے دعا کی اُس سے کچھ طلب کیا، یہ شرک ہوگا، اُس کے تمام اعمال ضائع ہوں گے!

بلکہ صحیح مذہب یہ ہے کہ قبر کو مقامِ تقرب بھی نہ سمجھے۔ وہاں یہ سمجھ کر دعا کرنا کہ یہاں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے یا جلدی قبول ہوتی ہے، یہ بھی غلط ہے۔ ایک اثر مشہور ہے۔ کہ امام شافعیؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی قبر کو قبولیت کا مقام سمجھتے تھے۔ یہ اثر غلط ہے، اس کی کوئی سند حضرت امام شافعیؒ تک نہیں پہنچتی!

زیارت کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے کہ مسنون دعا پڑھے اور مقبور کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرے۔ جس طرح جنازہ میں دعا کی جاتی ہے۔ اصحابِ قبور نہ کچھ دے سکتے ہیں، نہ لے سکتے ہیں۔ ان سے کچھ مانگنا عبث بھی ہے اور گناہ بھی!

غلط بیانیاں

قبر پرستوں سے عام طور پر سُنا گیا ہے:۔

اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باھل القبور!

جب تمہیں کسی کام میں حیرانی ہو تو اہلِ قبور سے مدد مانگو۔

اسے حدیث کہہ کر ذکر کیا جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث نہیں، محدثین نے صراحتاً فرمایا ہے یہ جھوٹی بات ہے ھو کلام موضوع مکذوب باتفاق العلماء۔ (اقتضاء الصراط ص۵۹) اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ یہ جھوٹی بات ہے!

شاہ ولی اللہ صاحب اس روایت کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

"ایں حدیث قولِ مجاوران است برائے اخذ نذر و نیاز بر مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم افترا کردہ اند" (بلاغ المبین ص۳۵)

یہ حدیث نذر نیاز جمع کرنے کے لئے مجاوروں نے آنحضرتؐ پر اختراع کیا ہے! احادیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں! محدثین اور محققین صوفیہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ اعتقاد کے مسائل میں بناوٹی روایات سے استدلال کرنا لاعلمی کی دلیل ہے!

اسی طرح کی ایک روایت اہلِ بدعت نے اور گھڑی ہے۔ فاعینونی یا عباد اللہ (اللہ کے بندو میری مدد کرو) یہ الفاظ بھی کسی صحیح حدیث میں نہیں ملے، ابوالعلی بحران وغیرہ میں الفاظ قریب قریب اس طرح مرقوم ہیں:-

اذا نفلتت دابة احدکم بارض فلاة فلینادیا عباد اللہ احبسوا علیٰ فان اللہ فی الارض حاضراً یحبسه!

جب تمہارے جانور جنگل میں گم ہو جائیں تو آواز دو کہ اللہ کے بندو! اسے روک لینا، اللہ کا کوئی نہ کوئی بندہ حاضر ہوگا جو انھیں روک لے گا

اگر تھوڑی دیر کے لئے اس حدیث کو مان بھی لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ناواقف آواز دے، اللہ کا کوئی نہ کوئی بندہ وہاں موجود ہوگا جو اس جانور وغیرہ کو روک لے گا!

اس میں تصوّر اولیاء سے استعانت کا کوئی ذکر نہیں!

امام شافعیؒ سے منقول ہے اصابنی ضیق فدعوت عند قبر ابی حنیفه (اقتفار ص۵۹۶)

یہ بھی امام شافعیؒ پر افتراء ہے، اولاً امام شافعیؒ جب بغداد آئے تو حضرت امام کی قبر چنداں مشہور رہی نہ تھی۔ دوم شافعیؒ حجاز سے آئے تھے وہاں ایسے لوگوں کی قبریں موجود تھیں جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بدرجہا افضل تھے۔ وہاں صحابہ کرام کی قبریں موجود تھیں، امام شافعیؒ نے تنگ دستی کا یہ علاج وہاں کیوں نہ کیا۔ سوم یہ نسخہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ حضرت ابویوسف امام محمد امام آخر وغیرہم رحمہم اللہ کو کیوں نہ ملا، ان لوگوں نے اپنے استاد کی قبر پر کیوں دعائیں نہ کیں۔ امام شافعیؒ کو حجاز میں یہ نسخہ مل گیا۔ اور قریب ترین تلامذہ شب و روز کے خادم اس سے محروم!

اصحاب بدر کا عرس

عام قبر پرست حضرات اپنی تقریروں میں فرمایا کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ بدر کے شہدا کے مزاروں پر ہر سال جایا کرتے تھے!

مجھے یہ روایت نہ صحاح میں ملی ہے نہ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں اس کا تذکرہ آیا ہے، معلوم ہوتا ہے حضرات اصحاب القبور نے اس میں کچھ جعل سازی سے کام لیا ہے!

بدر کی جنگ میں قریباً ستر کے قریب صنادید قریش سے تلوار کے گھاٹ اترے، جنہیں امیّہ کے سوا ہر ایک کو کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ چودہ کے قریب صحابہؓ اس معرکہ میں کام آئے۔ لیکن ان کو کہاں اور کیسے دفن کیا گیا، اس کی حیثیت صحیح طور پر معلوم نہیں!

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سال کے سال پابندی کے ساتھ شہدائے بدر کی قبور پر تشریف لے جاتے تو احادیث و آثار میں اس کی تفصیل ہونی ضروری تھی۔ اور سب سے بڑی بات قابلِ غور و توجہ تو یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں اس معمول کا پایا جانا ضروری تھا کہ یہ نفوسِ قدسیہ حضورؐ کی ایک ایک سنت پر عمل کرتے تھے اور حرزِ جان بناتے تھے!

بدر یوں بھی مدینہ سے کافی دور ہے۔ ایسے سفر نہ حضورؐ کی عادت تھی اور نہ دینی مصروفیات اس کی اجازت دیتی تھیں!

شہدائے احد

شہدائے احد کے متعلق ثابت ہے کہ آنحضرتؐ احد تشریف لے گئے اور یہ درست ہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ احد

مدینہ منورہ کا ایک حصہ ہے، اس کی راہ جنت البقیع کی طرح ہوگی، یہ کوئی سفر نہیں ہے اور یہ زیارت بھی ہر سال نہیں فرمائی۔ بلکہ صرف ۸ھ ہجری میں آنحضرت تشریف لے گئے، ان شہیدوں کے لئے دعا فرمائی۔ صحیح بخاری میں ہے:-

عن عقبة بن عامر قال صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم على قتلى احد بعد ثمان سنين كالمودع للاحياء والاموات - مشکوٰۃ

عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں آنحضرتؐ نے شہداء پر ۸ھ ہجری میں نماز پڑھی، ایسا سماں تھا جیسے حضرتؐ زندوں اور مردوں کو وداع فرما رہے ہوں۔

یہ حدیث صحیح بخاری میں تین جگہ مرقوم ہے، کتاب الجنائز میں ایک دفعہ اور کتاب المغازی میں دو دفعہ، الفاظ میں بھی معمولی سا اختلاف ہے — !

اس حدیث سے چند امور ظاہر ہیں:-

۱- حضورؐ یہ زیارت ہر سال نہیں فرماتے تھے - بلکہ یہ واقعہ صرف ۸ھ ہجری میں ہوا۔
۲- اس کی حیثیت وداعی حادثہ کی سی تھی، یعنی اس کے بعد آنحضرت زیارتِ شہدائے احد کیلئے تشریف نہیں لے گئے
۳- آنحضرت نے وہاں خطبہ دیا - ایسے خطبے حضورؐ غیر معتاد امور پر ہی خطبہ دیا کرتے تھے !

یہاں صلوٰۃ کے معنی صرف دعا سمجھے جائیں تو زیادہ مناسب ہے، پانچسال کے طویل عرصہ کے بعد قبر پر نماز پڑھنا احناف ناپسند فرماتے ہیں، کیونکہ اس عرصہ میں میت کا تفسخ یقینی ہے، شہید معرکہ پر شوافع نماز جنازہ کو ناپسند فرماتے ہیں- صحیح احادیث کا تقاضا بھی یہی ہے، قرین قیاس بھی ہے کہ آنحضرت نے ۸ھ ہجری میں وداعی دعا فرمائی !

قبوری حضرات نے ممکن ہے اسی واقعہ کو عرس سمجھ لیا ہو- مگر ظاہر ہے کہ ان روایات میں عرس کی گنجائش نہیں- اور خیال ہے کہ اسی واقعہ کو بدر پر چسپاں کر دیا ہو، ہمارے قبوری حضرات کے دلائل کا یہی حال ہے

چہ دہ گز بیا لاچہ دہ گز بہ زیر !

خواب اور کہانیاں

قبوری حلقوں میں سب سے زیادہ اعتماد غیر مستند قصوں اور خوابوں پر کیا جاتا ہے، یہی تار عنکبوت ہے- جس پر ان حضرات کو ہمیشہ اعتماد رہا معلوم ہے نہ خواب شرعی حجت ہے نہ قصے اور کہانیاں ! ائمہ سنت کا یہ حال ہے کہ وہ احادیث کے ذخیرہ میں سند کے بغیر کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے- پھر احادیث میں عقائد کے لئے متواتر اور یقینی ذخائر سے استدلال فرماتے ہیں- اعمال میں بھی ضعاف، شواذ اور منکرات پر توجہ نہیں دیتے، اور ان حضرات کا یہ حال ہے کہ عقائد کے مقابلہ میں جھوٹے قصوں اور مزخرف خوابوں سے دل کو تسکین دیتے ہیں- ائمہ اصول نے صراحت فرمائی ہے کہ امت کے خواب شرعاً حجت نہیں اور نہ ان سے کوئی حکم ثابت ہو سکتا ہے !

پھر اس قسم کے قصے اور کہانیاں اور خواب یہود، نصاریٰ، ہنود اور ان کے علاوہ مشرک قوموں کے پاس یہ ذخیرہ بکثرت موجود ہے، اگر استدلال کی یہ راہ کھول دی گئی تو بت پرستی، آتش پرستی کا ثابت کرنا بھی چنداں مشکل نہ ہوگا- قادیان کی نبوت اور خلافت کا انحصار بھی خوابوں پر ہے !

دانیال کی نعش - امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں اور شیخ الاسلام نے اقتضاء الصراط میں ذکر فرمایا کہ

حضرت عمرؓ کی خلافت میں جب تستر فتح ہوا تو ہرمز کے خزانہ میں ایک نعش تھی۔ جسے قحط کے ایام میں باہر نکالا جاتا تھا۔ تو بارش ہوجاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے ہم نے دن کے وقت تیرہ قبریں نکالیں، رات کے وقت انھیں دفن کرکے سب قبریں برابر کردیں تاکہ کوئی ان قبروں کو پہچان نہ سکے اور پرستش شروع نہ ہوجائے!

جہاں تک اہل حق پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تعلق ہے وہ زندوں پر بھی ہوتی ہے، مُردوں پر بھی۔ دانیال پر بھی ہوسکتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی۔ تمام انبیاء اور صلحاء اُس کی رحمت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ بلکہ ہم ایسے گنہگار بھی اُسی کی رحمت کے سہارے پر جی رہے ہیں۔ جہاں تک قبر پرستی کے لئے استدلال کا تعلق ہے، دانیال سے نہ اُس وقت کسی نے استغاثہ کیا، نہ اب درست ہے، بلکہ حضرت عمرؓ نے اس قبر کو اس قدر مخفی فرمادیا کہ نہ اُس وقت کوئی اُسے معلوم کرسکا، نہ آج ہی کسی کو معلوم ہے، اُسے گم کردینا دلیل ہے کہ صحابہ قبر کے ساتھ استعانت و استغاثہ کے تعلق کو ناجائز سمجھتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے حکم سے ایسا ہوا، ایک صحابی نے بھی اس کے خلاف آواز نہیں اُٹھائی، اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے مشرکانہ افعال کے خلاف صحابہ کا اجماع ہے ورنہ جب وہ کسی چیز کو ناپسند فرماتے تھے تو حضرت عمرؓ سے بھی کھلے طور پر کہہ دیتے تھے؟

اس موضوع پر ایک آیت کو بھی مسخ کرنے کی کوشش فرمائی گئی ہے:۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تتولوا قوما غضب اللہ علیھم قد یئسوا من الاخرۃ کما یئس الکفار من اصحاب القبور۔

اے ایمان والو اُن لوگوں سے مت دوستی کرو جن پر خدا تعالیٰ ناراض ہوا، وہ اللہ کی رحمت سے اسی طرح بے امید ہیں جس طرح قبروں والے کافر (موت کے بعد) اللہ کی رحمت سے بے امید ہیں!

آیت کا مطلب صاف ہے "من" بیانیہ ہے، اصحاب القبور الکفار کا بیان ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں تو ایمان کی امید ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اور بھی اسباب ہیں، جن سے امید ہوسکتی ہے، موت کے بعد اہل کفر کے لئے کوئی امید گاہ نہیں، جو لوگ مسلمان کہلا کر کفار سے وابستہ رہیں انھیں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بے امید ہوجانا چاہیئے۔ اس میں قبر پرستی کے لئے کوئی گنجائش نہیں، تمام مفسرین نے آیت کا مفہوم اسی انداز سے بیان فرمایا ہے!

قرآن عزیز تو ان امراض کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہے، وہ شرک کی کیوں اجازت دے گا، آیت **فلا تجعلوا للہ اندادا و انتم تعلمون** (بقرہ) کی تفسیر میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے انداد کی مختلف اقسام ذکر فرمائی ہیں ان میں چوتھی قسم میں قبر پرست حضرات کا تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں!

چہارم پیرپرستان گویند چوں مرد بزرگے کہ بسبب کمال ریاضت و مجاہدہ مستجاب الدعوات و مقبول الشفاعت عنداللہ شدہ بود ازیں جہاں میگذرد روح اورا قوت عظیم و وسعتے بس فخیم بہم میرسد۔ ہر کہ صلوٰۃ اورا برزخ سازد یا در مکان نشست و برخاست او یا بر گور او سجود و تذلل تام نماید روح او بسبب وسعت و اطلاق برآں مطلع شود

ودر دنیا وآخرت در حق او شفاعت نماید۔ (ص۱۵ جلد ۱ تفسیر عزیزی)

پیر پرست کہتے ہیں کہ بزرگ آدمی کثرتِ ریاضت اور مجاہدہ کی وجہ سے اس کی دعائیں اور سفارش اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ اس دنیا سے رخصت کے بعد اس کی روح میں بے حد قوت اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے، جب اس کی صورت کو برزخ بنایا جائے یا اس کی نشست گاہ اور قبر پر عجز و انقیاد سے سجدہ کیا جائے، اس کی روح کو وسعتِ علم کی بنا پر اطلاع ہو جاتی ہے۔ اور دنیا اور آخرت میں اس کے حق میں سفارش کرتی ہے، اس قسم کی استمداد اور رعایت کو شاہ صاحب "نِدّ" سمجھتے ہیں اور اسے شرک تصور فرماتے ہیں!

اللہ اور مخلوق کے درمیان اس قسم کے وسائل اور سفارش ضروری سمجھنا خدا تعالیٰ پر بدگمانی کے مرادف ہے —

ابن قیم فرماتے ہیں:۔

ومن ظن ان له ولداً او شريكا او ان احدا يشفع عنده بدون اذنه او ان بينه وبين خلقه وسائط يرفعون حوائجهم اليه وانه نصب لعباده اولياء من دونه يتقربون بهم اليه ويتوسلون بهم اليه ويجعلونهم وسائط بينهم وبينه فيدعونهم ويخافونهم ويرجونهم فقد ظن به اقبح الظن واسوءه۔ (الهدى ص۱۴۲ ج ۲)

جو یہ خیال کرے کہ اللہ کی اولاد ہے یا اس کا کوئی شریک ہے یا اس کے پاس کوئی بلا اجازت شفاعت کر سکتا ہے یا مخلوق اور خالق کے درمیان ایسے واسطے ہیں جو مخلوق کی ضرورتوں کو اللہ تک لے جاتے ہیں، یا اللہ کے سوا کچھ اولیاء ہیں جو اللہ تعالیٰ اور ان لوگوں کے درمیان وسیلہ اور قرب کا کام دیتے ہیں اور خالق اور مخلوق میں واسطہ بنتے ہیں، ان سے دعا کرتے ہیں، ڈرتے ہیں اور ان سے امید کرتے ہیں، جس کو یہ خیال ہو اس نے اللہ تعالیٰ پر بدگمانی کی!

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مسلکاً حنفی ہیں، مشرباً صوفی ہیں۔ حدیث پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ اہلِ حدیث، دیوبندی، بریلوی، تمام طبقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے انھیں گہری عقیدت ہے، علم و فضل، زہد و تقویٰ، انابت الی اللہ کے لحاظ سے ان کا مقام اپنے اقران میں بہت اونچا ہے (رحمہ اللہ ورضی عنہ ورفع درجتہ) ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں:۔

"اگر کوئی کہے کہ خدا اور رسول اس عمل پر گواہ ہیں، کافر ہو جائے گا، اولیاء معدوم کو موجود نہیں کر سکتے، موجود کو معدوم نہیں کر سکتے، ان کی طرف ایجاد یا اعدام، رزق دینے، اولاد دینے، مصیبت اور بیماری دور کرنے کی نسبت کرنا کفر ہے، ارشادِ ربانی ہے، اے محمد! کہہ دو میں اپنے لئے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں، نہ اس کے سوا کسی سے مدد طلب کرے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین میں اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی ہے کہ اے اللہ ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ایاک میں حصر ہے، اولیاء اللہ کے لئے کوئی نذر درست نہیں کیونکہ نذر عبادت ہے، اگر کوئی ایسی نذر مانے تو اسے پورا نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ معصیت سے جہاں تک ممکن ہو بچنا چاہیئے۔ اور قبروں کا طواف درست نہیں، کیونکہ طواف نماز کے حکم میں ہے اور ربوبیت اللہ کا حق ہے۔ زندہ اور مردہ ولیوں اور نبیوں

سے دعا کرنا درست نہیں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے۔ دعا ہی عبادت ہے، پھر ارشاد خداوندی ہے، مجھ سے دعا کرو، میں قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں جائیں گے!

اور جو لوگ یہ وظیفہ کرتے ہیں۔ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للّٰہ یا خواجہ شمس الدین پانی پتی شیئاً للّٰہ، یہ کہنا جائز نہیں شرک اور کفر ہے!

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ ان الذین تدعون من دون اللہ عباد امثالکم (جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ وہ تمہاری طرح بندے ہیں) یہ آیت صرف بت پرستوں کے لئے نہیں، کیونکہ من دون اللہ میں عموم ہے، احکام میں الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جاتا ہے۔!

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ اگر کوئی کلمہ توحید کے ساتھ علی ولی اللہ، ابوبکر ولی اللہ کو ملائے تو اُسے تعزیر لگائی جائے گی اسی طرح ذکر اور وظیفہ کے طور پر یا محمدؐ یا محمدؐ کہنا ناجائز ہے۔ (ص۱۹ " ارشاد الطالبین" فارسی میں ہے، اختصار کے لئے اُردو میں ترجمہ کر دیا۔ اور ملخص بھی کر دیا گیا ہے۔!

قرآن مجید سے شرک اور دعوت لغیراللہ کے لئے استدلال عجیب ہے۔ لیکن جب قوموں کے ذہن بگڑتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ عجائبات کا ظہور اُن سے ممکن ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے قبوری حضرات کا ہے، وہ قرآن عزیز سے شرک اور کفر کے لئے دلائل تلاش کرتے ہیں۔!

کتاب وسنت کا کام تو کفر و شرک اور بدعات کو مٹانا ہے، نہ کہ اُن کو قائم کرنا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی " شرک " کے خلاف اعلانِ جہاد تھی۔ حضورؐ ہی کی محبت اور اتباع کا یہ تقاضا ہے کہ ہم قبروں کے ساتھ وہی سلوک کریں، جس کی اجازت دی گئی ہے۔ اور جن باتوں کی نہی فرمائی ہے، اُن سے باز رہیں!

جن کو ہم اولیاء اللہ سمجھتے ہیں، وہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے سبب " اولیاء اللہ " بنے ہیں۔ پس کتاب وسنت سے جس کام کی مخالفت ہوتی ہو، اس کا کیا جانا اولیاء اللہ کی محبت کے منافی ہے! کتاب وسنت کی جس دینی فعل و عمل پر چھاپ نہ لگی ہو، وہ معتبر نہیں۔ اور اس قسم کے تمام افعال، عشق و محبت کے تمام زبانی وعدوں کے باوجود، آخرت کے خسران اور رسوائی کا باعث ہوں گے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو کتاب وسنت پر عامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

محترمہ عطیہ خلیل عرب

"الوسیلہ" کا حقیقی مفہوم

بَلْ نقذفُ بالحق علی الباطل فیدمغهٗ فاذا ھو زاھق!

یہ انتہائی غمناک والمناک و افسوسناک حقیقت ہے کہ وہ مسلمان جو توحید و رسالت پر یقین رکھتے ہیں، انہی میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو مشرکانہ رسوم اور بدعات کے اتنے خوگر ہو گئے ہیں کہ اپنی اس جہالت و ضلالت ہی کو "دین" سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے نہ تو وہ حق کی جستجو کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور نہ انھیں تو بہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے!

عوام کی اس جہالت اور گمراہی کے بہت کچھ ذمہ دار وہ مدعیانِ علم و خبر ہیں، جو "کتاب اللہ" کی آیات میں من گھڑت تاویلیں کرنے اور من بھاتا مطلب نکالنے تک سے نہیں چوکتے!

عوام کو سب سے زیادہ فریب:-

"... وابتغوا الیہ الوسیلہ"

کے نام پر دیا جاتا ہے۔ کہ یہ دیکھو! اللہ تعالیٰ قرآن میں حکم دیتا ہے کہ "وسیلہ تلاش کرو"۔ بس انبیاء، شہداء اور اولیاء کے "وسیلہ" کے بغیر خدا تک رسائی ہی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی "وسیلہ" کا عقیدہ پھیل کر، "قبروں پر جا کر مرادیں مانگنے، اُن پر چادر چڑھانے، طواف کرنے، اولیاء اللہ کو حاضر و ناظر جاننے، اُن کے ناموں کی دہائی دینے اور انھیں مصیبت کے وقت استمداد کے لئے پکارنے" کی مشرکانہ صورتیں اختیار کر لیتا ہے!

اس مضمون میں اسی آیت کی شرح و تفسیر مقصود ہے، تاکہ اہلِ بدعت نے جس آیت کو سب سے زیادہ اپنی ہوائے نفس کی کمیں گاہ بنا رکھا ہے، اُس کی معنوی تحریف اور غلط استدلال کا تار و پود بکھر جائے۔ اور لوگ سمجھ لیں کہ اس آیت کریمہ کا اصل منشاء اور مقصود و مدلول کیا ہے!

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلہ — (المائدہ)

خط کشیدہ جزوِ آیت سے اہلِ بدعت و بدعقیدہ لوگ پیر پرستی اور غیر اللہ کو خدا تک رسائی کا ذریعہ بنانے کے لئے بزعمِ خود وجہ جواز پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں یہاں اور جہاں بھی "الوسیلہ" استعمال ہوا ہے، اس سے مراد یہ نہیں ہے جو یہ لوگ لیتے ہیں—!

پہلے یہ دیکھنا ہے کہ "الوسیلہ" کے لغوی معنی کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب امام راغب اصفہانی کی لغت ہے۔ "مفردات راغب اصفہانی" میں اس لفظ "الوسیلہ" کی لغوی تشریح ملاحظہ ہو:-

(وسل) الوسیلة التوصل الی الشیٔ برغبة وھی اخص من الوصیلة لتضمنھا معنی الرغبة

قال تعالیٰ ابتغوا الیہ الوسیلہ وحقیقۃ الوسیلۃ الی اللہ تعالیٰ، مراعاۃ سبیلہ بالعلم والعبادۃ وتحری مکارم الشریعۃ وھی کالقربۃ والواسل الی اللہ الراغب الیہ

یعنی کسی شے تک رغبت سے پہنچنا اور یہ وسیلہ وصیلہ (بالصاد) سے صرف بمعنی رغبت کے خصوصیت رکھتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ وابتغوا الیہ الوسیلہ سے مراد صراط مستقیم پر علم، عبادت اور مکارم شریعت (اعمال صالحہ) کے باوصف گامزن رہنا ہے۔ اس لئے قربت کے معنی صحیح ہیں اور "الواسل" کے معنی اللہ سے رغبت و قرب رکھنے والا ہیں — !

مفسر گرامی علامہ محمد بن جریر الطبری فرماتے ہیں:-

(وابتغوا الیہ الوسیلہ) یقول، اطلبوا القربۃ الیہ بالعمل بما یرضیہ والوسیلۃ الفعیلۃ من قول قائل توسلت الیہ بکذا بمعنی تقربت الیہ

یعنی اللہ سے ایسے اعمال کے ساتھ تقرب چاہو جو اس کی خوشنودی کا باعث ہوں "الوسیلہ" علی وزن "فعیلہ" ہے مثلاً کوئی کہے میں اس سے قریب ہوا تو وہ توسل تقرب ہی کے معنی میں استعمال ہوگا، اس کی دلیل یہ عنترہ کا شعر ہے ؎

ان الرجال لھم الیک وسیلۃ ان یأخذوک تکحلی وتخضبی!

(لوگ تیرا قرب حاصل کرنے کے لئے تجھے لینا چاہتے ہیں اس لئے تو سرمہ اور مہندی سے بناؤ سنگھار کر لے)

اس کی تائید میں دوسرا شعر ہے:-

اذا غفل الواشون عدنا لوصلنا فعاد التصافی بیننا والوسائل

چغلخوروں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہم ملنے کا سامان کریں گے اور پھر پہلے درمیان تقرب و اخلاص لوٹ آئیگا !

آگے لکھتے ہیں:-

وبمعنی الذی قلنا قال بعض اھل التاویل ذکر من قال ذالک - حدثنا بشار، سفیان عن ابی وائل ابتغوا الیہ الوسیلہ القربۃ فی الاعمال، وحدثنی سفیان، ابی طلحۃ، عطاء، آیۃ۔ فی المسئلۃ القربۃ، عن قتادۃ ای تقربوا الیہ بطاعۃ والعمل بما یرضیہ عن ابی حذیفۃ قال حدثنا شبل عن ابن ابی نجیح عن مجاھد وابتغوا الیہ الوسیلۃ قال القربۃ -

یعنی ہماری طرح بعض اہل تاویل نے بھی یہی معنی مراد لئے ہیں - چنانچہ بشار، سفیان سے اور سفیان ابو وائل سے راوی ہیں کہ "الوسیلہ" سے مراد قربت ہے اعمال صالحہ سے - اور اسی طرح سفیان ابو طلحہ سے اور وہ عطا سے راوی ہیں کہ اس آیت میں "وسیلہ" کے معنی قربت کے ہیں ! اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے - آپ فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کے کام کر کے اس سے تقرب حاصل کرو، اور ابو حذیفہ شبل سے اور وہ ابن ابی نجیح سے اور حضرت مجاہد سے "الوسیلہ" کے معنی "القربت" ہی روایت کئے ہیں - (تفسیر ابن جریر الطبری ص۵۵)

تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ :-

(یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ) ای خافوا اللہ بترک المنہیات (وابتغوا الیہ) ای لا الٰی غیرہ (والوسیلۃ) الوسیلۃ الفعیلۃ من توسلت الیہ اذا تقربت الیہ والوسیلۃ القربۃ التی ینبغی ان تطلب وبہ قال ابو وائل، الحسن، مجاھد قتادۃ السدی ومن زید وروی عن بن عباسؓ وعطاء وعبد اللہ بن کثیر قال فی تفسیرہ ھذا الذی قالہ ھاؤلاء الائمۃ لاخلاف بین المفسرین فیہ- والوسیلۃ ایضاً درجۃ فی الجنۃ مختصۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم- (البخاری)

یعنی ممنوعات و مکروہات کو چھوڑ کر خدا سے ڈرو، خدا کے سوا اور کسی سے نہیں۔ الوسیلہ علی وزن فعیلہ ہے۔ گویا توسلتُ الیہ میں اس سے قریب ہوا بمعنی تقرب۔ اس لئے کہ "الوسیلہ" کے معنی "القربۃ" ہیں اور اللہ سے قربت ایسی نعمت ہے جسے ضرور مانگنا چاہیئے۔ اور اسی طرح حضرت ابو وائل، حضرت حسن، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ سے مروی ہے۔ اور السدی اور ابن زید، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عطاء روایت کرتے ہیں کہ الوسیلہ سے مراد اعمال صالحہ سے قرب خداوندی حاصل کرنا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ الوسیلہ کے اس معنی میں ان ائمہ مفسرین کو اتفاق ہے کسی ایک کو بھی اس تفسیر میں اختلاف نہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ و رضی عنہم (اس کے ساتھ ساتھ الوسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ منزل بھی ہے جو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے، اذان کے بعد جو دعا پڑھنے کا حکم ہے، اس دعا میں آت محمدن الوسیلۃ سے مراد جنت کا یہی درجہ ہے)

تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی میں ہے۔ وابتغوا الیہ الوسیلہ۔ ای القربۃ بالعمل۔ یعنی الوسیلہ سے مراد عمل سے قربت حاصل کرنا ہے!

علامہ ابن جریر الطبریؒ اور علامہ ابن کثیرؒ و علامہ رازیؒ کی طرح سلف و خلف کے تمام مفسرینؒ "الوسیلہ" کے اس معنی پر اتفاق رکھتے ہیں کہ "الوسیلہ" سے اعمال صالحہ کے ذریعہ تقرب خداوندی حاصل کرنا ہے!

ائمہ سلف میں امام ابن تیمیہؒ نے خاص طور پر مقالہ (الواسطۃ بین الخلق والحق) اپنے دیگر رسائل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالہ کے تحریر کرنے کا سبب یہی تھا کہ دو شخص آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا، خدا اور بندہ کے درمیان کوئی وسیلہ یا واسطہ ضروری ہے اور دوسرا اس کے خلاف تھا۔ چنانچہ یہ مسئلہ امام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ امام ابن تیمیہؒ کے جواب کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:-

"اگر اس شخص کی مراد یہ ہے کہ خدا اور بندہ کے درمیان کوئی واسطہ ضرور ہونا چاہیئے، جس سے بندوں کو یہ معلوم ہو کہ خدا کن اعمال سے خوش ہوتا ہے اور کن اعمال کو پسند فرما کر اپنے فرمانبردار بندوں پر انعام و رحمت کی بارش کرتا ہے اور کن نافرمانیوں اور بداعمالیوں سے بندے عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ نیز اللہ کی ذات و الاصفات کو کیا کیا نام زیبا اور شایان شان ہیں۔ ان تمام امور کی معرفت ادراک سے عقل انسانی عاجز و درماندہ ہے، اس لئے کسی ذریعہ یا واسطہ کی ضرورت پیش آتی ہے، چنانچہ اس"

قادرِ مطلق نے ہر دور میں اپنے رسول یعنی فرستادہ بندے دنیا میں بھیجے اور اس کے رسولوں پر ایمان لا کر عمل کرنے والے بلاشبہ راہِ ہدایت پر ہیں۔

واما سؤال السائل عن القطب او الغوث والفرد فهذا قد يقوله طوائف من الناس ويفسّرونه بامور باطلة فی دین الاسلام مثل تفسیر بعضهم ان الغوث هو الذی یکون مدد الخلائق بواسطة فی نصرهم ورزقهم فهذا اجنس قول النصاری فی المسیح بن مریم علیهما السلام والغالیة فی علی رضی الله تعالیٰ عنه فهذا اکفر صریح ......

دوسرے سائل کا یہ سوال کہ آیا کسی غوث، قطب اور فرد کے بغیر بھی خدا تک رسائی ممکن ہے، تو یہ چیز اب عام ہو گئی ہے، بعض لوگ اس طرح بے بنیاد اور باطل امور کو اسلام کا جزو بنائے ہیں بعض لوگ غوث کو ایسی طاقت مانتے ہیں جس کی وساطت سے امداد خلائق ہوتی ہے اور یہ وہی غلو ہے جس نے ابن مریمؑ کو ابن اللہ بنا دیا۔ اور اس غلو سے حضرت علیؓ کو بھی نصیریوں نے یزدانی طاقتیں دے رکھی ہیں۔ نعوذ باللہ! یہ سراسر کفر ہے۔

ومن انکر هٰذا بن فهو مرتد کافر۔ اور جس نے توسل کے ان دو معانی سے انکار کیا وہ کافر ہے[1]! (اس بارے میں تفصیل کر دی گئی ہے)

من جعل بینه وبین الله الوسائط یتوکل علیهم ویدعوهم ویسألهم کفر اجماعاً۔

یعنی جس نے اپنے اور خدا کے درمیان کسی کو ذریعہ بنا کر اس پر بھروسہ کیا، اس کو پکارا اور اس سے حاجت طلب کی تو اُس نے بالاجماع کفر کیا۔ (الجواب الکافی)

حضرت قتادہ نے فرمایا کہ خدا کی اطاعت اور اُس کی مرضی کے مطابق اعمال سے اس کا قرب حاصل کرو۔ ابن زیدؒ نے یہی آیت تلاوت فرمائی تھی! (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

فیطلبون القرب من الله بالاخلاص وطاعة فیما یرضیه، وترک ما نهاهم عنه واعظم القرب التوحید الذی بعث الله به انبیائه ورسله واوجب علیهم العمل به والدعوة الیه۔ وهو الذی یقربهم الی الله۔ ومن التوسل الیه باسمائه وصفاته کما قال تعالیٰ ولله الاسماء الحسنیٰ فادعوه بها وکما ورد فی الاذکار المأثورة ۔ من التوسل بها فی الدعوات اللّٰهم انی اسئلک بان لک الحمد وغیر ذالک من الاعمال الصالحة الخالصة التی لا یشوبه الشرک فالتوسل الی الله بما یحبه ویرضاه لا بما یکرهه ویاباه من الشرک الذی نزه به نفسه عنه بقوله سبحٰن الله عما یشرکون)

قربِ خداوندی اخلاص، طاعت اور ایسے اعمال سے مانگتے ہیں جن سے وہ راضی اور خوش ہو نہ کہ ایسے اعمال جن سے اُس نے منع فرمایا ہے۔ اور خدا سے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی وحدانیت کا اقرار ہے کہ اُس نے

---

[1] اعمالِ صالحہ اور حضورِ اقدس کا روزِ محشر میں وسیلۂ شفاعت!

اس پیغام کے ساتھ اپنے انبیاء اور رسولوں کو بھیجا، اس کا اُن کو حکم دیا اور یہی وہ ذریعہ ہے جو اُن کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ توسل کی ایک شکل یہ ہے کہ اس کو اُس کے ناموں اور صفات کے وسیلہ سے پکارو۔ یہی اس نے حکم دیا ہے اور جیسا کہ بعض ادعیہ ماثورہ میں ہے کہ اللھم انی اسئلک بان لک الحمد (اس دعا میں خدا کے سامنے اس کی تعریف کا وسیلہ لیا گیا ہے) اس کے علاوہ خدا سے قرب کا ذریعہ وہ نیک اعمال ہیں جو خالص اللہ کے لئے کئے گئے ہوں اور جن میں شرک کا شائبہ نہ ہو!

خدا کا قرب ان ہی اعمال سے حاصل کیا جا سکتا ہے، جن سے وہ راضی اور خوش ہو نہ کہ جن سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہو۔ خاص طور پر شرک، جس سے اُس نے اپنی ذات کو پاک رکھا ہے (سبحان اللہ عما یشرکون)

نہ صرف مفسرین وائمہ کرام بلکہ مزاج شناس رسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی قرآن کریم کے معانی میں انتہائی محتاط اور باریک بینی سے کام لیتے تھے۔ اس کے باوجود فرماتے ہیں۔ ای سماء تظلنی وای ارض تقلنی اذا قلت فی کتاب اللہ مالا اعلم۔" کونسا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کونسی زمین مجھے پناہ دے گی اگر میں کتاب اللہ سے وہ معنی بیان کروں جو میں نہیں جانتا" اور ان اہل بدعت کی یہ جرأت کہ کتاب اللہ کو اپنی خواہشات کا تابع بنانا چاہتے ہیں!

تفاسیر اور اقوال ائمہ سے یہ بات آفتاب کی طرح روشن اور ثابت ہے کہ الوسیلہ کا جو لفظ قرآن پاک میں آیا ہے، اُس سے مراد" اعمال صالحہ" کے ذریعہ قرب خداوندی حاصل کرکے اُس کی رحمتوں کا سزاوار بننا ہے۔ اہل بدعت الوسیلہ سے جو یہ مراد لیتے ہیں کہ کسی ولی، قطب اور پیر کو قرب خداوندی کا ذریعہ بنایا جائے یا مشکل کشا اور حاجت روا مانا جائے تو یہ اُن کی اختراع نفس اور بدترین قسم کی" تفسیر بالرائے" ہے۔ جس سے ایک طرف تو اس آیت کی معنوی تحریف ہوتی ہے اور دوسری طرف شرک و بدعت کے لئے میدان ہموار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان فتنوں سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے (آمین)

"الوسیلہ" قرآن کی روشنی میں

اہل بدعت ایک طرف اگر صرف اس ایک آیت وابتغوا الیہ الوسیلہ کا بزعم خود سہارا لے کر اور قرآن کریم میں معنوی تحریف کرنے کے بعد کسی ولی، قطب یا شہید کی ذات مراد لیتے ہیں، جس سے لامحالہ شرک فی الذات والصفات (باری تعالیٰ)، قبر پرستی و پیر پرستی کی راہیں کھلتی ہیں اور غیر اللہ کی نذر و نیاز، عرس، مزامیر اور مشرکانہ اشعار سے محفل سماع کا موقع ملتا ہے تو دوسری طرف سارے کا سارا قرآن کریم ہے، جس کی شان نزول ہی شرک و بدعات کا قلع قمع کرنا اور بندوں کا صرف خدا سے عابد و معبود کی حیثیت سے رشتہ قائم کرنا ہے۔ بعثت نبوی ہے کہ آپؐ کی ساری زندگی شرک و بدعات کے خلاف دعوت و تبلیغ سے اقوال و اعمال سے، سیرت و کردار سے، جہاد میں گزری ——

ولقد ارسلنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔ اس" طاغوت" سے مراد صرف پتھر کے صنم ہی نہیں بلکہ ہر وہ شے یا ذات ہے جس کو رب العالمین کے سوا معبود مان لیا گیا ہو!

کیا" الوسیلہ" سے اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ توحید کے پرستار ایک بار پھر ہزارہا " پرستیوں" میں مبتلا ہو گئے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں سے خراج وصول کرنے والے بزرگوں کی قبروں کی آمدنی پر جی رہے ہیں، لات و منات کی جگہ مقبروں اور تعزیوں نے لے لی ہے اور ان عقائد کے حامیوں کے اعمال و کردار میں، اقوال و گفتار میں زمانۂ جاہلیت کے

مشرکین سے کس درجہ شرمناک مشابہت پائی جاتی ہے!

زمانۂ جاہلیت کے مشرکین بھی ذات باری تعالیٰ کے منکر نہ تھے، لئن سألتھم من خلق السموات والارض لیقولن اللہ اور وہ بتوں کو قرب خداوندی کا وسیلہ بنا کر اُن کی پرستش کرتے تھے۔ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔ موجودہ دور میں قبر پرستی اور پیر پرستی کے لئے اہل بدعت بھی یہی غرض بتلاتے ہیں۔

اہل بدعت کی اس غلط فہمی کا ازالہ تو خود قرآن کریم ہی کی آیات سے ہو جاتا ہے:۔

(الف) وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غٰفِلُوْنَ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَھُمْ اَعْدَآءً وَّکَانُوْا بِعِبَادَتِھِمْ کٰفِرِیْنَ! (الاحقاف)

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو پکارے اللہ کے سوا کسی ایسے کو کہ نہ پہنچے اُس کی پکار کو روز قیامت تک۔ اور اُن کو خبر نہیں اُن کے پکارنے کی۔ اور جب لوگ جمع ہوں گے، تو اِن کے پوجنے کے سبب اُن کے وہ دشمن ہوں گے!

(ب) قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا (الرعد)

کہہ، پھر کیا تم نے بنا رکھے ہیں اس (یعنی اللہ تعالیٰ) کے سوا ایسے حمایتی جو مالک نہیں اپنے بھلے بُرے کے!

(ج) لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَھُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاہُ وَمَا ھُوَ بِبَالِغِہٖ وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (الرعد)

اُسی کو پکارنا سچ ہے، اور جن لوگوں کو پکارتے ہیں اُس کے سوا، وہ کام نہیں آتے اُن کے کچھ بھی! مگر جیسے کسی نے اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ اُس کے مُنہ تک آ پہنچے اور وہ کبھی نہ پہنچے گا اُس تک۔ جتنا پکارنا ہے کافروں کا وہ سب گمراہی ہے!

(د) ذالکم اللہ ربکم لہ الملک والذین تدعون من دونہ فلا یملکون کشف الضر عنکم ولا تحویلا اولٰئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلہ ایھم اقرب ویرجون رحمتہ ویخافون عذابہ ان عذاب ربک کان محذورا۔

الوسیلہ کے اس غلط مفہوم کے خلاف سارا قرآن کریم موجود ہے!

بفرض محال اگر "الوسیلہ" کا یہی مفہوم جائز، روا اور حقیقی ہوتا تو کوئی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی ولی، قطب، غوث کی ذات کو افضل وارفع قرار نہیں دے گا۔ اور نہ کوئی انسان خدا کے نزدیک آپؐ سے بڑھ کر معزز و مقرب اور محبوب ہو سکتا ہے۔ لہذا دنیا میں یہ مرتبۂ بلند اگر کسی کو ملتا تو وہ صرف محمد بن عبداللہ علیہ السلام ہی کی ذات گرامی ہوتی۔ لیکن ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

(س) ۱۔ قل لا املک لکم ضراً ولا رشداً قل انی لن یجیرنی من اللہ احدٌ ولن اجد من دونہ ملتحداً۔

۲۔ قل لا اقول لکم عندی خزائن الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ۔

۳۔ لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسّنی السوء۔

۴۔ قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ انما الٰھکم الٰہ واحد فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحاً ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً۔

(۱) تو کہہ میرے اختیار میں نہیں تمہارا برا اور نہ راہ پر لانا، تو کہہ مجھ کو نہ بچائیگا اللہ کے ہاتھ سے کوئی اور نہ پاؤں گا اس کے سوا کہیں سرک رہنے کو جگہ!

(۲) میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اسکی اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے!

(۳) اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی برائی نہ پہنچتی!

(۴) کہہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم۔ حکم آتا ہے مجھ کو کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے۔ تو پھر جس کو امید ہو اپنے رب سے ملنے کی، سو وہ کرے نیک کام اور شریک نہ کرے اپنے رب کی بندگی میں کسی کو۔ (کہف، آخری رکوع)

ان آیات کی روشنی میں سرور کائنات و فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات و محبوب رب العالمین کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں (آخری آیت میں آپؐ کی بشریت، توحید باری تعالیٰ کی دعوت اور اعمال صالحہ کی تلقین و شرک فی العبادت سے پرہیز کا اظہار ہے) تو پھر کس پیر، قطب اور ولی کی کیا ہستی ہے جو کسی کی مشکل کشائی یا حاجت روائی کر سکیں؟؟

تقرب و محبوبیت، افضلیت و اکملیت کے باوصف آپؐ کے عمل و خوف کا یہ عالم احتیاط و فروتنی کی یہ حالت کہ اگر کہیں کسی مقام پر بھی ربوبیت سے رسالت کی حدود کا ٹکراؤ دیکھ پائیں تو خشیت الٰہی سے لرز کر فرمائیں!

اجعلتنی للہ نداً؟ لا تقولوا ما شاء اللہ وشاء محمد بل قولوا ما شاء اللہ وحدہٗ!

یعنی ایک شخص کے یہ کہنے پر کہ "اللہ چاہیں اور آپ چاہیں" حضورؐ نے عتاب کا اظہار فرمایا اور کہا کہ کیا تم نے مجھے خدا کا شریک بنا دیا؟ یوں مت کہو کہ "جو اللہ اور محمدؐ چاہے" بلکہ یوں کہو کہ "جو اللہ تعالیٰ تنہا چاہے!

ایک متوازن سے متوازن انسان بھی اپنی تعریف سن کر خوش ضرور ہوتا ہے۔ خواہ زبان سے اظہار نہ کرے۔ لیکن رحمۃ للعالمینؐ کا یہ تقویٰ کہ اگر آپؐ کو جان نثاران توحید انت سیدنا کہیں تو فرمائیں بل السید ھو اللہ۔ گویا رسالت کی حد تک تو اپنی عظمت و تعریف برداشت ہے۔ ورنہ شرک فی الصفات کے خوف سے اتنا غلو بھی گوارا نہیں!

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ المسیح بن مریم علیہما السلام انما انا عبدہٗ ورسولہٗ!

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا سالت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ۔ (المشکوٰۃ)

تم کو کچھ بھی مانگنا ہو خدا سے مانگو اور جب بھی مدد چاہنا ہو تو خدا ہی سے مدد چاہو!

اس لئے کہ خدا کے سوا کسی کو بھی مشکل کشا یا حاجت روا سمجھنا خدا کی خدائی میں اس کو شریک کرنا ہے۔ اور ان الشرک لظلم عظیم کے ساتھ ساتھ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک، ایک اٹل فیصلہ ربانی ہے۔ اس "ذنب لا یغفر" سے بچنے کے لئے شرک کی بعید تر مشابہت سے بھی اجتناب کرنا چاہیئے کہ یہی

ایمان اور توحید کا تقاضا ہے!

اس طرح اگر کسی کے مزار پر عرس منانے، چراغاں کرنے اور نذر ونیاز کی اجازت ہوتی، تو اس کے لئے بھی صرف حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا روضۂ اقدس ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ فتنۂ قبور کی خطرناکی اور غلو فی الانبیاء والصالحین کے نتائج حضور کے پیش نظر تھے اس لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آپ نے تاکید فرمائی کہ "لا تجعلوا قبری عیداً" "میری قبر کو عید (میلہ) نہ بنا لینا!"

انہی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے آپ نے یہ دعا فرمائی۔ "اللّٰھم لا تجعل قبری وثناً یعبد" "الٰہی میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی پرستش کی جائے۔" "وثن" کا معنوی اطلاق ہر اس شے پر ہو سکتا ہے جسے خدا کے سوا معبود بنا لیا جائے۔ حضور نے صحابہ کرام سے فرمایا:-

ایاکم والغلو فانما اھلک من کان قبلکم الغلو۔ (الحدیث)

خبردار! غلو سے ہمیشہ بچنا اس لئے کہ تم سے قبل جو لوگ تھے وہ اس غلو سے تباہ کئے گئے!

آج نافرمانی کا یہ عالم ہے کہ ہماری نظروں سے ایسے اشعار بھی گزرتے ہیں جن کی نقل سے بھی ہاتھ لرزتے ہیں ؎

ہمارے سرورِ عالم کا رتبہ کوئی کیا جانے خدا سے ملنا جو چاہے محمدؐ کو خدا جانے

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

نعوذ باللہ من ذالک! اس مشرکانہ ذہنیت کے لوگوں کی اس مبالغہ آمیزی سے خود سرورِ کائنات کی روحِ پاک کو کس قدر اذیت ہوگی۔ "ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبینا" ——— لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم المسیح ؑ کی نافرمانی کے لئے اس سے بڑی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس غلو فی الانبیاء نے عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ اور عزیر علیہ السلام کو بھی خدا کا بیٹا بنا کر نصاریٰ اور یہود کو قہر الٰہی کی نذر کیا اور یہی غلو مسلمانوں کو بھی تباہی کے گڑھے کی طرف لے جا رہا ہے!

"وسیلہ" کا یہی مفہوم اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی لیا کرتے تو وہ بھی تقویٰ، صالحیت، عبادات، سب چھوڑ کر حضور اقدس ہی کی ذات گرامی کو قربِ خداوندی کا ذریعہ بنا لیتے۔ اور روضۂ اقدس کی مجاوری ان کا پیشہ ہوتا۔ لیکن آثارِ صحابہؓ میں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ ان مقدس ہستیوں کے اتقاء اور اتباعِ سنت پر سختی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ نے وہ درخت ہی کٹوا دیا جس کے سایہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعتِ صلح حدیبیہ لی تھی۔ اس میں محض شرک کا خوف کار فرما تھا۔ اس لئے کہ بعض لوگ قصداً اس درخت کے سایہ میں نماز پڑھنے جانے لگے تھے ——— !

معرور بن سُوید فرماتے ہیں۔ "میں نے ایک بار حضرت عمرؓ کے ساتھ مکہ کے راستہ میں صبح کی نماز پڑھی۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک طرف جا رہے ہیں۔ دریافت فرمایا۔ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ عرض کیا گیا۔ یا امیر المومنین! یہاں ایک مسجد ہے، جہاں رسول اللہ نے نماز پڑھی تھی۔ یہ لوگ بھی وہاں نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:-

وانما ھلک من کان قبلکم بمثل ھذا یتبعون آثار انبیائھم ویتخذونھا کنائس و بیعاً۔!

تم سے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہوئے کہ اپنے انبیاء کے آثار کی بھی اتباع کرتے تھے حتیٰ کہ ان کو عبادت گاہ (کلیسا اور معبد یہود) بنا کر چھوڑا ہے!

ایک بار حضرت عمرؓ نے بھرے مجمع میں دعا فرمائی:۔

اللّٰھم انا کنا اذا اجدبنا توسلنا بنبینا فتسقینا وانا نتوسل لعم نبینا فاسقنا فیسقون (بخاری)

الٰہی! پہلے جب قحط پڑتا تھا تو ہم اپنے نبی کے توسل سے پانی مانگتے تھے اور تو ہمیں سیراب کردیا کرتا تھا۔
اب ہم اپنے نبی کے عم محترم (عباس بن عبدالمطلبؓ) کے توسل سے پانی مانگتے ہیں تو انہیں سیراب کر!
چنانچہ بارش ہوگئی۔ (بخاری)

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نبی کریمؐ کی حیات طیبہ میں تو صحابہ کرام نے آپؐ کا وسیلہ لیا، مگر بعد وفات نہیں لیا۔
اس کی تائید میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

" اللہ سے کسی کا وسیلہ لینا جائز نہیں۔ اس کو اس کے نام و صفات سے پکارو۔ بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ الٰہی بحق فلاں نبی یا فلاں فرشتہ میری حاجت روائی کر" (درمختار۔)

خانوادۂ نبوی کے چشم و چراغ سیدنا زین العابدین (حسن بن حسینؓ) نے ایک شخص کو دعا و سلام کی غرض سے قبر اقدس کے پاس جانے سے منع فرما دیا اور کہا:۔

الا احدثکم حدیثا سمعتہ عن ابی عن جدی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتجعلوا قبری عیدا۔ ولا تجعلوا بیوتکم قبورا فصلاتکم تبلغنی حیث کنتم!
کہ مجھ سے میرے پدر بزرگوار نے جد محترم سے روایت کی ہوئی حدیث بیان کی ہے۔ کیا میں تمہیں نہ بتا دوں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ میری قبر کو میلہ نہ بناؤ۔ اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ تمہارا درود و سلام تم جہاں بھی رہو، مجھے پہنچتا رہے گا!

دراصل زمانۂ جاہلیت میں غلو فی الانبیاء و الصالحین نے بت پرستی اور قبر پرستی عام کی تھی اور یہی غلو فی الاولیاء والصالحین آج بھی بعض مسلمانوں کو گمراہی کی طرف لے جا رہا ہے!

" الوسیلہ" کا مفہوم اور اولیاء اللہ!

ہم نے جن اولیاء کرام کے نام سنے اور تصانیف دیکھی ہیں، اُن میں سے کسی ایک نے بھی "الوسیلہ" کا یہ مفہوم لے کر شرک و بدعت کا دروازہ نہیں کھولا اور نہ وہ مقدس بزرگ ان اہل بدعت کے ذمہ دار ہیں۔ فتح الغیب میں شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں:۔

" اپنی تمام حاجتیں اللہ کے حضور پیش کرو اور تمام خلقت سے منہ موڑ کر اُس کے آگے جھک جاؤ۔ اپنے دلوں کو غیر اللہ سے پاک رکھو اور اس کے سوا کسی سے نفع نقصان کی امید نہ رکھو" (الفتح الربانی)

اس کے علاوہ غنیۃ الطالبین شیخ جیلانی کی مشہور کتاب ہے، اس میں بھی بدعتوں سے احتراز کی سخت تاکید پائی جاتی ہے!

شاہ ولی اللہ دہلوی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کے یہاں بھی ولایت و بیعت کا سلسلہ جاری تھا۔
آپ فرماتے ہیں:۔

"مشرکین مکہ بتوں کو روحوں کی توجہ کا مرکز قرار دیتے تھے اور آج مسلمان قبروں کو سمجھتے ہیں۔" (فوز الکبیر)

"انبیاء و اولیاء ہمہ بندگانِ خدا اند مطلقاً تصرفے در کارخانہ جات الٰہی نہ دارند نہ در حیات نہ بعد ممات۔" (البلاغ المبین)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں:۔

"رفع شر یا دفع بلا کے لئے غیر اللہ کو پکارنا اور اُن کو صاحبِ اختیار سمجھنا شرک ہے (تفسیر عزیزی)

"استغاثة المخلوق بالمخلوق کاستغاثة المسجون بالمسجون" (بایزید بسطامیؒ)

"استمداد و استعانت از اہلِ قبور بہر نہج کہ باشد جائز نیست۔" (فتاویٰ)

"انبیاء اولیاء کی قبروں کو سجدہ کرنا، طواف کرنا، اُن سے مراد مانگنا، نذر و نیاز کرنا، یہ سب ناجائز حرام و ناجائز ہے۔" (مالابدمنہ)

منهم الذين يدعون الانبياء والاولياء عند الحوائج والمصائب باعتقاد ان ارواحهم حاضرة تسمع النداء وتعلم الحوائج وذالك شرك قبيح وجهل صريح قال الله تعالىٰ ومن اضل ممن يدعوا من دون الله! (تیسیر بحوالہ فاران)

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد سلطان العارفین قاضی حمید الدین ناگوری فرماتے ہیں

"وہ لوگ جو انبیاء اور اولیاء کو حاجتوں اور مصائب میں اس اعتقاد کے ساتھ پکارتے ہیں کہ اُن کی روحیں حاضر ہوتی ہیں اور پکارنے والوں کی ندا سنتی ہیں، اُن کی حاجتیں جانتی ہیں، تو یہ شرکِ قبیح اور جہلِ صریح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں، اُن سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا ؟"

اسی طرح دیگر اولیاء اللہ نے شرک فی الذات والصفات باری تعالیٰ کو حرام قرار دیا ہے اور اُن کے اقوال و اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے ہمیشہ قرآن و سنت کو اپنا لائحہ عمل بنایا اور ردِّ شرک و بدعت کے ساتھ توحید کی علمبرداری کرتے ہوئے اُن کی ساری کی ساری زندگیاں عبادت، تقویٰ، اور ریاضت سے تزکیہ نفس میں گزر گئیں۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین)

معلوم یہ ہوا کہ "توسیلہ" کا غلط مفہوم لے کر اُن مشرکانہ رسوم کو اولیاء اللہ کی خوشنودی کے لئے ادا کرنا ان مقدس ہستیوں پر سراسر تہمت جوڑنا ہے، بلاشبہ ان صالحین کی ارواح کو بھی اس یاوہ سرائی سے اذیت ہوتی ہوگی کہ:۔

بہ گرداب بلا افتاد کشتی — مدد کن یا معین الدین چشتی

حقیقت میں دیکھو تو خواجہ خدا ہے — ہمیں در پہ خواجہ کے سجدہ روا ہے

شیئاً للہ چوں گدائے مستمند — المدد خواہم ز خواجہ نقشبند !!

نعوذ باللہ من هذه الخرافات ونستغفره !

قرآن پاک کی یہ آیت کس طرح دوٹوک فیصلہ کرتی ہے۔

واذا سئلک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان ـــ!

یعنی اے پیغمبر! جب میرا کوئی بندہ تم سے میرے متعلق دریافت کرے کہ (وہ کیونکر مجھ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے) تو تم اس کو بتا دو کہ میں تو اس کے پاس ہی ہوں (دور نہیں کہ رسائی کے لئے کسی ذریعہ اور مشقت کی ضرورت ہو) اور میں اس کی پکارسُن کر قبول کرتا ہوں۔

اس آیت کے بعد غیر اللہ سے استمداد، استعانت اور استغاثہ کے لئے کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ یہ وہ اقرار ہے جو خدا اور بندے کے درمیان خالق و مخلوق اور حاکم و محکوم کا رشتہ قائم کر دیتا ہے۔ یہ وہ تعلق ہے جو "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کہتے ہی صرف ایک ذات کو استعانت و استمداد کا مستحق اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے غیر اللہ کے خوف اور بندگی کا طوق انسانیت کی گردن سے اتار دیتا ہے۔ اور اس حقیقت کے ادراک کے بعد ہی ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین کا صحیح لطف آتا ہے ـــ!

اس سے بڑھ کر ناشکری اور ظلم کیا ہوگا کہ اس قادر مطلق کے ساتھ اس کے بندوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھہرایا جائے۔ حالانکہ کیف تحکمون ہ قرآن کریم موجود ہے اور انسان عقل سے بھی محروم نہیں ہوا ہے۔ اگر متاع ہوش و خرد بھی غیر اللہ کی نذر نہ کی گئی ہو تو "اجیب دعوۃ الداع اذا دعان" کی تمثیل قرآن کریم میں نظر آتی ہے۔

ونوحاً اذ نادیٰ من قبل فاستجبنا لہٗ فنجیناہ واھلہ من الکرب العظیم۔ ایوب اذ نادیٰ ربہٗ انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین فاستجبنا لہ فکشفنا ما بہ من ضر۔ الخ

وذالنون اذ ذھب مغاضباً۔ الخ

ان انبیاء کی مثالوں سے اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کو پکارنے والوں پر حجت تمام کر دی ہے۔

الا ان للہ من فی السموات ومن فی الارض وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء، ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون ہ

یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ تمام ہستیاں جو زمین و آسمان میں ہیں، سب اللہ ہی کی تابعدار اور فرمانبردار ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا (اپنے بنائے ہوئے) معبودوں کو پکارتے ہیں، تم جانتے ہو وہ کس کی پیروی کرتے ہیں (یقین و بصیرت کی نہیں) وہ تو محض وہم و گمان کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں، کہہ دو (ہر بات میں) اپنی اٹکلیں دوڑاتے پھرتے ہیں!

وما بعد الحق الا الضلال۔ حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟

عالم اسلامی میں آج کتنے مسلمان ایسے ہیں جو کلمۂ حق لا الٰہ الا اللہ کے عملی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہوں، کوئی پیر پرستی میں مبتلا ہے، تو کوئی نجومیوں اور اشتہاری پامستوں کے ہاتھوں توہم پرستی سے ایمان فروشی کر رہا ہے، کسی کو مفاد پرستی سے فرصت نہیں، تو کوئی اقتدار کے نشے میں نفس پرستی کر رہا ہے اور موجودہ دور کا سب سے بڑا فتنہ یہی ہے!

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا !!

مولوی محمد مجیب اللہ ندوی

عقیدت کا غلو اور اُس کے نتائج

ماہر صاحب نے میرے لئے جو موضوع منتخب کیا ہے، وہ بہت نازک بھی ہے اور وسیع بھی۔ اس پر لکھنے کے لئے وسعتِ علم اور دقتِ فکر کے ساتھ پختہ اور مشاق قلم کی بھی ضرورت تھی اور ان میں سے کوئی چیز راقم کو معیارِ مطلوب کے مطابق حاصل نہیں ہے، مگر اپنی کم بضاعتی کے باوجود دو وجہ سے اس پر لکھنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ایک تو اس لئے کہ شاید اس کے ذریعہ کچھ بندگانِ خدا کی ذہنی اور عملی اصلاح ہو جائے اور یہ چیز قیامت میں میرے لئے کچھ اجر و ثواب کا سبب بن جائے دوسرے اس موضوع سے کچھ طبعی مناسبت بھی ہے۔

اس مناسبت کی وجہ یہ ہے کہ راقم کی تعلیم و تربیت جن بزرگوں کے ہاتھوں میں رہی، اُن میں سے کسی نے بھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ دین کا کوئی مسئلہ میں اُن کی شخصیت کے گرد سمجھوں۔ یا محض اُن کی تقلید کی بناء پر اُسے مان لوں۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ اصل ماخذ کی طرف رہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن، سنت، اور اسوۂ صحابہ میں جن باتوں کا سراغ نہیں ملتا، اُن کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی اور اُن سے نفرت ہوتی ہے، خواہ ظاہری طور پر اُن کے اوپر دین کے کتنے موٹے پردے کیوں نہ ڈال دیئے گئے ہوں۔ اور وہ باتیں کتنے ہی بڑے شخص کی طرف کیوں نہ منصوب ہوں — !

اُردو زبان میں عقیدت اُس غیر معمولی محبت اور دل کے لگاؤ اور جھکاؤ کو کہتے ہیں جو کسی چیز یا کسی انسان کی عظمت و محبت کے نتیجہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ کی اصل "عقد" ہے۔ جس کے معنی کسی کو چیز کو کسی کے ساتھ باندھ دینے یا وابستہ کر دینے کے ہیں۔

اسلامی شریعت میں خریدار اور دکاندار آپس میں خرید و فروخت کا جو معاملہ کرتے ہیں، اس کو عقدِ بیع کہا جاتا ہے۔ یعنی دونوں اس کے ذریعہ ایک دوسرے سے بندھ جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک مرد اور ایک عورت نکاح کے ذریعہ باہم زندگی گزارنے کا جو عہد کرتے ہیں، اُس کو عقدِ نکاح کہا جاتا ہے۔ گویا دونوں اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ ہم آپس میں بندھ گئے اور ایک دوسرے کے پابند رہیں گے!

اسی سے عقیدہ کا لفظ نکلا ہے، جو آدمی کے دل کو کسی خیال یا کسی حقیقت پر باندھ دیتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اُردو میں یہ لفظ عربی کے اصل معنی میں کچھ مزید اضافہ کے ساتھ بولا جاتا ہے!

مذہبی تاریخ کی یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جب بھی انسان کو کسی ممتاز انسان یا کسی دوسری مخلوق کے ساتھ عقیدت پیدا ہوئی ہے تو اُس نے انسان کو انسان یا اس مخلوق کو مخلوق نہیں رہنے دیا ہے، بلکہ اُس نے خالق کے صفات

میں سے کسی نہ کسی صفت میں اُسے ضرور شریک کرلیا ہے۔ الوہیت میں تو شرک کسی زمانہ میں نہیں رہا۔ مگر صفات الٰہی یا ربوبیت کا جامہ ہمیشہ اُس نے ممتاز مخلوقات کو پہنانے کی کوشش کی ہے۔ عرب کی بُت پرستی، عجم کی ثنویت، عیسائیوں کی تثلیث اور ہندوؤں کی اجرام و اصنام پرستی، سب میں آپ کو یہی عظمت و عقیدت اور محبت کا غلو کارفرما نظر آئے گا۔ یہی عظمت کا مُفرط احساس ہے جو آنحضرتؐ کو (معاذ اللہ) سے

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر — اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفٰےؐ ہو کر

کہتی ہے۔ اور یہی عقیدت کا غلو ہے جو رسول اللہ کو اللہ تعالیٰ سے بھی آگے بڑھا دیتی ہے۔ سے

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے — جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے (توبہ!)

یہ عقیدت کیوں اور کیسے پیدا ہوتی ہے اور پھر یہ کیسے گمراہی اور اس کے بعد شرک کی صورت اختیار کر لیتی ہے؟ یوں تو اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کے دو خاص سبب کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے:۔

۱۔ ایک محبت میں غلو۔!

۲۔ دوسرے عظمت میں غلو!

محبت آدمی کو شرک فی العمل میں مبتلا کرتی ہے اور عظمت شرک فی الربوبیت کی طرف لے جاتی ہے۔ غیر اللہ کی محبت و عظمت ابتدا میں شرک نہیں ہوتی مگر اس کے غلو کا نتیجہ ہمیشہ شرک ہی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے!

ابتدا میں جب انسان کے دل میں اجرام سماوی کی عظمت پیدا ہوئی تو وہ یک بیک اُن کے آگے سربسجود نہیں ہو گیا۔ بلکہ ایسا آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوا۔ اسی طرح انسان جب کسی ممتاز انسان سے محبت کرتا ہے اور اس کی عظمت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، تو ابتدا میں اُس سے اپنی نیازمندی کا اظہار کرتا ہے، پھر دل میں اُس کے خدا کا مقرب اور محبوب ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے، اب وہ اُس کی مرضی کو خدا کی مرضی اور اُس کے حکم کو خدا کا حکم سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اُس میں مزید غلو پیدا ہوتا ہے اور اب اس کو وہ مظہر الٰہی تصور کرنے لگتا ہے۔ اب اس مرحلہ پر آکر خدا کا یقین اُس کے دل سے یا تو نکل جاتا ہے یا اگر ہوتا ہے تو وہ یقین اس کے لئے محرکِ عمل نہیں بنتا۔ عملاً وہ خدا کو انگلستان کے بادشاہ سے زیادہ با اختیار نہیں سمجھتا۔ وہ اُس کی مرضی چاہتا تو ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ اس بارگاہ میں ہم بغیر ان واسطوں اور ذریعوں اور مظاہر کے نہیں پہنچ سکتے۔!

چنانچہ اب وہ اپنی ساری نیازمندیاں انہی بے دست و پا واسطوں اور بے قوت ذریعوں کی خوشنودی کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اس کے دل میں اب انہی کا خوف ہوتا ہے اور اُن ہی سے ساری امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ ان کو نفع و نقصان کا مالک سمجھتا ہے۔ اس لئے اُن سے دعائیں کرتا ہے، اُن کے آستانوں اور قبروں پر نذر و نیاز پیش کرتا ہے، اس لئے کہ اُن کے ذریعہ وہ خدا کی مرضی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ غرض یہ کہ تعبد و تذلل اور دعا و طمع کا جو حق صرف خالق کے ساتھ مخصوص ہے، اس کا مظاہرہ مخلوق کے ساتھ کیا جاتا ہے!

آج ہندو قوم اپنے دیوتاؤں رامؔ اور کرشن جی کی تصویروں اور شبیہوں کے ساتھ جو معاملہ کر رہی ہے، وہ عظمت پرستی اور غیر معمولی محبت کے نتائج ہیں۔

اہلِ فارس میں ثنویت اس لئے رواج پا گئی کہ انہوں نے اسباب کو مسبب کا درجہ دے دیا۔

عیسائیوں کی تثلیث، عظمت پرستی اور محبت میں غلو کا نہایت روشن ثبوت ہے۔ وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی شبیہوں کے ساتھ جس نیاز مندی کا اظہار کرتے ہیں، اس میں عقیدت کے غلو کا پورا پورا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ خدا نے ان کو پیار محبت سے روح اللہ کہا تھا۔ انہوں نے ان کو خدا بنا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عبداللہ کی ایسی محبت کو جو خدا کی محبت کے تابع نہ ہو، کسی ممتاز مخلوق کی ایسی عظمت اور تکریم کو جس کے ذریعہ اس کے بارے میں ماورائی تصور پیدا ہو، بالکل ناجائز قرار دیا ہے۔ بلکہ اُس نے اس سلسلہ میں ان منافذ کو بھی بند کر دیا ہے جس کے ذریعہ محبت اور عظمت گمراہی کی راستہ نکال لیا کرتی ہے!

عیسائیوں کے غلو فی المحبت اور غلو فی العظمت کا تذکرہ کر کے قرآن نے بار بار یہ تنبیہ کی:-

"لا تغلوا فی دینکم" دین میں غلو نہ کرو'

مگر اس کے باوجود آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بزرگوں، پیروں، اور اُن کی قبروں کے بارے میں جو تصور رکھتا ہے اور اُن کے سامنے جن اعمال کا مظاہرہ کرتا ہے، یہ سب اسی محبت و عظمت کے نتائج اور عقیدت میں غلو کا براہ راست سبب ہیں —!

مسلمانوں میں یہ چیز کس طرح گھس آئی، اس کی تفصیل کا یہ موقع تو ہے۔ مگر اس کے لئے ایک لمبی فرصت درکار ہے جو حاصل نہیں ہے، اس لئے چند باتیں عرض کر دی جاتی ہیں:-

مسلمانوں میں اجرام سماوی کی عظمت تو کسی زمانہ میں پیدا نہیں ہوئی اور نہ کبھی وہ ان کے آگے سربسجود ہوئے۔ مگر انسانوں کی عظمت و عقیدت نے ان میں بے شمار گمراہیاں اور ضلالتیں پھیلائی ہیں اور جو مسلمان ان گمراہیوں میں مبتلا ہیں۔ اُن کی اکثریت فرائض اسلامی سے غافل اور اُن کی ادائیگی میں کوتاہ ہوتی ہے۔ مگر ان مراسم کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی کوتاہی اور غفلت نہیں برتتی، جو اُس نے ان برگزیدہ ہستیوں کے لئے مخصوص کر لی ہیں۔ شب برات، گیارھویں، رجب کے مراسم وہ ضرور پورے کریں گے، خواہ انھیں قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ وہ عرس اور زیارت کے لئے دہلی، اجمیر، کلیر، ردولی اور پھلواری کے سفر میں سینکڑوں روپے صرف کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔ مگر ادائے زکوٰۃ اور سفر حج کا خیال اُن کو بہت کم آئے گا۔ حتیٰ کہ بعض تو عرس و زیارت کی شرکت کو سفر حج سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ مثال کے لئے ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے:-

> میرے ایک عزیز ایک کارخانہ کے منیجر اور بڑے صاحب دولت ہیں چشتی فریدی سلسلہ میں بیعت ہیں، ہر سال وہ اجمیر تشریف جاتے ہیں اور وہاں کی چھوٹی اور کبھی بڑی دیگ کا خرچ برداشت کرتے ہیں۔ میرے والد مرحوم نے اُن سے ایک دن کہا، آپ پر تو حج فرض ہے۔ آپ ایک سال اجمیر جانے کے بجائے حج ہی کر آتے، انہوں نے ایک آہ سرد بھری اور کہا کہ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ کو ایک واقعہ سنا لوں، انہوں نے اس کے بعد والد کو یہ واقعہ سنایا:-
>
> ایک بزرگ تھے جنہوں نے اپنی حلال کمائی سے بچا بچا کر سفر حج کے لئے کچھ روپیہ جمع کیا۔ جب سفر خرچ کے لئے روپیہ جمع ہو گیا اور انہوں نے سفر کی تیاری شروع کی تو اتفاق

سے روپیہ چوری ہوگیا۔ اُن کو بڑا رنج ہوا۔ مگر چارہ ہی کیا تھا۔ جب حج کا زمانہ ختم ہو گیا
تو کسی دوسرے بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ اِس سال کس کا حج مقبول ہوا ہے، آپ نے
ان صاحبان کا نام لیا جو روپے چوری ہو جانے کی وجہ سے زیارتِ حرمین کے لئے
نہ جا سکے تھے"!

یہ واقعہ بیان کرکے انہوں نے کہا کہ میں ہزاروں روپے اجمیر وغیرہ جاکر خرچ کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ بغیر سفر کئے ہوئے ہی اُن کے طفیل میں میرا حج قبول فرما لے[1] !

یہ محض ایک واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہ واقعہ مسلمانوں کے اس پورے طبقہ کی ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ جن کے دل میں بزرگوں کی عظمت اور اُن کی عقیدت بطور عقیدہ گھر کر چکی ہے، وہ اُن کی خوشنودی کے آگے خدا کی ناراضگی مول لیتے ہیں اور فرائض کو ترک کرکے مباحات ہی نہیں بلکہ مکروہات تک پر عمل کرتے ہیں۔ اور اس کو ثواب سمجھتے ہیں !

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ عیسائیوں کے غلو کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ صوفیاء کی اولاد کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

" اگر خواہی نمونہ ازیں فریق ملاحظہ کنی امروز اولادِ مشائخ و اولیاء تماشا کن کہ در حق آبائے خود چہ ظنون دارند و تا کجا کشیدہ بردہ اند وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"! (تفہیمات الٰہیہ ص۲۳)

اگر اس حلق کا نمونہ دیکھنا ہو تو اولیا و مشائخ کی اولاد کو دیکھو کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں کیا کیا خیالات فاسدہ رکھتے ہیں، اُن کو کس مرتبہ تک پہنچاتے ہیں۔ عنقریب یہ ظالم جانیں گے کہ کس کس کروٹ وہ لوٹائے جاتے ہیں !

شاہ صاحب نے محض مشائخ و صوفیا کی اولاد کا تذکرہ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اُن کے زمانہ میں یہ چیز زیادہ عام ہو۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کی اولاد کے ساتھ اُن کے خلفاء، متوسلین بھی اس عقیدت کے غلو میں شریک ہیں۔

اہلِ تقویٰ اور متبعِ سنّت مشائخ و صلحا کی عزّت و تکریم یقیناً موجبِ ثواب اور اُن کی صحبت باعثِ خیر و برکت ہے۔ مگر ان صلحا کے متوسلین جس انداز سے ان کی عظمت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں، وہ دین میں ایک فتنہ ہے، اس سے پہلے بھی یہ ذہنیت فتنہ بنی ہے اور آج بھی بن رہی ہے !

عام متوسلین کا حال یہ ہوتا ہے کہ مشائخ سے آزادانہ طور پر وہ کوئی سوال نہیں کرتے، یا نہیں کر سکتے۔ حالانکہ صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے تکلف سوال کرتے اور آپؐ جواب عنایت فرماتے تھے ! اُن کا تذکرہ کریں گے تو اُن کے نام کے بجائے القاب و آداب سے خطاب کریں گے، حالانکہ آنحضرتؐ کا تذکرہ بھی ہمیں اُن کے نام کے ساتھ بتایا گیا ہے یہی نہیں بلکہ آپؐ کی عبدیت کا دن میں کئی بار اعادہ بھی کرایا جاتا ہے !

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

اس میں آپؐ کی عبدیت کو رسالت پر مقدم رکھا گیا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ مخلوق کا اصل مقام عبدیت ہو!

[1] خدا کا شکر ہے کہ وہ اب حج کر آئے ہیں اور اپنے اعمال میں بہت کچھ تبدیلی کر لی ہے !

یہ حضرات صحابہؓ کا ذکر، اسلاف کا تذکرہ، اپنے حلقہ کے علاوہ دوسرے حلقہ کے بزرگوں کا ذکر بے تکلف نام لے کر کریں گے، مگر یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ اپنے شیخ کو شیخ، یا مولانا کہہ کر اُن کا نام بھی لے لیں۔ حضرت شیخ، چھوٹے حضرت، بڑے حضرت، اعلیٰ حضرت، یا دلمن کی نسبت سے اُن کو یاد کریں گے۔ بسا اوقات سننے والے کو اس تلمیح کے سمجھنے میں کئی منٹ لگ جاتے ہیں۔ اور کتنے بیچارے، تو سمجھ بھی نہیں پاتے ہوں گے!

ان بزرگوں کے اقوال کو، خواہ وہ کتاب و سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، بطور سنت و حجت پیش کریں گے۔ اس موقع پر اُن کا اسلامی احساس نہ جانے کیوں کُند ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اپنے مشائخ کی عقیدت میں اُن کا احساس انتہائی تیز اور نازک ہوتا ہے۔ رسالہ اور مضمون نگار کا نام یاد نہیں، مگر کچھ دن ہوئے ایک عالم دین نے وطن کی محبّت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ایک بزرگ کا یہ کشف نقل کیا تھا۔

"ایک بزرگ نے ... . اپنا کشف بیان فرمایا کہ گنگا کے پانی میں نورانیت محسوس ہوتی ہے"

مقصد یہ تھا کہ گنگا کی جو عظمت ہندوؤں کے دل میں ہے، اس کا ثبوت بزرگوں کے اقوال سے بھی ملتا ہے، اُن بزرگ نے نہ جانے کس موقع پر اور کن حالات میں یہ بات کہی تھی، یا کہی بھی تھی کہ نہیں۔ اس پر انہوں نے غور نہیں کیا۔ بہرحال اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے، کیا وہ گمراہی کا پیش خیمہ نہیں ہے۔ اگر وہ بزرگ موجود ہوتے تو شاید وہ مضمون نگار کو اس بات پر ضرور ٹوکتے!

اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ایک واقعہ سن لیجئے:-

> اعظم گڑھ میں کچھ لوگوں نے اُردو کی ترویج و اشاعت کا کام شروع کیا اور وہ لوگ مولانا تھانویؒ کے ایک متوسل جو ریٹائرڈ جج ہیں، اُن کے پاس بھی گئے۔ اور اُن سے اس میں مدد کی درخواست کی، انہوں نے پہلے تو خاموشی اختیار کی، اس کے بعد ایک صاحب کو الگ بلا کر لے گئے اور فرمایا:-
>
> "بھائی میری رائے میں اُردو کا کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ زبان کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس لئے کہ اس زبان میں حضرت (یعنی مولانا تھانوی) کی کتابیں ہیں"

قرآن کی زبان کے بارے میں تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مٹ نہیں سکتی، مگر دوسری کسی زبان کے بارے میں یہ بات کہنی یقیناً ذہنی کجی ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ آج اگر مولانا تھانویؒ موجود ہوتے تو وہ اس مبالغہ آمیز توجیہ کا شنتا پسند نہ فرماتے ــــ!

استاذ الاستاذ جناب سید سلیمانؒ ندوی فرماتے تھے کہ ایک بار اُن کی یہ خواہش ہوئی کہ مولانا تھانویؒ کی تفسیر کو آسان زبان میں منتقل کر دیں، تاکہ عام لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اُن کے اس ارادہ کی اطلاع جب مولانا کے ایک ممتاز خلیفہ کو ہوئی تو انہوں نے یہ کہہ کر اس سے سید صاحب کو باز رکھنے کی کوشش کی کہ "مولانا کے یہ الفاظ الہامی ہیں، اس لئے اس میں تبدیلی نہ ہونی چاہیئے"۔[1]

---

[1] سید صاحب نے یہ واقعہ علماء کے ایک مجمع میں بیان کیا تھا۔ اور خود بھی اظہار افسوس کیا تھا!

حاشا وکلا میں نے یہ واقعات بزرگوں کی توہین کے لئے نہیں بلکہ یہ دکھانے کے لئے پیش کئے ہیں کہ عظمت کا غلط تصور آدمی کو کتنی ذہنی گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، اُن کا دامن شرک کی چھینٹوں سے یقیناً پاک ہے۔ مگر اُن کی اس طرح کی بے اعتدالی نہ جانے کتنے اللہ کے بندوں کو شرک تک پہنچا دے گی۔ میرا خیال ہے کہ آج اگر مولانا اشرف علی تھانویؒ زندہ ہوتے تو وہ ضرور ان باتوں پر ٹوکتے۔ جس نے زندگی بھر شرک و بدعت کے مٹانے کی سعی کی ہو، آج اس کے بعض متوسلین اس کی عظمت وعقیدت کے ذریعہ خطرناک بے اعتدالی کا دروازہ کھول رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے علماء جنھوں نے شرک ہی نہیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی بدعتوں کے مٹانے کی کوشش کی، ان خرافات کے رد میں مناظرے کئے، آج وہاں کا یہ حال ہے کہ لوگ دعا کے لئے روپے بھیجتے ہیں۔ اور بخاری کا ختم کر کے دعا کی جاتی ہے۔ مصر کے لئے بھی ختم بخاری کے بعد دعا کی گئی تھی۔ جن ادارہ کے بزرگوں نے مقررہ وقت پر قرآن خوانی کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ اب وہاں ختم بخاری کی بدعت جاری کی جائے، کس قدر تعجب کی بات ہے۔ مگر آج اس کے خلاف کوئی آواز اس لئے نہیں اٹھ سکتی کہ بعض بزرگوں کے زیر پرستی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ جن کی عظمت نے زبانوں پر مُہرِ سکوت لگا دی ہے — !

مجھے اچھی طرح علم ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کے بہت سے مسائل میں اپنے شیخ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کیا تھا۔ اور اس پر وہ آخر وقت تک قائم رہے۔ مگر آج سیکولر حکومت جس نے مسلمانوں کے پرسنل لاء کی بھی جان نہ بخشی ہو، اس کا ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اس ادارہ کے بعض ذمہ دار اکابر وعظ و پند ہی نہیں، بلکہ مسلسل جدوجہد کے ذریعہ مسلمانوں کو روک رہے ہیں۔ اُن کے وابستگان میں کتنے لوگ ہیں جو اس بے اعتدالی کو سمجھتے ہیں، مگر اس کے خلاف نہ تو آواز اٹھا سکتے ہیں، نہ ان کو ٹوک سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اُن کی عظمت مانع ہے۔ مگر اسلامی ملکوں میں اقامتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جو مختلف تحریکیں چل رہی ہیں، اُس کی مخالفت میں سب سے پیش پیش یہی اہلِ عقیدت کا گروہ ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے — !

اس عقیدت اور عظمت پرستی نے دُنیا کی دُوسری قوموں کے ذہن و دماغ پر جو اثرات ڈالے ہیں اور جس طرح اُن کو گمراہ کیا ہے، اس کا ذکر چھوڑ دیجئے۔ اس نے مسلمانوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹا کر علم و عمل کی ایسی پُر پیچ وادی میں چھوڑ دیا ہے، بظاہر اس سے ان کا نکلنا دشوار معلوم ہوتا ہے — !

یہ گمراہ کن عظمت وعقیدت مسلمانوں میں جس راہ سے سب سے زیادہ آئی، وہ تصوف[لے] کی راہ ہے۔ آپ صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین اور محدثین کے حالات پڑھیے، مفسرین کی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ ممتاز فقہا کے تراجم دیکھئے ان کی زندگی آئینہ کی طرح صاف وشفاف اُن کے اقوال و افعال واضح اور روشن ہیں، اُن کی حکیمانہ باتیں قرآن و

لے فاضل مضمون نگار کا "تصوف" سے مطلب یقیناً "عجم زدہ تصوف" ہے، یعنی وہ تصوف جس میں عجمیت شامل ہوگئی ہے، ورنہ وہ تصوفِ خالص جو "تزکیۂ نفس" کی ضرورت پر زور دیتا ہے اور جو کتاب وسنت سے متجاوز نہیں ہو اُس سے متوحش ہونے کی کوئی وجہ نہیں — ! (م - ق)

سنت سے تعلق پیدا کرنے والی ہوں گی، اُن کی کتابیں ازدیادِ ایمان کا سبب ہوں گی۔ اُن کی باتوں سے اُن کی بڑائی ضرور معلوم ہوگی اُن کی سیرت کے پڑھنے سے دل میں اُن کی تکریم ضرور پیدا ہوگی۔ مگر ذہن میں اُن کے بارے میں کوئی ماورائی تصور یا خرقِ عادت عقیدہ نہیں بیٹھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ذات کو کبھی بدعت و شرک کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ اور اگر استعمال کیا گیا تو اُن کو بھی اسی راہ میں رد کر دیا گیا۔

مگر تصوف میں جب سے فلسفہ کی آمیزش ہوئی ہے، اُس وقت سے آج تک اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یا بزرگوں کے جو ملفوظات اور مکتوبات جمع کئے گئے۔ جن میں اکثر فرضی ہیں، اُن میں مستثنیات کو چھوڑ کر اکثر میں ایک طرف اگر کتاب و سنت کی تعلیم کی وضاحت اور اس کے اخلاقی و روحانی پہلوؤں کی صراحت ملے گی تو اسی کے ساتھ کچھ ایسی ذومعنی خرقِ عادت اور انتشارِ فکر پیدا کرنے والی باتیں بھی ملیں گی، جن سے آدمی غلط راہ اختیار کر سکتا ہے۔ اور ایسا ہوا ہے! ان بزرگوں کی نیت و عمل دونوں بخیر تھے۔ مگر تزکیۂ نفس کے سلسلہ میں فلسفۂ یونان، یوگ اور اشراقیات کی آمیزش سے جو فلسفۂ تصوف تیار ہوا۔ اس میں ساری توجہ بنیادی اعمال پر کم، کیفیات و واردات پر زیادہ رکھی گئی۔ اس لئے فرضی ملفوظات، مکتوبات اور کتابوں کے ذریعہ بھی عقیدت مندوں سے گمراہی پھیلائی اور اُن کے مولفین و مصنفین کی ذات کو بھی کیفیات و واردات کا ایک مجموعۂ طلسم بنا دیا۔ اُن کی زندگی کا عملی پہلو تو آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور صرف وہ پہلو سامنے رہ گیا جو خرقِ عادت اور عظمت و جلالت کے واقعات سے پُر تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدعت و گمراہی اور شرکِ جلی و خفی کے بے شمار مظاہر و مناظر پیدا ہو گئے ——!

شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات جن کا علم و عمل، ورع و تقویٰ، جن کا جذبۂ اتباعِ سنت، جن کے وعظ کا اثر ضرب المثل ہے، جن کا قول ہے کہ گھر کے باہر اگر توحید ہو اور اندر شرک، تو یہ نفاق ہے! مگر کیا آج اُن کی عظمت محض چند کرامات، خرقِ عادت واقعات اور گیارھویں کے فاتحہ تک محدود ہو کر نہیں رہ گئی ہے! کیا اُن کی طرف مواعظ و ملفوظات کا ایک طومار نہیں منسوب کر دیا گیا ہے، جن میں اُن کو نبیؐ سے بھی بڑھایا گیا ہے۔

اسی طرح شیخ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء، بختیار کاکیؒ، زکریا ملتانی رحمہم اللہ تعالیٰ کے تقدس و بزرگی میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ مگر کیا یہ ایک واقعہ نہیں ہے کہ عقیدتِ فاسد اور عظمت پرستی نے اُن کے مزارات کو خانۂ کعبہ اور مسجدِ نبویؐ کی عظمت عطا کر دی ہے؟

امام غزالیؒ کی کتاب و سنت سے شغف اور زہد و تقویٰ پر کون شبہ کر سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود فلسفۂ یونان اور فلسفۂ تصوف کے جو اثرات اُن کی خالص دینی کتابوں تک میں ہیں، اُن پر امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ۔ شاہ ولی اللہؒ صاحب وغیرہ نے حرف گیری کی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ تو اُن کے بارے میں بسا اوقات بہت سخت رائے دیتے ہیں! انہوں نے نبوت کی حقیقت اور استدلال کی نوعیت پر جو کچھ لکھا ہے، اس پر امام ابن تیمیہؒ نے سخت تنقید کی ہے۔[1] شرح صدر کی تشریح میں بعض اہلِ تصوف جو موشگافی کرتے ہیں اور جس کا کچھ اثر امام غزالیؒ کی کتابوں میں جھلکتا ہے اُس کے بارے میں شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:-

---

[1] راقم نے معارف میں کتاب الرد علی المنطقیین پر جو تبصرہ لکھا تھا اُس میں متعدد مثالیں دی گئی ہیں!

"خدا سے قربت حاصل کرنے کا صحیح راستہ وہی ہے جس پر انبیاء علیہم السلام چلے ہیں۔ لیکن دورۂ شرح صدر میں عام تعلقات اور طاعاتِ شاقہ مثلاً صوم وصال، صوم دہر، ہر رات ایک قرآن ختم کرنا، اس قسم کے اور بھی دقیق مسائل جو احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت میں مذکور ہیں، اُن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔"

جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کی دینی عظمت وجلالت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، اُن کے تذکرہ میں صاحب تذکرۃ الاولیاء جن کی علمی وعملی فضیلت بھی مسلم ہے لکھتے ہیں:۔

"ایک دن کتے کے بھونکنے پر آپ نے لبیک لبیک کہی، جب مرید نے وجہ دریافت کی تو فرمایا:۔

"گفت قوت ودمدمۂ سگ از قہر حق تعالیٰ دیدم وآواز قدرت حق تعالیٰ شنیدم وسگ را درمیان ندیدم لاجرم لبیک جواب دادم۔"

(کتے کی آواز اور اُس کی قوت میں میں نے حق تعالیٰ کا قہر دیکھا اور خدا تعالیٰ کی آواز سُنی اس دید وشنید میں میں نے کتے کو درمیان میں نہیں پایا اس لئے لاچار لبیک لبیک سے جواب دیا)

ایک بار آپ نے فرمایا "تیس سال تک جماعت میں اس طرح شرکت کی ہے کہ تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی اور اگر کبھی نماز میں دُنیا کا خیال آگیا تو نماز قضا کر دی ہے! اور اگر دوزخ و بہشت کا خیال آگیا ہے تو سجدۂ سہو کیا ہے۔"

ایک بار فرمایا کہ "قرآن سے فاتحہ اور قل ہو اللہ کے علاوہ کچھ اور نہ سیکھنا چاہیئے!"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے رونے کی آواز سُنتے تھے تو نماز ہلکی کر دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ نماز میں بسا اوقات اُن کا خیال فوج کی ترتیب کی طرف چلا جاتا تھا۔ اور پھر ساری نماز اسی حالت میں ختم ہو جاتی تھی۔ مگر نہ آنحضرتؐ نے کبھی نماز قضا کی اور نہ حضرت عمرؓ نے کبھی سجدۂ سہو کیا۔ غور کیجئے، جنت ودوزخ کا خیال عین خدا کی مرضی اور ناراضگی کا خیال ہے۔ مگر ان کے خیال سے سجدۂ سہو کیا جاتا ہے!

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کی ایک ایک آیت کو سیکھنا اور پڑھنا چاہیئے، اس لئے کہ اس کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے! آنحضرتؐ، صحابہؓ اور پوری اُمت کا اس پر تعامل ہے۔ مگر وہاں صرف سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کے سیکھنے اور پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے!

ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان اقوال کی تاویل کریں مگر جو تاویل بھی کی جائے گی وہ مزید ایک غلطی اور گمراہی کا سبب بنے گی۔ میرا یقین ہے کہ یہ باتیں جنیدؒ بغدادی کی طرف غلط منسوب کی گئی ہیں۔ اس لئے کہ وہ پابند شریعت اور متبع سنت تھے۔ اور اگر واقعی ان باتوں کی نسبت اُن کی طرف صحیح ہو تو بغیر کسی تاویل کے اُن کو غلط کہنا چاہیئے۔ مگر تصوف کا مزاج ہی ایسا بنا ہے کہ اُلٹی سے اُلٹی بات بھی وہاں حقائق ودقائق کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ حضرت بایزیدؒ بسطامی کے قول سبحانی ما اعظم شانی کی کیا تاویل کی جا سکتی ہے؟ شیخ منصور کے اناالحق کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔ مگر آج تک تاویل پر تاویل اور اُن کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے!

آج شیخ ابن عربی کی جو کتابیں خصوصاً فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ جو تصوف کی جان ہیں۔ اُن میں جو باتیں

صراحتہً شریعت کے بالکل خلاف نظر آتی ہیں، اُن کی طرف کیوں نظر نہیں اٹھتی۔ اگر اٹھتی ہیں تو پھر اُن کی عظمتِ عقیدت اُن پر تنقید کرنے سے کیوں مانع ہوتی ہے، کیا وہ کتاب و سنّت سے زیادہ قابلِ اعتماد اور قابلِ احترام ہیں؟

امام ابن تیمیہؒ ان کو بڑے سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور وہ اپنی دینی غیرت و حمیت کے سبب معذور تھے اس بارے میں امام ابن تیمیہؒ کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان باتوں کی کیا تاویل ہو سکتی ہے۔ اگر ان کی تاویل بھی ہو سکتی ہے تو پھر دُنیا میں ہر غلطی کی تاویل ہو سکتی ہے!

خالق و مخلوق کے درمیان امتیاز و فرق کو دُور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"وجود تو ایک ہی حقیقت ہے، اس میں کثرت کہاں۔ اور شئے تو اپنی ضد آپ نہیں ہوتی، پس مرتبہ وجود میں عین ذات ہے۔ نہ رب ہے نہ عبد ہے؟"

انہوں نے الولایۃ اعلیٰ من النبوۃ کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کی نقل تفصیل سے تو نہیں کی جا سکتی۔ دو تین باتیں ملاحظہ ہوں۔ اپنی ولایت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جب ۵۸۶ھ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و رسل کی ارواح مجھے دکھائے تو میں ایک مقام و مشہد میں قائم کیا گیا۔ اس جماعت انبیاء میں سے کسی نے مجھ سے گفتگو نہیں کی مگر ہود علیہ السلام نے تمام انبیاء کے جمع ہونے کی وجہ بیان کی کہ شیخ ابن عربی کو قطبیت کی مبارک باد دیں اور یہ کہ شیخ قائم ولایت خاصہ مقیدہ ہیں۔"

ولایت کی اس افضلیت پر غور کیجئے کہ نبی ولی کو بشارت دے رہا ہے اور اسی کے ساتھ واقعۂ معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیت المقدس کی امامت کو سامنے رکھئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام خلیل کیوں ہوا۔ اس کی توجیہ یوں فرماتے ہیں:۔

"حق تعالیٰ وجودِ ابراہیمؑ میں داخل ہو گیا ہے۔ خواہ بہ صورت روحانی یا جسمانی، ذہنی ہو یا اُخروی۔"

کیا ان تصورات میں اور ہندوؤں کے عقیدہ میں کوئی فرق ہے کہ شری کرشن، بھگوان کے اوتار ہیں۔ یہ تو میں نے چند اقتباسات بطور نمونہ دے دیئے ہیں۔ ورنہ اس طرح کی باتیں تصوف کی کتابوں سے جمع کی جائیں تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے—!

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین، محدثین، مفسرین اور فقہا میں ایک سے ایک متقی و برگزیدہ لوگ گزرے ہیں۔ مگر اُن کی ذات دو وجہ سے فتنہ نہیں بن سکی:۔

۱۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے رموز و اشارات کے بجائے واضح گفتگو کی!

۲۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے جرح و تعدیل کا جو معیار مقرر کیا تھا، اس پر وہ ہر شخص کے اقوال و افعال ہی کو نہیں بلکہ اُس کی ایک ایک نقل و حرکت کو جانچتے تھے—!

مشہور ہے کہ ایک محدث نے ایک محدث کی حدیث اس لئے قبول نہیں کی کہ وہ اپنے گھوڑے کو خالی برتن دکھا کر

پکڑ رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ جب جانور کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں تو پھر ان کی بات کا کیا اعتبار۔

کسی نے کسی کو بازار میں کھاتے دیکھ لیا اور حدیث کی روایت اُن سے ترک کر دی۔ باپ نے بیٹے کو غیر ثقہ اور بیٹے نے باپ کو غیر ثقہ کہا۔ ابو داؤد نے اپنے لڑکے سے روایت کرنے کو روک دیا تھا۔ اور یہ سختی صرف سماع حدیث تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ اس معیار پر اُن کی پوری زندگی بھی پرکھی جاتی تھی۔ اور جہاں جو خوبی یا خامی نظر آتی تھی اُس کی نشان دہی کر دی جاتی تھی۔ رجال کی کتابیں اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہیں!

ان کی اسی وضاحت اور معیار جرح و تعدیل کی وجہ سے نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب ہونے پائی اور نہ اُن کی طرف، اور اگر ہوئی تو انہوں نے اُس کی نشاندہی کر دی!

مگر اہلِ تصوف کے اردگرد جو ماحول پنپتا ہے، وہ محض عظمت و عقیدت کی بنیاد پر پنپتا ہے، وہاں نقد و جرح کا گزر نہیں ہے، وہاں محض تعدیل و توثیق ہونی چاہیئے۔ جرح و تنقید سے وہاں ایمان سلب ہو جاتا ہے، وہاں صرف بات مانی اور منوائی جاتی ہے۔ چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں ظواہر اور کمیات پر کم، اور کیفیات اور واردات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے! اس لئے مجموعی طور پر اس سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد آدمی عظمت و عقیدت کے ایک ایسے رشتہ میں بندھ جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کو یہ معلوم کرنے کی قطعی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ کعبہ کی طرف جا رہا ہے یا ترکستان کی طرف —! ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

یہ شعر ساتویں آٹھویں صدی کے سلسلۂ تصوف کی نہیں بلکہ اس صدی کے سلسلۂ تصوف کی بھی تصویر کشی کرتا ہے! جب تک تصوف کا یہ مزاج اور تصور نہ بدلے گا۔ جس طرح وہ آج سے پہلے ذہنی گمراہی اور عملی بدعت و خرافات کا سبب بنا ہے، آئندہ بھی بنتا رہیگا۔ چنانچہ اکبر کی گمراہی اور اُس کے دینِ الٰہی کی ایجاد کا ایک بڑا سبب علوم تصوف اور اہلِ تصوف کی دقیقہ سنجیاں بھی ہیں، خاص طور پر شیخ ابن عربی کی تشریحات:۔

> "ایک بار اکبر پر "حالتِ عجیب" اور "جذبۂ عظیم" طاری ہوا۔ وہ اس وقت شکار میں تھا، شکار موقوف کر کے اجمیر پہنچا، وہاں سے فتحپور سیکری آیا۔ شیخ تاج الدین کو بُلایا، اور ملّا عبد القادر کے بیان کے مطابق رات بھر شطحیات و ترہات صوفیاء کے سُننے میں مشغول رہا، شیخ تاج الدین نے فصوص الحکم سے فرعون کے ایمان کا مسئلہ پیش کیا اور نہ جانے کیا کیا سمجھایا"!

انہی تاج الدین کا لقب تاج العارفین ہے۔ ان کے بارے میں ملّا عبد القادر نے یہ لکھا ہے کہ "چنداں مقید بہ شرعیات نہ بود" مگر اپنی شدت کے باوجود ملّا صاحب نے یہ بھی لکھا کہ:۔

> "لائق وفائق در علم تصوف و در علم توحید ثانی شیخ ابن عربی" (جلد ۲ ص ۲۵۸)

اسی طرح اگر داراشکوہ کی گمراہی پر غور کیا جائے تو سرمد سرمست کی آوارہ مزاجی کو اس میں بڑا دخل نظر آئے گا۔ جن کے ساتھ وہ رات رات بھر خلوت نشین رہتا تھا —!

یہ تفصیلات میں نے اس لئے پیش کی ہیں اور اس کے لئے قدیم وجدید مثالیں اس لئے دی ہیں تاکہ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ مسلمانوں میں جو مبتدعانہ و مشرکانہ باتیں رواج پا گئی ہیں، وہ زیادہ تر عظمت و محبت کی غلط کاری اور عقیدت میں غلو کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور اس ذہنیت کے پیدا کرنے میں تصوف کو بڑا دخل ہے! گو کہ اس میں بعض دوسرے عوامل نے بھی حصہ لیا ہے، خاص طور پر ہندوستان اور پاکستان میں تصوف کے ساتھ ایرانی[1] شیعیت اور ہندو اثرات نے بھی کام کیا ہے اور ان دونوں عناصر کو زیادہ تر تیموری بادشاہوں کے جذبۂ احسان شناسی اور اسلامی علوم سے ان کی ناواقفیت کی بنا پر عام مسلمانوں کے قلب و دماغ پر چھاپا مارنے کا موقع مل گیا۔ وہ مسلمانوں کو اُن کے بنیادی عقیدے سے تو نہیں پھیر سکے، مگر اُن کے اندر مذہبی عقیدت کی راہ سے بہت سی ایسی بدعتیں اور گمراہیاں پیدا کر دیں۔ جن سے مسلمان آج تک دوچار ہیں ——!

ہندوؤں کا مذہبی تصور تو بنیادی طور پر غیر اللہ کی عقیدت کا ایک مرقع ہے، اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ عقیدت پیدا ہی ہوئی ہے اُن کے ساتھ کچھ ماورائے طبعی خیالات کے منسوب کرنے کی وجہ سے۔ اسی طرح سے شیعیت کا سارا دارومدار ہی عقیدت پر ہے۔ اُن کی عقیدت نے حضرت علیؓ کو نبوت کے مرتبہ سے آگے بڑھایا۔ ائمہ معصومین کو نبوت کا مرتبہ دیا۔ چنانچہ ائمہ معصومین کی روایت کی اُن کے نزدیک وہی حیثیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت و حدیث کی ہے!

ان دونوں عناصر کا سنگم یہاں تیموری شہزادے تھے۔ ایرانی شیعیت کا تحفہ تو سب سے پہلے ہمایوں اپنے محسنوں کا بدلہ چکانے کے لئے لے آیا اور اُس نے یہاں ایسا اثر جمایا کہ تیموریوں کا اثر اس کے آگے کم ہو گیا اور ہندو اثرات کا تو کچھ کہنا ہی نہیں، اُن سے تو ان کو دن رات سابقہ ہی رہتا ہوگا ——!

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ تیموری[2] بادشاہوں نے اپنی تمام دینی کوتاہیوں کے ساتھ بزرگوں کی عقیدت اور بے راہرو صوفیوں سے اپنا رشتہ کبھی نہیں توڑا۔ اکبر ایک طرف دین الٰہی وضع کرتا اور پوجا پاٹ بھی کرتا ہے، دوسری طرف پاپیادہ اجمیر بھی جاتا ہے۔ شہزادہ سلیم کا نام سلیم اسی لئے پڑتا ہے کہ شیخ سلیم چشتی کی دعا سے یہ پیدا ہوا تھا۔

اس طرح کی سینکڑوں مثالیں ملیں گی۔ غرض یہ چیز شیعیت اور ہندوازم کے ذریعہ اُن میں آئی اور ان کے اثر سے عام مسلمانوں میں پھیلی! الناس علی دین ملوکھم!

اب ایک نظر قرآن و سنت پر ڈال لیجئے کہ اُن میں غیر اللہ کی الوہی عظمت و عقیدت کو کن کن گوشوں سے مٹایا گیا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے اسلام کے تصور عبادت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لغت میں عبادت روندنے اور پامال کرنے کو کہتے ہیں۔ عرب اس راستہ کو جو بار بار روندا گیا ہو طریق "معبد" کہتے ہیں۔ اسلام نے اس مفہوم کو ذرا اور وسعت دی ہے گو اس میں لفظ کا اصل مفہوم شامل ہے!

اسلام میں عبادت، اطاعت کے ساتھ اُس اظہار تذلل، فروتنی اور دل کے جھکاؤ کو کہتے ہیں، جو غایت محبت میں پیدا ہو۔ امام راغبؒ کہتے ہیں۔

---

[1] ایرانی شیعیت کی قید میں نے قصداً لگائی۔ اس سے میری مراد صفویوں اور ان کے بعد کی شیعیت ہے!
[2] باستثنائے عالمگیرؒ۔

العبودية اظهار التذلل والعبادة ابلغ منها غاية التذلل
عبودیت اپنی پامالی اور عاجزی کے اظہار کا نام ہے اور عبادت میں اس سے بھی زیادہ یہ جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ یعنی غایت فروتنی!

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ شرع میں عبادت کمال محبت کو کہتے ہیں۔ امام بغوی کہتے ہیں کہ "عبادت اطاعت کے ساتھ جھکاؤ اور جھکاؤ کے ساتھ خوف" کو کہتے ہیں۔

اب اگر کوئی شخص دل کی پسندیدگی اور اس کے جھکاؤ کے بغیر عبادت کرتا ہے تو وہ عبادت نہیں کہی جائے گی۔ اسی طرح اگر محبت کے بغیر اس کی اطاعت کرتا ہے تو وہ عبادت عبادت نہیں ہوگی۔ بالکل اسی طرح اگر اس کے دل میں خدا کی عظمت کے مساوی کوئی عظمت پیدا ہو جائے یا کسی غیراللہ کا خوف اس کے دل میں بیٹھ جائے تو بھی اس کی عبادت ناقص ہوگی۔ امام ابن تیمیہ عبادت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب عظمت و محبت کے ساتھ تذلل نہ پایا جائے، عبادت مکمل نہیں ہوتی:۔

بل يجب ان يكون الله احب الى العبد من كل شيئ وان يكون الله عنده اعظم من كل شيئ بل لايستحق المحبة والذل التام الا الله تعالى فكل ما احب بغير الله فمحبته فاسدة وما عظم بغير امر الله كان تعظيمه باطلا۔۔! (رسالہ عبودیت صـ)

ضروری ہے کہ بندے کے نزدیک خدا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔ اور اسی طرح ہر چیز سے زیادہ اس کی عظمت اس کے دل میں ہو۔ بلکہ محبت اور مکمل عاجزی اور بندگی درماندگی کا مستحق صرف خدا ہی ہے۔ پس جو محبت خدا کی محبت کے بغیر ہو وہ فاسد محبت ہے اور جو عظمت خدا کے حکم کے بغیر ہو وہ باطل ہے۔۔!

اس مفہوم کے ساتھ قرآن نے عبادت کو خدا کے لئے خاص کیا ہے اور ہر مسلمان سے پنج وقتہ نمازیں اسی کا اقرار کرایا جاتا ہے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین!

اسی بنا پر ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قرآن میں جہاں عبادت کا حکم آیا ہے، وہاں عبادت سے مراد توحید باری[1] ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ خدا کی عبادت پوری عظمت، محبت اور اظہار تذلل کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ عزت و توقیر اور محبت دوسروں کی بھی کی جاسکتی ہے، مگر اسی قدر جتنی کہ شریعت نے اجازت دی ہے۔ خدا کے سوا کسی ذات کو یہ مرتبہ نہیں دیا جاسکتا کہ اس کی مرضی خدا کی مرضی ہو۔ اس کی سفارش تو فیصلہ کن ہو جب کہ[2] اس کا تقرب وواسطہ خدا

---

[1] توحید کے معنی صرف خدا کو خالق سمجھنے یا ایک ماننے کے نہیں ہیں بلکہ اس کو اس تصور کیساتھ ماننے کا نام توحید ہے کہ وہ اپنے پورے اختیارات اور قوت و قدرت کیساتھ اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ الا له الخلق والامر!

[2] رسول کی مرضی، ان کی محبت اور ان کی شفاعت سے یہاں بحث نہیں ہے بلکہ یہاں توحید کا مفہوم بیان کرنا مقصود ہے!

کا تقرب دعا سطہ بن جائے۔ مشرکین عرب جو بتوں کی نیاز مندی اور اُن کے استھانوں پہ نذر و نیاز کرتے تھے، اُن سے جب کہا گیا کہ جب تم خدا کو مانتے ہو[1] تو پھر خالص اُسی کی عبادت اور طاعت بھی کرو، تو وہ کہتے تھے کہ ہم عبادت تو خدا ہی کی کرتے ہیں، ان دیوی دیوتاؤں کو تو صرف تقربِ الٰہی کا ذریعہ بنایا ہے!

ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ!

ہم ان کی عبادت محض تقربِ الٰہی کے لئے کرتے ہیں!

ان کا یہ جواب بظاہر کتنا معصوم اور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ واسطے کے بغیر تو دُنیا کا کوئی معمولی سے معمولی کام بھی نہیں ہوتا، خدا کی اس بلند بارگاہ تک ہم ان واسطوں کے بغیر کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ اگر آپ جائزہ لیں تو اس برصغیر میں لاکھوں مسلمان ایسے ملیں گے کہ جب اُن کو اُن کی گمراہیوں اور بدعتوں پر ٹوکیں گے تو وہ یہی جواب دیں گے کہ ہم تو خدا تک اُن کے ذریعہ اپنی درخواست بھیجتے ہیں۔ مگر اُن کا یہ جواب محض اپنی بدعملی پر پردہ ڈالنے کے لئے ہوتا ہے۔ عملاً اُن کی ساری نیازمندی انہی واسطوں کے ساتھ ہوتی ہے، وہ جس ذوق و شوق اور خشوع و خضوع کے ساتھ ان ذریعوں اور واسطوں کے سامنے جاتے ہیں، اُس خضوع و خشوع اور ذوق و شوق کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں ایک دن بھی نہ جاتے ہوں گے!

اگر ان کا یہ جواب تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا اسلام میں اس تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا کی بارگاہ میں ہم ان واسطوں کے بغیر نہیں پہنچ سکتے، یا ہر اچھا شخص وہاں سفارشی ہو سکتا ہے۔ قرآن نے اس کی بار بار وضاحت کی ہے:۔

واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔

جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے پوچھیں تو اُن کو بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں۔ جب بھی وہ پکارے!

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید امن یجیب المضطر اذا دعاہ
ولا تنفع الشفاعۃ عندہ الا باذنہ!

میں رگِ گلو سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ پریشان حال کی دعا کون سنتا ہے جب وہ خدا کو پکارتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں اجازت کے بغیر کسی کی سفارش فائدہ نہیں پہنچا سکتی!

اسی کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ:۔

قل ادعوا الذین زعمتم من دونہ فلا یملکون کشف الضر عنکم ولا تحویلا
اولئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلۃ ایھم اقرب
ویرجون رحمتہ ویخافون عذابہ!

---

[1] قرآن نے متعدد جگہ ان کے اقوال نقل کئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی کے منکر نہیں تھے!

کہہ دو کہ جن کو تم خدا کے سوا کچھ سمجھتے ہو اُن کو بلا دیکھو سہی، سو وہ نہ تو تمہاری تکلیف کو دور کر سکیں گے اور نہ ان کو اس کے بدلنے کا کچھ اختیار ہے۔ یہ جن کو پکارتے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی خوشنودی کی تلاش میں ہیں کہ اُن میں کون زیادہ مقرب بارگاہ بنتا ہے اور وہ خدا کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں !

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے بارے میں کہا تھا کہ :۔

لاستغفرن وما املک من اللہ من شیئ !

میں آپ کی مغفرت خدا سے چاہوں گا مگر میں آپ کے بارے میں خدا کے یہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا!

تاکہ یہ تصور مٹ جائے کہ خدا کا مقرب ترین خدا کی خدائی میں دخیل ہے !

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرایا گیا کہ :۔

قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً

میں اپنے نفع و نقصان کا بھی مالک نہیں ہوں !

یہ موضوع کچھ ایسا ہے کہ قلم اس کے جس پہلو پر چل پڑتا ہے تو چلتا ہی جاتا ہے، اس لئے اس احساس کے باوجود کہ قلم اصل موضوع سے ہٹنے نہ پائے کہیں کہیں ہٹ ہی گیا ہے۔ اس کے لئے میں ناظرین سے معذرت خواہ ہوں۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ایسی عظمت و محبت جو کسی مخلوق کی عقیدت کے غلو میں مبتلا کردے جو کسی درجہ میں بھی خدا کی عظمت و محبت کی جگہ لے لے ، اسلام اس سے روکتا ہے !

محبت پہلے محبت کو لیجئے۔ قرآن و حدیث میں بے شمار آیات جن میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ محبت صرف خدا کی ہونی چاہیئے ۔ دوسروں سے محبت کی جاسکتی ہے مگر وہ محبت خدا کی محبت کے تابع ہونی چاہیئے۔ مشرکین عرب خدا سے محبت رکھتے تھے ، مگر اُن کی محبت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی ۔ ایک طرف وہ خدا سے بھی محبت کرتے تھے، دوسری طرف بتوں کی محبت بھی اُن کے دلوں میں اسی طرح سرایت کئے ہوئے تھی۔ اُن کی اس روش کے خلاف مومنین کی روش کو سراہا گیا ۔

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونہم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حباً للہ ۔ (بقرہ - ۱۹)

بعض لوگ جو خدا کے علاوہ کسی کو شریکِ خدا ٹھہرا لیتے ہیں ، وہ اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہیئے۔ اور جو لوگ مومن ہیں وہ تو ہی محبت صرف خدا سے رکھتے ہیں !

اس میں لفظ " انداداً " قابلِ غور ہے۔ "ند" کے معنی کسی کو کسی کے برابر قرار دینے کے ہیں ، یعنی محبت یا کسی امر میں خدا کے مثل کسی کو قرار نہیں دینا چاہیئے۔ مگر مشرک اس کے مثل قرار دیتے ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اس آیت کی تشریح یوں فرماتے ہیں :۔

" خدا اور غیرِ خدا کو محبت میں برابر کر دینا، خواہ وہ کوئی ہو، یہ مشرکین کا کام ہے "۔

علامہ رشید رضا اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" انداد کے معنی جمہور مفسرین کے یہاں اصنام اور اوثان سے زیادہ عام ہیں۔ ان میں

وہ ممتاز لوگ بھی شامل ہیں جن کے احکام کے آگے لوگ بے چون وچرا جھک جایا کرتے ہیں اور اس پر آگے کی آیت دلالت کرتی ہے اذ تبرأ الذین اتبعوا ان الذین اتبعوا تو مراد یہ ہو کہ انسان اپنے انداد سے وہ طلب کرے جو خدا سے طلب کرنا چاہیئے یا اس سے وہ احکام قبول کرے جو خدا کی طرف قبول کرنا چاہیئے "۔

حدیث میں آتا ہے کہ تین باتیں جس میں ہوں، اس نے ایمان کی لذت پائی - اُن میں ایک یہ ہو کہ خدا اور اس کے رسولؐ[1] کی محبت ماسوا اللہ کی محبت پر غالب ہو - دوسرے یہ کہ کسی سے محض خدا کے لئے محبت کرے - تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر میں لوٹنا پسند نہ کرے !

آخری جملہ کا مطلب یہ ہو کہ کوئی کام ایسا نہ کرے جو اُسے کفر کے راستہ پر ڈال دے - اسی لئے حدیث میں بار بار ـــــ " الحب فی اللہ والبغض للہ " کی تاکید آئی ہے - یعنی غیر اللہ سے جو محبت بھی کی جائے وہ خدا کی محبت کا طفیل اور صدقہ ہو، وہ محبت بالذات اُس مخلوق سے نہ ہو کہ وہ محبت خدا کی محبت کی مقابل نہ بن جائے یا اُس کی محبت خدا کی محبت کی جگہ لے لے - اس لئے قرآن نے محبت کے سلسلہ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ :-

قل ان کان آباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ ! (توبہ - ۲)

کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے مندے ہونے کا تمہیں خوف ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ اور اُس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہو جائیں تو خدا کے حکم کا انتظار کرو !

یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ یہ بات صحابہ کرام کو مخاطب کرکے کہی گئی ہے !

سفیان بن عیینہ سے کسی نے پوچھا کہ ان لوگوں کا حال کیا ہو گا جو اپنی خواہشوں سے شدید محبت رکھتے ہیں ؟ انہوں نے کہا تم کو قرآن کی یہ آیت بھول گئی ؟

واشربوا فی قلوبھم العجل - اُن کے دل میں بچھڑے کی محبت پلادی گئی -

ابن عیینہ نے اپنے اس مختصر سے جواب میں غیر اللہ کی محبت کی ایک پوری تاریخ بیان کر دی ہے - مصریوں کے دل میں گئو سالہ پرستی گھر کر چکی تھی - بنی اسرائیل جو دنیا میں توحید کے علمبردار تھے، مصر میں رہتے تھے - اُن کے دل میں بھی گائے کی محبت سرایت کر گئی تھی - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو پھر توحید خالص کا سبق ہی یاد نہیں دلایا - بلکہ اُن کو مصر کی فضا سے نکال کر شام کی طرف لے گئے - لیکن بنی اسرائیل نے راستہ میں کچھ لوگوں کو بُت پرستی کرتے دیکھا - گائے کی محبت پھر اُن کے دل میں عود کر آئی اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا " اجعل لنا الٰھا کما لھم " !

---

[1] رسولؐ کی محبت کو اس آیت کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی - یعنی رسولؐ کی محبت خدا کی محبت کے تحت ہو!

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو اس پر بڑی سخت تنبیہ کی - فرمایا-

قال هولاء متبر ما هم فيه وباطل ما كانوا يعملون قال اغير الله ابغيكم وهو فضلكم على العالمين - (اعراف)

یہ جس کام میں لگے ہوئے ہیں یہ برباد کردیا جائے گا اور یہ بے بنیاد باطل کام کر رہے ہیں-
اور کہا کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کسی کو معبود تجویز کردوں ؟

اس اثنا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر شرف تکلم کے لئے بلائے گئے - بنی اسرائیل کو موقع ملا - انہوں نے فوراً ایک گائے کا بچھڑا بنا کر اُس کی نیاز مندی شروع کردی - اُن کی اس گئو ماتا کو قرآن نے :-

واشربوا في قلوبهم العجل - اُن کے دل میں گئو سالہ پرستی پلا دی گئی ہے !

سے تعبیر کیا ہے !

غرض یہ ہے کہ غیر اللہ کی محبت جو خدا کی محبت کے مقابل بن جائے، اسلام میں وہ ناپسندیدہ ہے - یہ محبت دو طرح کی ہوتی ہے - ایک محبت طبعی[۱]، دوسرے محبت اختیاری - مثلاً بیوی بچوں کی محبت، ماں باپ کی محبت، ذوق و خواہشات کی محبت - ان سب چیزوں سے محبت کی جاسکتی ہے - مگر اس میں غلو کا نتیجہ بے عملی، پھر بد عملی اور اس کے بعد شرک فی العمل کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے! یعنی یہ محبت شرعی اعمال میں پہلے غفلت، اور غفلت کے بعد اس کے خلاف کرنے کی جرأت پیدا کرتی ہے - اور آخر میں وہ خدائی احکام کی جگہ لے لیتی ہے !

اختیاری محبت سے مراد یہ ہے کہ آدمی کسی خارجی سبب یا عظمت کی بناء پر کسی سے محبت کرنے لگتا ہے - مثلاً استاد کی محبت، بزرگوں اور صلحاء کی محبت، انبیاء کی محبت، ان میں سے ہر ایک سے محبت کا حکم دیا گیا ہے، مگر ان سب کیلئے حدود مقرر ہیں، اگر ان حدود سے ذرا بھی تجاوز کیا گیا تو دل میں اُن کی طرف سے وہی عقیدت پیدا ہوتی ہے جو گمراہی اور فتنہ کا سبب بن جاتی ہے اور جس سے آہستہ آہستہ تصور توحید میں رخنہ پڑتا ہے !

عظمت عقیدت کا دوسرا سبب کسی انسان کی غیر معمولی عظمت ہے، عظمت و کبریائی خدا کی مخصوص صفت ہے، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے - وله الكبرياء في السموات والارض - حدیث میں آتا ہے :-

العظمة ازاري والكبرياء ردائي فمن نازعني واحداً منهما عذبته

عظمت میرا جامہ اور کبریائی میری چادر ہے، ان میں سے ایک کو بھی کوئی ہاتھ لگائے گا تو میں اس کو عذاب دوں گا !

قرآن و سنت میں جہاں کبر و غرور کی ممانعت آئی ہے کہ یہ خدائی میں شرک ہے - وہیں غیر خدا کی ایسی تعظیم و عقیدت سے بھی روکا گیا ہے - جس کا ڈانڈا خدا کی عظمت و عقیدت سے مل جاتا ہے !

قرآن و سنت میں ادب و لحاظ کی ترغیب دی گئی ہے - مگر جس ادب و لحاظ اور عزت و توقیر میں ادنیٰ شائبہ بھی عظمت پرستی یا یادگار پرستی کا تھا، اس نے اس کو ختم کردیا ہے - اُوپر ذکر آچکا ہے کہ دُنیا کی بیشتر قوموں کی گمراہی کا

---

[۱] طبعی محبت سے مراد یہ ہے کہ فطری طور پر ہر آدمی میں ان چیزوں کی محبت ہوتی ہے !

سبب عظمت و محبت ہی میں افراط و تفریط ہے۔ خاص طور پر عیسائیوں نے اس میں سب سے زیادہ غلو سے کام لیا تھا۔ اس لئے قرآن نے بار بار ان کو تنبیہ کی کہ۔

لا تغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی اللہ الا الحق انما المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ و کلمتہ۔

اپنے دین میں غلو سے کام نہ لو اور خدا کی شان میں غلط بات مت کہو۔ عیسیٰ بن مریم محض خدا کے رسول اور اس کے کلمہ ہیں۔

دین میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی عظمت میں اتنا غلو نہ کرو کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہرا دو۔ حضرت عیسیٰؑ کی عظمت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ خدائی میں شریک ہیں، بلکہ اُن کی عظمت اس وجہ سے ہے کہ خدا کے رسول اور اُس کا حکم لے کر آئے ہیں۔ دینی تاریخ کا یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ اہل دین نے ہمیشہ انبیاء، صلحاء اور بزرگوں کی مفرط تعظیم کی ہے اور ان کی عقیدت میں غلو کیا ہے تو اُن کے بارے میں ماورائے بشریت خیالات پیدا ہوئے ہیں۔ اور ان خیالات کی وجہ سے شرک و بدعت کے بے شمار مظاہر وجود میں آگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت محمدیہ کو ہمیشہ یہ تنبیہ کی کہ وہ مدح و ستائش اور تعظیم و تکریم کے سلسلہ میں کوئی ایسا رویّہ اختیار نہ کریں جس سے یہ مترشح ہو کہ آپؐ خدا کی مشیّت اور مرضی میں کچھ دخیل ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:۔

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ بن مریم وانما انا عبد فقولوا عبد اللہ ورسولہ۔

مجھے اتنا نہ بڑھاؤ جتنا عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا۔ میں خدا کا بندہ ہوں تو مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:۔

لا تطرونی کما اطرت الیہود والنصاریٰ

میرے بارے میں اتنا مبالغہ نہ کرو جتنا یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء کے بارے میں کیا ہے!

قرآن نے عظمت کے اسی غلط تصوّر کو مٹانے کے لئے ان مواقع پر جہاں آپؐ کی عظمت و تکریم کا اظہار ہوتا ہے ہمیشہ آپؐ کو عبد اور رسول کے لفظ سے خطاب کیا ہے۔ جس سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہوتا ہے کہ کوئی بندہ کتنا ہی بلند رتبہ اور خدا کا مقرب کیوں نہ ہو، وہ بہرحال عبد ہی رہتا ہے، معبود نہیں ہو سکتا۔ اس کی بلندی اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ دائرۂ عبدیت سے نکل کر معبودیت تک پہنچ گیا ہے، بلکہ اس کی بلندی اس وجہ سے ہے کہ اس کا رشتۂ عبودیت مضبوط تر ہے!

واقعہ معراج آپؐ کی بلندئ مرتبت کا ایک روشن ثبوت ہے۔ مگر اس موقع پر آپ کو خدا نے اسریٰ بعبدہ کے لفظ سے کیا۔ شرح صدر خدا کی ایک مخصوص نعمت ہے، جو آپؐ کے لئے خاص ہے، رفع ذکر آپ کی رفعت کا ایک خاص نشان ہے، جس کا ذکر خدا نے ورفعنا لک ذکرک کے لفظ سے کیا ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ تصوّر بھی بٹھا دیا کہ یہ بلندئ مرتبت خدا کا عطیہ ہے، اس لئے عطیۂ خداوندی کا شکر بجا لاؤ۔ فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب!

آپؐ کی نماز اور قرأت قرآن کا ذکر قرآن میں بطور رفعت شان ہے، مگر الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

لما قام عبد اللہ یدعوہ ۔ جب خدا کا بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کو پکارنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے!
آپ کی زبان سے خدا نے بار بار اعلان کرایا۔
قل انما بشر مثلکم یوحیٰ الی ۔ کہہ دو کہ میں تمہارے جیسا انسان ہوں مگر میری طرف وحی آتی ہے (اور تم اس فضل سے محروم ہو)
ایک مسلمان کے ذہن میں دن میں کئی بار یہ تصور بٹھایا جاتا ہے۔ ان محمداً عبدہٗ ورسولہ ۔ محمد خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔
بنو عامر کا وفد خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ تو ان میں سے بعض نے کہا کہ آپ ہمارے سید و آقا ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ سید تو خدا ہے۔ ان لوگوں نے پھر کہا۔ آپ ہم سب سے افضل وبرتر ہیں۔ فرمایا کہ:-

قولوا بقولکم ولا یستجرینکم الشیطان !

یہ کہو مگر کہیں شیطان تم کو اپنا وکیل نہ بنا لے!

ایک دفعہ آپ کو کسی نے ان الفاظ سے مخاطب کیا:-

" اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند!"

آپ نے سُنا تو فرمایا۔ "لوگو! تقویٰ اختیار کرو۔ شیطان تم کو گمراہی میں نہ ڈال دے!"

انا محمد بن عبد اللہ ورسولہ واللہ ما احب ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنی اللہ عزوجل !

میں محمد بن عبد اللہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں پسند نہیں کرتا کہ مجھے تم میرے اس مرتبہ سے زیادہ بڑھاؤ جو خدا نے میرے لئے مقرر کیا ہے!

اکثر نیک لوگوں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیّت عین خدا کی مشیت ہوتی ہے۔ اُن کی دعا سے نظامِ کائنات میں تغیر وتبدل ہو سکتا ہے۔ اس میں نہ صرف بدعقیدہ قومیں بلکہ بعض اہل توحید مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ آنحضرتؐ نے اس غلطی پر بار بار متنبہ کیا اور بتایا کہ اس کائنات میں مشیّت صرف خدا کی ہے۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی ممتاز کیوں نہ ہو، اس کی مرضی اور مشیت کو اس کارخانۂ رنگ وبُو میں کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن نے اس بارے میں بار بار وضاحت کی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی۔ آپ کے ارشادات ملاحظہ ہوں:-

ایک شخص نے ایک بار کہا کہ "ماشاء اللہ وشاء محمد" یعنی خدا جو چاہے اور آپ جو چاہیں۔ آپ نے سنا تو فرمایا۔

قولوا ما شاء اللہ ثم شاء محمد۔ (یہ کہو کہ خدا جو چاہے اور اس کے بعد محمد جو چاہیں)

اس میں آپ نے حرف عطف یعنی واؤ کے ساتھ وشاء محمد کہنے سے منع فرمایا کہ اس میں مساوات پائی جاتی ہے۔

* اس کے بجائے آپ نے "ثم" کہنے کی ہدایت فرمائی۔ جس سے فرق مراتب کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے۔

ایک شخص نے کہا کہ "ماشاء اللہ وما شئت" آپ نے سُنا تو فرمایا:-

اَجعلتنی للہ ندًا قل ما شاء اللہ وحدہ ۔
کیا تم مجھے خدا کا مثل ٹھہراتے ہو ۔ صرف خدا کی مشیت کا اظہار کرو !
اسی بنا پر آپؐ نے غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع فرمایا ۔ خواہ قرآن اور رسولؐ ہی کی قسم کیوں نہ ہو ۔ کیونکہ اس سے غیر اللہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے ۔
آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی قسم کھائے تو خدا کی قسم کھائے ۔ ورنہ خاموش رہے ۔ آپؐ نے غیر اللہ کی قسم کو شرک قرار دیا ۔
من حلف بغیر اللہ اشرک !
ایک بار آپؐ گزر رہے تھے ، ایک شخص آپؐ کو دیکھ کر اس قدر مرعوب ہوا کہ کانپنے لگا ۔ آپؐ نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا کہ :-
" ڈرو نہیں ، میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں ۔ جو گوشت خشک کر کے کھایا کرتی تھی ! "
اس معمولی سے وصف کی نسبت اپنی طرف اس لئے کی کہ یہ واضح ہو جائے کہ خوف و رعب خدا سے ہونا چاہیئے ، اپنے جیسے انسان سے نہیں ۔
یہ ہدایات اس ذات کے بارے میں دی گئی ہیں ۔ جس کی محبت ایمان کا جزو اور جس کی عزت و تکریم نجات کا ذریعہ ہے ۔ لیکن آپؐ نے ایسا اس لئے کیا کہ اس سے پہلے انبیاء کی مفرط محبت ، غالی عظمت اور عقیدت نے شرک کی راہیں پیدا کر لی تھیں ۔ بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان ہدایات کے باوجود نبوت محمدیؐ اور صلحاء و اخیار کی عقیدت و عظمت کے سلسلہ میں وہ گمراہیاں مسلمانوں میں رواج پا گئیں جن کے مٹانے ہی کے لئے وہ ہدایات دی گئی تھیں !

یادگار پرستی

اسی عظمت پرستی اور عقیدت کیشی کا ایک نتیجہ یادگار پرستی ہے ، آدمی جب کسی انسان کو بڑا ممتاز سمجھ لیتا ہے اور اس کی عقیدت اس کے دل میں گھر کر جاتی ہے تو وہ اس کی یادگار قائم کرتا ہے ۔ ابتداء میں یہ چیزیں محض ایک یادگار ہوتی ہیں ۔ آہستہ آہستہ یہ یادگار ، یادگار پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ اگلی قوموں نے اپنے پیشواؤں کی وفات کے بعد یادگار قائم رکھنے کے لئے ان کی شبیہیں اور تصویریں بنائیں ۔ ان کی یادگاریں رکھیں ان کی قبروں پر نذر و نیاز کی رسمیں ایجاد کیں ۔ پھر آہستہ آہستہ ان کو عبادت گاہ اور سجدہ گاہ بنا دیا ۔ اور اب ان کی ساری نیازمندی اور سجدہ ریزی انہی کے گرد ہونے لگیں ! یہ یادگار پرستی ، قبر پرستی اور تصویر کشی ہی تک محدود نہیں ہے ، بلکہ اس کی اور بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں ، خاصکر مسلمانوں میں ۔ کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جامۂ مبارک اور موئے مبارک کی یادگار قائم ہے ، کہیں نعلین مبارک سر پر رکھ کر ان کے سامنے عقیدت کیشی کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ یہ یادگاریں صرف آنحضرتؐ کے متبرکات ہی تک محدود نہیں ہیں ۔ بلکہ اس میں بزرگوں اور صلحاء کے آثار و متبرکات شامل ہو گئے ہیں ۔ ان میں بیشتر فرضی ہیں ۔ اگر واقعی ان متبرکات کی نسبت آپؐ کی طرف صحیح ہو تو وہ قابل احترام ہیں مگر بہرحال ان کا احترام آپؐ کے حقیقی متبرکات کتاب و سنت سے زیادہ یا ان کے حدود سے باہر تو نہ ہونا چاہیئے !
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تمام یادگاروں سے روک دیا ہے ، جس سے آدمی کی توجہ خدا کی عظمت کے بجائے یا اس کے ساتھ کسی دوسری مخلوق کی عظمت کی طرف مبذول ہو جائے ۔ اس دنیا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے باعظمت کون انسان ہو سکتا ہے ۔ مگر آپؐ نے اپنی بھی اس طرح کی یادگار قائم کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے !

اسی بنا پر آپ نے تصویروں اور شبیہوں کے رکھنے ہی سے نہیں قبروں کے پختہ کرنے سے منع فرمایا۔ آپ نے اپنے تمام متروکات کو صدقہ قرار دیا تاکہ لوگ اس کو پرستش کے لئے یادگار نہ بنالیں۔ اور یہ چیز دنیا میں فتنہ بن جائے۔ اگلی امتوں نے اپنے انبیاء اور بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ اور عید گاہ بنا لیا تھا۔ اس لئے آپ نے بار بار تاکید فرمائی :۔

لا تتخذوا قبری مسجداً ۔ میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔

دوسری روایت میں ہے کہ :۔

لا تتخذوا عیداً ۔ میری قبر کو "عید" نہ بنانا۔

آپ کو اس کا اس قدر خیال تھا کہ وفات سے پانچ دن پہلے آپ نے فرمایا :۔

"تم سے پہلے لوگ قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے۔ دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنا لینا"

وفات سے چند گھنٹے پہلے آپ نے فرمایا کہ :۔

"خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے۔ ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا!

آپ نے فرمایا کہ اپنے گھروں کو قبر نہ بنا لینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے گھر قبروں کی طرح نہ ہوں۔ جہاں ذکر، عبادت اور دعا ممنوع ہے۔ آپ نے قبروں کے سلسلہ میں دو لفظ فرمائے ہیں۔ ایک "مسجد" دوسرے "عید"۔ مسجد کا مطلب یہ ہے کہ وہ افعال جو مسجدوں کے لئے مخصوص ہیں ان کا مظاہرہ قبروں پر نہ ہونے لگے۔ اور عید کے لفظی معنی بار بار لوٹنے کے ہیں۔ پس ہر وہ مقام عید ہے، جہاں لوگ بار بار جاتے ہیں۔ ہر وہ زمانہ عید ہے جس میں بار بار کوئی خاص کام کیا جاتا ہے۔ ہر وہ اجتماع عید ہے جو بار بار پیش آتا ہے۔

گویا آپ نے قبروں پر مکانی، زمانی اور صوری ہر طرح کی عید سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے اسی وجہ سے ان چیزوں سے بھی روک دیا ہے جو قبروں کے عید یا دگار بن جانے کا سبب بن جاتی ہیں۔ مثلاً قبروں پر چراغ جلانا۔ منتیں مانگنا۔ دعا کرنا۔ کسی قبر کو سامنے کر کے نماز پڑھنے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ کہ قبر کی عظمت کا کوئی تصور نماز پڑھنے والے یا دیکھنے والے کے ذہن میں نہ بیٹھ جائے!

چنانچہ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں بڑے بڑے حادثات پیش آئے، قحط پڑے، وبائیں پھوٹیں، مگر ایک صحابی نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے قریب جا کر نہ دعا مانگی اور نہ آپکو واسطہ بنایا!

بیشتر ائمہ اسلام قبر نبوی کے پاس بھی درود و سلام کے علاوہ دعا مانگنے کی اجازت نہیں دیتے۔ جو ائمہ اسکی اجازت بھی دیتے ہیں، وہ یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ قبر شریف سامنے نہ ہو۔ اس یادگار پرستی کو کس کس طرح مٹایا گیا ہے اس کے سلسلہ میں چند واقعات اور ملاحظہ ہوں :۔

مشرکین عرب ایک درخت کی تعظیم کرتے تھے۔ اور اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے۔ مسلمانوں نے دیکھا تو ان کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ اگر ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی درخت ہوتا تو اچھا تھا۔ آپ کو اس کا علم ہوا تو فرمایا۔

"اللہ اکبر! تم نے تو وہی بات کہہ دی جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہی تھی :۔

اجعل لنا الٰھاً کما لھم آلھۃ ۔ ہمارے لئے بھی ایک بُت بنا دیجئے جیسے کہ کفار کے لئے بُت ہیں !

ظاہر ہے کہ صحابہ کرام نے درخت کی کسی تعظیم کی بناء پر ایسا نہیں کہا تھا۔ مگر آپؐ نے اس خیال پر بھی سخت ناپسندگی کا اظہار کیا، اس لئے کہ آنے والوں کے لئے یہ یادگار بن جاتی ۔ اور اُن کے دلوں میں اس کی وہ عظمت و عقیدت قائم ہو جاتی جو بدعت اور گمراہی بلکہ شرک کا سبب بنتی ہے ــــ !

انہی ارشادات کی بناء پر صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اس طرح کی کسی یادگار کے قائم کرنے سے منع کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے کچھ شاگردوں نے ذکر و عبادت کے لئے کوئی جگہ مقرر کرلی اور وہاں جمع ہونے لگے ۔ ابن مسعودؓ کو علم ہوا تو بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ :۔

"کیا تم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہدایت پر استوار ہو۔ یا تم گمراہی کی راہ پر جا رہے ہو"

مقصد یہ تھا کہ اصحاب نبیؐ نے تو ایسا کیا نہیں۔ حالانکہ وہ تم سے زیادہ ہدایت یافتہ، دین سے واقف اور اُس کے شیدائی تھے ۔ اس کے باوجود انہوں نے اس طرح سے ذکر و عبادت نہیں کی، پھر تم کو کیا حق ہے ؟

غور کیجئے کہ اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔ ذکر و عبادت کے لئے کسی مقام کا تعین کوئی معصیت نہیں ہے۔ لیکن اگر صحابہ کے زمانہ میں یہ چیز قائم ہو جاتی تو پھر یہ مقام ایک مستقل فتنہ بن جاتا ۔ اس وجہ سے حضرت ابن مسعودؓ نے روک دیا ۔

جس درخت کے سایہ میں آنحضرت صلعم نے صلح حدیبیہ میں بیعت لی تھی۔ اس لوگ متبرک سمجھ کر اُس کی زیارت کو آنے لگے تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو اس کو کٹوا دیا ۔ اسی طرح لوگوں نے ان مقامات پر جا جا کر عبادت کرنی شروع کر دی، جہاں جہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔ تو حضرت عمرؓ نے اس سے لوگوں کو روکا اور فرمایا۔

"کیا تم اپنے نبی کے آثار کو مسجدیں بنا لینا چاہتے ہو ؟"

صحابہؓ کے زمانہ میں جو لوگ ان مقامات پر عبادت کے لئے جاتے تھے، یقیناً اُن کا مقصود جذبۂ اتباعِ سنّت اور برکت اندوزی ہی رہا ہوگا ۔ لیکن کتاب و سنّت کی تعلیم کی روشنی میں حضرات صحابہ کی دُور بین نگاہیں ان گمراہیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جو ان یادگاروں کے ذریعہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے انہوں نے بالکل ہی اس سے روک دیا۔

حدیث میں ان باتوں سے بھی روک دیا گیا ہے، جن میں غیر اللہ کی عظمت کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی پایا جاتا تھا۔ عرب میں عام طور پر غلاموں کو اُن کے مالک "عبدی" "میرا بندہ" اور غلام اپنے مالکوں کو "ربّی" کہا کرتے تھے ۔ چونکہ انسان کسی انسان کا عبد اور کوئی انسان کسی انسان کا رب نہیں ہے ۔ اس لئے آپؐ نے ایسے لفظ کے استعمال سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ لوگ اپنے غلاموں کو عبدی کے بجائے "فتائی" "میرے بچے یا میرے جوان ، اور غلام اپنے آقاؤں کو ربی کے بجائے مالک کہیں ۔

ایک صحابی کی کنیت ابوالحکم تھی۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ خدمت نبویؐ میں آئے تو آپؐ نے اُن سے پوچھا "حَکَم (فیصلہ کرنے والا) تو خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے۔ پھر تم کو کیوں ابوالحکم کہا جاتا ہے ؟ انہوں نے عرض کیا کہ

میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھی کو ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں وہ قبول کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے لوگوں نے مجھے یہ لقب دے دیا ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ "تمہارے بچوں کے نام کیا ہیں؟" بولے شریح، مسلم، عبداللہ۔ آپؐ نے فرمایا "تمہاری کنیت آج سے ابو شریح رہے گی۔"

ان تفصیلات کی روشنی میں آپ ان عقیدتوں اور عظمتوں کو دیکھیں۔ جن کا اظہار صلحاء اور اخیار کے متوسلین اُن کی زندگی میں اپنی مجلسوں اور غائبانہ تذکروں میں کرتے ہیں۔ اور اُن کی وفات کے بعد اُن کی قبروں، مزاروں، خانقاہوں اور اُن کے متروکات، ملفوظات اور اُن کی یادگاروں کے سلسلہ میں روا رکھتے ہیں۔

حالیؔ نے بہت صحیح کہا ہے:۔

کرے غیر گر بُت کی پُوجا تو کافر — جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر — کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبیؐ کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رتبہ نبیؐ سے بڑھائیں!
مزاروں پہ دن رات چادر چڑھائیں — شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

اسلام میں توحید اور مدعیانِ اسلام کی توحید

عقیدۂ توحید شرفِ انسانیت کی بنیاد ہے ۔ انسان کو کائنات میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کیلئے اور ان فرائض و واجبات سے جو اُس پر خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے عائد ہیں، عہدہ برا ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ عقیدۂ توحید پر یقین رکھتا ہو ۔ ایک "مسلم" کی زندگی کا محور یہی عقیدہ ہے ۔ اور یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے اخلاق و اعمال کی وہ تمام نہریں پھوٹتی ہیں جو انساں کی زندگی کو پربہار بناتی اور مرنے کے بعد اسے نعیم جنت سے ہمکنار کرتی ہیں ۔

جو مردِ مومن توحید کا صحیح و کامل اعتقاد رکھتا ہو وہ یقین رکھتا ہے کہ زندگی اور موت کا سررشتہ خدائے واحد کے ہاتھ میں ہے ۔ رزق کے خزانوں کی کنجی کا مالک وہی ہے، نفع و ضرر اس کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں ۔ لہٰذا گردن صرف اسی کے سامنے جھکائی جاسکتی ہے، اور حکم صرف اسی کا مانا جاسکتا ہے، اور دنیا و آخرت کی سعادت اسی کی فرمانبرداری میں مضمر ہے ۔ اور یہی معنی ہیں "اسلام" کے ۔ گویا اسلام اور عقیدۂ توحید لازم و ملزوم ہیں ۔

عقیدۂ توحید انسان کو صرف اس کی انفرادی زندگی ہی میں کامیاب و کامراں نہیں بناتا بلکہ وہ ایک ایسی مثالی سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے، جہاں سب انسان برابر ہوں سب کو حقوقِ انسانیت یکساں حاصل ہوں ۔ سب ایک کنبہ بن کر محبت و یگانگت کے ساتھ رہتے سہتے ہوں، اور ایک ہی قانون کے آگے سر جھکاتے ہوں، سب کا مطمح نظر ایک ہی ذات والا صفات کی رضا ہو، اور سب کی زندگی کا محور اسی خدائے واحد کا قانون ہو ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا خدا کے ایک مقدس پیغمبر نے مصر کے قید خانہ میں ان الفاظ میں اعلان کیا،

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ　　کیا متفرق بہت سے خدا اچھے یا ایک برتر و غالب خدا ؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی عظیم و رفیع عمارت کا سنگِ بنیاد اسی عقیدۂ توحید کو قرار دیا اور فرمایا :

بُنِيَ الاسلام علىٰ خمس شهادة ان لا اِلٰهَ الّا اللّٰه وَ ان محمداً عبدهٗ ورسولهٗ　　اسلام کی عمارت کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہو (پہلی) یہ کہ گواہی دیجائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "الٰہ" نہیں اور محمد اسکے بندے اور رسول بھی ہیں ۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ کلمہ شہادت میں اللہ کی وحدانیت اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کے ساتھ ساتھ آپ کی عبدیت کی تصریح کردی گئی ہے ۔ اس کی ایک خاص ضرورت تھی ۔ توحید باری کے عقیدہ میں دنیا کی تمام اقوام نے ٹھوکر کھائی ہی تھی، اہل کتاب بھی اس گمراہی سے نہ بچ سکے، اپنے انبیاء کرام کے مافوق العادت فضائل و کمالات اور خوارق و معجزات کو دیکھ کر اور ان کی عقیدت و محبت میں سرشار ہوکر وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ اگر خدا نہیں

تو خدا کے بیٹے یا خدا کے اوتار، یا خدائی اوصاف میں شریک ضرور ہیں۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اسلام گمراہی کے اس دروازہ اور فتنہ کے سرچشمہ کو بند کرتا۔ چنانچہ "رسولہ" کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے پہلے "عبدہ" کی وضاحت فرماکر یہ حقیقت آشکارا کردی گئی کہ خدا کا یہ آخری پیغمبر سب نبیوں کا سردار اپنے تمام اعلیٰ کمالات رسالت کے باوجود بہرحال خدا کا بندہ ہی ہے۔ اس کی خدائی میں کسی درجہ میں بھی شریک نہیں۔ گویا کلمۂ شہادت کا دوسرا جزو پہلے جزو کی تاکید و توثیق ہے۔

قرآن کریم نے جس قدر زور و قوت، جس قدر وضاحت و صراحت اور جس قدر اعادہ و تکرار کے ساتھ اس عقیدۂ توحید کو بیان فرمایا ہے کسی دوسرے کو بیان نہیں فرمایا۔ اگر ان تمام آیات کو جمع کیا جائے جو توحید باری سے متعلق ہیں تو ثلث قرآن سے کم نہ ہوں۔

قرآن کریم نے صرف عقیدہ توحید کے بیان ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے مختلف قسم کے دلائل و براہین بھی بیان فرمادیئے ہیں اور انسانوں کی مختلف النوع طبیعتوں کا لحاظ فرماتے ہوئے ہر طرح اس عقیدہ کو ان کے دماغ میں مرتسم اور دلوں میں پیوست کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے

دلیل نقل :-

ہر قوم و ملت کا طریقہ ہے کہ اپنے بزرگوں کی روایات کی قدر کرتی ہے، ان کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتی ہے۔ خصوصاً وہ بزرگ جنہوں نے سوسائٹی میں انقلاب برپا کردیا ہو، جنہوں نے قوم کو اخلاقی پستی کے غار سے نکال کر بلندی کی معراج پر پہونچادیا ہو، اور غلامی کا طوق ان کی گردنوں سے نکال کر جہاں بانی کی باگ ان کے ہاتھ میں دیدی ہو۔ جن کو وہ قوم خدا کا پیغمبر، بلکہ اس سے بھی زیادہ سمجھتی ہو۔ قرآن کریم نے پہلے مجملاً فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُوْلٍ
إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا
فَاعْبُدُوْنِ

ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب کی طرف یہی وحی نازل کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا صرف میری ہی عبادت کرو

پھر تاریخ عالم کی ان تمام قوموں کے، جن کے شاندار یا ناکام ماضی کی داستانیں لوح تاریخ پر ثبت ہیں نام لے لے کر بتایا کہ ان سب اقوام کے مصلحوں اور ہادیوں نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت کا پیغام سنایا اور اسی کی عبادت کی طرف بلایا۔ اس سلسلہ میں پوری تفصیل کے ساتھ حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک سب ہی ممتاز پیغمبروں کا ذکر فرمایا۔ پھر فرمایا کہ جب توحید باری کی دعوت تمام پیغمبروں کی مشترک دعوت ہے تو آؤ اسی کو بنیاد اتحاد بناؤ۔ اگر توحید کو قطعیت و جامعیت کے ساتھ قبول کرلو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ اسلام کے دوسرے اصول و احکام بھی تسلیم کرنے ہی پڑیں گے کیونکہ وہ سب توحید کامل کے لوازم میں سے ہیں اور توحید کی ان کو مانے بغیر تکمیل نہیں ہو سکتی۔

تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
أَنْ لَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا

آؤ وہ بات مان لو جو ہمارے اور تمہارے درمیان متفق علیہ ہے اور وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔

دلیل عقل :-

قرآن کریم نے بتایا کہ عقیدہ توحید روایت سے ہی نہیں درایت سے بھی ثابت ہے، نقل صحیح ہی کا نہیں عقل سلیم کا بھی یہی تقاضہ ہے۔ اس سلسلہ میں فلسفہ زدہ دماغوں کو مطمئن کرنے کیلئے قرآن کریم نے یہ دلیل پیش فرمائی:-

أَمِ اتَّخَذُوْا آلِهَةً مِنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ
لَوْ كَانَ فِيْهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللّٰهِ
رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

(الانبیاء ۲)

کیا انھوں نے زمین میں اللہ کے سوا اور معبود بھی ٹھہرائے ہیں جو ان کو موت کے بعد دوبارہ زندگی دیں۔ اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا دوسرے معبود بھی ہوتے تو زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جاتے لہٰذا اللہ عرش کا مالک ان الزامات شرک سے جو یہ اس پر لگاتے ہیں پاک ہے۔

اس دلیل کی تشریح یہ ہے کہ عبادت، ذلت و بے چارگی کے کامل طور پر اظہار کا نام ہے، اور کمال ذلت و بے چارگی کا اظہار اسی ذات کے سامنے مناسب ہے جو کمال عزت و قدرت سے متصف ہو اور ہر قسم کے نقص و عیب سے مبرا ہو۔ اب اگر بالفرض زمین و آسمان میں دو خدا تسلیم کر لئے جائیں تو پوچھا جائے گا کہ عالم کے تصرف و تدبیر میں دونوں میں رائے کا اتفاق رہتا ہے یا کبھی کبھی اختلاف بھی ہو جاتا ہے، اگر کہا جائے کہ ہمیشہ اتفاق ہی رہتا ہے۔ تو یا تو ایک تنہا کام نہیں چلا سکتا بلکہ مل جل کر دونوں چلاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ دونوں ناقص ہیں، اور اگر ایک بھی تنہا کام چلا سکتا تھا تو دوسرا زائد ٹھہرا اور ایک زائد و بے کار خدا کو خدا ماننا ہی بیکار ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ دونوں مفروضہ خداؤں میں کبھی کبھی اختلاف بھی ہو جاتا ہے تو یا تو ایک مغلوب ہو کر خاموش ہو جاتا ہوگا۔ اس صورت میں یہ مغلوب ناقص ہوا اور خدائی کا اہل نہ رہا یا دونوں برابر کی قوت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے اور ہر ایک اپنی رائے اور ارادہ کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے گا۔ اس صورت میں تمام کارخانۂ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ خدا جو کمال عزت و قدرت کا مالک ہے ایک ہی ہے اور اسی کی بارگاہ عظمت و جلالت میں انسان جو اشرف المخلوقات ہے سر تسلیم و تعظیم خم کر سکتا ہے

دلیل وجدان :-

مگر چونکہ اہل عقل دنیا میں کم ہیں اور عقلاء وقت کی عقول میں باہم تصادم بھی ہوتا رہتا ہے اس لئے قرآن حکیم نے انسان کے وجدان کو پکارا اور فطرت انسانی کے مطالعہ کی دعوت دی۔ چنانچہ فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّى إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

(یونس-۳)

وہی خدا ہے جس نے تمہارے لئے خشکی اور تری میں چلنے پھرنے کا سامان کیا پھر جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہوتے ہو اور وہ موافق ہوا میں چلنی شروع ہوتی ہیں اور تم اس سے خوش ہوتے ہو تو اچانک تیز و تند ہوا کے جھکڑ چلنے شروع ہو جاتے ہیں اور سمندر کی موجیں تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور تم کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب گھر گئے تو ایسے نازک وقت تم مخلصانہ فرمانبرداری کے جذبہ کے ساتھ اللہ ہی کو پکارتے ہو اور کہتے ہو کہ اے اللہ اگر تو نے ہم کو اس مصیبت سے نجات دیدی تو ہم ضرور تیرے شکر گذار ہونگے لیکن جب تم کو اللہ نجات دیدیتا ہے تو پھر اچانک دنیا میں ناحق خونریزی شروع کر دیتے ہو۔

یعنی انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب تک وہ آرام و اطمینان اور عیش و راحت کی حالت میں رہتا ہے اسے خدا یاد نہیں آتا۔ وہ اپنی فارغ البالی اور خوشحالی کو اپنی کوششوں کا نتیجہ سمجھتا ہے اور اسباب سے آگے بڑھ کر مسبب الاسباب تک اس کی نظر نہیں پہونچتی اور اگر خدا کی طرف دھیان بھی کرتا ہے تو بہت سے شرکاء و شفعاء و وسطاء کی فوج کو بھی اس کے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ لیکن اگر کبھی کسی سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں ظاہری اسباب کے سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے ہیں اور موت کا فرشتہ سامنے کھڑا نظر آنے لگتا ہے تو اس کا وجدان خفتہ یکایک بیدار ہو جاتا ہے اس کی فطرت کا زنگ آلود آئینہ یکایک چمک اٹھتا ہے اور وہ جذبۂ اطاعت خداوندی کے کامل اخلاص، دل کی پوری توجہ اور زبان کی پوری طاقت سے پکار اٹھتا ہے۔

"اے خدا! اے بے سہاروں کے سہارے میری کشتی کو بھی ساحل مراد پر لگا اور مجھے ہلاکت کے اس طوفان اور مصائب کے اس بھنور سے نجات دے۔ اگر تو نے مجھے اس مصیبت سے بچا لیا اور اپنے دامانِ امن

دعافیت میں پناہ دی تو میں باقی عمر تیری شکرگذاری میں صرف کروں گا اور تیرے دروازہ
کو چھوڑ کر کسی دوسرے دروازہ پہ قدم بھی نہ رکھوں گا۔"

خداوند علام الغیوب تو ماضی و مستقبل پر بیک وقت نظر رکھتا ہے۔ اسے کوئی دھوکا نہیں دے سکتا۔ مگر یہ اس کی ایک سنت ہے کہ وہ مضطرب دل سے نکلی ہوئی صدا کو رد نہیں کرتا خواہ وہ کافر ہی کے دل سے نکلے۔ مگر ہوتا یہ ہے، موت کی گرفت سے نکلتے ہی ظالم انسان پھر اپنے گناہوں میں سرشار ہو جاتا ہے، شر و فساد کا بازار گرم کر دیتا ہے، فتنہ و بغاوت کے ہنگامے اٹھا کھڑے کرتا ہے۔ سچے خدا سے منہ موڑ کر جھوٹے معبودوں سے رشتہ جوڑتا ہے اور اپنے تمام عہدوں کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالتا ہے۔

فطرت انسانی کی یہ ایک ایسی صحیح تحقیق ہے جو فاطر السموات و الارض کے سوا کسی اور سے ممکن نہ تھی۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ "توحید الٰہی" فطرت انسانی کا اصل تقاضہ ہے اور ضمیر و وجدان کی پہلی اور آخری پکار۔ اور یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ کفار عرب جو ہر صبح کو ایک نئے معبود کے آگے سر جھکاتے تھے اور جنہوں نے کعبہ میں بتوں کی ایک دوکان سجا رکھی تھی وہ بھی اصل معبود اور "الٰہ الالٰہ" خدائے واحد ہی کو مانتے تھے۔ دوسرے معبودوں کو وہ اس کے دربار کا شفیع اور اس کی بارگاہ کا مقرب قرار دیتے تھے اور دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھتے تھے کہ خدا پر ان کا اثر ہے اور وہ ان کی بات ماننے پر مجبور ہے چنانچہ کہتے تھے:

هٰٓؤُلَاۤءِ شُفَعَاۤؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ یہ تو خدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

نیز ان کا یہ بھی خیال تھا کہ خدا نے کارخانۂ عالم کے مختلف کام ان چھوٹے معبودوں کے سپرد کر دیئے ہیں۔ یہ اگرچہ اس کے مملوک ہیں مگر کارخانہ عالم کے انتظامات میں اس کے شریک ہیں اور اپنی محدود خدائی قوتوں کے ساتھ خداوند اعلیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کی حاجت روائی و مشکل کشائی کرتے ہیں۔ چنانچہ حج کے موقع پر ان کا تلبیہ یہ ہوتا تھا:-

لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ اِلَّا شَرِیْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ حاضر ہوں اے خدا، تیرا کوئی مستقل بالذات شریک نہیں لیکن ایسا شریک ہے جو تیرا اپنا ہی ہے اور تو اس کا مالک ہے اور اسکے اختیارات کا مالک ہے۔

مگر جب کسی سخت ترین مصیبت میں گھر جاتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ بات ان ماتحت خداؤں کے حدود اختیارات سے باہر ہے، خدائے اعلیٰ و اجل کے سوا کوئی ہماری مشکل کو حل نہیں کر سکتا تو آخر کار اسی کی طرف رجوع ہو جاتے تھے اور سب وسطاء و شفعاء نظر انداز کر کے اس کو پکارتے تھے مذکورہ بالا آیات کے شان نزول میں مفسرین نے ابو داؤد وغیرہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس سے اس حقیقت کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس روایت کا خلاصہ یہ ہے:-

"فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابۂ کرام کی فوج ظفر موج کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو ابوجہل کا بیٹا عکرمہ جس نے اپنے باپ کے دوش بدوش حضور کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا مکہ سے فرار ہو کر ساحل سمندر پر پہونچا اور ایک کشتی میں بیٹھ کر دوسرے ملک کی راہ لی۔ تھوڑی دور چل کر کشتی کو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا، ملاحوں نے کہا، مسافرو! سخت نازک وقت ہے اس وقت تمہارے معبود کسی کام نہ آئیں گے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا چاہتے ہو تو صرف خدائے واحد کو پکارو۔ یہ سنکر عکرمہ نے کہا یہ تو وہی بات ہے جو محمدؐ کہتے ہیں۔ اگر سمندر میں نجات کا انحصار اسی پر ہے تو بے شک خشکی میں بھی وہی نجات دے سکتا ہے۔ پھر کہا اے اللہ! میرا تجھ سے عہد ہے اگر تو نے مجھے اس مصیبت سے نجات دیدی تو میں محمدؐ کی خدمت میں

حاضر ہو کر اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دوں گا اور پھر میں انھیں معاف کرنے والا اور کرم کرنے والا پاؤں گا۔ چنانچہ عکرمہؓ کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اس نے نجات پاکر اپنے عہد کو پورا کیا۔"

کفارِ مکہ کے شرک کی نوعیت تو یہ تھی۔ اب آیئے ہم مدعیانِ اسلام اور علمبردارانِ توحید کی توحید پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ ممتاز فقہی مفسر علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ اپنی مشہور تفسیر "روح المعانی" میں ان آیات کے تحت لکھتے ہیں:-

فالآیة دالة علی ان المشرکین لا یدعون غیر اللہ تعالیٰ فی تلک الحال وانت خبیر بان الناس الیوم اذا اعتراهم امر خطیر وخطب جسیم فی بر او بحر دعوا من لا یضر ولا ینفع ولا یری ولا یسمع فمنهم من یدعو الخضر والیاس ومنهم من ینادی ابا الخمیس والعباس ومنهم من یضرع الی شیخ من مشائخ الامة ولا تری فیهم احدا یخص مولاه بتضرعه ودعاه ولا یکاد یمر له ببال انه لو دعا اللہ تعالیٰ وحده ینجو من هاتیک الاهوال فباللہ تعالیٰ علیک قل لی ای الفریقین من هذه الحیثیة اهدی سبیلا وای الداعیین اقوم قیلا والی اللہ تعالیٰ المشتکی من زمان عصفت فیه ریح الجهالة وتلاطمت امواج الضلالة وخرقت سفینة الشریعة واتخذت الاستغاثة بغیر اللہ تعالیٰ للنجاة ذریعة وتعذر علی العارفین الامر بالمعروف وحالت دون النهی عن المنکر صنوف الحتوف

آیت دلالت کرتی ہے کہ اس حالت میں مشرکین سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں پکارتے اور تمہیں معلوم ہے کہ آج (اسلام کے مدعی) لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب انھیں کوئی سخت حادثہ یا بڑی مصیبت پیش آتی ہے خشکی میں یا تری میں، وہ ان کو پکارتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ ضرر ہے نہ نفع، نہ وہ ان کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کی بات سن سکتے ہیں۔ کوئی حضرت خضر و الیاس (علیہ السلام) کو پکارتا ہے کوئی جناب ابوالخمیس و عباس کو آواز دیتا ہے کوئی کسی امام سے فریاد کرتا ہے کوئی کسی شیخ کے سامنے آہ و زاری کرتا ہے۔ ان میں تم کسی کو نہ پاؤ گے جو اپنی فریاد و دعا اللہ کے ہی حضور میں پیش کرتا ہو اور کسی کے دل میں یہ خیال بھی نہیں گذرتا کہ اگر وہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا تو ان مصیبتوں سے نجات پائے۔ تو تمہیں قسم ہے خدا کی بتاؤ ان دونوں فریقوں میں سے کون اس حیثیت سے ہدایت سے زیادہ قریب ہے اور کس کی پکار زیادہ درست ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے شکایت ہے ایسے زمانہ کی جس میں ہر طرف جہالت کے جھکڑ چل رہے ہوں اور ضلالت کی موجیں اٹھ رہی ہیں شریعت کی کشتی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے اور غیر اللہ سے فریاد کو نجات کا ذریعہ قرار دے لیا گیا ہے اور حالت اس قدر نازک ہو گئی ہے کہ جاننے والوں کے لئے امر بالمعروف دشوار ہو گیا ہے اور نہی عن المنکر کے راستہ میں ہلاکتوں کے غار حائل ہیں۔

علامہ آلوسی بغدادیؒ نے مندرجہ بالا سطور میں مدعیان اسلام کی جس کفر شعاری کا رونا رویا ہے اس کی وبا تمام بلاد اسلامیہ میں عام ہے۔ اللہ کی مساجد غیر آباد اور بے رونق ہیں اور مقابر اولیاء و صلحاء (موحدین (؟)) کے سجدوں سے معمور۔ تمام عمر سفر حج کی توفیق نہیں ہوتی مگر بزرگان دین کے عرسوں میں شرکت کے لئے ہر سال شد رحال ضروری۔ خدا کے سامنے التجا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھتے مگر قبور اولیاء کے سرہانے درخواستوں اور عریضوں کے انبار موجود۔ عقل کی ظلمت، قلب کی غفلت اور وجدان کی موت کی انتہا ہے کہ سخت ترین احوال میں مصائب و آلام کے ہجوم میں گھر کر اور حوادث و نوائب کے طوفان میں پھنس کر جب مشرکین مکہ جیسے کافر بھی خدائے واحد کی طرف رجوع ہو جاتے تھے آج ان مدعیان توحید کو خدا یاد

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

مولانا محمد ادریس ندوی نگرامی

پیامِ توحید

اکابرِ اُمّت کی تصریحات!

خدا کی توحید کا اقرار و اعتراف، اور اسی رنگ میں اپنی زندگی کو رنگ لینا ہر مسلمان کا اساسی اور بنیادی فریضہ ہے۔ اسی لیے علمائے اُمت نے ہر دور میں مسلمانوں کو اس فرض سے ہشیار کیا، ان کو توحیدِ الٰہی کی راہ بتلایا اور شرک سے نفرت دلایا۔ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے رسالہ "الواسطۃ بین الحق والخلق" میں، علامہ امیر یمانی نے رسالہ "تطہیر الاعتقاد" میں اور علامہ مقریزی نے رسالہ "تجرید التوحید" میں بہت ہی مفید اور مؤثر انداز سے گفتگو فرمائی ہے۔ ذیل کی سطروں میں انہی تینوں رسالوں کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے نفع پہنچائیں، ہم کو توحید کی لذت سے آشنا فرمائیں اور توحید کو صرف قال نہیں بلکہ ہمارا حال بھی بنائیں۔ آمین ——— م ق

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ خدا اور اس کے بندہ کے درمیان کسی واسطہ کا ہونا ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہم اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتے ہیں (یہ بات صحیح ہے کہ نہیں؟)

شیخ الاسلام نے فرمایا۔ اگر کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایسا واسطہ ہونا چاہیئے جو ہم تک اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچائے تو یہ صحیح ہے، اس لئے کہ مخلوق کو اس بات کا کیا علم کہ اللہ کس چیز سے خوش ہوتا ہے؟ اس کو کیا چیز پسند ہے؟ اس کا کیا حکم ہے؟۔ اور نہ یہ معلوم کہ اس نے اپنی اطاعت کرنے والوں کے لئے کیا کیا نعمتیں تیار کر رکھی ہیں؟ اور نہ اس کی خبر کہ نافرمانوں کے لئے اس کے یہاں کیسا عذاب مقرر ہے؟ اسی قسم کی بہت سی چیزیں ہیں جن کو انسان خدا کے رسولوں اور نبیوں کے بغیر نہیں جان سکتا۔ پس یہ عقیدہ صحیح ہے۔ اور پیغمبروں پر ایمان لانے والے، ان کی پیروی کرنے والے ہی ہدایت پر ہیں، وہی اللہ کے مقرب ہیں، اللہ انہی کے درجات بلند فرمائے گا، اور دنیا و آخرت میں سرفراز فرمائے گا۔ اور جو لوگ پیغمبروں کے مخالف ہیں وہ رحمتِ پروردگار سے دور ہیں۔ اپنے رب سے گمراہ ہیں، ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

یٰبَنِیٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ
عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا
بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْہَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ
ہُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ ○ (سورۂ اعراف)

"اے اولادِ آدم اگر تمہارے پاس پیغمبر آئیں جو تم ہی میں سے ہونگے، جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے۔ جو شخص تقویٰ رکھے اور درستی کرلے تو ان لوگوں پر نہ کچھ اندیشہ ہے، نہ وہ غمگین ہونگے۔ اور جو ہمارے ان احکام کو جھوٹا بتائیں گے ان سے تکبر کرینگے وہ لوگ دوزخ والے ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہوا:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ہُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ ہُدَایَ

"پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو شخص

فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ
فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
اَعْمٰى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ
بَصِيْرًا قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا
وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (سورۂ طٰہٰ)

میری اس ہدایت کا اتباع کریگا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے روز اسکو اندھا کرکے اٹھائیں گے وہ کہے گا کہ اے میرے رب آپنے مجھکو اندھا کرکے کیوں اٹھایا میں آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا ایسے ہی تیرے پاس میرے احکام پہنچے تھے پھر تونے اسکا کچھ خیال نہ کیا اور ایسے ہی آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جاوے گا۔"

اہل دوزخ کے متعلق فرمایا :-

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ
نَذِيْرٌ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا
مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ
كَبِيْرٍ (سورۂ ملک)

جب اس میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا تو اس کے محافظ ان لوگوں سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا وہ کافر کہیں گے واقعی ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا سو ہم نے جھٹلا دیا اور کہدیا کہ خدا تعالیٰ نے کچھ نازل نہیں کیا تم بڑی غلطی پر ہو۔

سورۂ زمر میں ارشاد ہوا :-

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتّٰىٓ اِذَا
جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ
اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ
رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا
بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝ (سورۂ زمر)

اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہانکے جائیں گے یہانتک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے تو ان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور ان سے دوزخ کے محافظ کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغمبر نہ آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیات پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے۔ کافر کہیں گے ہاں۔ لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر پورا ہو کر رہا۔

قرآن پاک میں اس طرح کی بہت سی آیتیں ہیں، مسلمان، یہود، نصاریٰ، ان کے سوا اور تمام مذہب وملت والوں نے خدا وبندہ کے درمیان رسولوں کو واسطہ تسلیم کیا ہے اور ان کے منکر کو کافر سمجھا ہے۔ قرآن پاک میں یہ حقیقت بار بار واضح کی گئی ہے کہ پیغمبروں کے جھٹلانے والے ہلاک ہوئے اور ان کی پیروی کرنے والے کامیاب وشادکام ہوئے۔ فرمایا :

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ
لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝ (سورہ الصّٰفّٰت)

اور ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے یہ قول ہمارا پہلے ہی سے مقرر ہو چکا ہے۔ بیشک وہی غالب کئے جائیں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب رہتا ہے۔

ارشاد ہوا :-

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ۔

بیشک ہم ضرور مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں اور اس دن مدد کرینگے جب کہ گواہ کھڑے ہوں گے۔

قرآن کہتا ہے کہ عبد اور معبود کا واسطہ یعنی پیغمبر اس لئے ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ فرمایا :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اس واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خدا انکی اطاعت کیجائے۔

لیکن اگر واسطے سے مقصد یہ ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ایسی ہستی ہو جس سے نفع و نقصان کے وقت مدد چاہی جائے (رزق، اولاد، بیماری، شفا، قرض وغیرہ کے معاملات میں اس سے بالذات مدد چاہی جائے) تو یہ شرک ہے۔ مشرکین کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس لئے کافر قرار دیا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے نفع و نقصان کا معاملہ ٹھہرایا تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنا شفیع و ولی جانا تھا۔ ارشاد فرمایا:-

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ

بدون اُس کے نہ تو تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارش کرنے والا۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

فرمایا:-

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ

اور ایسے لوگوں کو ڈرایئے جو اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس ایسی حالت میں جمع کئے جائیں گے کہ جتنے غیر اللہ ہیں نہ کوئی ان کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع۔

ارشاد ہوا:-

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (سورۂ بنی اسرائیل)

آپ فرما دیجئے کہ جنکو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ان کو پکارو تو سہی وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا یہ لوگ جنکو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کا ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے، وہ اسکی رحمت کے امیدوار ہیں اور اسکے عذاب سے ڈرتے ہیں واقعی آپکے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کے قابل۔

فرمایا:-

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِیْرٍ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سورۂ سبا)

آپ فرمایئے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو، وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے ہیں نہ آسمانوں میں نہ زمین میں نہ انکی ان دونوں میں شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے، اور خدا کے سامنے سفارش کسی کے لئے نہیں آتی مگر اسکے لئے جسکی نسبت اجازت دی جائے۔

سلف کی ایک جماعت کہتی ہے کہ ایک گروہ حضرت مسیحؑ حضرت عزیرؑ اور فرشتوں کی پرستش کرتا تھا تو اللہ نے ان کے لئے فرمایا کہ فرشتے اور پیغمبر مصیبتوں کو دور نہیں کرسکتے ہیں، وہ لوگ خود اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ وَلَا یَاْمُرَكُمْ اَنْ

کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بنجاؤ خدائے تعالیٰ کو چھوڑ کر لیکن کہے گا تم لوگ اللہ والے بنجاؤ بوجہ اسکے کہ تم کتاب سکھاتے ہو بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو اور یہ نہ بتلائے گا

تتخذوا الملٰئکۃ والنبیین اربابا ایأمرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون ○ (آل عمران)

کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب قرار دے لو کیا وہ تم کو کفر کی بات بتلائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔

اللہ تعالیٰ نے کھول کر بیان فرمادیا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو رب بنانا کفر ہے پس جس نے نبیوں اور فرشتوں کو ایسا واسطہ تسلیم کیا کہ ان کی عبادت کی جائے، انھیں پر توکل کیا جائے۔ نفع اور نقصان کے اوقات میں انھی کی طرف رجوع کیا جائے تو ایسا آدمی اجماعی طور پر کافر ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا:-

وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدا سبحانہ بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ وھم من خشیتہ مشفقون ومن یقل منھم انی الٰہ من دونہ فذٰلک نجزیہ جھنم کذٰلک نجزی الظٰلمین ○ (سورۂ انبیاء)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد بنا رکھی ہے وہ پاک ہے بلکہ بندے ہیں معزز وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے اور اسی کے موافق عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اگلے پچھلے اعمال جانتا ہے اور بجز اسکے جس کیلئے اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے اور وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے ڈرتے ہیں اور ان میں سے جو شخص کہے کہ میں علاوہ خدا کے معبود ہوں تو ہم اس کو سزائے جہنم دینگے ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔

فرمایا:-

لن یستنکف المسیح ان یکون عبدا للہ ولا الملٰئکۃ المقربون ومن یستنکف عن عبادتہ ویستکبر فسیحشرھم الیہ جمیعا ○ (سورۂ نساء)

مسیح ہرگز اللہ تعالیٰ کے بندے بننے سے عار نہیں کریں گے اور مقرب فرشتے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے عار کریگا اور تکبر کرے گا تو خدا تعالیٰ ضرور سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔

ارشاد ہوا:-

ویعبدون من دون اللہ ما لا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھٰؤلاء شفعاؤنا عند اللہ قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم فی السمٰوٰت وفی الارض سبحٰنہ وتعالیٰ عما یشرکون ○ (سورۂ یونس)

اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انکو ضرر پہنچا سکے اور نہ ان کو نفع پہنچا سکے اور کہتے ہیں کہ اللہ کے پاس یہ ہمارے سفارشی ہیں آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا تعالیٰ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کی شرکت سے۔

فرمایا:-

وکم من ملک فی السمٰوٰت لا تغنی شفاعتھم شیئا الا من بعد ان یاذن اللہ لمن یشاء ویرضیٰ۔ (سورۂ نجم)

اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں موجود ہیں ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی۔ مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جب حکم دے اور جس کے واسطے چاہے اور پسند کرے۔

ارشاد ہوا:-

من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ (سورۂ بقرہ)

ایسا کون شخص ہے جو اسکے پاس سفارش کر سکے بدون اسکی اجازت کے۔

فرمایا:-

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۔ (سورۂ فاطر)

اللہ جو رحمت لوگوں کے لئے کھول دے تو اس کا بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کر دے تو اس کے بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں ۔

ارشاد ہوا:-

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (سورۂ زمر)

آپ کہئے پھر بھلا یہ تو بتلاؤ کہ خدا کے سوا تم جن معبودوں کو پوجتے ہو اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں یا اللہ تعالیٰ مجھ پر عنایت کرنا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی عنایت کو دور کر سکتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے خدا کافی ہے توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں ۔

انبیائے کرام کے سوا علماء اور مشائخ دین کا بھی یہی حال ہے ۔ کہ جس نے ان کو رسول اور رسولوں کی امت کے درمیان ایسا واسطہ تسلیم کیا کہ یہ امت تک رسول کے احکام پہنچاتے ہیں ۔ اُمت کو تعلیم دیتے ہیں اور اس کی رہنمائی کرتے ہیں ' پس اس نے بالکل درست عقیدہ قائم کیا۔ اور جس نے یہ سمجھا کہ یہ فقیر اور درویش اور مشائخ خدا اور بندے کے درمیان اس طور سے واسطہ ہے کہ مخلوق اپنی ضروریات کو ان کے سامنے پیش کرتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتے ہیں ' اور اللہ تعالیٰ انہی کے توسط سے رزق وغیرہ دیتا ہے (یعنی جس طرح بادشاہ رعایا کے درمیان ایک جماعت ایسی ہوتی ہے کہ رعایا اپنی ضروریات کو اس امید پر کہ یہ جماعت بادشاہ سے زیادہ قریب ہے اس لئے اس کا ذریعہ اختیار کرنے میں نفع کی توقع ہے اس جماعت کے سامنے پیش کرتی ہے اور یہ بادشاہ سے عرض کرتے ہیں) پس جس نے علماء اور مشائخ کو ایسا واسطہ قرار دیا وہ گمراہ ہے ' اس کو توبہ کرنا چاہیئے ۔ بادشاہ اور رعایا کے درمیان جو جماعت واسطہ ہوتی ہے اس کے تین اسباب ہوتے ہیں ۔ اوّل یہ کہ یہ جماعت بادشاہ کو لوگوں کے ان احوال کی خبر کرتی رہے جن سے وہ ناواقف ہے ۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کو اس جماعت کی ضرورت نہیں ہے ' اس لئے کہ وہ عالم الغیب ہے کھلی اور پوشیدہ ہر چیز کو جانتا ہے ' زمین اور آسمان کی کوئی شے اس سے چھپی نہیں ہے ۔ لوگ مختلف آوازوں میں ' مختلف زبانوں میں ' مختلف ضرورتوں کو اس کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں اور وہ سب کو سُنتا ہے ۔ اس لئے جس شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے احوال سے اس وقت تک ناواقف رہتا ہے جب تک کہ بعض فرشتے یا انبیاء (یا بزرگانِ دین) اسے خبر نہ دیں ' تو وہ بالاجماع کافر ہے ۔

دوسرے یہ کہ بادشاہ کو نظام سلطنت کے سلسلہ میں مددگار کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ تنِ تنہا بادشاہت کے سارے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے ۔ لہٰذا وہ مجبور رہے کہ اپنے لئے رفقاء کار کو تلاش کرے ۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ان امور سے اعلیٰ و اشرف ہے اُسے کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے ۔ ارشاد ہوا:-

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۔ (سورۂ سباء)

آپ فرمائیے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو ' وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے نہ آسمانوں اور نہ زمین اور نہ ان دونوں میں ان کی کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی مددگار اللہ کا ہے ۔

فرمایا:-

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ
لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ
الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا ۔ (سورۂ بنی اسرائیل)

اور کہہ دیجئے تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے
اور نہ کوئی اس کی سلطنت میں شریک اور نہ کمزوری کی وجہ سے
اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی خوب بڑائیاں بیان کیا کیجئے ۔

دُنیا میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اس کا مالک، پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے ۔ وہ ہر چیز سے بے پرواہ ہے اور سب چیزیں اس کی محتاج ہیں دُنیاوی بادشاہوں کا معاملہ اس سے بالکل جداگانہ ہے ۔ وہ اپنے مددگاروں کے محتاج ہیں، ان کے مددگار ان کی بادشاہی میں شریک ہیں ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی شریک نہیں وہ اکیلا ہے ۔ بادشاہی اس کی ہے، تعریف اس کی ہے، وہی ہر چیز پر قادر ہے ۔

تیسرے یہ کہ بادشاہ خود اپنی رعایا کے ساتھ سلوک نہیں کرنا چاہتا لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے بادشاہ کو کچھ خوف ہے یا ان سے کچھ اغراض وابستہ ہیں، ان کی تحریک پر بادشاہ رعایا کے ساتھ رحم وکرم کے برتاؤ پر اپنے کو مجبور پاتا ہے ۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ہر چیز کا مالک اور رب ہے ۔ جس قدر ایک ماں کو اپنے بچے سے محبت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان سے کہیں زائد رحیم ہے ۔ ہر چیز اسی کی مشیت سے ہوتی ہے ۔ جو کچھ اس کی مرضی ہوئی وہ پوری ہوئی اور جو کچھ چاہے گا وہ ہوگا ۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو نفع پہنچانا چاہتا ہے تو کسی کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھلائی کرے، اس کے لئے دعائیں کرے اور اس کے لئے شفاعت کرے ۔ دیکھو ہر چیز اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوئی، یہ ناممکن ہے کہ کوئی ہستی بھی ہو جو خدائے برتر کو اس کی مرضی کے سوا کسی چیز پر مجبور کرے یا اس قدر علم رکھتا ہو کہ اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کو بتلانے کی ضرورت پڑے یا جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کو خوف ہو یا کچھ توقعات وابستہ ہوں، شفاعت بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بغیر اس کی اجازت کے نہ ہو سکے گی ۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ
(سورۂ بقرہ)

ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدون
اس کی اجازت کے ۔

یہ چیز اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو پکارا جاتا ہے وہ نہ تو بادشاہ ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کے شریک ہیں اور نہ اس کے مددگار ہیں ۔ اور ان کی شفاعت ہرگز نفع نہ دیگی ۔ ہاں ان لوگوں کے حق میں ضرور نفع بخش ہوگی جن کی شفاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہو صاف صاف ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ نفع اور نقصان کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، بلکہ وہ خود اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں ۔ فرمایا :-

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا
یَمْلِکُوْنَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنْکُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا
اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ
الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ
وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ کَانَ
مَحْذُوْرًا ۔ (سورۂ بنی اسرائیل)

آپ فرما دیجئے کہ جن کو تم خدا کے علاوہ قرار دیتے ہو ذرا ان کو پکارو
تو وہ نہ تم سے تکلیف کے دُور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے
بدل ڈالنے کا ۔ یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب
کا ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ قریب ہوتا ہے اور وہ
اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں واقعی
آپ کے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کے قابل ۔

اور شفاعت کو ایک قسم کی دُعا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مخلوق کی دُعا ایک دوسرے کے لئے نفع بخش ہوتی ہے، لیکن شفاعت کرنے والے کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کے حق میں شفاعت کرے، اور نہ ان لوگوں کی شفاعت کر سکتا ہے جن کے لئے صریح ممانعت ہو ۔ مثلاً مشرکین کی شفاعت یا ان کے حق میں دعائے مغفرت کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا :-

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۔ (سورۂ توبہ)

پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے دعائے مغفرت مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہو اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد یہ لوگ دوزخی ہیں اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت مانگنا وہ صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہو گئے۔

منافقین کے حق میں فرمایا :-

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۔

ان کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں خواہ آپ ان کے حق میں استغفار کریں یا نہ کریں اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مشرکین اور منافقین کے لئے استغفار سے منع فرما دیا ہے اور آگاہ کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں معاف نہیں فرمائیگا۔

ارشاد فرمایا :-

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرے، اور اس کے سوا جتنے گناہ ہیں جس کو چاہے گا بخش دیگا۔

مقصود یہ ہے کہ جب اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان ایسا واسطہ تسلیم کیا جیسے بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہوتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ مشرکین کہا کرتے تھے کہ یہ بت انبیاء اور صالحین کے مجسمے ہیں ان کے ذریعہ سے ہم اللہ کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔ یہی وہ شرک ہے جس کے متعلق اللہ تبارک و تعالیٰ نے نصاریٰ پر رد کیا ہے۔ فرمایا :-

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۔

بنالیا اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا، اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی! اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک معبود کی، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا وہ پاک ہے ان کے شریک بنانے سے۔

اللہ تعالیٰ نے توحید کو قرآن پاک میں خوب واضح فرمایا ہے اور شرک کے مواد کو اس طرح مٹا دیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں باقی رہتا اور اس کے سوا کسی سے توقع نہیں قائم ہوتی اور اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ فرمایا کہ اطاعت تو اللہ اور رسول دونوں کی ہے۔ لیکن خشیت صرف اللہ کی ہونا چاہیئے۔ ارشاد ہوا :-

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۔

جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانے اور اللہ سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے بچے بس ایسے ہی لوگ بامراد ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی توحید کی تشریح امت کے لئے فرمایا کرتے تھے اور ان کے دلوں سے شرک دور فرماتے تھے۔ کیونکہ یہی کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا صحیح مطلب ہے۔

(۲)

علامہ امیر یمنی فرماتے ہیں :-

جب میں نے دیکھا کہ یمن، شام، نجد اور تہامہ نیز دیگر بلادِ اسلام کے دیہی اور شہری حلقوں میں لوگوں نے مخلوقِ خدا کو معبود اللہ معبود بنا رکھا ہے۔

قبروں کے متعلق عجیب و غریب اعتقادات قائم ہیں۔ اکثر فاسق و فاجر جو نہ کتاب و سنت سے واقف نہ حشر و نشر سے خائف کبھی ان کو اللہ کے سامنے رکوع و سجدہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ وہ علم غیب اور کشف و کرامات کے مدعی ہیں تو میں نے ضروری سمجھا کہ ان امور پر انکار کروں جن پر اللہ تعالیٰ نے انکار کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ اور اس چیز کو پوشیدہ نہ کروں جس کا اظہار خدائے برتر نے واجب فرمایا ہے۔ چند اصول ہیں انہیں سمجھ لینا چاہیئے کیونکہ درحقیقت وہ دین کی بنیاد ہیں۔

اصل اوّل | جو کچھ قرآن پاک میں ہے وہ حق ہے باطل نہیں ہے۔ سچ ہے جھوٹ نہیں ہے۔ ہدایت ہے گمراہی نہیں ہے۔ علم ہے جہالت نہیں ہے۔ شریعت اس میں شک نہیں ہے۔ یہ وہ اصل ہے جسے مدار اسلام کہا جا سکتا ہے اس کے بغیر اسلام کی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔

اصل دوم | تمام انبیاء علیہم السلام نے اللہ کے بندوں کو صرف اللہ ہی کی عبادت اور صرف اسی کی پرستش کی دعوت دی اور سب سے پہلے جو پیغام انھوں نے اپنی امتوں کو پہنچایا وہ یہی تھا کہ

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ (سورۂ ہود)

اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

فرمایا۔

أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللّٰهَ (احقاف)

تم خدا کے سوا کسی کی عبادت مت کرو۔

أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ

تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

یہی معلوم ہے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا پیغمبروں نے اسی کلمہ کی دعوت دی اور صرف زبان سے اس کا اقرار نہیں چاہا بلکہ انھوں نے اس کے معانی و مفہوم پر صحیح اعتقاد رکھنے کا مطالبہ فرمایا۔

اصل سوم | توحید کی دو قسمیں ہیں اول توحید ربوبیت، توحید خالقیت، توحید رزاقیت وغیرہ۔ یعنی صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کو دنیا کا خالق، پالنے والا اور رزق دینے والا جاننا۔ مشرکین بھی اس چیز کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ان امور کے معترف تھے اور اللہ کے ساتھ کسی کو اس میں شریک نہ کرتے تھے قرآن پاک میں ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو کہیں گے کہ اللہ نے۔

فرمایا۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ
لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ۝

اور اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ ان کو زبردست جاننے والے نے پیدا کیا ہے۔

ارشاد ہوا:۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ
يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ
الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ

آپ کہئے کہ وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے یا وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور وہ کون ہے جو جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے

فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿﴾

اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے، تو ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ۔ تو ان سے کہئے کہ پھر کیوں نہیں پرہیز کرتے۔

فرمایا

قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ ۝

(المومنون)

آپ کہہ دیجئے کہ یہ زمین اور جو اس پر رہتے ہیں یہ کس کی ہیں؟ اگر تم کو خبر ہے، وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ کی ہے ان سے کہئے کہ پھر کیوں غور نہیں کرتے آپ یہ بھی کہئے کہ ان سات آسمان کا مالک اور عالیشان عرش کا مالک کون ہے وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ یہ بھی اللہ کا ہے آپ کہئے کہ پھر کیوں نہیں ڈرتے، آپ یہ بھی کہئے وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا اگر تم کو کچھ خبر ہے؛ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب صفتیں بھی اللہ ہی کی ہیں آپ کہئے کہ پھر تم کو کیسا خبط ہو گیا ہے؟

دیکھو فرعون اپنے کفر میں کس قدر سخت تھا۔ اس کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ کی پروردگاری کا کس انداز میں اعتراف کرتا ہے۔

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنْزَلَ هٰؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ بَصَائِرَ۔ (بنی اسرائیل)

تو خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات خاص اور زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں، جو بصیرت کے لئے ذرائع ہیں۔

ابلیس کہتا ہے۔

إِنِّي أَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ (سورہ مائدہ)

میں تو خدا پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں۔

توحید کی دوسری قسم عبادت ہے یعنی عبادت کی جس قدر قسمیں ہیں وہ صرف ذات خداوندی کے لئے مخصوص کرلی جائیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی اس کا شریک سمجھا ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں کو اسی مسئلہ پر تنبیہہ فرمائی ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ۔ (النحل)

اور ہم ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہتے ہیں کہ تم اللہ کی عبادت کرو۔

ارشاد ہوا:۔

اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ (الاعراف)

عبادت کرو تم اللہ کی اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔

فرمایا:۔

فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ)

اب تو مت ٹھہراؤ اللہ کے مقابل اور تم جانتے بوجھتے ہو

عبادت خداوندی کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے جو بہت ہی اہم اور ضروری ہیں ان کو ہم ذکر کرتے ہیں:

عبادت اعتقادی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں اس امر کا یقین موجود ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی رب ہے، اکیلا ہے، خلق وامر اسی کے لئے ہے، نفع اور نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ وہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا ہے۔ اور اسی قسم کی جو چیزیں لازمہ الوہیت ہیں ان کا دل سے یقین کرنا یہ عبادت اعتقادی ہے۔

عبادت لفظی | اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زبان سے کلمۂ توحید کا اظہار کریں۔

عبادت بدنی | مثلاً نماز میں اٹھنا، بیٹھنا، رکوع، سجود، روزہ رکھنا، حج کرنا وغیرہ۔

عبادت مالی | مثلاً اللہ کی راہ میں اس مقررہ رقم کو نکالنا جو شریعت کی جانب سے متعین ہے۔ یہ عبادتیں اور اسی قسم کی جو عبادتیں ہیں ان کو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص کر لینا یہی ہے توحید عبادت۔ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر سرور کائنات محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمامی انبیاء علیہم السلام نے اسی امر کی دعوت دی ہے۔

مشرکین کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے بعض تو فرشتوں کی پرستش کرتے تھے، دکھ درد میں انہیں کو پکارتے تھے۔ بعض پتھروں کی پرستش کرتے تھے (یہ پتھر حقیقت میں صلحاء کی یاد میں بنی ہوئی مورتیں تھیں) اور اپنی مصیبتوں کو دور کرانے کے لئے انہیں کی جانب رجوع کرتے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اور آپ کی زبان سے اعلان فرمادیا کہ رب ذوالجلال جس طرح اپنی ربوبیت میں فرید اور وحید ہے اسی طرح اپنی معبودیت میں بھی وہ کسی کو اپنا شریک اور ہمسر نہیں رکھتا ہے۔ فرمایا:

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ	سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے اور خدا کے سوا جنکو یہ لوگ پکارتے ہیں
لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ (الرعد)	وہ انکی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کرسکتے۔

توحید عبادت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک یہ نہ ہو کہ دعائیں مانگی جائیں وہ صرف اللہ سے مانگی جائیں۔ غم ہو یا مسرت، ہو تنگی ہو یا فراخی ہو، تمام حالتوں میں صرف اللہ ہی کو پکارا جائے مدد صرف اللہ ہی سے مانگی جائے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) پر صحیح معنوں میں عمل کیا جائے۔ التجا اور آرزو ہو تو اللہ کی بارگاہ میں ہو، نذر و قربانی ہو تو صرف اسی کے نام پر ہو، رکوع، سجدہ، طواف جو کچھ ہو سب اسی ذات وحدہٗ لاشریک لہ کی خاطر ہو۔ اگر کسی نے ان امور کو خالق کے سوا مخلوق کے ساتھ برتا، وہ مخلوق زندہ ہو یا مردہ پس اُس نے اس مخلوق کو اپنا معبود بنالیا۔ اب اگر وہ اللہ کا اقرار بھی کرتا ہے اور اس کی عبادت کا دم بھی بھرتا ہے پھر بھی اس نے مشرکانہ عمل کیا تو اس کا یہ اقرار اس کے اس مشرکانہ فعل کی مکافات نہیں کرسکتا۔

اگر تم یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بندوں سے امداد چاہنا تو احادیث سے ثابت ہے۔ دیکھو حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت کے روز پہلے حضرت آدم علیہ السلام سے خواستگار ہوں گے، پھر حضرت نوح علیہ السلام سے، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے۔ سب امداد سے عذر کریں گے۔ تب سرور کونین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور مدد چاہیں گے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے علاوہ بندوں سے امداد طلب کرنا بُرا نہیں ہے۔

ہم کہیں گے کہ تمہارا یہ شبہہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں کس کو کلام ہے کہ اگر خدا کی ایک مخلوق کسی چیز پر قادر ہے تو اس میں اس سے امداد کی درخواست نہ کی جائے، اس قسم کی اعانت طلبی تو عالم اسباب کے لوازم میں سے ہے۔ دعا طلبی ہو یا دوا طلبی اس میں حرج نہیں۔ حرج تو اس اعتقاد میں ہے کہ دُعا اور دوا کا لازمی نتیجہ کارسازی اور کاربرآری ہے۔ حرج تو اس عقیدہ میں ہے کہ فلاں شخص کو یہ قدرت اور یہ مرتبہ حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ہمارا کام ضرور ہی بن جائے گا۔ اور اگر ہم فلاں شخص کا دامن تھام لیں تو نعوذ باللہ ہم اللہ سے بے نیاز ہوگئے۔ یا اللہ ہمارے حسب منشا کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اعانت طلبی کی مثال ایسی ہے کہ ایک بوجھ ہم اکیلے نہ اٹھا دیں۔ دوسرے بھی ہمارا ہاتھ بٹا دیں۔ خود قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں قبطی اور اسرائیلی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے:

فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۔ (القصص)
سو وہ جو ان کی برادری میں تھا اس نے موسیٰ سے اس کے مقابلہ میں جو ان کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ عمرہ کی غرض سے تشریف لے جانے لگے تو دیکھو روحی فداہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کن الفاظ میں حضرت عمر فاروقؓ سے دعا کرنے کے لئے فرماتے ہیں۔

لَا تَنْسَنَا یَا اَخِیْ مِنْ دُعَائِكَ ۔
اے بھائی مجھ کو اپنی دعا میں نہ بھولنا

اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ مومنین کے لئے استغفار کریں۔ اوراں کے لئے دعائے خیر کریں۔ ارشاد ہوا:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ ۔ (الحشر)
اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔

حضرت اُم سلیمؓ فرماتی ہیں۔

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ خَادِمُكَ اَنَسٌ اُدْعُ اللّٰہَ لَہٗ
اے رسول اللہؐ اپنے خادم انسؓ کے حق میں دعا فرمائیے۔

یہ امر تو متفق علیہ ہے۔ اس کے جواز میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ گفتگو تو اس میں ہے کہ لوگ اہل قبر کے سامنے درخواست کرتے ہیں یا زندوں کے سامنے ان امور کے لئے دست سوال دراز کرتے ہیں جن پر وہ قطعی قادر نہیں ہیں! وہ تو خود اپنی ذات کے نفع نقصان کے مالک نہیں، موت و زندگی کے معاملات سے واقف نہیں۔ پھر بھی لوگ ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بیماروں کو شفا دیں، مردوں کو زندہ کردیں، کھیتوں کو سرسبز و شاداب کردیں، لوگوں کو نظر بد سے محفوظ رکھیں۔ یہ لوگ درحقیقت وہی ہیں جن کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَا اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (اعراف)
اور تم جن لوگوں کی خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور نہ وہ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں۔

پس یہ قبروں کے سامنے سر جھکانے والے اور گمراہوں سے اچھا اعتقاد رکھنے والے، انھوں نے درحقیقت وہ راستہ اختیار کیا ہے جو اہل شرک کا ہے انھوں نے ان جاہلوں کے متعلق، اور قبروں کے متعلق وہ وہ اعتقادات قائم کئے ہیں جن کا اللہ کے سوا اور کسی ساتھ قائم کرنا جائز نہیں ہے — وہ قبروں کا طواف کرتے ہیں، ان سے منتیں چاہتے ہیں، ان کے نام پر قربانی کرتے ہیں، اور کیا عجب ہے کہ سجدہ بھی کرتے ہوں، حالانکہ یہ تمام چیزیں صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ کھلا ہوا شرک ہے اور اللہ تعالیٰ ہرگز شرک سے راضی نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ
بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے۔

(۴)

علامہ تقی الدین احمد بن علی المقریزی نویں صدی ہجری کے ایک مشہور عالم ہیں۔ اپنی کتاب "تجرید التوحید" میں فرماتے ہیں:-

دنیا کی وہ قومیں جو شرک کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ عموماً شرک عبادۃ اور شرک ربوبیت میں مبتلا ہیں۔ شرک عبادۃ کا ان لوگوں پر غلبہ ہے جو بت پرست ہیں، فرشتوں اور جنوں کو اپنا معبود جانتے ہیں۔ زندہ اور مردہ مشائخ اور صالحین کے ساتھ پرستش کا معاملہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا مقرب بنا دے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی۔ یعنی ہم ان کے سامنے عقیدت اور نیازمندی کا اظہار صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ تبارک و تعالیٰ کے دربار میں ہماری شفاعت کریں گے۔ اگر ان کے یہاں ہم کو تقرب حاصل ہو گیا تو بارگاہ ایزدی میں بھی نزدیکی نصیب ہوگی۔ جس طرح دنیا میں بادشاہوں اور رئیسوں کے یہاں وہی لوگ مقرب ہوتے ہیں جو ان کے دست

احباب، اعزا و اقربا اور ملازمین سے زیادہ ربط و ضبط رکھتے ہیں۔

حالانکہ یہ وہ عقیدہ ہے جس کی تردید اوّل سے آخر تک تمام پیغمبروں نے اور تمام آسمانی کتابوں نے کی ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے کو بڑا اور اللہ کا دشمن بتایا گیا ہے۔ قومیں عموماً اسی شرک کی وجہ سے برباد ہوئی ہیں اس عقیدے کی خرابی کا اصلی سبب یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی محبت بھی دلوں میں گھر کر گئی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ	ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ضروری ہے اور جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ قوی محبت ہے۔

دوزخ میں مشرکین اپنے بتوں سے کہیں گے کہ۔

تَاللَّهِ إِنْ كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ إِذْ نُسَوِّيكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ (شوریٰ)	بیشک ہم صریح گمراہی میں تھے جبکہ تم کو رب العالمین کے برابر کرتے تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور بتوں کے درمیان برابری اس میں نہیں تھی کہ انھوں نے بتوں کو خالق اور پروردگار سمجھا ہو۔ اس لئے کہ مشرکین کو تو اقرار تھا کہ رب اور خالق اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے۔ بلکہ یہ مساوات محبت اور عبادت کی تھی۔ ان کے دلوں میں معبود باطل کی جانب سے محبت اور پرستش کا وہی جذبہ تھا جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ہونا چاہیئے۔ پس جس نے اللہ کے سوا کسی دوسرے سے محبت، خوف اور امیدوں کا وہ تعلق پیدا کیا جو اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے تو یقیناً اس شرک کا مجرم ہوا جس کو اللہ معاف نہ فرمائے گا۔ ذرا غور کرو کہ جب اللہ اور غیر اللہ میں برابری کرنے والوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا تو ان لوگوں کا حشر کیا ہوگا جنھوں نے غیر اللہ کو اپنے اوپر پورا قبضہ دے رکھا ہے۔ اللہ سے زیادہ ان کی محبت میں مست و سرشار ہیں، اللہ سے زیادہ ان سے ڈرتے ہیں اور اللہ سے زیادہ ان کے احکام کی تعمیل میں مصروف ہیں۔ ستم یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود وہ اپنے کو موحد اور مسلم بھی جانتے ہیں۔ نہ صرف قرآن پاک نے بلکہ تمام آسمانی صحیفوں نے ان تمام لغویات کا انکار کیا ہے۔ ارشاد ہوا

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ	ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

دیکھو اس آیت قرآنی نے شرک کی گندگیوں سے علیحدہ کر کے انسان کو صرف ایک معبود حقیقی کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اب پرستش ہے تو اسی کی، امداد کی درخواست ہے تو اسی سے، اب اس بارگاہ عالی میں نہ شرک عملی ہو نہ شرک لفظی اور نہ شرک ارادی!

شرک عملی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے کوئی فعل ایسا سرزد نہ ہو جو مشرکانہ ہو مثلاً اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہ کیا جائے۔ حضور پرنور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

لا ینبغی لاحد ان یسجد لاحد الا اللہ	اللہ کے سوا کسی کا سجدہ جائز نہیں

اسی طرح خانۂ کعبہ کے سوا کسی، دوسری چیز کا (مثلاً مقابر اور مزارات) کا طواف کرنا، قبروں کو بوسہ دینا اور ان کا سجدہ کرنا، یہ سب امور مشرکانہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لعن اللہ الیہود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائہم مساجد	یہود اور نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔

فرمایا:۔

لعن اللہ زائرات القبور والمتخذین علیہا المساجد والسراج	قبروں پر جانے والی عورتوں پر اللہ کی لعنت ہے اور ان لوگوں پر لعنت ہے جنھوں نے قبروں پر چراغ جلایا اور قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔

شرک عملی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے سامنے اظہار عجز و بندگی کی غرض سے سر کے بال منڈائے جائیں۔[1]

شرک لفظی

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زبان سے کوئی لفظ نہ نکلے جو اپنے اندر مشرکانہ بو رکھتا ہو۔ مثلاً حلف! کہ اللہ کے سوا اور کسی کی قسم کھانا ہرگز جائز نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

من حلف بغیر اللہ فقد اشرک (ابوداؤد) جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

اسی طرح اپنے بزرگوں اور مرشدوں کے سامنے کہتے ہیں، جو مرضی اللہ کی اور آپ کی، میرے لئے آسمان پہ اللہ ہے اور زمین پر آپ، سب برکتیں اللہ کی جانب سے ہیں اور آپ کی جانب سے ہیں۔ مجھے اللہ پہ اور آپ کی ذات پہ بھروسہ ہے —— ذرا غور تو کرو۔ یہ الفاظ عموماً ہماری زبان سے نکلتے ہیں اپنے اندر اعتقادی حیثیت سے کس قدر فساد رکھتے ہیں۔

حضورؐ کے سامنے کسی نے کہا۔ جو کچھ آپ چاہیں اور اللہ چاہے۔ حضورؐ نے فوراً روک دیا اور ارشاد فرمایا کہ کیا تم مجھ کو اللہ کا شریک بناتے ہو یہ کہو کہ جو کچھ اللہ چاہے۔

شرک ارادی

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کوئی کام کریں لیکن اس کام سے سارا مقصود بجائے اللہ کی خوشنودی کے کچھ اور ہو، مثلاً نمود، شہرت، وجاہت طلبی وغیرہ) مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ کسی کار خیر میں بجائے اللہ کی مرضی تلاش کرنے کے، ہمارا نیت دنیا طلبی ہو تو یہ شرک کی وہ قسم ہے جسکا مرتکب درحقیقت مقام (ایاک نعبد ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) سے قطعی نا واقف ہیں۔

اس بات کو قطعی سمجھ لو کہ بندہ کی بندگی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی ہے جب تک کہ اس کے اعمال اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کے لئے خالص نہ ہوں ساتھ ہی ساتھ ان اعمال کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع بھی نصیب ہو۔

وہ لوگ جن کے اعمال اللہ تعالیٰ کے لئے خالص اور سنت رسولؐ کے موافق ہیں، درحقیقت ان کا کردار، ان کی گفتار، ان کی بخشش انکا نفقہ ان کی محبت، سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے وہ اپنے کسی عمل پر بندوں سے بدلہ کے خواہش مند نہیں ہیں اور نہ شکریہ کے خواستگار۔ انھوں نے اہل دنیا کو بالکل اہل قبر کی مانند سمجھ رکھا ہے جو نفع و نقصان، موت زندگی کسی کی بھی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

---

[1] اس مسئلہ کے متعلق شیخ الاسلام عارف باللہ حافظ ابن قیمؒ نے "زاد المعاد" میں ایک واضح تقریر فرمائی ہے، اس کو ہم اختصار کے ساتھ یہاں نقل کرتے ہیں۔ شیخ نے فرمایا: "سر کے بال عموماً تین مقاصد کے ماتحت مونڈے جاتے ہیں (۱) حج میں یا عمرہ میں (۲) عام انسانی ضروریات کی بنا پر (۳) شرک و بدعت کی وجہ سے، جیسے کہ بعض مریدین اپنے پیروں کے نام پر سر منڈاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں (پیر، فقیر، شہید) کے لئے سر منڈایا ہے۔ ان الفاظ کا مفہوم وہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ہم نے فلاں کا سجدہ کیا۔ اس موقعہ پر سر کے بال کا منڈانا عجز و انکساری و خاکساری و فروتنی کا اظہار کرنا ہے۔ ائمہ شرک و گمراہی نے اس چیز کو اپنے لئے بھی ضروری قرار دیا کہ ان کے سامنے بھی اظہار بندگی کی جائے۔ ان جاہل نفوس نے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا درجہ بالکل گرا دیا۔ طرح طرح کے مشرکانہ اعمال جاری ہوئے، غیر اللہ کے سجدے ہوئے، اُن کے نام کی قسمیں کھائی گئیں، ان کے لئے نذریں مانی گئیں، ان کے لئے سر کے بال منڈوائے گئے، ان کے نام پر قربانیاں کی گئیں، ان کے سامنے اس طرح کھڑا ہوا گیا جیسے نماز میں خشوع و خضوع کیساتھ کھڑے ہوتے ہیں، ان سے خوف اور امید کا رشتہ مضبوط کیا گیا جو صرف اللہ کیلئے جائز ہے۔ حالانکہ یہ سب مشرکانہ اعمال ہیں اللہ ان سے پناہ میں رکھے" آمین

لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ہم لوگوں کی آزمائش کریں گے کہ ان میں سے زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔

احسن عمل سے مراد خالص اور درست عمل ہے جو صرف اللہ کے لئے ہو، اور درست وہ ہے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔ جو عمل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نہیں ہے وہ بجائے تقرب کے اللہ سے دوری کا باعث ہوگا۔ وہ لوگ جن کے اعمال میں نہ اخلاص ہے، اور نہ وہ رسول اللہ کی سنت کے موافق ہیں، درحقیقت وہ لوگ خدا کی بدترین مخلوق ہیں انہی کے حق میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

جو لوگ اپنے کردار سے خوش ہوتے ہیں اور جو کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ انکی تعریف کیجائے سو ایسے شخصوں کے متعلق خیال کرو کہ وہ عذاب سے محفوظ رہیں گے، ان کو دردناک عذاب ہوگا۔

جن لوگوں کے اعمال تو مخلصانہ ہیں لیکن وہ سنت مصطفوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پابند نہیں ہیں وہ بڑی غلطی میں گرفتار ہیں۔ اس مرض میں زیادہ تر جاہل صوفیا اور فقرا مبتلا ہیں، ان کو سمجھنا چاہیئے کہ اللہ کی عبادت اسی طریقہ سے مطلوب و مقصود ہے جو طریقہ اللہ کے نزدیک محبوب ہے۔ (اور وہ اتباع سنت ہے)

وہ لوگ جن کے اعمال سنت کے مطابق تو نظر آتے ہیں، مگر درحقیقت اللہ کے لئے خالص نہیں ہیں وہ بڑے گھاٹے میں ہیں۔ وہ جہاد اس لئے کرتے ہیں کہ بہادر کہلائیں، حج اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی شہرت ہو، تعلیم و تصنیف کا کام اس لئے کرتے ہیں کہ مؤلف اور مدرس کہلائیں۔ پس فی نفسہٖ یہ اعمال تو درست ہیں۔ مگر اللہ کے نزدیک مقبول نہیں ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۔ ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھیں۔

عبادت تو وہی مطلوب ہے جو صرف اللہ کے لئے ہو اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو اور اس حق کو وہی لوگ ادا کرتے ہیں جو اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کی حقیقت سے آشنا ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "الفوز الکبیر" میں لکھتے ہیں:۔

اگر تو مشرکین عرب کے عقائد اور ان کے اعمال اور ان کے حالات کی پوری پوری تصویر سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اس زمانے کے عوام اور جہلا کو دیکھ لو کہ وہ قبروں اور استھانوں پر جاتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ غرض اس زمانہ کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جس میں اس زمانہ کی ایک قوم اس کا ارتکاب نہیں کرتی۔ اور ان کے مثل اعتقاد نہیں رکھتی۔ خدا ہم کو ایسے عقیدوں اور عملوں سے بچائے۔

(ملتقطاً۔ اردو ترجمہ)

ابو محمد امام الدین رام نگری

عقیدۂ توحید اور انسانیت

خدا کی ہستی اور اس کی توحید کے عقیدے کو انسانی زندگی میں کس قدر اہمیت حاصل ہے، دنیا نے اسے سمجھنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔ اور اب مسلمان بھی بڑی حد تک اس حقیقت کی طرف سے غفلت اور جہول میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ خدا کی ہستی سے انکار انسان کو انسانیت سے دور کر دیتا ہے اور یہی نتیجہ شرک کا ہوتا ہے۔ سچی انسانیت خدا کی ہستی اور اس کی توحید کے عقیدے پر موقوف ہے۔

انکارِ خدا کے مفاسد

انکارِ خدا کے مفاسد کا شمار نہیں ہے، خدا کا انکار انسان کو آوارہ مزاج بنا دیتا ہے، خدا کے منکر کے لئے سماج میں کوئی مرکزیت باقی نہیں رہ جاتی۔ ہر انسان خدا اور ہر انسان بندہ بن جاتا ہے۔ جس انسان کے ہاتھ میں بھی طاقت اور اقتدار کی لاٹھی آجاتی ہے، وہ انسانوں پر جانوروں کی طرح حکومت کرنے لگتا ہے۔ اور کمزور اور بے بس انسان جانوروں کی طرح اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ اقتدار و اختیار ایک انسان سے دوسرے انسان کے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی ایک با اقتدار انسان کے مرنے کے بعد دوسرا انسان اس کے اقتدار پر قبضہ پا جاتا ہے یا قبضہ کر لیتا ہے۔ اور وہ انسانوں کو اپنے پسندیدہ راستہ پر ہانکنا شروع کر دیتا ہے۔ اور کبھی کوئی طاقتور اٹھتا ہے اور صاحب اقتدار کے ہاتھ سے زبردستی عنانِ اقتدار چھین لیتا ہے اور انسانی گروہ پر حسبِ دلخواہ خدائی کرنے لگتا ہے۔

خداؤں کے تبادلے کے ساتھ ساتھ انسانوں کی بندگی کے طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں اور انسانیت اسی طرح کچلتی، پستی اور پامال ہوتی رہتی ہے۔ اس کو نہ کبھی سچی شرافت و عزت نصیب ہوتی ہے اور نہ سچا امن و اطمینان میسر آتا ہے۔ کبھی کوئی شریر انسان نمرود و فرعون کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، کبھی ہلاکو اور چنگیز کے روپ میں اور کبھی مسولینی، ہٹلر اور اسٹالن کی شکل میں، اور ان کے ہاتھوں ملکوں اور قوموں میں ہمیشہ تباہی و بربادی اور ہلاکت و خونریزی کا بازار گرم رہتا ہے!

انسان پر انسان کی خدائی کی ایک پُرفریب صورت پارلیمنٹری اور مغرب زدہ جمہوری حکومت ہے۔ اس صورت میں بادشاہ اور ڈکٹیٹر کی بجائے انسانوں کا ایک منتخب گروہ خدائی کرتا ہے۔ اور اس خدائی کے اثرات و نتائج بھی کم و بیش وہی ہوتے ہیں جو پہلی قسم کی خدائی کے۔ ہر نئے آنے والے گروہ کو یہ حق و اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اپنے سے پہلے گروہ کے راستہ کو غلط قرار دے دے اور انسانیت کو ایک بالکل ہی نئی راہ پر ہانکنا شروع کر دے۔ اس طرح راستوں کا الٹ پھیر ہوتا رہتا ہے اور انسانیت کو کبھی پریشانی اور سرگردانی سے نجات نہیں ملتی۔ زہر کے اس شجرِ خبیثہ سے برابر نئی نئی شاخیں اور کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں جو نئے نئے زہریلے پھول اور پھل دیتی رہتی ہیں۔

شراب ایک روز انسانیت کے لئے زہر قرار دی جاتی ہے اور دوسرے روز تریاق بنا دی جاتی ہے۔ جوئے کی ایک قسم سے دل بھر جاتا ہے تو دوسری صورتیں وضع کر لی جاتی ہیں۔ ایک قسم ممنوع ہوتی ہے تو دوسری قسمیں جائز بن جاتی ہیں۔ سود کی ایک صورت

کی مذمت کی جاتی ہے اور اُس کی جگہ بہت سی نئی صورتیں نکال لی جاتی ہیں۔ شادی ایک سے زیادہ خلافِ قانون قرار دے دی جاتی ہے اور حرام کاری کی ساری راہیں کھلی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ کسی دن ازدواجی زندگی ہر قید سے آزاد کردی جاتی ہے، پھر اس کی غلطی تسلیم کی جاتی ہے اور سماج کو مقیّد ازدواجی زندگی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ عورتوں کی آزادی و مساوات کے نام پر اُن کو گھروں سے باہر لاکر کھیتوں اور کارخانوں میں مردوں کے ساتھ کھڑا کردیا جاتا ہے۔ بازاروں اور پارکوں میں پھرایا جاتا ہے۔ ہوٹلوں اور کلبوں میں اُن سے نچوایا اور گوایا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو اسکولوں اور کالجوں میں نوجوانوں کے دوش بدوش بٹھایا جاتا ہے۔ اُن کو عشقیہ ادب کا سبق پڑھایا جاتا ہے اور اُن کے سامنے انتہائی رنگین رومانی اشعار کی تشریح کی جاتی ہے اور اُن کے اندر وہ جنسی آگ بھڑکائی جاتی ہے کہ کنواریاں بیوی بننے سے پہلے ہی عملاً جنسی زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا ہوکر درسگاہوں سے نکلتی ہیں اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا۔ اُن کو جنگی قواعد پریڈ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اسلحہ دے کر محاذِ جنگ پر بھیجدیا جاتا ہے۔ اور فوجی کیمپوں اور خندقوں میں بھی حُسن و عشق کے رزم و بزم کا سلسلہ جاری رہتا ہے!

ان چیزوں کا نام رکھا جاتا ہے آزادیٔ نسواں، ترقیٔ نسواں، مساوات، خودکفیلی، پھر جب جنسی آوارگی حد سے زیادہ زور پکڑ جاتی ہے، نوجوان دن دہاڑے دوشیزاؤں کی عصمتوں پر ڈاکے ڈالنے شروع کردیتے ہیں۔ لڑکیاں شادی سے پہلے ہی مائیں بننے لگتی ہیں۔ بیویاں شوہروں کو چھوڑ کر عاشقوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگتی ہیں۔ عدالتوں میں دھڑا دھڑ طلاقوں کے دعوے دائر ہونے لگتے ہیں اور عائلی نظام پراگندہ ہونے لگتا ہے تو اصلاح و اخلاق کے وعظ شروع کردیئے جاتے ہیں اور کہا جانے لگتا ہے کہ انسانیت کے قیام و بقا کے لئے مردوں اور عورتوں کی زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا!

اس طرح کے واعظ سماج میں مقدس خیال کئے جانے لگتے ہیں۔ ان کو مفکر اور مصلح کا لقب دیا جاتا ہے اور اُن کی آواز بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ لیکن ترقی پسند گروہ ان مقدس واعظین پر مُسکراتا ہے اور یہ فقرہ چُست کرتا ہے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

جہاں خدا ہی کا اقرار نہ ہو، وہاں خدا کی بازپرس اور اُس کے عذاب و عتاب کے خوف کا کیا ذکر۔ پُوری انسانی زندگی بہیمانہ زندگی بن کر رہ جاتی ہے۔ دُنیا پرستی، نفس پرستی، خواہش پرستی اور مادیت پرستی زندگی کا نصب العین بن جاتی ہے۔ اور اس نصب العین کے حصول کے لئے ظلم و فساد، بے ایمانی و بے انصافی، غداری و بدعہدی، جنگ و پیکار اور اس طرح کی تمام ناکردنیوں کو کردنی بنا دیا جاتا ہے!

شرک کے مفاسد شرک یہ ہے کہ خدا کا اقرار کیا جائے، لیکن اس کے ساتھ اور بھی کم و بیش خداؤں کو مانا جائے۔ اُن کے متعلق بھی خدا کی طرح نفع و ضرر کا عقیدہ رکھا جائے اور خدا کی طرح ان کی بھی عبادت و بندگی کی جائے!

شرک کفر سے بھی زیادہ منافیٔ انسانیت ہے۔ وہ انسان کو انسانیت کے مجد و شرف سے بالکل محروم کردیتا ہے، مُشرک انسانیت کے مقام سے اتنا گر جاتا اور اتنا پست و ذلیل ہو جاتا ہے کہ ہر طاقت اور اقتدار کے سامنے جُھکنا اس کا مسلک و شعار بلکہ مذہب بن جاتا ہے۔ وہ ہر ہستی اور ہر شئے میں خدا کی نمود اور اس کی صفت دیکھنے لگتا ہے! وہ سورج کو دیکھتا ہے کہ زمین سے کتنا بلند اور روشن ہے۔ اور اس کی تابانی اور تپش کا یہ عالم ہے کہ کوئی آنکھ اُسے نگاہ بھر کر دیکھ نہیں سکتی!

چاند اور ستارے رات کی تاریکی میں ضیا بار اور روشن ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ ان میں نفع وضرر کے بہت سے خواص و اثرات ہیں۔ اس لئے انسان نے ان کو معبود بنا لیا۔ آگ اور پانی کو دیکھا کہ ان میں بھی بڑی طاقت موجود ہے اور ان سے بھی انسان کے بہت سے منافع اور نقصانات وابستہ ہیں۔ آگ لوہے تک کو پگھلا کر پانی بنا دیتی ہے اور پانی کا سیلاب بڑی بڑی چٹانوں کو بھی اپنی رَو کے ساتھ بہالے جاتا ہے اس لئے ان کی بھی پوجا شروع کر دی۔ اس نظریہ نے پھیل کر جانور، درخت، دریا، انسان، غرض ہر چیز کو دائرۂ عبودیت میں داخل کر لیا ـــ!

شرک کی یہ پیاس بڑھتی ہی گئی، خدا کو مجسّم بنا کر سامنے لایا نہیں جا سکتا تھا۔ سورج، چاند، ستارے دسترس سے باہر تھے۔ اُن کو زمین پر اُتار لانا ممکن نہ تھا۔ فرشتے اور جن اور اَن دیکھی رُوحیں مرئی نہیں بنائی جا سکتی تھیں، اس لئے ان کی خیالی صورتیں تجویز کی گئیں۔ ان صورتوں کے بُت اور مجسّمے بنائے گئے۔ قوموں کے ممتاز انسانوں کو خدا کا اوتار اور مظہر کہا گیا اور اس طرح اُن کے ذریعہ جذبۂ پرستش کی تکمیل کی گئی ـــ!

اس عقیدے نے انسانیت کو خوب خوب ذلیل اور بے عزّت کیا ہے۔ انسانوں نے انسانوں ہی کو نہیں پُوجا ہے، انسانوں کے قدموں کے نقوش ہی نہیں پُوجے ہیں، مرد اور عورت کی شرمگاہوں کی شکلیں بنا کر بھی پُوج ڈالی ہیں۔ یہ اس تصوّر کے ماتحت کہ یہی تخلیق انسانیت کے مخرج ہیں۔ شیطان نے انسان کو کیسے کیسے فلسفے سکھائے ہیں اور کیسی کیسی پٹی پڑھائی ہے!

شرک اور کفر میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں کی سرحدیں ایک دُوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ ایک خدا کے سوا جب دُوسری ہستیوں اور دُوسری چیزوں کو بھی خدا مان لیا جائے تو خدا کے اقرار اور انکار میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔ جہاں سے غیر خدا کی خدائی کا اقرار شروع ہوتا ہے، ٹھیک اسی جگہ سے خدا کی خدائی کا انکار شروع ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ عقل و سائنس کا زمانہ ہے، عقل اور سائنس خدا کے انکار کو ضروری نہیں ٹھہراتیں۔ لیکن انسان نے اپنے جہل اور حماقت سے خود عقل اور سائنس کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور طے کر دیا ہے کہ عقل و سائنس کی رُو سے خدا کا عقیدہ محض وہم اور جاہلی زمانہ کا بقیہ ہے۔ ایسے زمانہ میں سورج، چاند، ستاروں، جانوروں، درختوں اور غیر مرئی ہستیوں کو کون خدا مانتا ہے۔ لیکن انسانی خدائی نے کامل ہمہ گیری کے ساتھ انسانیت پر اقتدار و تسلّط قائم کر لیا ہے۔ اب نمرود و شدّاد، فرعون وغیرہ جیسے انسان خدا نہیں ہوتے۔ اب اُن کی جگہ مُلکوں اور قوموں کے لیڈروں، پارلیمنٹوں، صدروں، وزیر اعظموں اور ڈکٹیٹروں نے لے لی ہے۔ جو خدا کی طرح انسانوں پر اپنے احکام و قوانین جاری کرتے ہیں۔

انسان خوشی اور ناخوشی سے، لالچ اور فریب سے، عقیدت و محبّت سے اپنے لئے خدا بناتے ہیں اور اُن کی اطاعت و بندگی کرتے ہیں۔ یہ خدائی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ملکوں اور قوموں کے منتخب علماء و عقلاء۔ مدبّرین و مقننین اپنی انتہائی قابلیتیں صرف کر کے انسانوں کے لئے ایک دستور زندگی بناتے ہیں۔ لیکن آئے دن اُن میں تنسیخ و ترمیم اور ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک برسرِ اقتدار پارٹی کے بعد دُوسری پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے اور ملک و قوم کی زندگی کو بالکل دُوسرے رُخ پر پھیر دیتی ہے۔ یہ چکر چلتا رہتا ہے ایک ڈکٹیٹر کے بعد دُوسرا ڈکٹیٹر انسانی زندگی کا نظام اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اور کل تک جس ڈکٹیٹر کے محاسن و محامد کے کلمے پڑھے جاتے تھے اُس کی نسبت کہتا ہے کہ وہ بڑا ہی ظالم، سفّاک اور انسانیت کُش تھا۔ ہماری پالیسی کو اُس کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح جو احکام و قوانین کل تک "حرفِ آخر" سمجھے جاتے تھے اُن پر خطِ تنسیخ پھیر دیا جاتا ہے۔ جو پارٹی کسی ملک میں انقلاب برپا کرتی ہے اُن میں سے ایک شخص کچھ لوگوں سے ساز باز کر کے تختِ اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے اور اپنے رفقائے انقلاب

میں سے جن لوگوں کو اپنے مفاد کے خلاف دیکھتا ہے اُن کو ملک وقوم کا دشمن قرار دے کر گولیوں کا نشانہ بنا دیتا ہے، پھانسی پر چڑھا دیتا ہے۔ جیلوں میں ٹھونس دیتا ہے، ملک کے کسی دُور دراز اجنبی جہنم میں ڈال دیتا ہے اور اُن بیچاروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اس شرک اور انسانی خدائی میں خود خدا کا یہ حال ہوتا ہے کہ اُسے مندروں، مسجدوں، خانقاہوں، گرجاؤں اور معبدوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اور خدا کے ماننے والے انسانوں پر یہ پابندی لگا دی جاتی ہے کہ تمہارا اور تمہارے خدا کا معاملہ تمہاری ذات تک محدود ہے۔ تم جس طرح چاہو اپنے دل میں خدا کو مانو۔ اور اپنے گھر میں جیسے چاہو خدا کو پوجو۔ لیکن گھر سے باہر نکلو تو خدا کو ساتھ لے کر نکلنے کی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ ع

یہ تو ہے اک معاملہ دل کا خدا کے ساتھ!

خدا کو انسان کی اجتماعیت کے معاملہ میں کوئی حصّہ اور دخل حاصل نہیں۔ خدا کو اس طرح ماننا اس کے انکار کی کھلی ہوئی صورت ہے۔ جو لوگ اس طرح خدا کے ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خدا کا علانیہ انکار اور اُس سے بغاوت کرتے ہیں۔ وما قدروا اللہ حق قدرہٖ!

سچّی انسانیت اور عقیدۂ توحید

اُوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انکارِ خدا کا عقیدہ ہو یا شرک کا، دونوں انسانیت کے لئے نہایت ذلیل کُن اور ہتک آمیز ہیں۔ ان عقیدوں میں انسانی عزت و شرافت کے لئے کوئی مقام نہیں ہے۔ سچّی انسانیت کا دارومدار عقیدۂ ربّ اللہ اور عقیدۂ توحید الٰہ پر ہے۔ صرف خدا کو خدا ماننا اور اُسی کی عبادت و بندگی کرنا سچّی انسانیت کی راہ ہے۔ سچّی انسانیت یہ نہیں ہے کہ کچھ انسان خدا ہوں اور باقی اُن کے بندے۔ کچھ حاکم و فرمانروا ہوں اور باقی محکوم و فرمانبردار۔ کچھ انسان اپنے احکام و قوانین جاری کریں اور باقی انسان بندوں کی طرح اُن کے جاری کئے ہوئے احکام و قوانین کی پابندی پر مجبور ہوں!

سچّی انسانیت یہ ہے کہ ایک خدا حاکم و فرمانروا ہو۔ اُسی کے احکام و قوانین چلیں اور تمام انسان ان احکام و قوانین کے پابند ہوں۔ کسی انسان کو کسی انسان پر فوقیت و برتری حاصل نہ ہو۔ فوقیت و برتری اور عزت و شرافت کا ایک ہی معیار ہو۔ وہ معیار ہو خدا کے ساتھ وفاداری، خدا کی اطاعت و بندگی اور اس کے احکام و قوانین کی پابندی، خدا ترسی اور اس کی رضا جوئی۔ جو ان چیزوں میں جتنا پیش پیش اور سرگرم ہو، وہ اُتنا ہی شریف و معزز اور اعلیٰ انسان سمجھا جائے اور اس اعتبار سے اسے ملک و قوم اور حکومت میں رتبہ، درجہ اور منصب حاصل ہو۔

اسی کا نام ہے حقیقی انسانیت، باقی سب صورتیں انسانیت کشی کی ہیں!

سچّی آزادی اور عقیدۂ توحید

آج کل آزادی، آزادی کا بڑا شور ہے۔ لیکن سچّی آزادی عنقا ہے۔ شاید اس طرح انسانی آزادی کا خون انسانی تاریخ میں اب سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پابندیوں میں جکڑی ہوئی انسانیت مفلوج اور بے بس ہو کر دم توڑ رہی ہے!

انسان کو سچّی آزادی اسی صورت میں نصیب ہو سکتی ہے، جب صرف خدا کو خدا مانا جائے۔ انسانوں پر انسانوں کی خدائی نہ ہو۔ انسانوں پر انسانی اقتدار قائم نہ ہو۔ انسانوں پر انسانوں کو اپنا حکم چلانے کا اختیار نہ ہو۔ تمام انسان بالاتفاق یہ اصول تسلیم کرلیں کہ انسانوں پر انسانوں کے نہیں خدا ہی کے احکام و قوانین جاری ہونے چاہئیں!

جب تک یہ اصول تسلیم نہ کیا جائے گا، زمین پر سچی انسانیت قائم نہیں ہوسکتی۔ انسانوں پر انسانی آئین و قوانین کی حکومت اور سچی آزادی دونوں متضاد چیزیں ہیں، جو ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں — !

سچی مساوات اور عقیدۂ توحید

طاقت و حکومت اور اقتدار کے زور سے عام پروپیگنڈا کرکے مساواتِ انسانی کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ حالانکہ سچی آزادی کی طرح سچی مساوات کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ سچی مساوات سے تو انسانیت اسی صورت میں بہرہ ور ہوسکتی ہے کہ اس تصور ہی کو ممنوع اور خلافِ قانون قرار دے دیا جائے کہ انسانوں کا کوئی فرد یا گروہ انسانوں پر اپنے احکام و قوانین کے ذریعہ حکومت و فرمانروائی کرسکتا ہے۔ اور سے انسانی زندگی کا بنیادی عقیدہ قرار دے دیا جائے کہ پوری انسانیت پر خدا ہی کے احکام و قوانین چلنے چاہئیں — !

سچی حریت و مساوات کی واحد راہ خدائے واحد کی اطاعت و حکم برداری ہے۔ یہ صرف عقیدہ کی بات نہیں ہے۔ ایک عقلی اور تجربی حقیقت بھی ہے۔ انسان جب خود انسانوں کے لئے دستور و قوانین بنائے گا تو مساواتِ عامہ کی رعایت کے احساس کے باوجود عدم مساوات سے کامل طور پر دستور و قوانین کو پاک رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وہ عوام کے مقابلہ میں حکومت کے کارفرما اور اہلِ مناصب طبقے کے لئے کچھ نہ کچھ ترجیحی قوانین ضرور بنائے گا۔ جن میں اس طبقہ کے حقوق و اختیار کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہوگی — چنانچہ کسی ملک، کسی قوم اور کسی اصول و نظریہ کے دستور و آئین کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں صدر جمہوریہ، ڈکٹیٹر، بادشاہ، صوبہ کے گورنر وغیرہ کے لئے استثنائی اور ترجیحی قوانین ضرور ملیں گے۔ ان کی تنخواہوں، اور بھتّوں (Allowances) میں بھی اُن کی واقعی اور حقیقی ضروریات پر نظر نہ ہوگی۔ بلکہ اُن کے اس مصنوعی عہدہ و منصب کے اعتبار سے ان کا مشاہرہ اور بھتّہ مقرر ہوگا۔ خواہ اس کے لئے دوسرے ملازمین کے جائز حقوق ہی دبانے پڑیں یا عوام پر ٹیکس ہی لگانے پڑیں۔ اسی طرح ان کے رہنے کے قصر و ایوان، شان و شوکت اور عیش و آرام کے سامان میں غیر معمولی اہتمام سے کام لیا جائے گا۔ خواہ عوام کو ضرورت کے مطابق رہنے کے لئے مکان، پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور تن پوشی کے لئے کپڑے نصیب نہ ہوں۔ غرض مشاہرہ، بھتّہ، مکان، خوراک، لباس، سواری، ہر چیز میں حکومت کے کارفرما اور سرکردہ طبقہ کو خصوصی حقوق حاصل ہوں گے — !

عدم مساوات کا یہ وہ پودا ہے، جس کی جڑ اُوپر ہوتی ہے اور شاخیں نیچے کی جانب بڑھتی پھیلتی چلی آتی ہیں۔ چنانچہ یہ عدم مساوات بالائی اہلِ مناصب سے زیریں حکام میں۔ اور اُن سے پورے سماج میں پھیل جاتی ہے اور یا تو مساوات کا نام ہی نام رہ جاتا ہے یا کوئی اس کا نام بھی نہیں لیتا — !

سچا انصاف اور عقیدۂ توحید

دُنیا میں آئین و قوانین کے بڑے بڑے دفاتر موجود ہیں۔ بڑی بڑی عدالتیں قائم ہیں۔ جن میں آئین و قوانین کے بڑے بڑے ماہرین اُونچی اُونچی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔ لیکن سچا انصاف مفقود ہے۔ اس لئے کہ انصاف کی بنیاد ہی نا انصافی پر قائم ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی نا انصافی نہیں ہوسکتی کہ انسان انسانوں کے خدا بن جائیں اور خدا کی تفویض کی ہوئی امانتِ اختیار کو اس کے نائندے بن کر استعمال کرنے کی بجائے مختارِ مطلق بن کر اس کا استعمال کریں۔ انسان خدا ہی کے معاملہ میں نامنصف بن جائے تو وہ انسانوں کے معاملہ میں کیسے منصف ہوسکتا ہے ؟

جب کوئی برسرِ اقتدار انسان یا انسانوں کا کوئی برسرِ اقتدار گروہ انسانوں کے قوانین بناتا ہے تو ان قوانین کی تشکیل و تخلیق ہی میں بے انصافی موجود ہوتی ہے۔ اربابِ اقتدار کے لئے کچھ قوانین ہوتے ہیں اور باقی انسانوں کے لئے کچھ۔ اور جب یہ گھٹیا اور ناقص قسم کے غیر منصفانہ قوانین انصاف ناآشنا انسانوں کے ذریعہ استعمال میں آتے ہیں تو یہ اور بھی انصاف کش بن جاتے ہیں — !

انصاف کے نام سے ایوانِ حکومت سے لے کر گلی و کوچہ، دفتر کچہری اور عدالت تک میں بے انصافی کا دَور دورہ ہو جاتا ہے بے انصافی کے قتیل تڑپتے، کراہتے اور نالہ و فغاں کرتے رہتے ہیں لیکن کوئی شنوا نہیں ہوتا ــــ !

انسانیت کے ساتھ سچا انصاف خدائی آئین و قوانین ہی کے ذریعہ ممکن ہے، جن میں انسانی خود غرضی، افادیت پسندی اور اقتدار پرستی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اور وہی حاکم اور منصف سچا انصاف کر سکتے ہیں جو خدا اور خدا کی باز پرس پر ایمان رکھتے ہوں ــــ !

سچا امن اور عقیدۂ توحید

آج ہر ظالم، ہر مفسد اور ہر امن شکن ملک اور قوم کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں وہی امن کی واحد علمبردار ہے۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ امن و انصاف کی سب سے بڑی دشمن وہی قومیں ہیں جو امن و انصاف کا پروپیگنڈا کر رہی ہیں۔ ان بد امن قوموں کے ہاتھوں ساری دُنیا کا امن تباہ ہے۔ کمزور قومیں جو آزادی چاہتی ہیں اور جو امن و سکون کی زندگی کے لئے تڑپ رہی ہیں، امن و امان کی جھوٹی مدعی قوموں نے اُن کی عافیت تنگ کر رکھی ہے۔ غریبوں کو چین نہیں لینے دے رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک سے زیادہ دُنیا کے امن و امان کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ کمزور قومیں اپنے ملک میں بھی آزاد نہیں رہ سکتیں۔ اُبھر نہیں سکتیں، ترقی نہیں کر سکتیں۔ اگر وہ اِدھر اُدھر سے اپنی حفاظت و بقا کا کوئی سامان کرتی ہیں تو طاقتور قوموں کی طرف سے توازن بگڑنے کا شور برپا کیا جاتا ہے، کوئی طاقتور قوم مغرب کے کسی جزیرہ میں بستی ہے۔ اور کوئی شمال کے کسی دور دراز کے خطۂ زمین میں، اور کوئی جنوب کے کسی دُور کے ملک میں۔ لیکن دُنیا کے کسی خطّہ میں کوئی کمزور اور چھوٹی سی قوم بھی اپنی فلاح و بہبود کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتی ہے تو طاقت کا توازن ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے اور بڑی بڑی اقتدار پرست قوموں کی فوجیں امن و امان کے قیام کے نام سے نقل و حرکت میں آ جاتی ہیں۔ بگڑتا ہے ان استعمار پسند قوموں کے اقتدار و قوّت کا توازن اور شور مچ جاتا ہے دُنیا کی قوّت کے توازن کے بگڑنے کا۔ دُنیا نام ہے دُنیا کے مفسد اور امن شکن قوموں اور ملکوں کا۔ اور امن نام ہے اُن کے وقار و تمکن کا ــــ !

امن عالم کے بقا و تحفظ کے لئے دُنیا کی قوموں کی ایک مجلس بنائی گئی ہے۔ اس کی ایک جنرل کونسل یا مجلسِ عظمیٰ ہے۔ اور ان میں جو بڑی بڑی طاقتور اور با اقتدار قومیں ہیں، انہوں نے اپنی ایک بالادست مجلس بنائی ہے، اس کا نام سلامتی کونسل ہے، جسے حفاظتی کونسل بھی کہتے ہیں۔ اس کونسل کا ایک قانون یہ ہے کہ کسی اختلافی معاملہ میں متعلقہ قومیں ایک رائے ہوں۔ صرف ایک قوم کو اس سے اختلاف ہو۔ اور وہ ان کے فیصلے کے ماننے سے انکار کر دے تو وہ فیصلہ رد ہو جائے۔ کیا غیر مہذب اور جاہل دُنیا نے بھی کبھی حق و انصاف کا ایسا قانون وضع کیا تھا؟

یہی قومیں ہیں امنِ عالم کی علمبردار۔ اور محافظِ امن، یہ مجلس بھی دراصل ان مفسد قوموں نے دُنیا کے امن و امان کے تحفظ و بقا کے لئے نہیں بنائی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کو جنگ سے خود اپنے اقتدار و تمکن اور اپنے امن و امان کے لئے خطرہ ہے۔ ان کو یہ ڈر ہے کہ دُنیا کی چھوٹی چھوٹی قومیں کہیں اُن کے اقتدار سے نکل نہ جائیں اور اُن کے اقتدار کی فلک بوس عمارتیں منہدم نہ ہو جائیں۔ لیکن جب انہی قوموں کے مفاد و مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی اُبھرتی ہوئی قوم کو کچل دیں تو وہ خود اپنی ہی بنائی ہوئی مجلس کے قوانین و ضوابط کو پوری بے رحمی اور بے حیائی کے ساتھ توڑ کر رکھ دیتی ہیں اور اُن کی ہمنوا قومیں بھی بے شرمی اور بیباکی کے ساتھ اُن کے اس قانون شکن اور دشمنِ امن اقدام کے رد کرنے میں ڈھیل اور حیلے حوالے سے کام لینے لگتی ہیں ــــ !

ان خرابیوں کی تہ میں جو فساد کام کرتا رہتا ہے اُن پر بے خدا اندھی قوموں کی نگاہ نہیں پڑتی۔ یہ فساد در اصل خدا کے انکار یا خدا کے ساتھ شرک کا نتیجہ ہے، خدا کی اطاعت و بندگی سے آزاد قومیں اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہیں کہ وہ انسانیت، انسانی شرافت اور حق و انصاف ہی سے آزاد ہوجائیں ــــ!

دُنیا میں حقیقی امن اُسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب دُنیا کی قومیں خدا کو مانیں اور اُسی کے آئین و احکام کو انسانی زندگی کا دستور اور ضابطہ تسلیم کرلیں۔ جب دُنیا کی تمام قومیں ایک ہی خدا کو مانیں گی۔ ایک ہی اقتدار کو تسلیم کریں گی۔ ایک ہی دستور و آئین کی پابند ہوں گی اور خدا کی بازپرس اور اس کی جزا و سزا کے عقیدے کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیں گی تو کوئی قوم کسی قوم کے ساتھ زیادتی اور بے انصافی نہ کرے گی اور دُنیا میں سچے امن و انصاف کی بُنیاد قائم ہوجائے گی ــــ!

مجلسِ اقوام کو ایک بے لاگ اور منصفانہ دستور و آئین کی ضرورت ہے۔ جس میں نہ کسی قوم کو غیر منصفانہ فوقیت دی گئی ہو، نہ کسی قوم کو غیر منصفانہ طور پر دبانے کی گنجائش ہو۔ ایسا دستور اور آئین صرف خدائی دستور و آئین ہوسکتا ہے جو خدا کے اقتدار و حاکمیت پر مبنی ہو۔

اگر دُنیا کی دُوسری قومیں خدائی دستور و آئین پر رضامند نہ ہوں تو صرف وہ قومیں جو اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں اور جو خدا کی توحید اور اس کے دستور و آئین کے ماننے ہی کی بنا پر اپنے کو مسلمان کہتی ہیں، اپنی حکومت اور اپنی پُوری زندگی خدائی دستور و آئین کو نافذ کریں۔ اور خدائی حکومت اور اسلامی زندگی کا دُنیا کے سامنے نمونہ پیش کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ دیکھ لیں گی کہ دُنیا کی دُوسری قومیں کس طرح خدائی آئین و ضوابط اور اسلامی زندگی اختیار کرنے کے لئے بہ رضا و رغبت آمادہ ہوجاتی ہیں۔ اگر وہ اعترافِ حق کے ساتھ خدائی دستور و آئین کو قبول نہ کریں گی جب بھی وہ اس کی نقل کرنے پر مجبور ہوجائیں گی۔ اور اس صورت سے دُنیا کے فساد اور انسانیت کے بگاڑ میں بڑی حد تک کمی ہوجائے گی اور انسانیت روز روز کے فساد اور بدامنی کے گرداب سے نکل کر امن و امان کا ٹوٹا پھوٹا ساحل صحیح پالے گی ــــ!

اسلام انسانیت کا عالمگیر نظام ہے

اسلام انسانیت کا عالمگیر نظام ہے۔ اس کا مقصد ہی دُنیا میں انسانیت پیدا کرنا۔ انسانیت کو فروغ دینا اور اسے پروان چڑھانا ہے۔ اس کی پُوری تاریخ شاہد ہے کہ اس نے ہمیشہ یہی کیا ہے۔ اور جہاں اور جب اسلامی قوانین و ضوابط پر عمل ہوا ہے انسانیت سارے دُکھوں اور دردوں سے نجات پاگئی ہے۔ اور سچی انسانیت کا نمونہ وجود میں آگیا ہے۔ انسانیت کو جو کچھ مطلوب ہے۔ یعنی سچی آزادی، سچی مساوات، سچا انصاف، سچا امن۔ وہ سب اسلام کے دامن میں انسانیت کو بدرجۂ اتم یکجا فراہم مل سکتا ہے!

دعوتِ محمدی کے ظہور کے زمانے میں دُنیا کی حالت

انسانیت کو تباہ کرنے والے جتنے جتنے عقائد و اعمال ہوسکتے ہیں دعوتِ محمدی کے زمانے میں وہ سب موجود تھے اور دُنیا کے ہر ملک اور ہر قوم میں موجود تھے۔ کسی ملک اور کسی قوم میں سچی انسانیت موجود نہ تھی۔ مثلاً:۔

(۱) دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو صرف ایک خدا کو ماننے والی ہو۔ پُوری دُنیا میں شرک کا دَور دورہ تھا۔ انسان بندہ تھا اور ہر مخلوق معبود تھی۔ سورج، چاند، ستاروں، فرشتوں، جِنوں، رُوحوں سے لے کر جانوروں اور درختوں تک کی پُوجا ہوتی تھی۔ اور مختلف ملکوں میں انسان خدا کا مظہر اور اس کا نمائندہ بن کر انسانوں سے خدا کی عبادت و بندگی نہیں بلکہ اپنی پُوجا بھگتی کراتا تھا۔ یُونانیوں کے

تین خدا تھے۔ پیٹر، مزدا اور بکسش۔ مصریوں کے بھی تین خدا تھے۔ اوسیس، آیسس اور ہورس۔ ایرانی دو خدا مانتے تھے۔ یزدان نیکی کا خالق تھا اور اہرمن بدی کا۔ عیسائیوں نے خدا کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی ماں کو خدا ٹھہرا لیا تھا۔ ہندوستان میں خدا کا توحیدی تصور موجود تھا۔ لیکن خدا کی تین خداؤں کی مانی جاتی تھی۔ برہما، وشنو اور مہیش کی۔ پھر انہی تین خداؤں تک پُوجا اور پرستش موقوف نہ تھی، بے شمار دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کی پُوجا ہوتی تھی۔ انہی معبودوں میں مرد اور عورت کے جنسی اعضاء کی شکلیں بھی تھیں۔ اور آج بھی ہندوستان کے ہر شہر و دیار میں ان کے مظاہر عام ہیں — !

(۲) جب دُنیا میں کہیں توحید کا وجود ہی نہ ہو۔ ایک سے زائد خدا کی عبادت و بندگی ہو رہی ہو تو ایک خدا کے آئین و قوانین کا کیا ذکر؟ اُس زمانہ میں تو دُنیا جمہوریت اور حقوقِ عامہ کے تصوّر سے بھی ناآشنا تھی۔ انسانوں پر انسانوں کے احکام و قوانین چل رہے تھے — !

(۳) انسانیت کو دُنیا کے کسی ملک اور کسی خطہ میں بھی حریت و آزادی نصیب نہ تھی۔ تمام دُنیا میں شخصی اور خاندانی حکومتیں قائم تھیں۔ ایک انسان کہیں بادشاہ اور راجہ بن کر اور کہیں شہنشاہ اور مہاراجہ بن کر ملک اور قوم پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کی زبان اور مرضی ہی قانون تھی۔ اُس کے مُنہ سے نکلی ہوئی ہر بات کو دینی تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ کوئی اس کی نافرمانی کا تصوّر تک دل میں نہ لاسکتا تھا۔ بادشاہ اور راجہ کے سامنے مؤدب کھڑا ہوا جاتا تھا۔ اُس کے سامنے گھٹنے ٹیکے جاتے تھے۔ اور اُسے سجدہ کیا جاتا تھا۔ گویا وہ بادشاہ اور راجہ ہی نہیں معبود بھی تھا۔

(۴) جہاں حریت و آزادی ہی کا فقدان ہو، وہاں مساوات کا وجود کیونکر ممکن ہے؟ دولت و ثروت، عزت و شرافت، عیش و راحت، اختیار و اقتدار، غرض ایسی تمام چیزیں مُٹھی بھر انسانوں کا ورثہ تھیں۔ یہ مٹھی بھر انسان تھے بادشاہ، راجہ، اُن کے اہلِ خاندان اور عمائد، اور زیادہ سے زیادہ اُن کے قبیلہ و خاندان کے لوگ — !

ہندوستان میں ایک انسانیت چار ٹکڑوں میں بانٹ دی گئی تھی۔ جن کو برہمن، چھتری، ویش اور شودر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس ملک میں جانور مقدس اور قابلِ پرستش تھے، مگر شودر کتے اور سُور سے بھی زیادہ ذلیل تھے۔ کتے اور سُور اچھوت نہ تھے۔ مگر ان انسانوں سے کوئی چُھو جاتا تو وہ ناپاک ہو جاتا تھا۔ ہندوستان کے ایک وسیع تر فرقہ کو آج بھی اس غیر مساواتی تقسیم پر اصرار ہے! اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانیت کی بھلائی اور ملک کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ گنگا اُلٹی بہتی رہے۔ انسان انسان برابر نہ ہوں، کچھ انسان پاک سمجھے جائیں اور کچھ پیدائشی ناپاک، یہ طے ہے کہ ناپاکوں کے لئے انسانیت و پاکیزگی کا دروازہ قدرتی طور پر بند ہے۔ وہ کسی طرح انسانیت اور پاکیزگی کا درجہ حاصل ہی نہیں کر سکتے — !

نوعِ انسانی کے اندر یہ تفریق و تقسیم اور طبقہ بندی ہندوستان کے ساتھ خاص نہ تھی۔ روم، مصر، یونان، فارس، غرض دُنیا کے جتنے مانے ہوئے مہذب اور تمدن یافتہ ملک تھے، سب میں یہ تقسیم اور طبقہ بندی موجود تھی۔

(۵) جس دُنیا میں ایک خدا کے بجائے بہت سے خداؤں کو مانا جاتا ہو۔ انسان خدا بن کر انسانوں پر خدائی کر رہا ہو۔ ہر بادشاہ، راجہ اور فرمانروا کی زبان قانون کا سرچشمہ ہو۔ عوام کی کوئی آواز نہ ہو۔ انسانی مساوات مفقود ہو۔ تفریق اور طبقہ بندی قانونِ قدرت کا حکم رکھتی ہو۔ اس دُنیا کے متعلق قانونی مساوات یا قانونی انصاف کا تصوّر ایسا ہی ہوگا جیسے یہ سوچنا کہ قمری مہینہ کے آخری عشرہ میں بھی پوری رات چاندنی ہوگی یا رات بھر بھی آفتاب شعاعیں بکھیر رہا ہوگا۔

اونچے طبقہ کا کوئی آدمی نیچے کے طبقہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو اس کی سزا معمولی تھی۔ لیکن اگر نچلے طبقہ کا آدمی، اونچے طبقہ کے

کسی شخص کے ساتھ گستاخی بھی کرتا تو وہ گشتنی قرار دیا جاتا۔ اور نیچے کے طبقہ کا کوئی شخص اُونچے طبقہ کے ایک آدمی کو مار ڈالتا تو اس جرم میں اس طبقے کے متعدد آدمی قتل کر دیئے جاتے۔ یہ تھا قانونِ انصاف!

بعثتِ محمدی - دعوتِ اسلام کا آغاز

تاریخ کے اس جاہلی و تاریک دور میں:-

(۱) جب دُنیا خدا کی توحید کو فراموش کر چکی تھی۔

(۲) جب انسان خود انسانی عظمت و شرافت کو بھلا چکا تھا۔

(۳) جب دُنیا میں انسانی آزادی کا نام باقی نہ تھا۔

(۴) جب انسانیت مساوات کے نام سے ناآشنا ہو چکی تھی۔

(۵) جب دُنیا میں انصاف ناپید تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آپ نے دُنیا کو اسلام کی دعوت دی۔ اسلام کا بُنیادی کلمہ تھا۔ لا الٰہ الا اللہ۔ خدا کے سوا کوئی معبود اور حاکم نہیں۔ کتنا مختصر اور سادہ پیغام تھا۔ لیکن یہ انسانیت کا شاہ کلید تھا۔ یہی چند لفظوں کا ایک چھوٹا سا کلمہ انسانیت کے سارے دُکھوں اور دردوں کا نسخۂ شفا تھا۔ خدا کی وحدانیت ہی کا اعلان نہ تھا۔ یہ اعلان تھا۔

۱۔ کائنات کی سب سے بڑی سچائی کا۔

۲۔ انسانیت کی حقیقی عظمت و شرافت کا۔

۳۔ انسانی حریت و آزادی کا۔

۴۔ اُخوت و مساوات کا۔

۵۔ حقیقی عدل و انصاف کا۔

۶۔ عالمگیر اصولِ امن کا۔

دُنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ میں خدا کی طرف سے پیغامبر اور ہادی آئے تھے۔ اور ہر پیغمبر اور ہر رہنما کی پکار تھی لا الٰہ الا اللہ۔ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔ انما الٰھکم الٰہ واحد۔ تم سب کا خدا خدائے واحد ہے۔ یہ دعوت مغرب و مشرق شمال و جنوب، ہر خطہ اور ہر ملک میں بسنے والی قوموں کی مشترکہ میراث تھی۔ لیکن تمام قومیں اس مشترکہ میراث کو گم کر چکی تھیں ــــ! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پچھم والوں کے لئے بھی آئے تھے اور پورب والوں کے لئے بھی۔ اُتر والوں کے لئے بھی اور دکھن والوں کے لئے بھی۔ گوروں کے لئے بھی اور کالوں کے لئے بھی۔ آپ نے خدا کی طرف سے ہر ملک اور ہر قوم میں آنے والوں کے اس پیغام کو زندہ کیا۔ دُنیا کے تمام انسانوں کی گم شدہ میراث اُن کے سامنے رکھ دی۔ محمد رسول اللہ کا یہ تمام دُنیا پر اور دُنیا کی ساری قوموں پر ایک احسانِ عظیم تھا ــــ!

محمد رسول اللہ کے اس بنیادی پیغام نے انسانیت کی کایا پلٹ کر دی۔ اس کا لُٹا ہوا سہاگ اسے واپس مل گیا۔ اس کا تاریک چہرہ چمک اٹھا۔ انسانیت کے سارے دُکھ درد دُور ہو گئے۔ انسانیت نکھر گئی۔ اس کی رگوں میں صحت و توانائی کا نیا خون گردش کرنے لگا۔ انسانیت کی:-

(۱) غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں۔ اب انسان خدا کے سوا کسی کا غلام نہ تھا۔ انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ تھی۔ انسان خدا کے سوا کسی کا محکوم نہ تھا ــ!

۲- انسانوں میں نہ کوئی بڑا رہا نہ کوئی چھوٹا ۔ اونچ رہا نہ نیچ ۔ چھوت رہا نہ اچھوت، پوتر رہا نہ چانڈال ۔ قوموں قوموں کا جھوٹا امتیاز مٹ گیا ۔ مغرب و مشرق کا امتیاز مٹ گیا ۔ گورے کالے، رنگ و نسل، ورن اور طبقہ کی تفریق و تقسیم باقی نہ رہی ۔ ہر انسان انسان تھا ۔ ایک دوسرے کے برابر کا انسان ۔ سب کی حیثیت برابر تھی ۔ سب کی عزت برابر تھی ۔ سب کے حقوق برابر تھے ۔ سب کے لئے ایک قانون تھا ۔ اگر بڑائی اور چھوٹائی تھی تو صرف اس اعتبار سے کہ کون دل کی زیادہ سچائی کے ساتھ خدا کے قانون کی پابندی کرتا ہے ۔ کون خدا سے زیادہ ڈرتا ہے ۔ کون خدا کی رضا و خوشنودی کی طلب کی زیادہ فکر رکھتا ہے ۔ کس کی زندگی بلحاظ اخلاق و عمل، بلحاظ سلوک اور برتاؤ، بلحاظ لین دین زیادہ پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے ۔ ان تمام چیزوں میں جو بڑھ کر تھا وہ زیادہ اونچا اور زیادہ قابلِ عزت تھا اور جو کم تھا وہ کم اونچا اور کم عزت کے لائق تھا ۔ اور جس میں سرے سے یہ باتیں نہ تھیں وہ بالکل حقیر و ذلیل تھا ـــ !

۳- انصاف سب کے لئے عام تھا، قانون کی پابندی میں کسی کے لئے کوئی رعایت نہ تھی ۔ حاکمیت خدا کی تھی ۔ باقی سب محکوم اور رعایا تھے خدائی حکومت کے بڑے سے بڑے سربراہ کو بھی جو خلیفہ اور امیرالمومنین کہلاتا تھا، قانون کی نظر میں کوئی امتیاز حاصل نہ تھا ۔ اسے کسی قسم کی استثنائی اور ترجیحی حقوق حاصل نہ تھے ۔

۱ - نماز سب پر فرض تھی ۔
۲ - زکوٰۃ سب پر فرض تھی اگر صاحبِ نصاب ہو ۔
۳ - روزہ سب پر فرض تھا اگر معذور نہ ہو ۔
۴ - حج ہر صاحبِ نصاب پر فرض تھا اگر کوئی شرعی امر مانع نہ ہو ۔
۵ - حلال و حرام کی پابندی سب پر فرض تھی ۔
۶ - شراب سب کے لئے حرام تھی ۔
۷ - زنا سب کے لئے حرام تھا ۔
۸ - جوا سب کے لئے حرام تھا ۔
۹ - چوری سب کے لئے حرام تھی ۔
۱۰ - سود سب کے لئے حرام تھا ۔
۱۱ - خونِ ناحق سب کے لئے جرم تھا ۔
۱۲ - ہر جرم کی سزا جو بڑے کے لئے تھی وہی چھوٹے کے لئے تھی ۔ حکومت کا سب سے بڑا سربراہ کار اور سب سے بڑا سرکردہ بھی کسی جرم کی سزا سے مستثنیٰ نہ تھا ۔ اور نہ اس کے لئے قانون میں کوئی رعایت تھی ـــ !

اسوۂ محمدی

(۱) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا پرستی اور نیک کرداری کا نمونہ تھے ۔ آپ کی ذات قدسی صفات ہر گناہ اور معصیت سے پاک تھی ۔ وہ معصوم اور سراپا خیر ہی خیر اور نیکی ہی نیکی تھے ۔ آپ میں کوئی برائی اور بدی نہ تھی ۔ آپ سے جو کچھ صادر ہوتا تھا وہ خیر ہی ہوتا تھا ۔ لیکن خود ان کا حال یہ تھا کہ وہ جس نیکی اور خیر کا دوسروں کو حکم دیتے، اس کی سب سے زیادہ خود پابندی کرتے، انہوں نے دنیا کو لا الٰہ الا اللہ، کی دعوت دی تو ان کی زندگی توحید پرستی کا سب سے زیادہ روشن اور تابناک نمونہ تھی ۔ دنیا کی تمام قوموں نے اپنے ہادی و پیشرو کو خدا بنا کر پوج ڈالا ۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے سب سے

زیادہ بڑھ چڑھ کر تے۔ پھر انسان اُن کو سب سے بڑا خدا بنا کر اور زیادہ جوش وخروش کے ساتھ کیوں نہ پوجتا! لیکن آپ نے اس ضلالت کے ہر دروازہ اور ہر رخنہ کو پوری سختی سے بند کر دیا۔ آپ نے دنیا کو اپنے متعلق جو تعلیم دی اُس کا بنیادی کلمہ ہے: "اشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ" میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے اور رسول ہیں۔ یعنی خدا کی خدائی میں محمدؐ کا کوئی حصّہ اور ساجھا نہیں ہے۔ اُن کی اوّلین حیثیت خدا کے بندے کی ہے۔ وہ پہلے خدا کے بندے ہیں، اس کے بعد خدا کے رسول۔ اور یہی اُن کی حیثیت کی آخری حد ہے۔ قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ۔ اے محمدؐ! تم کہہ دو کہ میں تمہارے جیسا ایک بشر ہوں البتہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی بھیجی جاتی ہے۔ یعنی میں خدا کا رسول ہوں۔

آپ نے اپنی ہر ہر ادا سے خدا کے حضور اپنے عجز و بندگی کا اظہار کیا۔ آپؐ رات کو اس کثرت سے نماز پڑھتے کہ آپؐ کے پائے مبارک ورم کر جاتے۔ نماز میں خوفِ خدا سے اس طرح روتے کہ آپؐ کے اندر سے آگ پر جوش مارتی ہوئی دیگ کی سی آواز آتی۔ آپؐ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے اور ہر کام خدا کا نام لے کر شروع کرتے۔ آپؐ مختلف وقتوں میں خصوصاً رات کی تنہائیوں میں خدا سے کس عاجزی اور بے چارگی کے ساتھ دعائیں مانگا کرتے تھے۔ آپؐ کی ایک دعا کے کچھ لفظوں کا ترجمہ یہ ہے:۔

"میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جُو ہوں، پریشان ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں۔ جیسے بیکس سوال کرتے ہیں۔ تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں، جیسے گنہگار ذلیل و خوار گڑگڑاتے ہیں۔ تجھ سے مانگتا ہوں جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ مانگتا ہے۔ اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے سامنے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔" (کنز العمال)

جب آپؐ رات کی نماز میں اتنی مشقت کرتے کہ پاؤں ورم کر آتے اور آپؐ سے کہا جاتا کہ خدا نے تو آپ کو کسی گناہ کے بغیر ہی یہ بشارت دے دی ہے کہ آپؐ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے گئے پھر آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ تو فرماتے: "کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟" غرض ہر طرح آپؐ نے دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ خدا خدا ہے اور بندہ بندہ! میں بھی خدا کا بندہ ہوں، اُس کی خدائی کا شریک نہیں ہوں۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو خدا کی حکمبرداری کی تعلیم دی تو سب سے زیادہ سختی کے ساتھ خود خدا کے احکام کی پابندی کا نمونہ پیش کیا۔ آپؐ کی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت بھی خدا کے حکم کے خلاف نہ ہوتی تھی۔ آپؐ بولنے، دیکھنے اور سننے تک میں خدا کے حکم کی پابندی کرتے تھے، آپؐ کی پوری زندگی خدا پرستی اور خدا کی حکمبرداری کا نمونہ تھی۔ کسی نے آپؐ کی بیوی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی سیرت و کردار کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب دیا: "کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟" مطلب یہ تھا کہ آپؐ کی پوری زندگی خدا کی بھیجی ہوئی کتاب قرآن مجید کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو مساوات کی تعلیم دی۔ تو خود اس کا نمونہ اس طرح پیش کیا کہ اپنے آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ اور اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اُن کے عقد میں دے دیا۔ حضرت بلال اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہما بھی آزاد کردہ غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان کو اپنے گھر والوں میں شامل کر لیا تھا۔ یہ دونوں بزرگ آپؐ کے خاندان اور آپ کی قوم کے بڑے بڑے عالی مرتبہ صحابہ کے برابر سمجھے جاتے تھے۔ آپ حضرت زیدؓ بن حارثہ کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے نواسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی طرح پیار اور محبت کرتے تھے۔ غلاموں کی دعوت قبول فرماتے اور وہ جو روکھا سوکھا کھانا پیش کرتے اُسے خوشی سے کھا لیتے۔ لونڈیوں کی درخواست پر اُن کے ساتھ جاتے اور اُن کے مالکوں سے اُن کی طرف سے سفارش فرماتے۔ اپنے صحابہ کے ساتھ چلتے تو اُن میں اس طرح مل جل کر چلتے کہ جو آپؐ سے ناآشنا ہوتا اُسے پتہ نہ چلتا کہ ان میں خدا کے رسولؐ کون ہیں۔ صحابہ کی مجلسوں میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ صدر و پائیں کا خیال نہ فرماتے۔ حالانکہ جہاں تک عقیدت و احترام کا تعلق تھا جس عقیدت و احترام کا ثبوت آپؐ کے صحابہ نے دیا کسی پیغمبر اور کسی رہنما کے پیروں نے نہ دیا ہوگا۔ لوگ آپؐ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے لیکن سجدہ خدا کے سوا کسی کے لئے جائز نہ تھا۔ آپؐ نے مسئلہ سمجھا کر صحابہ کو اس سے منع فرما دیا۔!

صحابۂ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہو جانا اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ لیکن جب مدینہ منورہ میں مسجدِ نبوی بننے لگی تو آپؐ بھی صحابہ کے ساتھ مٹی اور پتھر ڈھوتے تھے۔ اور جب جنگِ خندق کے موقع پر مدینہ کی حفاظت کے لئے خندق کھودی جانے لگی تو صحابہ کے ساتھ آپؐ نے بھی خندق کھودنے میں حصہ لیا۔ ایک سفر میں جب ایک جگہ پڑاؤ ہوا اور کھانا پکنے لگا تو لکڑیاں لانے کا کام آپؐ نے اپنے ذمے لے لیا۔ اور صحابہ کے باصرار روکنے پر بھی لکڑیاں آپؐ جمع کر لائے۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عفو و درگزر اور امن پسندی کی تعلیم دی تو آپؐ نے اپنے بڑے بڑے جانی دشمنوں کو بھی قابو پانے کے بعد معاف فرما دیا۔ ایک دفعہ آپؐ صحابہ کے ساتھ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ دھوپ کے موسم میں ایک باغ کے سایہ میں مقام ہوا۔ آپ صحابہ سے الگ کسی درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے۔ ایک دشمن موقع پا کر آپ کے پاس پہنچ گیا۔ آپ کی تلوار درخت سے لٹک رہی تھی۔ اُس نے تلوار درخت سے اُتار لی۔ آپؐ کو بیدار کر کے پوچھا "بتاؤ اب تم کو مجھ سے کون بچائے گا؟" آپؐ نے کامل اعتماد علی اللہ کے ساتھ جواب دیا "اللہ" اس جواب میں ایسا اثر تھا کہ دشمن نے تلوار نیام میں کر لی۔ اتنے میں صحابہ بھی آ گئے۔ لیکن دشمن بعافیت واپس چلا گیا اور حضورؐ نے اُس سے کچھ تعرض نہ فرمایا۔ حضورؐ کی موجودگی کے باعث جاں نثار صحابہ کی پیشانی تک شکن آلود نہ ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عفو و درگزر اور امن پسندی کا ایک بے مثال نمونہ فتح مکہ کے موقع پر پیش کیا۔ قریش مکہ بیس اکیس[۲۱] برس تک آپ کی مسلسل مخالفت کرتے رہے۔ اور دشمنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ انہوں نے آپ کو اور آپ کے صحابہ کو تین برس تک مکہ کی ایک گھاٹی شعب ابی طالب میں نظر بند رکھا تھا۔ آپ کے قتل کی کوشش کی تھی۔ آپ کو اور آپ کے صحابہ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ مدینہ منورہ پر بار بار فوجی حملے کر کے چاہا تھا کہ اسلام کو اور آپ کو نیست و نابود کر دیں۔ لیکن جب آپ ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے اور اہلِ مکہ میں تابِ مزاحمت باقی نہ تھی تو آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ:۔

۱۔ جو شخص ہتھیار ڈال دے، اُس کے لئے امن ہے۔
۲۔ جو شخص اپنے گھر میں بیٹھ رہے اس کے لئے امن ہے۔
۳۔ جو شخص ابوسفیان کے مکان میں چلا جائے اس کے لئے امن ہے۔ حالانکہ ابوسفیان دشمنوں کے سردار تھے اور شکست

کھانے کے بعد ابھی ایک روز پہلے مسلمان ہوئے تھے ---!

داخلۂ مکہ کے بعد خدا کے رسولؐ کا فاتحانہ دربار منعقد ہوا ۔ بیسؔ برس تک مسلسل عداوت و دشمنی سے پیش آنے والے جنگی مجرم کی طرح حاضرِ دربار تھے ۔ آپؐ نے اُن سے سوال کیا کہ "تمہارا کیا خیال ہے کہ آج تمہارے ساتھ کیا ۔ سلوک کیا جائے گا؟"

لوگوں نے جواب دیا "ہم جانتے ہیں کہ آپؐ اچھے بھائی اور اچھے بھائی کے بیٹے ہیں ۔ ہم آپ سے اچھے ہی سلوک کی امید رکھتے ہیں"

دشمن تھے ، لیکن آپؐ کی فطرتِ کریمانہ سے ناآشنا نہ تھے ۔ آپؐ نے دشمنوں کی توقع سے بھی کہیں بڑھ کر جواب دیا ۔ فرمایا "جاؤ تم آزاد ہو ۔ آج تم پر کسی قسم کی ملامت و سرزنش نہیں ۔ لا تثریب علیکم الیوم !

جن لوگوں نے بیسؔ برس تک آپؐ کی رسالت و نبوت کا انکار کیا تھا اور اسلام کے مٹانے میں اپنی ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر دیا تھا ، وہ آپ کے اس اخلاقِ کریمانہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُن کی اکثریت اسی وقت اسلام قبول کر کے آپ کے خادموں اور اطاعت گزاروں کے حلقہ میں داخل ہو گئی ۔ پھر اُن کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ وہ اسلام کے جتنے سخت دشمن تھے ، اس سے کہیں زیادہ اسلام کے مخلص جاں نثار اور خدا کا رہن گئے ۔ لا الٰہ الا اللہ کی کنجی سے اُن کے دلوں کے قفل کھُل گئے ۔ اور سینے نور سے معمور ہو گئے ---!

(۵)۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ اپنے خاندان اور اپنے صحابہ کا تو کیا ذکر ہے ، آپ نے اپنی ذات کے ساتھ بھی انصاف کے معاملہ میں کسی رعایت کو روا نہیں رکھا ۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے ساتھ جو آپ کے مخالف اور بدترین دشمن تھے ، جب کبھی کوئی معاملہ پیش آیا اور حق یہودی کے ساتھ تھا تو آپ نے یہودیوں کے موافق فیصلہ فرمایا ۔ آپؐ کی اسی انصاف پسندی کا نتیجہ تھا کہ یہودی اپنے ججوں سے زیادہ آپ پر بھروسہ کرتے تھے ۔ اور اپنے مقدمے آپ کی خدمت میں لایا کرتے تھے ۔ اور کبھی کسی فریق کو آپ کے فیصلے کے خلاف شکایت پیدا نہیں ہوئی ۔

عقیدۂ توحید اور اسلام

انسان نے جب سے اس زمین پر قدم رکھا ، ایسا زمانہ کبھی نہیں آیا جب انسانوں میں خدا کا تصور اور عقیدہ موجود نہ رہا ہو ۔ اور ہر دَور میں اکثریت و اہمیت اسی گروہ کو حاصل تھی جو خدا کا عقیدہ رکھتا تھا ۔ اگر کسی زمانہ میں کوئی شخص اور ایسا فرقہ پیدا بھی ہوا جو خدا کا منکر تھا تو اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی اور نہ اس نے انسانیت کے لئے کوئی اخلاقی کارنامہ انجام دیا ۔ جن لوگوں نے انسان کو انسانیت کی تعلیم دی ، انسان کو انسان بنایا ۔ دُنیا میں نیکی پھیلائی اور انسانی اخلاق و کردار کو بلند کیا ، وہ سب خدا کے ماننے والے تھے ۔ قرآن مجید کا یہ عام دعویٰ ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے معلم و رہنما آئے ، اُن سب نے انسانوں کو خدا کی ہستی کے عقیدے اور اسی کی عبادت و بندگی کی تعلیم دی ۔ موجودہ اقوامِ عالم میں بھی زیادہ تعداد انھیں قوموں کی ہے جو خدا کے ماننے کا دعویٰ کرتی ہیں ۔ لیکن خدا کو ماننے والی دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو کسی نہ کسی درجہ میں شرک میں مبتلا نہ ہو ---- ہندوستان کا آریہ فرقہ ایک خدا کے ماننے کا دعویٰ کرتا ہے ۔ مگر وہ بھی خدا کی طرح روح اور مادّہ کو ازلی اور غیر مخلوق مانتا ہے ۔ جب وہ ان دو صفتوں میں خدا کے ساتھ روح اور مادّہ کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو اس کا عقیدۂ توحید بھی شرک فی الصفات سے ملوث ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔ لیکن اسلام کا عقیدۂ توحید بالکل خالص اور بے آمیز ہے ۔ اسلام کہتا ہے لا ابتدا اور لا انتہا اور غیر مخلوق صرف خدا کی ذات ہے ، وہ تمام چیزوں کا خالق ہے ۔ اس کے سوا جو کچھ ہے سب اُس کی مخلوق ہے ۔ قرآن مجید نے لا الٰہ الا اللہ کی کس طرح تفسیر و تشریح کی ہے ۔ اور عقیدۂ توحید کو کس طرح نکھارا اور اُجاگر کیا ہے ، اسے قرآن ہی کے لفظوں میں دیکھئے ۔

۱- اللہ خالق کل شیٔ - اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔
۲- اللہ علی کل شیٔ قدیر- اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔
۳- بدیع السموات والارض - آسمانوں اور زمین (سب کا) وہی پیدا کرنے والا ہے۔
۴- لہٗ ملک السموات والارض - آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت خدا ہی کے لئے ہے۔
۵- لہٗ مقالید السموات والارض - آسمانوں کی اور زمین (کے اختیار) کی کنجیاں اللہ کے قبضہ میں ہیں۔
۶- لیس کمثلہ شیٔ - خدا کے جیسی کوئی چیز نہیں۔
۷- لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار- اس تک نگاہیں نہیں پہنچتیں اور وہ نگاہوں تک پہنچ جاتا ہے۔
۸- ان اللہ اعلم غیب السموات والارض انہ علیم بذات الصدور- اللہ آسمانوں اور زمین کی چھپی باتوں کا بھی جاننے والا ہے، نیز وہ دلوں کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔
۹- اللہ اعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور- اللہ تمہاری آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور ان باتوں کو بھی جو تم اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے ہو۔
۱۰- سبّح للہ ما فی السموات وما فی الارض - آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں- یعنی زبان حال سے اس کی پاکی بیان کرتی ہیں۔
۱۱- عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں- نزول قرآن کے زمانے میں یہودیوں کا ایک فرقہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتا تھا۔ مشرکین میں بہت سی قومیں فرشتوں کے متعلق عقیدہ رکھتی تھیں کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں، اس لئے قابل پرستش ہیں۔ قرآن نے جا بجا ان عقائد باطلہ کی تردید کی ہے:-

"انما اللہ المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ۔"

مسیح عیسیٰ (نہ خدا تھے، نہ خدا کے بیٹے) وہ مریمؑ کے بیٹے اور خدا کے رسول تھے۔

"انما اللہ الہ واحد سبحٰنہ ان یکون لہ ولد۔"

ایک خدا ہی معبود ہے، وہ اس بات سے پاک ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔

"لن یستنکف المسیح ان یکون عبداللہ ولا الملٰئکۃ المقربون۔"

مسیح اور مقرب فرشتے اس بات میں کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرتے کہ وہ خدا کے بندگی گزار ہوں۔

۱۲- بعض قوموں کا عقیدہ ہے کہ خدا انسانوں کی شکل میں جنم لیتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی تردید کی:-

"لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد۔"

خدا نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا- اور نہ کوئی اس کے جوڑ کا ہے۔

یعنی یہ خدا کی شان کے قطعی منافی ہے کہ وہ کسی مرد کے نطفہ میں منتقل ہو کر کسی عورت کے جسم میں آئے اور انسانوں کی طرح جنمے۔ وہ اس گندگی سے بالکل پاک ہے۔

۱۳- بہت سی قومیں سورج، چاند اور ستاروں کو پوجتی تھیں- قرآن نے کہا۔

الم تر ان اللہ یسجد لہ من فی السموات ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب

وکثیر من الناس ـــ !

"کیا تم نے غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوق ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بکثرت انسان خدا کو سجدہ کرتے ہیں"

یعنی اپنی اپنی خلقت کے مطابق سب خدا کے سامنے جھکے ہوئے اور اس کی بندگی بجا لا رہے ہیں۔ لیکن سب کی جنس اور خلقت جُدا ہے، اس لئے اُن کی بندگی کی صورتیں بھی ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

(۲) سورج اور چاند کے متعلق جن کی پرستش زیادہ عام تھی، یہاں تک فرمایا۔

"وسخر لکم الشمس والقمر دائبین"

سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا کہ دونوں (دن رات) ایک طریقے پر چل رہے ہیں۔

اس بات کو اور عام کیا:۔

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا نے سب کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے۔

یعنی آسمان و زمین کی ساری ہی چیزیں انسان کی خادم ہیں۔ اس کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ خدا کی مخلوق میں کوئی شئے اس قابل نہیں کہ وہ انسان کی معبود ہوں اور انسان اُن کی پُوجا پرستش کرے!

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی

خدائی حکومت

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو سارے عرب میں اسلام پھیل چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں پُورے ملکِ عرب پر خدا کے رسُول کے ذریعہ خدائی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ہم اُسے خدائی حکومت اس لئے نہیں کہتے کہ عرب میں کہیں حکومت کا پائے تخت تھا، وہاں کوئی قلعہ تھا جس میں کوئی شاہی تخت رکھا ہوا تھا۔ جہاں خدا کا دربار آراستہ ہوتا تھا اور خدا تختِ سلطنت پر رونق افروز ہو کر فرمانِ سلطانی کا نفاذ کیا کرتا تھا۔ نہیں کہیں کوئی قلعہ نہ تھا۔ شاہی قصر و ایوان بھی نہ تھے۔ تخت و تاج بھی نہ تھے، وہی مدینہ کا شہر تھا۔ وہی مسجدِ نبوی تھی جس کا فرش کچی زمین کا تھا اور چھپر کھجور کی ٹہنیوں کا۔ یہی خدائی حکومت کا دربار خانہ تھا۔ حکومت کرنے والا ہاتھ بھی انسانی ہی ہاتھ تھا۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خلیفہ اور جانشین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ یہی خدائی حکومت کے صدر یا سربراہ کار تھے۔ جن کو خلیفۂ رسُول کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ پیوند لگے ہوئے پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر مسجدِ نبوی میں کھجور کی چٹائی پر بیٹھا کرتے تھے۔ یہیں سے ایرانی اور رومی شاہنشاہیوں کے مقابلہ کے لئے مجاہدین کی فوجیں روانہ ہوتی تھیں۔ یہیں سے تمام عرب کے لئے احکام صادر ہوتے تھے۔ یہی مسجد عدالت کا کام بھی دیتی تھی۔ اسی میں بیٹھ کر خلیفۂ رسُول مقدمے فیصل کیا کرتے تھے۔ آپ کی شانِ حکومت و خلافت یہ تھی کہ جس طرح خلیفہ ہونے سے پہلے اپنے غریب پڑوسی کی بکریوں کا دُودھ دُوہ دیا کرتے تھے اسی طرح اب بھی یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ مدینہ کے ضعیفوں اور معذوروں کے گھروں پر جا کر اُن کی ضرورتیں پُوری کیا کرتے تھے۔ مسکینوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔ غرض خدائی حکومت کے حاکمانہ فرائض انجام دینے والے انسان ہی تھے۔ لیکن ہم اس حکومت کو خدائی حکومت کیوں کہتے ہیں؟ ہاں بلاشبہ وہ خدائی حکومت تھی، اس لئے کہ اگر وہ انسانی حکومت ہوتی تو اُس کے پایہ تخت کے لئے اس زمانہ کے موافق قلعہ

تعمیر ہوتا۔ اس کا حکمران ایران و روم اور دوسری سلطنتوں کے فرمانرواؤں کی طرح شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ ایوان و محل میں رہتا۔ تاج شاہی زیب سر کرتا۔ تخت زرین پر جلوہ افروز ہوتا۔ اس کے حشم و خدم ہوتے۔ نقیب اور چوب بردار ہوتے۔ اس کا دربار آراستہ ہوتا۔ درباری ہاتھ باندھے، نگاہیں نیچی کئے اس کے سامنے حاضر ہوتے۔ اس کا قانون قانون ہوتا۔ اس کی مرضی فرمان واجب الاذعان ہوتی۔ اس کا ہر حکم واجب العمل ہوتا۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی طرف بہ حرف تعمیل ہوتی۔ کسی کو مجال دم زدن نہ ہوتی۔ لیکن خلیفہ کو قانون بنانے، اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق حکم دینے اور اپنا قانون چلانے کا مطلق اختیار نہ تھا۔ اس کی ایسی بات کے سننے، ماننے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے ایک شخص بھی تیار نہ تھا۔ زبان خلیفہ کی تھی اور دماغ بھی خلیفہ کا تھا۔ لیکن قانون خلیفہ کا نہ تھا۔ مرضی خلیفہ کی نہ تھی۔ قانون تھا خدا کا۔ اس کی تشریح و توضیح تھی خدا کے رسول کی۔ خلیفہ صرف خدائی دستور و قوانین کے نافذ اور جاری کرنے والے تھے۔ خلیفہ بھی پورے خدائی دستور و آئین اور اس کے ایک ایک قانون کے اسی طرح پابند تھے جس طرح عرب کا ایک غریب بدو ہاتی۔ خلیفہ کو کسی پر کوئی ترجیح و فوقیت حاصل نہ تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کا خود یہ حال تھا کہ جب ان کو خلیفہ منتخب کیا گیا اور انہوں نے بحیثیت خلیفہ کے مسجد نبویؐ کے منبر سے پہلی تقریر کی تو خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:۔

"لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں۔ حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری اعانت کرو۔ اور برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو۔"

تقریر کے آخر میں فرمایا:۔

"میں خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو۔ لیکن جب خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت نہیں ہے۔"

ہم اسی کو خدا کی حکومت کہتے ہیں۔ کیا ایسی حکومت واقعی خدائی ارضی حکومت نہیں ہے؟

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، خلیفہ کے بدلنے سے حکومت کا دستور و آئین نہیں بدلا۔ اس لئے کہ دستور و آئین انسانی نہ تھا۔ خدائی تھا۔ وہ نہیں بدل سکتا تھا۔ حکومت کی پالیسی بھی نہیں بدلی۔ دوسرے خلیفہ کی زندگی بھی وہی تھی جو پہلے خلیفہ کی تھی۔ وہی پھٹے پرانے پیوند لگے ہوئے کپڑے، وہی مسجد نبویؐ۔ وہی کھجور کے پتوں کی چٹائی کا فرش۔ حکومتوں کے سفراء آتے تھے اور خدائی حکومت کا صدر اور سربراہ کار اسی شان سے اُن سے ملتا تھا۔ وہی خدا ترسی اور وہی خدمت خلق جو اُس کے پیش رو کا طرۂ امتیاز تھی۔!

وہ روم و فارس کے محاذ جنگ پر فوجیں روانہ کرتے۔ میدان جنگ میں قیادت کرنے والوں کو ہدایتیں بھیجتے۔ یتیموں، بیواؤں، بوڑھوں، معذوروں کے گھروں پر جا کر ان کی ضرورتیں پوری کرتے۔ راتوں کو جاگ کر نمازیں پڑھتے تھے اور خدا کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے تھے!

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور چوتھے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ سب کی خلافت و حکومت کا قانون وہی خدائی قانون تھا۔ وہ بھی خدائی قانون کی پابندی میں عوام سے پیش پیش تھے۔ اُن کو بھی ہر شے سے زیادہ خدا کی رضا و خوشنودی کی طلب تھی۔ وہ حکومت کو اپنی ملک نہیں خدا کی امانت سمجھتے تھے۔ سرکاری خزانے سے صرف اتنا لیتے تھے جتنے میں ان کا اور متعلقین کا پیٹ بھر سکے۔ اور تن پوشی ہو سکے۔ وہ بھی غریب انسانوں کی طرح۔ اس سے زیادہ ایک پائی بھی اپنی اور اپنے متعلقین پر

خرچ کرنا ناجائز سمجھتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس طرح بھی ایک کوڑی سرکاری خزانے سے نہ لی۔ کھایا پہنا اپنا اور بارہ برس تک خدائی حکومت کی خدمت انجام دی۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس تنگ حالی کے ساتھ بسر کرنے کے لئے سرکاری خزانے سے جو وظیفہ لیا۔ اس کے متعلق بھی مرتے وقت وصیت کر گئے کہ میری جائیداد سے وہ رقم ادا کر دی جائے۔ یہ خدائی حکومت نہ تھی تو کیا تھی؟ تاریخ میں ایسی انسانی حکومت انسان نے کب دیکھی؟ اگر کسی تاریخ سے ایسی حکومت کا سراغ مل سکے تو ہمیں بھی اس کا نام بتائیے۔

عقیدۂ توحید کے ثمرات

انسان فرشتوں کی طرح معصوم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود عقیدۂ توحید نے انسانوں کی کس قدر کایا پلٹ کر دی تھی؟ ایک بار دو شخص ایک زمین کا جھگڑا لے کر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ ہر شخص کا دعویٰ تھا کہ زمین اُس کی ہے!

خدا کے رسول نے دونوں کو تنبیہ فرمائی کہ دیکھو تم میں جو شخص اپنے دعوے کو ثابت کرے گا، میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں گا۔ لیکن اگر زمین واقعی اس کی نہیں ہے اور اُس نے اپنی چرب زبانی سے اپنا حق ثابت کر دیا تو قیامت کے روز میرا فیصلہ اسے خدا کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔ یہ سُن کر دونوں فریق خوفِ خدا سے رو پڑے اور دونوں کہنے لگے۔ اے خدا کے رسول! زمین فریق ثانی کو دے دی جائے۔

ایک عورت سے بدکاری ہو جاتی ہے۔ وہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خود حاضر ہو کر درخواست کرتی ہے کہ مجھے بدکاری کی سزا دی جائے۔ نہ کوئی مدعی ہے اور نہ کوئی گواہ۔ اسے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا لے جائے مگر خدا کی باز پرس کی فکر اسے چین نہیں لینے دیتی۔ اور بالآخر اُسے سزا دے دی جاتی ہے۔

یہ اپنی نوعیت کا تنہا واقعہ نہیں ہے، کئی عورتوں اور مردوں کے ایسے واقعات احادیث میں موجود ہیں۔ اول تو ایسے واقعات ہمیشہ ہی شاذ و نادر آتے تھے۔ لیکن معاشرے میں اَن دیکھے خدا کی ہستی کا ایسا شدید یقین پیدا ہو گیا تھا کہ لوگ آخرت کی باز پرس سے بچنے کے لئے وہ خوشی خوشی دُنیا کی جانی سزا تک قبول کر لیتے تھے۔

ایک شخص قتل کا مجرم ہے۔ مدعی اُسے پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے لاتا ہے۔ مجرم کو خود اعتراف جرم ہے۔ مگر اس کے چھوٹے بھائی کے نام اس کے باپ کی ایک وصیت ہے۔ وہ مہلت کی درخواست کرتا ہے کہ باپ کی وصیت پوری کر آئے۔ ایک صحابی اس کی ضمانت کرتے ہیں۔ وہ گھر جاتا ہے اور وقت مقررہ پر واپس آکر حاضر ہو جاتا ہے۔ مدعی اُس کی سچائی سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ خون معاف کر دیتا ہے۔ خدا اور اُس کی توحید کا عقیدہ خدائی حکومت کے قانون کا کتنا احترام عوام کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے؟

(۲) ایک ایسا معاشرہ اور ایسا نظام حکومت وجود میں آ گیا تھا کہ عوام ہوں یا حکومت کا اعلیٰ سربراہ کار۔ سب کی زندگی کی بنا ایک خدا کے عقیدے پر تھی۔ جو زمین و آسمان اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور ساری کائنات کا مالک ہے۔ اور جس کے علم اور رسائی کا حال یہ ہے کہ وہ آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے بھید تک کو جانتا ہے۔ اس لئے اب زندگی کی کوئی کل ایسی نہیں جو بے بید ہی نہ ہو گئی ہو۔ اب کسی کا حوصلہ نہیں ہے کہ کوئی کسی کو دبائے۔ کسی پر زیادتی کرے۔ یا کسی کی آزادی کو کچل سکے۔ اب سب کی حیثیت ایک سی ہے۔ سب آزاد ہیں۔ سب کے حقوق برابر ہیں۔ اب خود خلیفہ اور امیر جو نظام حکومت اور معاشرے میں سب سے اونچی پوزیشن کا مالک ہے، عوام کی آزادی کا احترام کرتا ہے۔ اور جہاں دیکھتا ہے کہ کوئی صاحب اقتدار عوام کی آزادی کی بے حرمتی کر رہا ہے، صاحب اقتدار کی سرزنش کرنے میں ذرا نہیں جھجکتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرب، شام، عراق، فارس اور مصر پر حکومت کر رہے تھے۔ شام کے دورہ سے مدینہ واپس آ رہے ہیں، راستہ میں بھی جا بجا رک رک کر پتہ لگا رہے ہیں کہ حکومت اور حکام سے کسی کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟ ایک چھوٹا سا خیمہ نظر آتا ہے۔ اس کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں ایک بڑھیا ملتی ہے۔ پوچھتے ہیں:-

"تمہیں کچھ معلوم ہے عمر کا کیا حال ہے؟"

بڑھیا کہتی ہے "ہاں شام سے چل چکا ہے۔ خدا اُسے غارت کرے، آج تک مجھ کو اُس سے ایک حبہ نہیں ملا۔"

حضرت عمرؓ بے اختیار رو پڑتے ہیں کہتے ہیں:-

"بڑی بی! عمر کو اتنی دُور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

بڑھیا کہتی ہے "پھر اس نے اتنی بڑی مملکت اور اتنے بندگانِ خدا کی ذمہ داری اپنے سر کیوں لے رکھی ہے؟"

حضرت عمرؓ اس سے معافی مانگتے ہیں اور اس کے گزارے کا معقول انتظام کر دیتے ہیں۔

قانون خلیفہ اور امیر کا نہیں، خدا کا چل رہا ہے۔ اس کے متعلق خلیفہ اور امیر سے کیوں نہ بھول چوک ہو۔ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ خلیفہ کو ٹوک دے۔ حضرت عمرؓ ایک تقریر میں عورتوں کے زیادہ مہر باندھنے کی مخالفت کرتے ہیں۔ ایک بڑھیا قرآن شریف کی ایک آیت کا حوالہ دیتی ہے۔ جس میں زیادہ سے زیادہ مہر باندھنے کی آزادی دی گئی ہے۔ حضرت عمرؓ فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں "بیشک ایک بڑھیا کا علم عمرؓ سے زیادہ ہے۔"

ایک بار مالِ غنیمت میں کچھ کپڑا آتا ہے۔ وہ مسلمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو بھی اُس میں سے اُتنا ہی حصہ ملتا ہے جتنا دوسرے مسلمانوں کو۔ آپ اس کپڑے کا کُرتا پہن کر مسجد میں خطبہ دینے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک معمولی شخص اُٹھتا ہے۔ کہتا ہے:-

"عمرؓ جب تک میرے سوال کا جواب نہ دے دو، میں تمہاری بات نہیں سُن سکتا۔"

آپ فرماتے ہیں۔ "پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟"

کہتا ہے۔ "تم جس کپڑے کا کُرتا پہنے ہوئے ہو، وہ ملا تو تمہیں بھی ہم سب کے برابر۔ اس سے ہمارا کُرتا تو نہیں بنا تمہارا کیسے بن گیا؟"

حضرت عمرؓ اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ سے فرماتے ہیں۔ "اٹھو۔ معترض کو جواب دو۔"

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں:-

"اس کُرتے میں میرے حصہ کا کپڑا بھی شامل ہے۔"

سائل کہتا ہے۔ "ہاں اب میں تمہاری بات سنوں گا۔"

ایک دفعہ ایک شخص نے کسی معاملہ میں حضرت عمرؓ سے کہا۔ "عمرؓ! خدا سے ڈرو۔"

وہ شخص بڑی بیباکی کے ساتھ بار بار اس جملہ کو دُہرا تا رہا۔

دُوسرے شخص نے اسے ٹوکا، کہا "بہت ہو چکا۔ اب بس بھی کرو۔"

"حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "ان کو کہنے دو۔ اگر یہ مجھے نصیحت نہ کریں تو ان میں کوئی خوبی نہیں۔ اور اگر میں ان کی نصیحت قبول نہ کروں۔ تو مجھ میں کوئی اچھائی نہیں۔"

یہ خدا اور اس کی وحدانیت کے عقیدہ کا ثمرہ نہ تھا تو اور کیا تھا؟ کسی اور نظامِ زندگی نے بھی ایسے حکمران پیدا کئے؟

ایک بار حضرت عمرؓ نے منبر پر چڑھ کر فرمایا " لوگو! اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم کیا کروگے ؟"
ایک شخص فوراً کھڑا ہوگیا - اور سینا میں سے تلوار کھینچکر بولا " تمہارا سر اڑا دوں گا "
حضرت عمرؓ نے امتحاناً سوال کیا " میری شان میں ایسے الفاظ کہتا ہے ؟"
اس نے کہا " ہاں تمہاری شان میں "
حضرت عمرؓ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا - فرمایا " خدا کا شکر ہے - ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو عمرؓ کو بھی سیدھا کر سکتے ہیں "

خدائی حکومت کا سربراہ کار لوگوں کے جذبۂ آزادی کو کچلتا نہیں، بلکہ اسے اس طرح ابھارتا اور اسے جلا دیتا ہے۔

(۳) جہاں سچی آزادی ہوگی وہاں خود بخود سچی مساوات پیدا ہو جائے گی - جبلہ بن ایہم غسانی شام کے سرحدی علاقہ کا بادشاہ تھا - وہ عیسائی سے مسلمان ہو گیا تھا - کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چادر کا گوشہ ایک معمولی آدمی کے پاؤں کے نیچے آگیا - جبلہ نے اسے طمانچہ مارا - اس نے بھی طمانچہ کا جواب طمانچہ سے دیا - جبلہ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی آپ نے فرمایا " تم نے جو کچھ کیا اس کا یہی جواب تھا "

جبلہ کو حضرت عمرؓ سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی - اس نے کہا " ہم وہ ہیں کہ ہمارے ساتھ گستاخی کی سزا قتل ہے "
حضرت عمرؓ نے فرمایا " ہاں اسلام سے پہلے ایسا ہی تھا - مگر اسلام میں امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں ہے "
جبلہ غیر اسلامی ماحول کا پروردہ اور پروان چڑھا ہوا تھا - وہ چپکے سے بھاگا اور پھر عیسائی ہو گیا - ایسے ہزار جبلہ عیسائی ہو جائیں، کسی کی خاطر سے خدائی قانون نہیں بدل سکتا کبھی نہیں بدل سکتا !

حضرت عمروؓ بن العاص بڑے خاندانی آدمی تھے مسلمانوں میں بھی ان کو بڑا مرتبہ حاصل تھا - مصر کے فاتح اور گورنر تھے - ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بھی بڑے مرتبہ کے صحابی تھے - انہوں نے ایک بار ایک شخص کو ناحق کوڑوں سے پیٹ دیا - حضرت عمرؓ نے مجمع عام میں حضرت عمروؓ بن العاص کے سامنے حضرت عبداللہؓ کو اسی شخص کے ہاتھ سے کوڑے لگوائے - جس کو انہوں نے مارا تھا - باپ بیٹے اُف نہ کر سکے — !

ایک بار ایک شخص نے خود حضرت عمروؓ بن العاص پر دعویٰ کیا کہ انہوں نے مجھے ناحق سو کوڑے مارے ہیں - حکومت کے بڑے بڑے عہدہ دار اور عوام موجود تھے -
حضرت عمرؓ نے مدعی سے کہا " اٹھو، اور تم بھی ان کو سو کوڑے مارو "
حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا " اگر ایسا کیا گیا تو حکومت کے عمال بددل ہو جائیں گے "
حضرت عمرؓ نے فرمایا " نتیجہ جو بھی ہو، لیکن کیا یہی جائے گا "
حضرت عمروؓ بن العاص نے دو سو اشرفیوں پر مدعی سے معاملہ طے کیا -

انسانی تاریخ میں اس طرح پہلی بار دنیا مساواتِ انسانی سے روشناس ہوئی - اور یہ عقیدۂ توحید کا ثمرہ تھا - ملحوظ رہے کہ یہ بیسویں صدی کا واقعہ نہیں ہے - واقعہ ہے ساتویں صدی عیسوی کا، جسے آج کی نام نہاد انسانیت پسند دنیا دورِ ظلمت و بربریت کہتی ہے !

(۴) مساوات اور عدل ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں - سورج ہوگا تو اس کے ساتھ لازماً دھوپ بھی ہوگی - سورج کے بغیر

ڈھونپ نہیں ہو سکتی۔ مساوات نہ ہو اور عدل و انصاف کا وجود ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے۔ ایک خدا کے عقیدے کی بنیاد پر وجود میں آئی حکومت عرب۔ شام، فارس اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ انصاف اتنا سستا اور عام تھا، جس کا آج کی دنیا میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ عدالت کی عمارتیں اتنی عالیشان اور بارعب نہ تھیں کہ غریب مدعی ان کو دیکھ کر ہی دہل جائے۔ نماز پڑھنے کی مسجدیں ہی عدالت کا کام دیتی تھیں، جن سے غریب سے غریب انسان مانوس ہوتا تھا۔ عدالت کے دروازہ پر کسی قسم کی چوکی تھی نہ پہرہ تھا۔ وکیلوں کا سرے سے سسٹم نہ تھا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بے تکلف منصف اور جج کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ ججوں کو حکومت کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ غریبوں کے ساتھ خاص طور پر نرمی سے پیش آئیں، تاکہ وہ بغیر رعب و داب کے اپنا معاملہ پیش کر سکیں ۔۔۔ !

جن مقدمات پر آج کی مہذب دنیا میں ہفتوں، مہینوں اور برسوں صرف ہو جاتے ہیں۔ اور سینکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ کتنے لوگ ان مصارف کے نہ ہونے سے انصاف ہی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اُس زمانے میں گھنٹوں اور دنوں میں بغیر کسی صرف کے لوگ انصاف پا جاتے تھے۔ پبلک میں بھی آج کی طرح بددیانتی، بے ایمانی اور جعل سازی نہ تھی۔ گواہ بھی عموماً سچے ہوتے تھے۔ سیدھے سادے طور پر مقدمات پیش ہوتے تھے۔ ثبوت اور صفائی کی عموماً سچی شہادتیں گزرتی تھیں۔ اور آسانی سے مقدموں کے فیصلے ہو جاتے تھے ۔۔۔ !

مساوات کا یہ حال تھا کہ امیرالمومنین کو بھی جو حکومت کے سب سے بڑے سربراہ کار اور آج کے صدر مملکت کے برابر منصب رکھتے تھے مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اور وہاں بھی اُن کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک جائز نہ تھا ۔۔۔ !

ایک دفعہ حضرت ابیؓ بن کعب نے حضرت عمرؓ پر دعویٰ دائر کیا۔ امیرالمومنین حضرت عمرؓ جواب دہی کے لئے گئے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت حاکم عدالت تھے۔ انہوں نے ازراہِ احترام حضرت عمرؓ کے لئے جگہ خالی کر دی۔ حضرت عمرؓ نے نے کہا: "زید! یہ تمہاری پہلی بے انصافی ہے۔" یہ کہہ کر مدعی کے برابر بیٹھ گئے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ اور حضرت عمرؓ کو مدعی کے دعوے سے انکار تھا۔ ایسی صورت میں قانون تھا کہ مدعی، مدعا علیہ سے قسم لے۔ چنانچہ حضرت ابی نے حضرت عمرؓ سے قسم کا مطالبہ کیا۔ حضرت زید نے حضرت عمرؓ کے مرتبہ کا لحاظ کر کے کہا: "امیرالمومنین کو قسم سے معاف رکھو۔" حضرت عمرؓ بہت رنجیدہ ہوئے۔ کہا:-

"جب تک تمہاری نظروں میں عمرؓ اور ایک عام آدمی برابر نہ ہوں، تم جج کے منصب کے لائق نہیں سمجھے جا سکتے۔"

اسلام میں شراب نوشی کی سزا اسّی کوڑے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بیٹے ابوشحمہ نے شراب پی۔ حضرت عمرؓ نے اُن کو اپنے ہاتھ سے اسّی کوڑے مارے۔ وہ اس مار کو برداشت نہ کر سکے۔ اسی کے صدمہ سے مر گئے۔

جس حکومت کے سب سے بڑے سربراہ کا یہ رویہ ہو اُس حکومت میں بھلا کسی کے ساتھ بے انصافی کیسے ہو سکتی ہے؟

حق و انصاف کی یہ روح پورے معاشرے میں پیدا ہو گئی تھی۔ ایک بار اسلامی حکومت کی ایک غیر مسلم رعایا نے حضرت عمرؓ کی عدالت میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ پر مقدمہ دائر کیا۔ حضرت علیؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے لڑکے حضورؐ کے داماد تھے۔ لوگ عموماً اُن کا نام لینے کے بجائے عزت کے خیال سے اُن کو ابوالحسن کہہ کر پکارا کرتے

تھے۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے کہا۔

"ابوالحسن! اپنے مدعی کے برابر بیٹھ جاؤ۔"

یہ سُن کر حضرت علیؓ کے چہرہ پر ناگواری کا اثر رونما ہوا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "شاید آپ کو میری ہدایت ناگوار گزری — حالانکہ اسلام کا قانونِ مساوات یہی ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ کو ایک نگاہ سے دیکھا جائے۔"

حضرت علیؓ نے کہا "میری ناگواری کا سبب یہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ نے میرے مدعی کے مقابلہ میں میرے احترام کا اظہار کیوں کیا؟ آپ کو چاہیئے تھا کہ "ابوالحسن" کہنے کی بجائے مجھے "علی" کہہ کر مخاطب فرماتے۔"

سچّی انسانیت کے یہ جتنے نمونے اوپر گزرے ہیں، یہ سب ایک خدا اور اس کی باز پُرس اور جزا و سزا پر سچّے یقین کے ثمرات و نتائج تھے۔

ایک ایسے زمانہ میں جب ساری دُنیا میں انسانیت کے جوہر ناپید تھے۔ اور ایک ملک میں جس کی حالت تمام دُنیا سے زیادہ بگڑی ہوئی تھی۔ ایسا پاکیزہ اور ہمہ گیر انقلاب اسی عقیدۂ توحید کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ آج کی بگڑی ہوئی دُنیا کو اسی عقیدۂ توحید اِلٰہ کی ضرورت ہے۔ اسی عقیدے کی بنیاد پر سچّی انسانیت قائم ہو سکتی ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

مولانا عامر عثمانی (مدیر تجلی)

بدعت توحید کی ضد ہے

توحید ایک سادہ سا لفظ ہے، جس کے مفہوم و مراد کو ہر عام و خاص جانتا ہے۔ لیکن اگر علم و عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہی سادہ سا لفظ اپنی حقیقت اور ثمرات و مقتضیات کے اعتبار سے تمام دنیائے انسانیت کے لئے اتنا عظیم، ایسا اہم اور اس قدر گرانمایہ ہے کہ اسی پر اس کی دنیا اور عقبیٰ، آغاز اور انجام، حیات اور معاد، حتیٰ کہ تمدن و معاشرت کی اصلاح و فساد اور زندگی کے تمام شعبوں کی بھلائی برائی کا دار و مدار ہے۔ علم و اعتقاد کا اگر یہ سرچشمہ خشک ہو جائے تو انسان کے پاس خیر، فلاح اور ہدایت و حقیقت تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ شاید اسی لئے رب العزت نے ازل کے دن اپنے بندوں سے سوال کیا تھا کہ "الست بربکم" ؟ اور بندوں نے کہا تھا کہ "بلیٰ! ہاں تو بیشک ہمارا رب ہے۔" یہ عہد حافظوں سے اگرچہ محو ہو گیا۔ لیکن انسان کے تحت الشعور اور فطرت میں ایک پیاس، ایک تحریک، ایک داعیہ بن کر سما گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں، ہر قوم اور ہر مذہب نے، کسی نہ کسی نوعیت سے توحید کی شان و عظمت کو تسلیم کیا۔ اور عملاً بے شمار خداؤں کو پوجنے کے باوجود بنیادی اور نظری طور پر یہی مانا کہ بڑا خدا ایک ہی ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے خدا اسی کے قائم مقام ہیں۔ یا اس کی مختلف صفات کے نمائندے ہیں۔ یا انھیں امورِ عالم حصہ وار سپرد کر کے بڑا خدا آرام کر رہا ہے۔ وغیر ذالک!

ممکن ہے بہت پرانے زمانہ میں بعض قومیں کسی قلیل مدت تک معبود کے تصور سے عاری رہی ہوں۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی انسانی شعور نے ذرا آنکھیں کھولیں اور فطرت کے تہ نشین داعیوں اور تقاضوں کو ابھرنے اور پر پرزے نکالنے کا موقع ملا۔ اسی وقت یہ قومیں آپ سے آپ بلا کسی خارجی تحریک کے انسان سے مافوق کسی طاقت کی تلاش میں سرگرداں نظر آئیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ہر فرد نے کسی اقتدار اعلیٰ اور قوی تر ہستی کا تصور قائم کر کے اس کی پرستش کے کچھ طریقے مقرر کر لیے!

تاریخ سے کتابی اور سطحی واقفیت رکھنے والے حضرات تو شاید میرے اس دعوے پر حیرت کریں۔ کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ پچھلے زمانوں میں تقریباً تمام ہی قومیں پتھر کے بتوں، گوشت پوست کے انسانوں اور سورج، دریا، آگ اور اسی طرح کی دیگر اشیاء کو معبود مانتی رہی ہیں۔ اور آج دورِ ترقی میں بھی مسلمانوں کے سوا کم و بیش ہر قابلِ ذکر قوم توحید کے برعکس عقائد رکھتی ہے۔ اور عملاً متعدد خداؤں کی قائل ہے۔ لیکن جو لوگ تاریخ کا گہرا علم رکھتے ہیں اور ظاہری افعال کا علمی و نفسیاتی تجزیہ کر کے ان کے پیچھے کام کرنے والے عوامل و داعیات کا پتہ چلانے کی اہلیت سے بہرہ ور ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فطرت اور عقل کے بنیادی تقاضہ کے تحت تمام ہی قومیں اس حقیقت کو محسوس کرتی رہی ہیں کہ مالک الکل اور مقتدرِ اعلیٰ اور حاکم مطلق کسی ایک ہی ہستی کو ہونا چاہیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ عقل و علم کی کجی، شعور و وجدان کی طفولیت اور آسمانی ہدایت و تنویر سے محرومی کے باعث وہ نہ تو اس فطری رجحان کو کسی واضح عقیدے کی شکل میں ظاہر کر سکیں نہ وہ یہ جان سکیں کہ صرف ایک معبود کو تسلیم کرنے کی صورت میں وہ کونسا طریقۂ عبادت ہو سکتا ہے جو اس تسلیم اور رجحان و عقیدے کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ ان کی عقل اور علم کی حد تک ایک واحد مرکزی ہستی کے لئے جن صفات کا پایا جانا

ضروری تھا۔ ان صفات کے لئے انہوں نے الگ الگ مظاہر اور نشانات مقرر کر لئے اور علیحدہ علیحدہ اُن مظاہر اور نشانات کو پوجا۔ ہر مظہر اور نشان کو پوجتے ہوئے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی گمان کرتی رہیں کہ ہم اصل معبود کو پوج رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان اگر کسی عقیدے اور تخیل کی ترجمانی کے لئے ایسے افعال و اطوار اختیار کرے جو حقیقتاً اس عقیدہ و تخیل کی ضد اور نقیض ہوں تو یہ عقیدہ و تخیل ان ضد لڑتے پڑتے بالکل معدوم ہو جاتا ہے۔ اور خواص کے قلب و دماغ میں اس کا موہوم سا نقش باقی بھی رہے تو کم سے کم عوام کے دل و دماغ میں یہ برائے نام بھی باقی نہیں رہتا۔ عوام اپنے اعمال میں عموماً رسم و روایت اور بے مغز تقلید و اتباع کے عادی ہوتے ہیں۔ چنانچہ فطرت کے تقاضے اور انبیاء کرام کی تعلیمات کے باوجود غلط اور باطل طرز عبادت نے توحید کے نقش کو اس طرح مٹا دیا کہ جب رسولؐ نے اُن سے کہا کہ ایک ہی خدا کو مانو تو اظہارِ حیرت کرتے ہوئے بولے کہ یہ تو ہمارے سارے معبودوں کو ذلیل کر کے ایک ہی خدا کو سارے حقوق دیئے دیتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ حیرت اور اعراض توحید کے عقلی و جبلّی انکار اور شعور کی تردید پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ عملاً متعدد معبودوں کو پوجتے رہنے اور رسم و رواج کے رنگ میں رنگے جانے کا سطحی نتیجہ تھا۔ جہالت و بے شعوری کا ثمرہ تھا۔

آج کی دُنیا کو دیکھئے، جو قومیں بے شمار بُتوں کو پُوجتی ہیں اور کتنے ہی انسانوں کو معبود بنائے ہوئے ہیں اور کتنے ہی خیالی دیوتاؤں کی پجاری ہیں، اُن کے رہنماؤں اور عالموں سے آپ کلام کریں تو وہ ہرگز ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ کارخانۂ عالم پر دو یا دو سے زیادہ برابر کی طاقت والے دیوتاؤں کی خدائی ہے، بلکہ وہ اصل اور حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی آمرِ مطلق تسلیم کریں گے۔ لیکن چونکہ سب سے بڑا خدا اور اس کی متعدد طاقتیں اور صفات آنکھوں سے نظر آنے والی چیز نہیں۔ اس لئے اُس خدا اور اُس کی صفات پر اچھی طرح دھیان جمانے اور جس صفت سے مدد لینے کی ضرورت پڑے، اُسی صفت پر اپنی توجہ مرتکز کرنے کے لئے ہم نے بُتوں کو ظاہری نشان اور مظہر بنا لیا ہے۔ بعض انسانوں اور خیالی دیوتاؤں کے بارے میں وہ یہ کہیں گے کہ بجائے خود بھگوان تو ہم کسی کو نہیں مانتے۔ ہاں فلاں بزرگ میں بھگوان نے اپنی فلاں صفت ڈال دی اور فلاں دیوتا کو فلاں طاقت سپرد کر دی۔ گویا اصل کے اعتبار سے تو معبود ایک ہی ہے، مگر واسطے اور انتظامی آسانیوں کے اعتبار سے یہ لوگ دسیوں معبود بنائے ہوئے ہیں ـــ !

جو قومیں خوش فہمی سے اپنے کو عیسائی کہتی ہیں (" خوش فہمی " اس لئے کہ درحقیقت نہ یہ اس تعلیم کو مانتی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم تھی، نہ یہ تعلیم اپنی صحیح شکل میں آج موجود ہے) اُن کا بھی یہی حال ہے کہ علمی و منطقی اعتبار سے قائل تو وہ تثلیث کی ہیں، لیکن کسی بھی عیسائی عالم سے گفتگو کیجئے، وہ شرک کا اقرار اور توحید کا انکار ہرگز نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنی تثلیث کا سرا کھینچ تان کر توحید ہی سے ملائے گا۔ اور باوجود مشرکانہ عقائد و اعمال کے بنیادی ذہن اُس کا یہی ہو گا کہ مستقل بالذات مختارِ مطلق اور تمام اقتدار و قوت کا مرکز تو صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے ـــ !

ایسا کیوں ہے؟ انسان کی عقل و شعور اور فطرت کس لئے توحید کا میلان رکھتے ہیں؟ کھُلی مشرک قومیں کس لئے توحید کا انکار نہیں کرتیں؟ ان سوالوں کا واحد جواب یہ ہے کہ اس کارخانۂ عالم کے لئے کسی ایک ہی ہستی کو خالق و مالک ماننا اور تمام قوت و قدرت کو اسی سے منسوب کرنا عینِ فطرت اور عینِ شعور اور عینِ عقل و فہم ہے۔ عقل چاہے کیسی ہی نکتہ سنجیاں کر لے، منطق چاہے کتنی ہی پلٹیاں کھا لے، فلسفہ چاہے کیسے ہی گوشے نکال لے۔ لیکن ناچار اس پہاڑ کی طرح اٹل حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کہ معبودِ حقیقی اور تمام اختیار و اقتدار کا مالک اور پروردگار ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اسلام کے اپنی مکمل اور آخری شکل میں آنے سے پہلے تو یہ ممکن بھی تھا کہ خود ساختہ معبودوں کے پجاری اور خود تراشیدہ طرقِ عبادت کے متوالے توحید سے برملا انکار کر دیں۔ لیکن اسلام نے آکر انسان کو اُس کی فطری مانگ کا ٹھیک ٹھیک احساس دلایا۔ تہ نشیں داعیہ کو ایک حسین و جمیل نظریہ اور اصول کی شکل میں پیش کیا۔ ٹھوس علمی و عقلی

دلائل فراہم کئے۔ اور قرآن کی تنہا ایک ہی دلیل اتنی اثر انگیز، قوی اور آہن و فولاد سے زیادہ مستحکم ثابت ہوئی کہ انسانی عقل و علم اور مشاہدہ و تجربہ کے لئے اس کی تردید ناممکن ہوگئی۔ خدا نے سادہ لفظوں میں کہا کہ اگر ایک سے زیادہ رب ہوتے تو کارخانۂ عالم زیر و زبر ہو جاتا۔ یہ سادہ سی مختصر دلیل انسانی عقل و علم کی تمام بساط پر آسمان کی طرح چھا گئی۔ تجربہ نے قدم قدم پر بتایا کہ بقائے عالم کے لئے ایک ہی شہنشاہ اور مالک الملک کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے اور بھی مضبوط دلیلیں دنیا کے سامنے رکھیں اور دنیا کو ماننا پڑا کہ توحید کی صداقت و حقانیت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

دوسرا جواب ایک اور بھی ہے جو اگرچہ عقلی و قیاسی قسم کا نہیں بلکہ اس کو سمجھنے اور ماننے کا مدار انسانی قلب و روح کی صلاحیت پر ہے۔ لیکن چونکہ ہمارا خطاب اہلِ ایمان ہی سے ہے اس لئے اس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

سورۂ اعراف رکوع ۲۲ میں ہے:-

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ ۝

اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھ سے اُن کی اولادیں نکالیں اور خود اُنہی کو اُن کا گواہ بنا دیا (اُن سے پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اُنہوں نے جواب دیا۔ بیشک! (یہ کام اللہ نے اس لئے کیا کہ) تم حشر کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس سے (تیرے رب ہونے سے) بے خبر تھے۔

یہ واقعہ عالمِ مثال کا ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزِ اول سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام ہی انسانوں سے یہ عہد لیا گیا[1]۔ اور الفاظِ قرآنی کو کسی خاص تعدادِ انسانی پر بھی بقول بعض محمول کیا جا سکتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ توحید کا اعتراف و اقرار فطرتِ انسانی کا جزو ہے۔ پہلی صورت میں تو کسی توجیہ کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر انسان اس میں شامل ہے، البتہ دوسری صورت میں یہ توجیہ کرنی پڑے گی کہ جس طرح بھوک، پیاس، نیند، عقل اور ضرورتِ توجیہ وغیرہ انسان کے اندر ایک دوسرے میں متوارث ہوتی چلی جاتی ہیں، اسی طرح اس عہدِ الست کا اثر بھی قیامت تک متوارث ہوتا چلا جائے گا۔ یہ توجیہ محض تاویل کا درجہ نہیں رکھتی، بلکہ انسان کی تاریخ اس پر ناقابلِ تردید شہادت مہیا کرتی ہے۔ قدیم سے قدیم تر جس زمانہ کا حال ہمیں تاریخ بتاتی ہے اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مہذب، پس ماندہ، بے علم اور ترقی سے ناواقف انسان بھی آپ سے آپ کسی نہ کسی معبود کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔ مانا کہ عقل کی نارسائی اور نفس کی فریب انگیزی کے باعث یہ پوجا توحید کی ضد اور شرک پر مشتمل تھی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کی کیا گنجائش ہے کہ اُن کے جذبۂ عبودیت فطرت ہی کی پکار تھا۔ فطرت نہ ابھارتی تو آخر کون سی طاقت انھیں مجبور کر رہی تھی کہ تلاشِ رزق، جستجوئے آرام و راحت اور دیگر مشاغلِ دنیادی کے ساتھ ساتھ وہ خواہ مخواہ پوجا پاٹ میں وقت ضائع کریں۔ اور بے وجہ خود کو کسی ایک یا چند معبودوں کے آگے پست و ذلیل بنائیں۔ آخر کس نے اُن سے کہا تھا کہ سورج یا دیا یا پتھر کے مجسموں کو پوجنا شروع کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض اور محض اسی بنا پر ہو سکتا ہے کہ جس طرح بھوک، پیاس، طلبِ آرام، نیند اور

---

[1] اسی روایت کی تصدیق و تائید امام احمدؒ کی اس روایت سے ہوتی ہے جو مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر میں درج ہوئی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر یہی تشریح محقق معلوم ہوتی ہے اور دوسری تشریح کی کوئی دلیل مجھے معلوم نہ ہو سکی سوائے اس کے کہ تمام انسانوں کو بیک وقت عالمِ مثال میں حاضر کر لینا عقول کے مستبعد ہے، حالانکہ اس طرح کے معاملات میں عقلِ انسانی کی استعداد پر توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔ (ع-ع)

جنسی میلان فطرت کے ایسے داعیے ہیں کہ ان کے لئے کسی خارجی محرک اور معلم کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جذبۂ عبودیت اور خواہش نیازمندی بھی فطرت ہی میں داخل ہے، جس کے لئے کسی بیرونی محرک و معلم کی احتیاج نہیں۔ احتیاج ہے تو صرف اس بات کی کہ اس جذبہ کو صحیح راہ پر ڈالنے کے لئے اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کی تعلیم و تفہیم کو قبول کیا جائے۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد وہ اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے جو کم فہم اور سطح بین لوگ عہد الست کے بارے میں کرتے ہیں یعنی وہ لوگ کہتے ہیں کہ جب یہ ازلی عہد انسان کے حافظہ میں محفوظ نہ رہا تو اس سے کیا حاصل ہوا؟ اور کیوں اللہ نے یہ عبث کام کیا؟

یہ اعتراض اس لئے ختم ہو جاتا ہے کہ یہ عہد حافظوں میں مرتسم کرنے کے لئے لیا ہی نہیں گیا تھا۔ اور نہ اللہ تعالیٰ نے توارث و تناسل میں یہ قاعدہ رکھا ہے کہ جو واقعات باپ کے حافظہ میں محفوظ ہوں وہ کل یا بعض اولاد کے حافظوں میں بھی منتقل ہو جائیں بلکہ اس عہد کا منشاء توحید اور جذبہ پرستش کو انسان کی فطرت کا جزو بنا دینا تھا۔ اور اس کے اندر پروردگار کی تلاش و تجسس کا رجحان، استعداد اور داعیہ پیدا کر دینا تھا۔ کسی واقعہ کا حافظہ سے محو ہو جانا ہی اس کی بے اثری پر کافی دلیل نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو جوانی میں یہ بالکل یاد نہیں رہتا کہ آج ہم جس زبان کی ہر کتاب کو فر فر پڑھ ڈالتے ہیں، اُس زبان کی الف بے ہمیں بچپن میں کس نے، کب اور کس طرح سکھائی۔ انھیں نہ وہ ماحول یاد ہوتا ہے، جس میں انھیں حرف شناسی کے ابتدائی سبق ملے۔ نہ اس سے متعلق کوئی اور تفصیل حافظہ میں محفوظ ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کی موجودہ حرف شناسی اور زبان دانی اور علم و فن کی بنیاد اولین چھٹپنے کی یہی تعلیم تھی اور اسی تعلیم نے آن میں یہ ملکہ پیدا کیا کہ ضخیم کتابیں بلا تکلف پڑھ ڈالیں۔ اب کیا کوئی نادان یہ احمقانہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ حافظہ سے محو شدہ ابتدائی تعلیم بیکار اور عبث رہی۔ یا کوئی پڑھا لکھا آدمی محض اس لئے اپنے پڑھے لکھے ہونے سے انکار کر سکتا ہے کہ اسے اپنے بچپن کے معلم کا نام اور حرف شناسی کا زمانہ اور کیفیت اور ماحول اور کچھ بھی یاد نہیں رہا ہے۔ یاد رہے نہ رہے لیکن حرف شناسی کا جو ملکہ اور شعور پیدا ہو چکا۔ ۔۔۔ کافی ہے۔

۔۔ سے کسی حد تک ملتی جلتی ہوئی مثال عہد الست کی ہے۔ وہ حافظوں میں ثبت کرنے کے لئے نہیں لیا گیا تھا۔ بلکہ وہ اس لئے تھا کہ انسان کی جبلت و فطرت میں ایک ملکہ، ایک استعداد اور ایک مستقل پیاس، ایک طلب، ایک داعیہ، ایک تحریک ہمیشہ کے لئے جاگزیں کر دے اور دیگر عناصر فطرت اور اجزائے جبلت کی طرح یہ بھی قیامت تک فطرت کا جزو بنا رہے۔

اس کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے:-

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ -

اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس کی تخلیق میں تغیر و تبدل ممکن نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو بایں الفاظ بیان فرمایا:-

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ -

ہر ایک بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی (وغیرہ) بنا دیتے ہیں۔

اصل فطرت یہی ہے کہ انسان ایک خدا کو مانے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ عقل و علم کی نارسائی کے باعث انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ماننے کے صحیح طریقے اور آداب اور مقتضیات کو آپ سے آپ سمجھ سکے۔ اس کے لئے اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اس ضرورت کو اللہ تعالیٰ برابر پورا کرتے رہے اور آخر کار ایک آخری نبی کو مکمل شریعت اور دین دے کر بھیجدیا۔ کہ قیامت تک کے لئے تمام عالم انسانی اس دین کے بتائے ہوئے طریقوں پر چل کر بندگی کا صحیح حق ادا کر سکے۔

توحیدِ خالص

ان تمہیدی سطور کے بعد اب ہمیں دیکھنا ہے کہ جب تمام ہی قومیں کسی نہ کسی نوعیت میں توحید کی صداقت و حقانیت کی صراحتاً یا اشارۃً قائل ہیں تو کیا اُن کی اور مسلمانوں کی توحید ایک ہی ہے یا الگ الگ؟ کیا توحید کی حد تک سب کو ایک ہی صف میں سمجھا جائے گا یا کچھ فرق کیا جائے گا۔

تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ توحید اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو فرق و اختلاف اور تقسیم کی گنجائش ہی نہیں رکھتی۔ لیکن لفظی مفہوم کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے تو ان دو قسموں کا نام توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت رکھا ہے لیکن میں بات کو زیادہ عام فہم بنانے کے لئے ان کا نام توحیدِ لفظی اور توحیدِ حقیقی رکھتا ہوں۔

توحیدِ لفظی تو یہ ہے کہ آدمی خدا کو ایک مانے اور بس۔ یعنی وہ یوں کہے کہ تمام اقتدار و قوت کا مالک ایک ہی ہے اور اس کے مثل اور برابر کوئی نہیں۔ بس بات اتنے پر ختم کردے یا زیادہ سے زیادہ یہ مان لے کہ وہی رزق دینے والا ہے، مارنے والا ہے، جلانے والا ہے۔ اس طرح کی چند صفات مان کر خاموش ہو جائے اور نہ تو جملہ صفاتِ الٰہیہ کا اقرار کرے نہ اُن مقتضیات اور ثمرات پر توجہ دے جو خدا کو مالک و خالق اور رزاق و رب ماننے کا لازمی نتیجہ ہیں —— یہ ہے توحیدِ لفظی۔ یہی توحید ہے جس کے غیر مسلمین قائل ہیں۔ اور یہی وہ توحید ہے جو اگرچہ لفظاً توحید کہی جاتی ہے۔ لیکن نتائج اور ثمرات کے اعتبار سے کفر و شرک پر منتہی ہوتی ہے اور اس توحید کے قائلین عموماً وہ کچھ کرتے اور کہتے ہیں جو توحیدِ حقیقی و اصلی کے فوائد و منافع کو پامال کرنے والا اور شرک و کفر کے مضرات و فسادات کو نشو و نما دینے والا ہوتا ہے!

قرآن و حدیث میں لفظی توحید کی پوری صراحت ہے، اور بہت صفائی سے بتا دیا گیا ہے کہ اس طرح کی توحید نہ خدا کو مطلوب ہے نہ اس سے توحیدِ حقیقی کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ توحیدِ لفظی کے قائلین کا حال اللہ نے ایک جگہ یوں بیان کیا:-

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝
قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ
لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝

(اے محمدؐ!) اگر تم ان سے پوچھو کہ بتاؤ زمین و آسمان اور ساری چیزیں کس کی ہیں۔ اگر تمہیں معلوم ہو۔ تو کہیں گے اللہ کی! ——تو ان سے کہو تم پھر نصیحت کیوں نہیں حاصل کرتے؟ پوچھو سات آسمانوں اور عرشِ اعظم کا مالک کون ہے؟ کہیں گے اللہ! کہو تو پھر تم کس لئے نہیں ڈرتے۔ پوچھو تمام کائنات کی ملکیت و حکومت کس کے دستِ قدرت میں ہے۔ وہ کون ہے جو دوسروں کو پناہ دیتا ہے لیکن اس کے بالمقابل کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ کہیں گے اللہ! تو کہو تو پھر آخر تم پر کیا جادو چل گیا ہے (کہ گمراہ ہوئے جاتے ہو)

دوسری جگہ فرمایا:-

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔

اگر اُن سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے کہ خدا نے۔

گویا وہ لوگ اللہ کی مالکیت اور حاکمیت اور خالقیت وغیرہ کے تو قائل تھے لیکن پھر بھی وہ راہِ راست سے اس درجہ ہٹے

ہوئے تھے کہ گویا سحر زدہ ہوں۔ جو صاف اور سیدھی راہ پر چلنے کی بجائے غلط اور ٹیڑھی راہ چلے جا رہے ہوں۔ چنانچہ فرمایا۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا هُمْ مُشْرِكُوْنَ ۝

ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اکثر لوگ مشرک ہوتے ہیں۔

دوسری قسم توحید حقیقی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ ذاتِ خدا کو بایں معنی ایک ماننے کہ تمام صفاتِ کمالیہ کا وہی متصف ہے اور اسی کی عملداری نہ صرف مادّی کائنات کے ہر گوشے پر ہے بلکہ انسان کے جذبات و خیالات، روح، شعور اور لطیف سے لطیف تر عناصر پر ہے اور اس کے اقتدارِ مطلق اور حاکمیت جامعہ کے جو بھی تقاضے اور مطالبے ہیں وہ سب کے سب نہ صرف دل و زبان سے واجب القبول ہیں بلکہ انھیں حقیقی زندگی میں رہنما بنانا اور افعال و اعمال سے اُن پر یقینِ کامل کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے، وہی ہر چھوٹے بڑے معاملہ کا منصف، ہر مسئلہ کا حل کرنے والا، ہر کھُلی چھُپی بات سے باخبر، ہر عیب و صواب کا واقفِ کامل اور ہر مقام پر ہر وقت ہر زمانے میں حکمران ہے!

توحید کی یہی قسم ہے جو اللہ کو مطلوب ہے اور اسی کے ماننے والے اس کے نزدیک مومن ہیں۔ جیسا کہ قرآن و حدیث میں اسے بالوضاحت بیان کر دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن و حدیث میں ایسی لفظی تقسیم نہیں ملتی جیسی ہم نے یا بعض علمائے سلف نے کی ہے۔ کیونکہ توحید تو فی الاصل ایک ہی ہے۔ اور جس نامکمل، ناقص اور بے نتیجہ تخیل کو انسانوں نے توحید کا نام دے لیا ہے۔ وہ توحید نہیں شرک ہے۔ لیکن ہم نے تقسیم محض سمجھانے اور بات کو واضح کرنے کے لئے کی ہے تاکہ اللہ کو جو توحید مطلوب ہے اُس کی وضاحت ہو اور جو توحید مطلوب نہیں ہے اس کی تردید ہو جائے۔

توحید حقیقی کی وضاحت کے لئے اللہ نے قرآن میں بہت سی صریح و واضح آیات نازل فرمائیں اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی تشریح و توضیح اتنے تکرار اور کثرت سے کی کہ شاید ہی کسی اور آیت کی کی ہو۔ آپؐ نے شرکِ جلی ہی کو واضح نہیں فرمایا بلکہ شرکِ خفی کو بھی موقع بہ موقع بیان کرتے رہے اور زندگی کے کسی بھی گوشہ میں مشرکانہ خیالات و عقائد کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ فرمایا:۔

يَسْئَلُ اَحَدُكُمْ رَبَّهٗ حَاجَتَهٗ كُلَّهَا حَتّٰى شِسْعَ نَعْلِهٖ اِذَا انْقَطَعَ فَاِنَّهٗ اِنْ لَّمْ يُيَسِّرْهُ لَمْ يَتَيَسَّرْ۔

چاہیئے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی ہر حاجت خدا ہی سے مانگے، یہاں تک کہ جُوتے کا تسمہ بھی، جب وہ ٹوٹ جائے۔ کیونکہ اللہ اگر میسّر نہ فرمائے تو جُوتے کا ایک تسمہ بھی میسّر نہیں آسکتا۔

غور کیجئے، کتنی پاکیزہ اور بے میل توحید کا سبق رسول اللہ دے رہے ہیں، انہوں نے اُمت کو ایک حقیر سی شے۔ جُوتے کے تسمہ کی مثال دے کر یہ تعلیم دی کہ خزانے، جائدادیں اور مہتم بالشان چیزیں ہی خدا کی عطا کردہ نہیں ہیں بلکہ دُنیا کی حقیر سے حقیر تر چیز بھی اسی کی مرضی سے میسّر آسکتی ہے ورنہ اس کی مرضی نہ ہو تو جُوتے کا تسمہ جیسی حقیر چیز بھی میسّر نہیں آسکتی۔ اس کی ہزاروں مثالیں آپ کو اپنے چاروں طرف بکھری نظر آسکتی ہیں۔ ایک شخص ہے جو دونوں وقت قیمتی اور لذیذ غذائیں کھاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں گیہوں کی ایک روٹی کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ لیکن دوسرا شخص ہے جو گیہوں کی ایک روٹی ہی کے لئے خون پسینہ ایک کرتا ہے اور پھر بھی بعض اوقات اسے بھوکا سو جانا پڑتا ہے۔ آدمی غور کرے تو اللہ کے انعامات اور جود و سخا کی انتہا نہیں۔ کبھی جس کو نمونیہ ہو اُس سے پوچھئے

کہ ایک سانس لینے میں وہ کس درجہ اذیت برداشت کرتا ہے۔ اور ہوا کی ایک معمولی سی مقدار کو اپنے پھیپڑوں تک پہنچانے کے لئے اُسے کتنی عظیم تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ حالانکہ یہی وہ ہوا ہے جسے تمام انسان بلا ادنیٰ مشقت کے ہر لحظہ اپنی زندگی کے کام میں لاتے ہیں۔ اور محسوس بھی نہیں کرتے کہ ان کا ہر سانس اللہ جل شانہٗ کی عطا اور انعام ہے۔ وہ جب چاہے اسی سانس کو انسان پر بارِ عظیم بنا سکتا ہے لہٰذا انصاف اور علم وعقل کا تقاضا یہ ہے کہ بڑی سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی چیز تک اُسی کے تصرف و اختیار میں ہو اور اس کے حصول میں دنیاوی ذرائع اور اسباب محض بہانے کا درجہ رکھتے ہیں، اصلی مُعطی اور بخشندہ وہی ہے۔ مالک الملک ذوالجلال والاکرام۔

توحید کی نزاکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے واضح ہوتی ہے:۔

مَنْ صلّٰی یُرائی فقد اَشرک ومن صامَ یُرائی فقد اَشرک ومن تصدّقَ یُرائی فقد اَشرک۔

جس نے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا جس نے دکھاوے کے لئے روزہ رکھا اُس نے شرک کیا۔ جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔

جانتے ہیں آپ یہ کس کے الفاظ ہیں ـــــ؟ اُس صادق ومصدوق کے جس کے لئے اللہ جل شانہٗ نے وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ فرمایا۔ جس کا ہر فرمودہ ریب وشک سے بالاتر اور عین صداقت ہو۔ غور کیجئے فکر ونظر کی کن گہرائیوں تک توحید کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور کس آخری درجہ تک اجتناب عن الشرک مطلوب ہے۔ براہ راست کسی مخلوق کو صفات الٰہیہ میں سے کسی صفت کے ساتھ متصف کرنا تو درکنار صرف اتنی سی بات بھی شرک قرار دی گئی کہ آدمی عبادت کرتے ہوئے دکھاوے کی نیت رکھے۔ گویا وہ اپنی عبادت کا صلہ مقبولیت وشہرت اور عقیدت ونیازمندی کی شکل میں مخلوق سے طلب کر رہا ہے۔ حالانکہ اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ مگر دل میں دکھاوے کا خیال پایا جانا ہی حکمِ شرک کے لئے کافی سمجھا گیا اور کیوں نہ سمجھا جاتا جب کہ اللہ نے شروع ہی میں یہ تعلیم بندوں کو پہنچائی کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ حصر جلی وسرِّ خفی پر مشتمل یہ الفاظ یقیناً اس کے طالب تھے کہ شرک کے شائبہ تک کو مٹا دیا جائے اور توحید خالص وحقیقی کی بنیاد پر اُمتِ اسلامیہ کی تعمیر ہو۔

. . . . . کہ عربی میں عبد غلام کے معنی میں آتا ہے اور اَمَۃ لونڈی کے معنی میں۔ یہ دونوں لفظ اسلام سے پہلے اور اس کی آمد پر اہلِ عرب میں عموماً مستعمل تھے۔ لیکن رسول اللہ فرماتے ہیں:۔

لا یقولنّ احدکم عبدی واَمتی کلکم عبید اللّٰہ وکل نسائکم اماء اللّٰہ ولکن لیقل غلامی وجاریتی وفتای وفتاتی۔

تم میں سے کوئی بھی ہرگز کسی کو عبدی اور اَمَتی نہ کہے کیونکہ تم سب اللہ کے عبد ہو اور سب عورتیں اللہ کی باندیاں ہیں۔ ہاں تمہیں کہنا چاہیئے غلامی (میرا غلام) اور جاریتی (میری کنیز) اور جوان مرد اور جوان عورت

ظاہر ہے کہ اپنے معروف معنی کی وجہ سے کوئی بھی عرب عبدی اور اَمتی اُن معنی میں نہیں بولتا تھا جن معنی میں انسان کو اللہ کا عبد اور اَمَۃ کہا جاتا ہے۔ لیکن صدقہ اس شانِ توحید اور تنزیہہ مکمل کے کہ لفظی تشابہ بھی پسند نہیں فرمایا اور فساد وتخریب کی جڑیں کاٹ دیں۔

توحیدِ خالص کے اثبات اور شرک کے ابطال پر قرآن وحدیث سے صدہا دلیلیں لائی جاسکتی ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارا روئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو توحید کے قائل اور شرک کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اس لئے اور کچھ کہنے کی بجائے ایک حدیث پر کلام کے اس پہلو کو ختم کرتے ہیں۔ یہ حدیث ابن حبان اور حاکم اور ترمذی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ اس سے ہر مسلمان اندازہ کرسکتا ہے

کہ اسلام کو صرف اتنا ہی مطلوب نہیں کہ آپ اللہ کو ایک اور خالق و مالک اور رازق و رب مان کر امورِ دنیا میں غرق ہو جائیں۔ بلکہ وہاں تو اس کی تمام صفات کاملہ کا اعتراف و ایقان مطلوب ہے۔ تاکہ آپ کو زندگی کے کسی بھی گوشہ سے اس کے اقتدار و تصرف کو خارج کر دینے کی گنجائش نہ ملے۔ اور کسی بھی عنوان سے آپ اس کے سوا کسی کو بااختیار و حکمران تصور نہ فرما سکیں۔ اہلِ توفیق اگر اس حدیث میں بیان کردہ اسمائے حسنہ کو حفظ کر لیں گے تو ان کے پڑھتے رہنے کی بڑی منفعت اور برکت علماء و اتقیا نے لکھی ہے۔

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ علیہِ وسلّمَ قالَ إِنَّ لِلّٰہِ تعالیٰ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ اِسْمًا مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَھَّارُ الْوَھَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ الْحَکَمُ الْعَدْلُ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ الْحَلِیْمُ الْعَظِیْمُ الْغَفُوْرُ الشَّکُوْرُ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ الْحَفِیْظُ الْمُقِیْتُ الْحَسِیْبُ الْجَلِیْلُ الْکَرِیْمُ الرَّقِیْبُ الْمُجِیْبُ الْوَاسِعُ الْحَکِیْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِیْدُ الْبَاعِثُ الشَّھِیْدُ الْحَقُّ الْوَکِیْلُ الْقَوِیُّ الْمَتِیْنُ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ الْمُحْصِیْ الْمُبْدِئُ الْمُعِیْدُ الْمُحْیِیْ الْمُمِیْتُ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاھِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِیْ الْمُتَعَالِیْ الْبَرُّ التَّوَّابُ الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّءُوْفُ مَالِکُ الْمُلْکِ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِیُّ الْمُغْنِیُّ الْمَانِعُ الضَّارُّ النَّافِعُ النُّوْرُ الْھَادِیْ الْبَدِیْعُ الْبَاقِیْ الْوَارِثُ الرَّشِیْدُ الصَّبُوْرُ۔

روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں۔ جو انھیں یاد کرے گا جنت میں جائیگا۔ وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی لائقِ بندگی نہیں، وہ نہایت مہربان بہت رحم والا۔ وہ شہنشاہ ہے پاک ہے۔ ہر نقصان و زیاں سے بری ہے۔ امن دینے والا پناہ میں لینے والا ہے، زبردست ہر دباؤ والا ہے، صاحبِ عظمت بنانے والا، نکال کھڑا کرنے والا۔ صورتیں بنانے والا بے حد بخشش والا۔ بہت غلبہ والا، بہت دینے والا روزی عطا کرنے والا۔ فیصلہ کرنے والا، باخبر، تنگی اور فراخی کرنے والا، پست و بلند کرنے والا۔ عزت و ذلت بخشنے والا۔ سننے والا دیکھنے والا۔ اٹل فیصلہ والا، انصاف کرنے والا۔ بھید جاننے والا، خبردار، بردبار، عظمت والا۔ مغفرت کرنے والا۔ تھوڑے عمل پر بہت دینے والا۔ بلند مرتبہ، بڑائی والا۔ حفاظت کرنے والا۔ حصہ بانٹ کر دینے والا حساب کرنے والا، بزرگی والا، بے مانگے عطا کرنے والا، نگراں، جواب دینے والا۔ وسعت والا، حکمت والا بڑی محبت والا، مجد و شرف والا۔ اٹھانے والا۔ گواہ، ثابت، کارساز، زور آور، مضبوط، دوست اور مددگار، تعریف کا مستحق، ہر چیز کا شمار رکھنے والا، عدم سے وجود میں لانے والا۔ معدوم کو پھر موجود کرنے والا، زندہ کرنے والا، مارنے والا، سدا زندہ، مخلوق کی ہستی کو منضبط رکھنے والا، ہر کمال بالفعل رکھنے والا۔ شرف والا، یکتا، یگانہ، بے نیاز۔ قدرت والا، ہر شے پر قابض، آگے اور پیچھے کرنے والا، سب سے مقدم اور سب سے بعد باقی رہنے والا۔ سب پر عیاں اور نگاہوں سے اوجھل۔

ہر شے کا ذمہ دار، بہت بلند، بڑا محسن، توبہ کی توفیق بخشنے والا اور قبول کرنے والا۔ بدلا لینے والا معاف کرنے والا، بڑی رحمت والا، ساری کائنات کا مالک جلال و بخشش والا، انصاف کرنے والا جمع کرنے والا سب سے بے نیاز، دوسروں کو غنی بنانے والا۔ روکنے والا، نقصان پہنچانے والا، نفع پہنچانے والا خود بخود ظاہر، ہدایت دینے والا، بغیر نمونہ کے بنانے والا ہمیشہ رہنے والا، تمام مخلوقات کی فنا کے بعد اُن کے مال کا مالک، درست راہ بتانے والا، ضبط کرنے والا۔

غور فرمایئے کہ کیا یہ کثیر اسمائے صفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ یونہی عبث بیان فرمائے؟ کیا ان کا یہ منشاء نہیں ہے کہ کائنات میں جو بھی اسباب و نتائج اور وسائل و ثمرات نظر آتے ہیں ان سب میں اللہ ہی کی کارسازی اور قدرت کارفرما ہے۔ یہ نہیں کہ وہ مالک الملک کائنات کو تخلیق کر کے ایک طرف ہو گیا اور مخلوق کو من مانی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ نہ یہ کہ رزق حیات و موت اور اسی نہج کے چند مہتم بالشان امور تو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھے باقی چند قوتیں مخلوق میں تقسیم کر دیں۔ بلکہ وہ ہر زمانہ اور ہر مقام پر انسان کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں، رنج و راحت میں، کامیابی و خسران میں، ذلت و عزت میں، غربت و امارت میں پوری طرح متصرف اور کارپرداز ہے!

بدعت!

توحید کی ضد اگرچہ شرک ہے لیکن انسان کی عقل اور علم کو اتنی رسائی نہیں کہ وہ نبیؐ صادق کی توضیح و تنبیہ کے بغیر پوری طرح یہ سمجھ سکے کہ کون سے امور ہیں جو شرک کے تحت آتے ہیں اور کون سے معتقدات باوجود مشرکانہ نظر نہ آنے کے فی الحقیقت مشرکانہ ہوتے ہیں۔ "ریا" ہی کو دیکھ لیجئے۔ یہ اپنی ظاہری شکل میں زیادہ سے زیادہ ایک ناقص اور عیب دار فعل نظر آتا ہے جس کا مرتکب اکثر حالات میں انکار توحید کا وہم بھی نہیں کرتا اور یہ تصور تک نہیں کرتا کہ وہ شرک کی غلاظت سے آلودہ ہو رہا ہے۔ لیکن زبانِ صادق و مصدوق نے اُسے متعدد بار شرک سے تعبیر کیا۔

یہی معاملہ بدعت کا بھی ہے۔ بدعت کسے کہتے ہیں، پہلے اسے سمجھ لیجئے۔ اللہ نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعہ انسان کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات اور نظام زندگی نازل فرمایا۔ اور زندگی کی کارفرمائی کے لئے جتنے گوشے ممکن ہو سکتے ہیں اُن سب کے لئے کچھ اصول، کچھ طریقے اور کچھ قوانین مقرر فرما کر اعلان کر دیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم۔ آج ہم نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ گویا مملکتِ عالم کے لئے جس دستورِ جاودانی کی ضرورت تھی اسے تمام و کمال اللہ جل شانہ نے انسان کو عطا کر دیا اور اسکی گنجائش نہیں چھوڑی کہ قیامت تک اس پر کوئی اضافہ یا اس میں کچھ کمی کی جا سکے! رسُول اللہ نے بالفاظ صریح بار بار اسکی تصدیق کی:۔

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا (وفی روایۃ فی دیننا) ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ!

جس شخص نے ہمارے اس امر میں (اور ایک روایت میں "فی دیننا" کے الفاظ ہیں) کوئی نئی چیز نکالی وہ نا قابلِ قبول ہے!

دوسری جگہ کہا:۔

وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ!

خبردار! بدعت سے بچتے رہنا پس یقیناً ہر بدعت گمراہی ہے!

ایک اور جگہ بتایا کہ دین میں اپنی طرف سے کوئی نئی بات نکالنے والا اللہ تعالیٰ کے انتہائی غضب کا مستحق ہوگا۔ ایک اور جگہ

بتایا کہ جب کسی جگہ ایک بدعت اختیار کی جاتی ہے تو اس کے عوض وہاں سے ایک سنت اللہ تعالیٰ اٹھا تا ہے، گویا دوہری محرومی، ایک تو بدعت کا گناہ دُوسرے سنّت کی برکت سے محرومی!

کسی کو اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی نئی عبادت، کوئی جدید طریق پرستش، کوئی خود ایجاد اصل و فرع دین میں بڑھا سکے۔ صرف اتنا اختیار دیا گیا ہے کہ جن امور و مسائل کے لئے وضاحت و صراحت کے ساتھ کھلے احکام بیان نہیں کئے گئے اُن میں دین کے دیگر اصول و احکام کی روشنی میں اجتہاد غور و فکر اور استنباط کرو۔ احکام کے اسباب و علل پر نظر رکھو۔ قیاس صحیح سے کام لو اور جو عبادات و وظائف کسی خاص شکل میں متعین کر دیئے گئے ہیں اُن میں ہرگز تبدیلی مت کرو۔ چنانچہ اجتہاد و استنباط کی مثال تو وہ فقہ ہے جو اُمت کے علماء و ماہرین نے قرآن و حدیث کی روشنی میں مدوّن کی اور عبادات و وظائف کی مثال نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں کہ اُن کے لئے جو تعداد جو نصیں جو اوقات جو شرح مقرر کردی گئی ہے اُس میں تبدیلی کی سرمو گنجائش نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ فجر میں دو کی بجائے چار یا ظہر میں چار کی جگہ چند فرائض پڑھے جائیں۔ روزہ کو مغرب کی بجائے عشاء کے وقت افطار کیا جائے۔ حج میں افعال کی ترتیب و کیفیت بدل دی جائے، یا زکوٰۃ کی شرح میں من مانے تغیر کر دیئے جائیں۔ اب رہے وہ امور جو بجائے خود ممنوع و مکروہ نہ ہوں مگر انہیں قرون مبارکہ میں اختیار نہ کیا گیا ہو، تو کسی خاص سبب اور تقاضے کے پیش آجانے پر اُن میں بطور ذریعہ و وسیلہ اختیار تو کیا جا سکتا ہے لیکن انھیں عبادت مستقلہ کی شکل دینا اور اُن پر اصرار و شدّت جائز نہیں ہے!

بدعت کی حقیقت کو سمجھنے میں سطحی فہم رکھنے والوں کو ایک اور دشواری پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ اگر ہر نئی بات بدعت ہے تو بے شمار امور ایسے ہیں جو آنحضورؐ کے دَورِ مبارک میں نہیں تھے، نہ قرآن و حدیث میں اُن کی وضاحت ہے۔ لیکن بعد کے مسلمان انہیں اختیار کئے ہوئے ہیں اور تمام علماء اسلام اُن کی حلّت بلکہ ضرورت و اہمیت پر متفق ہیں۔ مثلاً دینی کتابیں لکھ کر چھاپنا اور فروخت کرنا۔ مدرسے بنا کر اُن میں مہتمم اور تنخواہ دار مبلّغین رکھنا۔ انجمنیں بنانا، دفاتر کھولنا، وغیرہ ذالک!

یہ اشتباہ فی الحقیقت دین اور احکام اسلامیہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، ایسا دستور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جس میں تمام ممکن جزئیات بیان کر دی گئی ہوں، دستور تو اصول و کلیات سے بحث کرتا ہے اور مطلوب و غیر مطلوب افعال و عقائد کی تشریح بیان کر دیتا ہے۔ اب یہ عوام الناس کا کام ہے کہ اپنے افعال و عقائد کو اس کی روشنی میں جانچیں اور اُن مقاصد کو پورا کریں جن کا دستور طالب ہو۔ قرآن و حدیث نے علم کی اشاعت کا حکم جاری کیا۔ اب یہ انسانوں کا کام ہے کہ ہر دَور کے وسائل و ذرائع کے مطابق اس حکم کی تعمیل کریں اور بہتر سے بہتر انتظام کے ذریعہ مقصد اشاعت کو پورا کئے جائیں۔ کتابیں چھاپنا تو ایک طرف اگر ریڈیو یا کسی اور ایجاد کو اس مقصد کا ذریعہ بنائیں گے تب بھی کوئی خرابی واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ ان وسائل و اسباب کی حیثیت نہ ایجاد فی الدین کی ہے نہ بجائے خود یہ عبادت ہیں۔ بلکہ ان کو اختیار کرنا ایک مقصدِ نیک کے حصول کی خاطر ہے۔ جس کی پاکیزگی و خوبی قرآن و حدیث نے صراحتہً بیان کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا بلّغوا عنّی ولو آیۃ دوسروں تک پہنچاؤ خواہ میری ذرا سی بات ہی ہو۔ اب ایک شخص کو اختیار ہے کہ لوگوں کو حدیث سُنانے اُونٹ پر بیٹھ کر جائے یا ریل پر۔ فرش پر بیٹھ کر سُنائے یا تخت پر۔ کوئی بھی ایسا طریقہ جس میں دین کے کسی اور حکم کی نافرمانی نہ ہوتی ہو اُس کے لئے جائز ہوگا اور بدعت نہ کہلائے گا۔

ان تمہیدی سطور کے بعد اب سمجھئے کہ بدعت توحید کی ضد کیسے ہے۔ بہت سیدھی سی بات ہے۔ کہ قانون بنانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ اہلِ ملک کچھ متعین لوگوں کو اس کام پر لگاتے ہیں۔ یا غیر جمہوری نظاموں میں تنہا بادشاہ یا بادشاہ اور وزیر وغیرہ قانون بناتے اور نافذ کرتے ہیں۔ ملک بھر میں ہرگز کوئی اس کا مجاز نہیں ہوتا کہ اپنی طرف سے کوئی قانون نکالے۔

دین کے بارے میں جب ہم نے یہ مان لیا کہ اللہ کا ایک مکمل دستور ہے اور کائنات کا خالق و مالک اور مختار کل ہونے کے باعث اللہ ہی اس کا مستحق بھی ہے کہ دستور بنائے اور حدود مقرر کرے تو یہ بات آپ سے آپ طے ہو جاتی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو قانون کی ایک بھی نئی دفعہ تراشنے کا اختیار نہیں ملا اور جو شخص ایسا کرے گا وہ گویا خود کو بھی کسی نہ کسی درجہ میں خدائی قوت و اقتدار کا شریک سمجھے گا۔ اسی کا نام شرک ہے !

دوسرے پہلو سے یہ شرک کفر تک بھی پہنچتا ہے اور وہ یوں کہ دین میں دو ہی طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک تو وہ جو اللہ سے قربت حاصل کرنے اور اس کی رضا اور انعام پانے کا ذریعہ ہیں۔ دوسری وہ جو اس سے دور ہونے اور اس کا قہر و عتاب حاصل کرنے کا سبب ہیں۔ انسان کے پاس تو ایسی عقل و بصیرت تھی نہیں کہ وہ ہزار پردے میں نہاں ذوالجلال والاکرام کی مرضیات کو پا سکتا۔ وہ ہرگز نہیں جان سکتا تھا کہ رب اکبر کن اعمال و عقائد اور کن طریقوں سے خوش یا ناراض ہو سکتا ہے اور کن افعال پر انعام اور کن افعال پر عذاب دے سکتا ہے۔ اس علم و خبر کا واحد ذریعہ وہی دین ہے جسے اللہ جل شانہ نے اپنے نبی صادق کے ذریعہ انسانوں تک پہنچایا۔ اس دین میں وہ تمام طریقے اور اصول کھول کر بیان کر دیے گئے جن سے اللہ خوش یا ناراض ہوتا ہے۔ کوئی کسر اس میں نہیں چھوڑی گئی۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کے کام میں کسر کا کیا امکان۔ تب کوئی شخص اگر بالکل نیا کام نکالتا ہے۔ جس کے لئے دین میں کوئی حکم نہیں دیا گیا اور سمجھتا ہے کہ اس سے اللہ کا تقرب اور ثواب آخرت حاصل ہوگا تو گویا وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کا دین ناقص ہے جس میں حصولِ تقرب کا یہ طریقہ بیان نہیں کیا گیا۔ نیز وہ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ نعوذ باللہ خود اللہ کو وہ طریقے معلوم نہ تھے جو اسے خوش کرنے کے ہو سکتے ہیں، جبھی تو اس نے میرے اس نو ایجاد طریقہ کو بیان نہیں کیا وہ اس کا بھی مدعی ہے کہ خدا کا آخری اور سب سے افضل رسول بھی حصولِ تقرب اور وصولِ ثواب کا وہ طریقہ نہیں پا سکا جسے میں نے پا لیا ہے، ونعوذ باللہ من ذالک !

حق یہ ہے کہ اعمالِ خیر سے ثواب کا حاصل ہونا کوئی حسابی یا سائنسی فارمولا نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ جس طرح دو اور دو لازماً چار ہوں گے یا جس طرح پانی آنچ پا کر لازماً بھاپ بن جائے گا اسی طرح انسان عملِ خیر کر کے لازماً ثواب حاصل کرے گا۔ بلکہ قرآن و حدیث اس پر شاہد اور اصحاب و اتقیا کا قول و عمل اس کا گواہ ہے کہ اعمالِ خیر تو صرف تعمیلِ حکمِ الٰہی کے درجہ میں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی حیثیت ان الطاف کے شکریہ کی سی ہے جو اللہ جل شانہ نے انسان پر بطور احسان کر رکھے ہیں۔ جن اخروی انعامات کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اعمالِ خیر پر فرمایا ہے وہ انسان کو تبھی ملیں گے جب اس کے اعمالِ خیر اللہ کے یہاں مقبول بھی ہو جائیں۔ نہ مقبول ہوں تو ہزار سال کی عبادتیں بھی بے کار اور فضول ہیں !

اب غور یہ کرنا چاہیے کہ کونسا طریقہ ہے جسے اختیار کر کے یہ امید ہو سکتی ہے کہ اللہ ہمارے اعمال مقبول فرمائے گا۔ واحد جواب یہی ملے گا کہ خود کو سراپا بندۂ حکم بنا لینا اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کو مضبوطی سے پکڑنا اور ان کے ضوابط کو بغیر کمی بیشی کے قولاً اور عملاً تسلیم کر لینا مقبولیت کی امید دلا سکتا ہے۔ اپنا کوئی نیا طرزِ عبادت نکال کر یہ ثابت کرنا کہ اللہ کی بتائی ہوئی عبادتیں کافی نہیں ہیں، اللہ کے قہر و غضب کو بھڑکانے کا باعث ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ غلو فی الدین خواہ وہ دین میں افراط کے ذریعہ ہو یا تفریط کے ذریعہ بے حد ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے!

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ۔ اے کتاب والو! اپنے دین میں غلو مت کرو۔

رسولؐ اللہ نے تین بار فرمایا۔
هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ ـــــ حد سے بڑھنے اور غلو کرنے والے ہلاک ہوئے۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا:۔
اِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فَاِنَّمَا اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ ۔ خبردار! غلو سے بچے رہنا۔ تم سے پہلے بہت سوں کو غلو نے برباد کیا۔

بدعت خواہ اس معنی میں ہو کہ حصولِ ثواب کے نئے طریقے ایجاد کئے جائیں جنہیں نہ اللہ اور رسولؐ نے بتایا نہ اصحابؓ نے اختیار کیا۔ یا اس معنی میں ہو کہ اللہ اور رسولؐ نے اعمال و اعتقاد کی جو حدیں اور صورتیں متعین کر دی ہیں اُن میں آدمی خواہ مخواہ باریکیاں اور نکتے نکالے، یا جن احکام، اشیاء اور بندگانِ ذی مرتبہ کے جو مراتب، جو مقدار، جو درجات متعین فرمائے ہیں اُن میں اضافے کرتا چلا جائے۔ دونوں ہی صورتیں بربادی و خسران کی ہیں!

اب میں آگے بڑھنے سے پہلے ناظرین کی خدمت میں چند معروضات پیش کروں گا۔ اگر آپ بعض ایسے اعمال و عقائد کے حامل ہیں جو میرے سابقہ اور آنے والے بیان کی روشنی میں بدعت ٹھہرتے ہیں تو آپ مکدر اور ناراض نہ ہوں بلکہ انصاف کے ساتھ یہ غور فرمائیں کہ دین نہ میری جائداد ہے نہ آپ کی۔ دین میں کسی اضافے یا کمی کا نہ مجھے اختیار ہے نہ آپ کو ـــ یہ بھول جائیے کہ میں اُس دیوبند کا رہنے والا ہوں جہاں کے علماء بہت سی رسومِ رائجہ کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی نظر انداز کر دیجئے کہ وہابی یا اہلِ حدیث یا غیر مقلد وغیرہ کے کیا جھگڑے ہیں ـــ صرف یہ دیکھئے کہ دین تو قرآن و سنّت کا نام ہے اور قرآن و سنّت سے علم و عقل کی روشنی میں جو احکام و اصول نکلتے ہیں وہی ایک مسلمان کے لئے واجب القبول ہیں اور جو طریقے اور رسمیں رائج ہیں وہ جس حد تک قرآن و سنّت کے خلاف ہوں اُسی حد تک ترک و احتراز کے لائق ہیں۔ محض یہ بات کہ بعض طریقے نہ صرف عوام بلکہ بعض خواص میں بھی رائج و مقبول ہو گئے ہیں اور اُن کی ابتداء کرنے والوں میں بعض بڑے بڑے نیک عمل لوگ شامل ہیں، اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ اسے دین سمجھ لیا جائے۔ بلکہ دین وہی ہے جس کی تائید قرآن و سنّت سے ہو اور کوئی دینی اصول اس سے ٹوٹتا نہ ہو۔ میں مناظرے کے طور پر نہیں بلکہ خالص افہام و تفہیم کے طور پر بعض خلافِ دین امور کا ذکر کروں گا۔ جنہیں کچھ مسلمانوں نے جزوِ دین بنا لیا ہے۔ اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ میری بات کو رد کر دینا اور اپنے عقیدے پر اڑے رہنا میری دُنیا و آخرت کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں، بلکہ اگر میری بات فی الواقع صحیح ہے تو نقصان ضد کرنے والے ہی کو ہوگا۔ میں تو بڑے ادب اور عجز کے ساتھ اُس اللہ کی آیات اور اُس صادق و مصدوق سرورِ کونین محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جنہیں آپ بھی واجب الاطاعت تسلیم کرتے ہیں۔ آپ خالی الذہن ہو کر خلوص، دیانتداری اور بردباری کے ساتھ غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ جن اعمال و عقائد پر آپ والہ و شیدا ہیں، اُن میں کسی طرح کا سقم و نقص تو نہیں ہے۔ وہ رضائے الٰہی کی بجائے عتابِ الٰہی کے تو سزاوار نہیں ہیں ـــ پھر یہ بھی یقین فرمائیے کہ یہ گزارش میں اپنی طرف سے نہیں کر رہا۔ بلکہ خود حضور علیہ التحیات والتسلیم نے فرمایا ہے:۔

فَاِنَّهٗ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِی النَّارِ۔

تم میں سے جو زندہ رہیگا وہ کثیر اختلاف دیکھے گا پس ایسی حالت میں تمہیں چاہیئے کہ میری سنّت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنّت کا سہارا لو اور اُسے دانتوں سے پکڑ لو اور خبردار

نئے نئے کاموں سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا جہنم ہے۔

کیا آج کے دور میں اختلافات کا کچھ شمار رہ گیا ہے؟ کیا ٹھیک یہی دور نہیں جب حضورؐ کے اس فرمان کی تعمیل کی جائے؟

صحابہؓ کا طرزِ عمل

یہ بات ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جن بدعتوں سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے روکا ہے وہ ایسی نہیں ہوں گی جن پر احکامِ ظاہری کے لحاظ سے ہر شخص ممنوع و منکر ہونے کا فتویٰ لگا سکے۔ ممنوعات و منکرات کی توضیح تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے متعدد مقامات پر کر دی۔ بلکہ بدعت سے مراد وہی امور ہو سکتے ہیں جو بظاہر باعتبارِ شکل و شباہت دینی امور معلوم ہوں لیکن دین میں اُن کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ ایسے ہی امور انسان داخلِ دین کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور ایسے ہی امور سے حصولِ ثواب کی غلط توقع وابستہ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس حقیقت کو خوب سمجھا اور ایسی احتیاط برتی کہ حق ادا کر دیا۔ نمونے ملاحظہ ہوں:-

نمازِ فجر و عصر کے بعد امام کے داہنے یا بائیں مڑ کر کچھ دیر بیٹھنا امرِ معروف ہے۔ رسول اللہ سے بروایاتِ صحیحہ اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اب عبد اللہ ابن مسعودؓ جیسے صحابیٔ جلیل کو دیکھئے۔ فرماتے ہیں:-

لا یجعل احدکم للشیطان شیئاً من صلوٰتہ یری ان حقاً علیہ ان لا ینصرف الا عن یمینہ لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثیراً ینصرف عن یسارہ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

تم میں سے کوئی شخص شیطان کو اپنی نماز میں حصہ دار نہ بنالے بایں طور کہ وہ صرف داہنی طرف مڑنے کی پابندی کرے۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ کو بار بار بائیں طرف مڑتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

مشہور عالمِ دین ملا علی قاری اپنی شرح میں اس کے تحت لکھتے ہیں:-

من اصرّ علی امرٍ مندوبٍ وجعلہٗ عزماً ولم یعمل بالرخصۃ فقد اصاب منہ الشیطان من الاضلال فکیف من اصرّ علی بدعۃٍ ومنکرۃٍ۔

جس نے کسی امرِ مستحب پر اصرار کیا اور مضبوطی سے اس پر جا اور رخصت پر عمل نہیں کیا پس یقیناً اس ذریعہ سے شیطان اُسے گمراہ کرنے پہنچ گیا۔ (پس جب امرِ مستحب کا یہ معاملہ ہو تو) اُس شخص کا کیا حال ہوگا جو بدعت یا منکر پر اصرار کرے۔

آپ اگر یہ کہیں کہ ملا علی قاری کی بات ہم نہیں مانتے تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں مگر ابنِ مسعودؓ کے بارے میں تو آپ ایسا نہیں کہہ سکتے۔ خود اُن کا یہ قول بتا رہا ہے کہ جو فعل بجائے خود مستحب ہو لیکن رسول اللہ نے اُس کی پابندی نہ کی ہو۔ اُسے بھی پابندی کے ساتھ کرنا گویا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس فعل کو ضروری سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دین میں جس چیز کو جو درجہ دیا گیا ہے اُسے اس سے زیادہ درجہ دینا بھی اسی طرح بُرا ہے جس طرح کم درجہ دینا۔ پھر اس میں یہ بھی غور کیجئے کہ نیت اور عقیدے کا ذکر ابن مسعودؓ نے نہیں کیا۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ داہنی طرف مڑنے کو عقیدتاً ضروری سمجھنے والا اور دوسروں کو اس عقیدے کی تعلیم دینے والا گروہ ہے۔ ایسے شخص کو تو کافر کہا جاتا کیونکہ وہ گویا بائیں طرف مڑنے کو گناہ ٹھہرا رہا ہے اور بائیں طرف مڑنا آنحضورؐ سے ثابت ہے۔ لہٰذا نعوذ باللہ اُس نے حضورؐ کو بھی گنہگار ٹھہرایا ۔۔ ایسا نہیں بلکہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ نے مجرد اس طرزِ عمل ہی کو شیطنت ٹھہرایا ہے کہ امام ہمیشہ دائیں طرف مڑا کرے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ کوئی بھی ایسا کام نکالنا جو

عوام کے نزدیک تقرب الی اللہ اور ثواب کا ذریعہ ٹھہرے۔ حالانکہ قرآن وسنت سے اس کا اشارۃً بھی حکم نہ ملا ہو قطعاً بازغت ہو خواہ نکالنے والے کی نیت اسے ضروری قرار دینے کی نہ ہو۔

یہی ابن مسعودؓ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ایک بار اپنے بعض شاگردوں کو دیکھا کہ ذکر و عبادت کے لئے ایک جگہ مقرر کر کے جمع ہوتے ہیں تو غصہ فرمایا اور تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اے لوگو! کیا تم رسول اللہ کے اصحاب سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ ہو؟ یا گمراہی کی طرف دوڑ رہے ہو! دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں تو میں نے اس طرح کا ذکر نہیں دیکھا پھر تم لوگ کیوں یہ نیا طریقہ نکال رہے ہو؟ — نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ رک گیا۔ غور کا مقام ہے۔ ذکر الٰہی جیسا مقدس فعل لیکن ابن مسعودؓ جیسا عظیم الشان صحابی اس پر خفا ہے۔ صرف اس لئے کہ دین کے رنگ میں رنگی ہوئی مصفا ترین بصیرت خوب دیکھتی ہے کہ جو طریقے ابتداء میں نہایت خلوص وللہیت سے نکالے جاتے ہیں۔ وہی کچھ عرصہ بعد کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ اور وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ شیطان اللہ کے مومن بندوں کو نبیؐ کی سنت اور اللہ کے فرائض سے دور رہے جانے کے لئے کیسے کیسے خوبصورت حربے استعمال کرتا ہے۔ وہ جن لوگوں کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ دنیاوی متاع کی چمک دمک پر مائل ہونے والے نہیں، ان کے لئے دین ہی کی نوعیت اور رنگ کا جال بنتا ہے۔ دام ہمرنگِ زمین بچھاتا ہے اور بہت کم اللہ کے بندے اس کے کید سے بچ پاتے ہیں۔ ابن مسعودؓ کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ ذکر اللہ کے لئے ایسی اجتماعی شکلیں اختیار کی جائیں جن کی تعلیم عملاً یا قولاً رسول اللہ نے نہیں دی!

ترمذی میں حضرت نافعؓ سے روایت ہے کہ:۔

ان رجلاً عطس الی جنب ابن عمر قال الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ قال ابن عمر انا اقول الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ ولیس ھکذا علّمنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علّمنا ان نقول الحمد للہ علی کل حال (مشکوٰۃ)

ایک شخص عبد اللہ ابن عمر کے پہلو میں کھڑے ہوئے چھینکا اور کہنے لگا الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ۔ ابن عمر نے فرمایا یہ بات تو میں بھی کہتا ہوں۔ لیکن رسول اللہ نے ہمیں اس طرح نہیں سکھایا ہے بلکہ یوں سکھایا کہ ہر حال میں الحمد للہ کہیں۔

اندازہ کیجئے۔ والسلام علی رسول اللہ جیسا پاکیزہ جملہ لیکن ابن عمر نے اسے بھی پسند نہیں کیا۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ چھینک کے بعد صرف "الحمد للہ" کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور اسی پر اکتفا کرنا دین کا تقاضا ہے۔ اس تقاضے کو آپ نے رسول اللہ ہی سے سمجھا تھا اور یہ بات اُن کی نظر میں تھی کہ جس جگہ رسول اللہ نے لفظ "نبی" استعمال فرمایا ہو وہاں کسی کو "رسول" کہنے کا بھی اختیار نہیں!

ہو سکتا ہے کوئی یوں کہے کہ اس حدیث کے بعد صاحب مشکوٰۃ نے "ھٰذا حدیث غریب" لکھا ہے اور صاحب مشکوٰۃ جب ایسا لکھتے ہیں تو بقول شیخ محدث دہلوی تو اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث میں کسی طرح کا طعن ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ فی الحقیقت صاحب مشکوٰۃ کے نہیں ہیں بلکہ خود ترمذی کے ہیں۔ اور ہر صاحب علم کو معلوم ہے کہ ترمذی ان الفاظ کو صاحب مشکوٰۃ کے معنی میں استعمال نہیں کرتے بلکہ بارہا صحیح حدیث کے بارے میں بھی وہ فنی نقطۂ نظر سے ایسا کہہ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث کو غریب اس وجہ سے کہا کہ اس کے رُواۃ میں ایک راوی زیاد بن ربیع منفرد ہیں، لہٰذا

اصطلاحاً اس پر غرابت کا اطلاق ہوا۔ ورنہ یہ راوی ہر لحاظ سے معتبر اور بخاری کے رُواۃ میں سے ہیں اور حدیث صحیح ہے۔

حضرت عمر رضی کا یہ عمل کسے معلوم نہیں کہ آپ نے اُس درخت کو کٹوا ڈالا تھا، جس کے نیچے رسُول اللہ نے بیعت لی تھی اور جس کی زیارت کرنے لوگ کرنے لگے تھے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس درخت کا وجود عوام الناس میں بدعت و شرک پیدا کرے گا۔ پھر یہ بھی حضرت عمرؓ ہی کا واقعہ ہے کہ سفرِ حج سے لوٹتے ہوئے جب راہ میں ایک ایسی مسجد پڑی جس میں رسُول اللہ نے نماز ادا فرمائی تھی تو لوگ اُس کی طرف دوڑے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اے لوگو! اہلِ کتاب انہی باتوں کی وجہ سے برباد ہوئے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی یادگاروں کو عبادت گاہ بنا ڈالا"

اللہ اکبر! نگاہِ عمرؓ کتنی دُور دیکھ رہی تھی — ! آپ آج اپنی آنکھوں سے بصیرتِ عمرؓ کا نظارہ فرمالیں۔ نبی تو بڑی چیز ہے۔ نبی کی خاکِ پا جیسے بزرگوں کی قبروں اور درگاہوں کا حال دیکھئے۔ جُہلا ہی نہیں پڑھے لکھے بھی آپ کو ملیں گے کہ خاک کے تودوں پر سرِ نیاز خم کئے ہوئے ہیں اور جس فرقِ مقدّس کے آگے کبھی فرشتوں نے سجدہ گزرا تھا وہی فرقِ مقدّس مٹی کے ڈھیروں کے آگے جھکا ہوا ہے۔ صحابہؓ جیسے عظیم مومن و مسلم اور رسُول اللہ جیسے رسولِ اکرم کی محبّت و عقیدت، — لیکن پھر بھی حضرت عمرؓ نے ایک تہہ نشین خطرے اور فتنے کو اس فعلِ حَسن کی گہرائیوں میں دیکھ لیا۔ وہ فاروق تھے — فارقِ حق و باطل — انہی کے لئے زبانِ صادق و مصدوقؐ نے کہا تھا کہ لوکان بعدی نبی لکان عمرؓ (اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو عمرؓ ہوتا) ورضی اللہ عنہ!

بدعت اور ایجاد فی الدین سے جلیل القدر صحابہؓ کو کتنا گریز تھا اس کے لئے اور بیسیوں آثار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن مجھے چونکہ ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لئے اتنے ہی پر اکتفا کرکے آگے چلتا ہوں۔

قبر پرستی

قرآن و سنّت کے صریح احکام کے بالکل برعکس رواج پا جانے والی بدعات میں غالباً سب سے بدتر لیکن سب سے عام بدعت قبر پرستی ہے جو کافی مقبول ہو چکی ہے اور جس کی بہت سی صورتیں شرک جلی میں داخل ہیں۔

ہمارے سامنے آج تک ایک بھی دلیل ایسی نہیں آئی جس سے معلوم ہو سکتا کہ مروجہ قبر پرستی قرآن یا حدیث کے کس حکم یا اصول کے تحت اختیار کی گئی ہے۔ ہمیں تو غور و فکر اور مطالعہ کے بعد یہی اندازہ ہوا کہ قبر پرستی کی تمام تر عمارت محض جہل، نادانی، نفس پرستی اور اندھی تقلید پر کھڑی ہوئی ہے۔ آپ کے غور و فکر کے لئے چند نصوص پیشِ خدمت ہیں:۔

مسلم اور ترمذی میں ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تجلسوا علی القبور ولا تصلوا الیہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قبروں پر مت بیٹھو اور ان کی طرف رُخ کرکے نماز نہ پڑھو۔

اگر کسی کو اس سے یہ غلط فہمی ہو کہ یہاں تو قبر پر چڑھ کے بیٹھنے کو منع کیا گیا ہے تو یہ درست نہیں ہے۔ کبھی اور کہیں بھی ایسا نہیں دیکھا یا سُنا گیا کہ لوگ قبروں پر چڑھ کے بیٹھتے ہوں۔ لہٰذا حضورؐ کے حکم کو اس معنی میں لینا گویا رسُول اللہ پر یہ الزام رکھنا ہے کہ آپ عبث باتیں بھی فرمایا کرتے تھے۔ (نعوذ باللہ) ظاہر ہے کہ منع اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو زیرِ عمل آتی ہو۔ زیرِ عمل یہی چیز آتی رہی ہے کہ لوگ قبروں کے پاس بیٹھتے اور اس بیٹھنے کو متبرک سمجھتے رہے ہیں۔ باقاعدہ درگاہیں بنی ہیں اور وہاں نیاز مندیوں کے مختلف پیرائے اختیار کئے گئے ہیں۔ اسی سے حضورؐ نے منع فرمایا ہے! ۸

حیرت کی بات ہے کہ لوگ حضرت آدمؑ اور حضرت یوسفؑ کو سجدے کئے جانے کی دلیل سے قبروں کو اور غیر اللہ کو سجدہ

کرنے کی دلیل لاتے ہیں حالانکہ رسول اللہ نے سجدہ کرنا تو درکنار قبروں کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے تک کو منع فرمادیا کہ اس میں اشتباہ کا اندیشہ ہے اور قبر کو سجدہ کرنے کا ابہام ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی نہ کہا جائے کہ نماز تو چونکہ قبلہ رُخ ہو کر پڑھنی چاہیئے، اس لئے قبر کی طرف نماز پڑھنے کو منع فرمایا۔ یہ حکم رسول بلاشبہ اُسی صورت میں ہے جبکہ قبر قبلہ کی طرف واقع ہو رہی ہو۔ ورنہ کون دیوانہ مسلمان ہوگا جو قبلہ کے سوا کسی طرف مُنہ کرکے نماز پڑھے گا۔

مسلم اور ترمذی میں ہے:۔

قال علی رضی اللہ عنہ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالاً الا طمستہٗ ولا قبراً مشرفاً الا سوّیتہٗ۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کیا میں تمہیں اُس مہم پر نہ بھیجوں جس پر رسول اللہ نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ کہ تم کسی مجسمہ کو مٹائے بغیر نہ رہو اور کسی اُونچی قبر کو برابر کئے بغیر نہ چھوڑو!

یہ میں نہیں کہہ رہا امام الاتقیا خلیفۂ چہارم رسول اللہ کے داماد حضرت علیؓ فرمارہے ہیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:۔

لمّا نزل برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طفق یطرح خمیصۃً علی وجہہ واذا اغتمّ کشفھا عن وجہہ، فقال وھو کذالک "لعنۃُ اللہ علی الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبورَ انبیائھم مساجد" یحذّر ما صنعوا ولولا ذالک اُبرز قبرہٗ غیر انّہ خشیَ ان یتخذ مسجداً۔

جب جانکنی کا عالم رسول اللہ پر طاری ہوا تو آپ نے چہرے پر چادر کھینچ لی۔ جب سانس گھٹتا چادر ہٹا دیتے۔ اسی عالم میں فرمایا "یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا" ایسا کہہ کر آپ اُمت کو اس طرح کی حرکتوں سے ڈرا رہے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو خود رسول اللہ کی قبر شریف بھی کھلی رکھی جاتی۔ لیکن اسی خوف سے کہ اُسے عبادت گاہ بنالیا جائے گا، بند رکھا گیا!

اندازہ کیجئے۔ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے رسول اللہ کو کتنی نفرت و کراہت تھی۔ بہت ہی کم آپ کسی کے لئے لعنت اللہ کہا کرتے تھے۔ لیکن اس فعل کے کرنے والوں پر حضورؐ عالمِ جانکنی میں کس دلسوزی سے لعنت بھیج رہے ہیں۔ پھر انبیاء کی قبور کا جب یہ معاملہ ہو تو اُن لوگوں پر کس قدر لعنت برسے گی جو انبیاء سے بہت کم درجہ بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنائے ہوئے ہیں!

ذرا ملاحظہ کیجئے۔ غیر انبیاء کی قبروں کا ذکر بھی حدیثِ رسولؐ میں ملتا ہے۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ حضرت اُم حبیبہ اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبش کے دو ایسے گرجاؤں کا ذکر رسول اللہ کے حضور کیا جس میں انہوں نے تصاویر دیکھی تھیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:۔

ان اولئک اذا کان فیھم الرجلُ الصالحُ فمات بنوا علی قبرہ مسجداً وصوّروا فیہ تیک الصوَر اولئک شرار الخلق عند اللہ یوم القیامۃ۔

ان لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب ان میں کوئی مردِ صالح مرجاتا ہے تو اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنالیتے ہیں

اور صالحین کی تصویریں نقش کر لیتے ہیں۔ یہی لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوں گے۔

دیکھا آپ نے۔ آج کی درگاہ سازی و قبر نوازی سے کتنی مطابقت رکھتی ہے یہ حدیث؟ اور سنیئے۔ موطا امام مالک کی روایت ہے:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللهم لا تجعل قبری وثناً یعبد اشتد غضب اللہ علیٰ قومٍ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ اے اللہ! میری قبر کو بُت نہ بنا دینا جسے پُوجا جائے۔ اللہ کا سخت غضب آئے اُس قوم پر جو اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لے!

مُسلم کی ایک اور روایت ملاحظہ کیجئے۔ قولِ رسولؐ ہے:۔

اَلَا وانّ من کان من قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیائھم وصالحیھم مساجد۔ اَلَا فلا تتخذوا القبور مساجد انی انھاکم عن ذالک!

خبردار رہو۔ تم سے پہلے لوگوں نے اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا تھا۔ خبردار تم ہرگز قبروں کو عبادت گاہ نہ بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں!

روکنے اور منع کرنے کا وہ کونسا صریح اسلوب ہے جو اس سلسلہ میں سرورِ کونین نے اختیار نہیں فرمایا۔ تنبیہ و تنذیر کے جو واضح ترین الفاظ تھے بار بار استعمال کئے۔ پھر بھی اگر مسلمان اس پر توجہ نہ کرے تو سوچئے روحِ پاکؐ پر کیا گزرے گی اور آخرت میں اُس کے ساتھ کیا معاملہ رہے گا۔ اور دیکھئے مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، موطا امام احمد سبھی میں یہ روایت ہے کہ:۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان یقعد علیہ وان یبنیٰ علیہ!

منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو گچ کرنے (چُونے کنکریٹ وغیرہ سے پختہ کرنے) سے اور اُس پر بیٹھنے سے اور اُس پر عمارت بنانے سے!

اور دیکھئے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے:۔

انّ من شرار الناس من تدرکھم الساعۃ وھم احیاء والذین یتخذون القبور مساجد۔

بدترین ہیں وہ لوگ جن کی زندگی میں قیامت برپا ہوگی اور بدترین ہیں وہ لوگ جو قبروں کو مسجدیں بنالیں گے!

اور ملاحظہ کیجئے۔ ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور ابوداؤد کی روایت ہے:۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور والمتخذین علیھا المساجد والسرج!

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لعنت بھیجی رسولؐ اللہ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور اُن پر بھی جو قبروں کو مسجدیں بنالیتے ہیں اور اُن پر چراغ جلاتے ہیں۔

گویا عورتوں کے لئے نفسِ زیارت ہی قابلِ لعنت ہے خواہ وہ وہاں کوئی مشرکانہ فعل کریں یا نہ کریں۔ یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ محولہ بالا روایتوں میں "مسجد" سے مراد گنبدوں اور میناروں والی اصطلاحی مسجد ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ قبروں کو ایسی جگہ نہ بناؤ جہاں عبادت کی قسم سے کوئی عمل کیا جائے۔ یا میلہ لگایا جائے۔ چنانچہ یہ تشریح حضورؐ ہی کے قول سے ثابت ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

جُعلت لِی الارضُ مسجداً وطھوراً — میرے لئے تمام روئے زمین مسجد اور پاک بنا دی گئی!

ظاہر ہے کہ مسجد سے مراد یہی ہے کہ جہاں چاہوں اللہ کی عبادت کرلوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ مسجد نام کی خاص عمارت ہی میں عبادت ہوسکے۔ گھر، جنگل، ریگستان۔ ہر جگہ نماز اور ہر عبادت ادا ہوسکتی ہے۔ اور فرمایا:-

لا تجعلوا قبری عیدا۔ میری قبر کو میلہ گاہ نہ بنانا۔

کفار عرب کے کئی بتوں مثلاً ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے بارے میں تو بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ تشریح منقول ہے کہ یہ سب قوم نوحؑ کے نیک لوگ تھے جنہیں بعد میں بُت بنا کر پوُجا گیا۔ مشہور بُت لات کے بارے میں ابن جریرؒ نے مجاہد جیسے جلیل القدر عالم و فقیہ کی روایت بیان کی ہے کہ یہ ایک شخص تھا جو لوگوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا۔ گویا پہلے ہی سے اہلِ کفر میں نیک لوگوں کو اُن کی موت کے بعد پوُجنے کی بیماری چلی آرہی ہے۔ اور یہی بیماری آج کثیر مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، اتنی جرأت تو ان سے نہ ہوسکی کہ باقاعدہ بُت تراش لیتے۔ لیکن بزرگوں کی قبروں، بعض حالتوں میں جعلی قبروں تک کے ساتھ معاملہ پرستش اور بندگی ہی کا ہے !!

قبروں پر میلے اور عرس

ایک طرف تو اس حدیث کو دیکھئے جس میں تین مسجدوں کے سوا کسی بھی مسجد یا مزار یا درگاہ کی طرف باقاعدہ سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب تو یقیناً نہیں ہے کہ ہر طرح کے سفر ہی کو رسولؐ اللہ نے منع فرمادیا۔ بلکہ باتفاق علماء اس کا یہ مطلب ہے کہ تقرب الی اللہ اور ثواب کی نیت سے صرف تین مساجد ہیں جن کی طرف سفر کرنا جائز ہے۔ مسجدِ اقصیٰ۔ مسجد حرام، مسجد نبویؐ۔ ان کے علاوہ تقرب الی اللہ کی نیت سے سفر نا جائز ہے!

دُوسری طرف وہ قول رسولؐ اللہ دیکھئے، جسے ابھی نقل کر آیا ہوں یعنی "میری قبر کو عید نہ بنا لینا"

"عید" کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنا۔ ہر وہ جگہ عید ہے جہاں لوگ بار بار جاتے ہیں۔ ہر وہ زمانہ اور وقت عید ہے جس میں کوئی کام بار بار کیا جاتا ہے۔ ہر وہ مجمع عید ہے جو بار بار اکٹھا ہوتا ہے۔ روایاتِ صحیحہ گواہ ہیں کہ صحابہؓ اور تابعین اور ائمہ واقعتاً سے رسولؐ اللہ کے حکم کی تعمیل کی، اور قبر رسولؐ کو عید نہیں بنایا۔ وہاں کے لئے اوقات متعینہ میں جمع ہونا یا تنہا جانا جائز نہیں سمجھا۔ صحابہ میں سے بعض بغیر تعین وقت اور بغیر پابندی کے جاتے تو قبر پر کھڑے ہوکر صرف سلام کہتے۔ کیونکہ سلام کا حکم رسولؐ اللہ نے دیا تھا اور بعض صحابہ بہت دُور ہی سے سلام کہہ لیتے!

یہ تو تھی تعلیمِ رسولؐ اور تعلیم صحابہؓ کا حال۔ اب ذرا ہمارے زمانہ کے عُرسوں اور سالانہ میلوں کا حال دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ کثیر مسلمان کس ذوق و شوق سے سال بسال قبروں کے میلوں میں جاتے ہیں اور لاتعداد خرافات و منکرات میں مُبتلا ہوتے ہیں۔

قبروں پر دعا

قبروں پر جاکر اہلِ قبر سے کچھ مانگنا تو کھُلا شرک ہے ہی لیکن قبروں پر جاکر براہ راست اللہ سے مانگنے کی فضیلت و خصوصیت بھی قرآن و سنّت میں کہیں نہیں ملتی۔ یعنی ایسا کہیں نہیں ملتا کہ قبروں کے پاس دعا مانگنا نسبتاً بہتر اور وجہ برکت ہو۔ جتنی بھی روایات ہیں اُن میں صرف مُردوں کے لئے دعا ہے یا بعض ایسے الفاظ ہیں جو عبرت کا فائدہ دیتے ہیں۔ مثلاً:-

السلام علی اھلِ الدیار من المومنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون
نسأل لنا ولکم العافیۃ (مسلم)

سلام پہنچے ان بستیوں کے مومن اور مسلم بسنے والوں کو۔ ہم انشاء اللہ تم سے مل جانے والے ہیں۔ ہم اپنے اور تمہارے لئے عافیت کے طالب ہیں۔

السّلامُ علیکم دارَ قومٍ مومنینَ انتم لنا فَرَطٌ ونحنُ بکم لاحقون۔ اللھم لاتحرمنا اجرھُم ولاتفتِنّا بعدھُم۔ (ابن ماجہ)

اے مومنو! تم پر سلامتی ہو۔ تم ہمارے پیش رو ہو اور ہم تمہارے پیچھے آنے والے ہیں۔ خدایا ہمیں اُن کے ثواب سے محروم نہ کر اور ہمیں ان کے بعد فتنہ میں نہ ڈال!

ان دعاؤں میں مقصدِ اصلی مرحومین کے لئے دعا ہے اور اپنے لئے خیر و فلاح کی طلب ضمناً ہے۔ ہمارے زمانہ میں مرحومین کے لئے دعا کا طریقہ تو ختم ہوا اور اُلٹی گنگا بہی کہ بزرگوں کی قبروں پر جاتے ہیں اور اُن کے لئے دعا تو اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کی نجات و مغفرت پر ہم ایمان لا چکے ہیں۔ خود اپنے لئے دعا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ صاحب کی برکت و فضیلت سے دعا پُر اثر ہو جائے گی۔ ایسا سمجھنا غلط اور خلافِ شرع ہے کیونکہ قرآن و سنّت میں اس کے لئے کوئی تعلیم نہیں۔ معلوم نہیں کن لوگوں نے یہ گھڑ دیا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہ کہا کرتے تھے کہ جب کبھی مجھ پر کوئی سختی آن پڑتی ہے تو میں امام ابو حنیفہؒ کی قبر پر آ کر دعا کرتا ہوں۔ اور سختی دُور ہو جاتی ہے۔ یہ محض جھوٹی روایت ہے جو نہ تو روایت کے مسلّمہ اصولوں پر صحیح اُترتی ہے نہ عقل و قیاس کے مطابق ہے۔ امام شافعیؒ تو اپنی تحریروں میں قبروں کی تعظیم و تکریم مکروہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے حجاز و یمن، عراق و شام اور مصر وغیرہ میں کتنے ہی صحابہ اور تابعین کی قبریں دیکھیں لیکن کبھی کسی قبر کی طرف رجوع نہیں فرمایا۔ حالانکہ صحابہ تو ظاہر ہے امام ابو حنیفہؒ سے بدرجہا افضل و برتر تھے۔ حق یہ ہے کہ امام شافعیؒ جب بغداد میں تشریف لائے تو نہ وہاں کسی قبر پر لوگ دعا کے لئے آتے تھے نہ یہ طریقہ ناقص اُس دَور میں مروج تھا۔۔۔!

بعض لوگ مشہور بزرگ معروف کرخیؒ کی قبر کے متعلق کسی بزرگ کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ وہ قبولِ دعا کے لئے تریاق اور مجرب ہے اور خود معروف کرخیؒ نے اپنے بھتیجے کو یہ وصیّت فرمائی تھی کہ میری قبر پر آ کر دعا کیا کرے۔ نیز بعض نیک لوگوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ صلحاء اور انبیاء کی قبروں پر آ کر دعائیں کیا کرتے تھے۔ اور دعائیں قبول ہو جاتی تھیں۔ نیز بعض فقیہوں نے قبر پر قرآن خوانی کا جواز لکھا ہے۔ یا بعض لوگوں نے اپنے تجربے بیان کئے کہ فلاں شیخ کے مزار پر ہم نے دعا کی اور مقبول ہوئی یا بعض علماء اور زاہدین قبروں پر دعائیں کرتے اور جُھکتے دیکھے گئے۔ لہذا یہ لوگ جاہل اور تارکِ شریعت نہیں ہو سکتے۔۔!

اس طرح کی حجتیں لادین و شریعت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک دعا کے مقبول ہونے کا تعلق ہے تو کوئی بھی فیصلہ کُن طور پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کس لئے مقبول یا رد ہوئی۔ دعا گھر کے کونے میں بھی مقبول ہوتی ہے اور قبرِ رسولؐ تک پر نا مقبول ہو جاتی ہے۔ دعا کافروں اور مشرکوں اور سخت گناہ گاروں کی بھی قبول ہوتی ہے اور کفّار بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں عمل کی وجہ سے یا فلاں گرجا کی برکت سے دعا قبول ہوئی۔ ہندوؤں میں بھی عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں مندر یا فلاں استھان یا فلاں گھاٹ پر دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا کافروں اور مسلمانوں سب کی قبول و رد کرتا ہے۔ وہ رب العالمین ہے اور اگر کسی قبر پر دعا کرنے سے فوری قبولیت حاصل ہو جائے تو یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ مقبولیت اس قبر یا صاحبِ قبر کی برکت سے ہے بلکہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ وقت ہی اللہ تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کا رکھا تھا اور اس وقت کسی بھی جگہ یہ دعا مانگی جاتی قبول ہوتی۔

رہا بعض بزرگوں کا قول۔ تو اوّل تو اس قول کی روایتیں ہی مستند نہیں ہیں۔ دوسرے کسی شخص کا بزرگ ہونا اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ اُس کا ہر اجتہاد درست ہی مان لیا جائے۔ اگر وہ مجتہد کا درجہ رکھتا ہے تو زیادہ سے زیادہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسے اِس

اجتہاد پر کوئی گناہ نہیں ہوا۔ بلکہ ایک درجہ میں اجتہاد کا ثواب ہی ملا۔ لیکن جو لوگ محض تقلید میں اسے اختیار کرتے ہیں، وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔ کیونکہ مقلد کے لئے یہ مسئلہ اجتہادی نہیں بلکہ غلط اجتہاد کی پیروی ہے! قول کے بعد فعل کا نمبر ہے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ کسی بزرگ کا خصوصی فعل شریعت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہر دور میں قبروں کی تعظیم اور اس پر دعا کی مخالفت کرنے والے بہت علماء رہے ہیں۔ لہٰذا اگر کچھ علماء و صلحاء تعظیم و دعا کو درست بھی کہیں تو یہ مسئلہ اختلافی ہوا اور اختلافی مسائل میں اللہ تعالیٰ کا کھلا حکم ہے کہ:۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ۔

جب تم کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کرنے لگو تو اسے اللہ اور اُس
کے رسول کی تعلیمات کی روشنی میں فیصل کرو۔

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ دعا کا قبول کیا جانا الگ بات ہے اور فعلِ ممنوع کی سزا الگ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کافر بُت یا صلیب کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور اللہ اُس کی دعا قبول کر لیتے ہیں۔ تو کیا اس قبولیت کے باوجود اُس کے یہ کافرانہ افعال مستوجبِ سزا نہ ہوں گے۔ ہوں گے اور ضرور ہوں گے۔ اسی طرح قبر پر جاکر اگر کوئی مسلمان دعا کرتا ہے اور وہ قبول ہو جاتی ہے تو غلط اعتقادی اور ممنوع طرزِ عمل اختیار کرنے کا عذاب تو بہر حال ملے گا۔!

پھر بعض دعاؤں کا قبول ہونا بھی عذابِ الٰہی کی ایک شکل ہوتا ہے۔ آدمی اپنے نزدیک جو چیز مفید سمجھتا ہے وہ مانگتا ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہی چیز اس کے لئے مصیبت و ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ جیسے مثلاً ایک شخص ثعلبہ نے آنحضورؐ سے درخواست کی کہ میرے لئے کثرتِ مال و اولاد کی دعا فرمائیں۔ آنحضورؐ نے فرمایا۔ ایسی خواہش مت کر تجھے نقصان رہیگا۔ لیکن اُس نے ضد کی اور آپؐ نے دعا فرما دی جو مقبول ہوئی۔ مگر یہی چیز اس کے لئے تباہی کا باعث بن گئی۔ چنانچہ جب مال ملا تو اُس نے زکوٰۃ تک سے انکار کر دیا۔ ایسی ہی مثالیں آپ اپنے اردگرد دیکھ سکتے ہیں۔ اولاد کی دعا قبول ہوتی ہے تو بعض حالتوں میں یہی اولاد ماں باپ کے لئے ہزاروں پریشانیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ وعلیٰ ہذا۔

زیارتِ قبور

قبروں کی زیارت کا بیشک حضورؐ نے اذن دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے کہ موت کو یاد رکھو، موت کو یاد رکھنا ظاہر ہے کہ بجائے خود مقصد نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی موت کو یاد رکھے گا تو اچھے اعمال کی طرف راغب ہوگا، برائیوں سے بچے گا اور دُنیا کی زندگی میں محو نہیں ہوگا۔ مسلم میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

"میں نے اللہ سے اپنی والدہ کی مغفرت کی اجازت چاہی تو منع فرما دیا گیا۔ مگر اُن کی قبر کی زیارت کا اذن مانگا تو مل گیا۔"

دوسری روایت مسلم ہی میں ہے کہ حضورؐ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اور اس قدر روئے کہ جو اصحاب ساتھ تھے وہ بھی رونے لگے۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں نے اپنی والدہ کے لئے مغفرت طلب کی تو انکار فرما دیا۔ لیکن قبر پر آنے کی اجازت دے دی۔ لہٰذا قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔!

حضورؐ کے طرزِ عمل پر غور کیجئے۔ پھر یہ دیکھئے کہ آج کتنے لوگ موت کو یاد کرنے قبروں پر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لوگوں نے اس عبرت حکم ہی کو فراموش کر دیا اور محض صالحین کی قبروں پر تقرب الی اللہ اور برکت و سعادت کے لئے میلے لگانے لگے۔ اور موت کی عبرت انگیز ویرانی و خموشی کو راگ رنگ، شور و شر اور فسق و فجور میں بدل دیا۔ واحسرتا! زیادہ سے زیادہ مذکورہ فعلِ رسولؐ سے یہ نظریہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے کسی عزیز و قریب یا دوست کی قبر پر بطور محبت جانا جائز ہے تو اس میں بھی کچھ اعتراض نہیں لیکن

یہ محض رسمی چیز نہ بن جانی چاہیئے - نہ اسے اجتماعی شکلیں دینا درست ہے !

راگ رنگ قوالی

"سماع" کے نام سے جو خرافات و منہیات رواج پا گئی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں - قرآن و حدیث اور تعامل صحابہ رضوان اللہ علیہم اور قیاس صحیحہ سے تو ان کے جواز پر کوئی دلیل ملتی ہی نہیں - بس بعض بعد کے صلحا کے عمل کو بنیاد بنا کر لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا اور اس میں اتنے بڑھ گئے کہ صریح محرمات و منکرات کا ارتکاب کیا جانے لگا - اوّل تو پچھلے بعض بزرگوں نے جو "سماع" اختیار کیا یہ اُن کا ذاتی فعل تھا جو ہرگز حجت نہیں ہو سکتا - پھر انہوں نے بہت سخت شرائط اس کے لئے رکھیں، جن کی تفصیل اُن کے قول و عمل میں ملتی ہے - آج یہ شرائط قطعاً نظر انداز کر دی گئیں - اور محض لغویت و مزخرفات اختیار کر لی گئیں - ہم نہیں جانتے کہ وہ کون صحیح العقل مسلمان ہو سکتا ہے جو خلوص کے ساتھ قرآن و سنّت کا مطالعہ کرے اور پھر آج کل کے عرسوں، قوالیوں اور ناچ گانوں کی، اہمیت و تقدس کا وہم بھی کر سکے !

بدعت کی کسوٹی

میرا ارادہ تھا کہ مروجہ بدعات میں جو زیادہ مشہور و مقبول ہیں ان میں سے ایک ایک پر مفصل گفتگو کروں گا - لیکن ایک تو یہ کہ فاضل مدیر فاران کے اصرار کے باوجود میں عدیم الفرصتی کے باعث مناسب وقت پر مضمون شروع نہ کر سکا - اور آغاز اُس وقت کیا جب اُن کا یہ خط آیا کہ مضمون فوراً بھیجو - دوسرے میرا قلم اس چیز نے روکا کہ یہ صرف مضمون ہے کتاب نہیں - فاران میں آخر اوروں کے بھی تو مضامین آنے ہیں - اگر میں نے الگ الگ بدعتوں کو لیا تو پوری کتاب بن جائیگی - صرف قبروں ہی کے معاملہ پر آپ دیکھئے کتنے صفحے صرف ہو گئے - حالانکہ اس میں میں نے سب گوشے اور بسیط مطالب بیان نہیں کئے - پھر بدعتیں اتنی کثیر ہیں کہ سب کو ایک ہی مضمون میں جمع کرنا اور ہر ایک کی خرابی الگ الگ بیان کرنا دفتر چاہتا ہے - لہٰذا جدا جدا بیان کرنے کے عوض میں مناسب سمجھتا ہوں کہ قرآن و سنّت کی روشنی میں ایسی کسوٹی آپ کے سامنے رکھ دوں جس پر آپ کسی بھی قول و فعل کو پرکھ کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ بدعت ہے یا امر جائز - مردود ہے یا مقبول - وما اللہ التوفیق !

لغت میں لفظ "بدعت" کے معنی ہر اُس کام کے ہیں جو نیا نیا کیا گیا ہو - اور اس سے پہلے اس پر عمل نہ ہوا ہو - لیکن شریعت میں یہ لغوی مفہوم مراد نہیں بلکہ مراد صرف وہ نئے کام ہیں جنہیں دین کا جزو بنایا جا رہا ہو - یہ اتنی سیدھی اور صاف بات ہے کہ معاند یا احمق کے سوا کوئی اس سے اعراض نہیں کر سکتا -

آدمی جو بھی کام کرتا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ مقصد اور منشاء ضرور ہوتا ہے - اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ مقصد دُنیا کی کوئی منفعت و مصلحت ہے یا آخرت کی - اگر دُنیا کی ہے تو شریعت کو اس سے کوئی دشمنی نہیں - بس وہ تو اتنا کہتی ہے کہ حلال و حرام کی جو حدیں اللہ و رسُول نے متعین فرما دی ہیں وہ نہ توڑیں اور آپ ان حدوں میں رہتے ہوئے جس طرح چاہیں افادِ دُنیاوی اور راحت و عزت حاصل کریں - مثلاً آپ نے ریل کا سفر کیا - ظاہر ہے کہ رسُول اللہ کے دور میں ریل نہیں تھی - لہٰذا ازروئے لغت ریل کا سفر بدعت ہوا - مگر اس کا مقصد خالص دُنیاوی ہوتا ہے اور قرآن و سنّت کے کسی لفظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اہلِ کفر کی ایجادات سے دُنیاوی فائدہ نہ اُٹھاؤ - بلکہ اس کے برعکس اہلِ کفر کی مصنوعات کا استعمال خود فعلِ رسُول سے ثابت ہے - لہٰذا شریعت کے نزدیک یہ بدعت نہ ہوگی - اسی طرح دیگر امور ہیں جو کسی حکم شرعی کے خلاف نہ ہوں اور باعتبار عہدِ مبارک کے لغتاً بدعت ہوں - ان پر شریعت کو کچھ اعتراض نہیں - ہاں اگر اُن سے کوئی حکم شرعی ٹوٹتا ہو تو بے شک شریعت اُن پر معترض ہوتی ہے - مثلاً بینک کا کاروبار ہے - آنحضُور کے دور میں یہ کاروبار اپنی موجودہ شکل میں نہیں تھا - اور آج یہ دُنیاوی منفعت کے لئے رائج کر لیا گیا ہے - لیکن شریعت نے سود کے لئے جو احکام بیان کئے یہ کاروبار چونکہ اُن کو جھٹلاتا ہے -

اس لئے شریعت کے خلاف ٹھہرا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کام کا مقصد دُنیاوی نہ ہو بلکہ اُخروی ہو۔ اس کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ اس کا حکم قرآن و سنت میں موجود ہے یا نہیں اور صحابہؓ و ائمہ نے اسے قرآن و سنت کے کسی لفظ یا جملہ سے اخذ کیا ہے یا نہیں۔ اگر دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت موجود ہے۔ تو اس کام کے شرعی ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اور اگر کوئی صورت موجود نہیں ہے تو دیکھا جائے گا کہ جس مقصد اور سبب کی خاطر یہ کام کیا جا رہا ہے وہ مقصد اور سبب رسُول اللہ کے دَور میں بھی موجود تھا یا نہیں۔ نیز اگر موجود تھا تو رسُول اللہ اور اُن کے اصحاب کے لئے عملاً اس کام کو کر لینے میں کوئی رکاوٹ حائل تھی یا نہیں۔ اگر وہ مقصد و سبب اُس دَور میں بھی موجود تھا اور اس کے حصول کے لئے آج جو کام کیا جا رہا ہے، اس زمانہ میں بھی کر لینا ممکن تھا تو یقیناً کہا جائے گا کہ یہ کام بدعت شرعی میں داخل ہے۔ مثال کے طور پر بعض بدعت پسندوں کے اس طرزِ عمل کو لیجئے کہ وہ کسی ایک یا چند نمازوں کے بعد سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص وغیرہ پڑھنے کو نہ صرف اچھا سمجھتے ہیں بلکہ اس کی پابندی کرتے ہیں اور جو اُن کی تقلید نہ کرے اُسے وہابی وغیرہ کہتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اُن کا یہ عمل دُنیاوی مقاصد کے لئے ہے یا دینی مقاصد کے لئے۔ ظاہر ہے کہ دُنیاوی فائدہ تو اس میں ذرّہ برابر نہیں۔ یہ لوگ ثواب اور برکت ہی کے مقصد سے یہ فعل کرتے ہیں۔ جو اخروی فائدہ میں داخل ہے اور تقرب الی اللہ کے سوا اس کا کوئی نفع متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ پس یہ مقصد تو دَورِ مبارک میں نہ صرف موجود تھا۔ بلکہ اسی مقصد اور سبب کیلئے آنحضورؐ مبعوث ہوئے تھے اور یہی دین کا مقصد و حاصل ہے۔ علاوہ ازیں کوئی مانع بھی ایسا موجود نہ تھا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حضورؐ اور آپ کے اصحاب بعد نماز فاتحہ اور سورۂ اخلاص کی پابندی نہ کر سکتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی قول و فعل سے نہ تو حضورؐ نے اس کی تعلیم دی نہ صحابہ نے اس پر عمل کیا۔ لہٰذا لازماً یہ بدعت ہے اور اس کو افضل و مقدس سمجھنے والا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کے تقرب اور حصولِ ثواب کے جن ذرائع سے میں واقف ہوں اُن کا علم رسُول اللہ کو بھی نہ تھا۔ نعوذ باللہ۔ اندازہ کیجئے رسُول اللہ تو جمعہ کو متعین کر کے روزہ رکھنے کو بھی منع فرماتے ہیں کہ اس طرح لوگوں میں یوم جمعہ کے لئے ایسے فضائل متصور کر لئے جائیں گے جو اس میں نہیں ہیں اور مدعیانِ اسلام نئی نئی عبادتیں گھڑ کے اُن پر خود جمتے اور لوگوں کو جماتے ہیں۔ حالانکہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص وغیرہ کی جو تعریفیں رسُول اللہ سے منقول ہیں اُن کا اقتضا صرف یہ ہے کہ مسلمان وقتاً فوقتاً انھیں پڑھتا رہے اور دُوسروں کو بتلائے کہ ان سورتوں کو پڑھا کریں مگر کسی وقت کے ساتھ انھیں خاص اور پابند کر دینا ایجاد و بدعت شمار ہوگا۔ کیونکہ جن مواقع پر ان کی پابندی اور دوام منقول نہیں اُن مواقع پر پابندی کرانا گویا آزادی اور رخصت کا وہ حق سلب کرنا ہے جو اللہ و رسُولؐ نے مومنین کو دیا ہے۔ اس حق کو سلب کرنے کا کسی کو کیا حق ہے!

دوسری مثال مولود کی ہے جو یوم پیدائش پر سال بہ سال نہایت اہتمام اور پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ مثال اس لحاظ سے بڑی نازک ہے کہ جب اس کے بدعت ہونے پر کلام کیا جائے تو بدعت پسند حضرات عوام کو جذباتی باتوں میں پھنسا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو صاحب یہ ذکرِ رسُولؐ کو بھی منع کرنے لگے۔ حالانکہ ذکرِ رسُولؐ سے تو منع کافر ہی کر سکتا ہے۔ ذکرِ رسُولؐ اپنی جگہ مسلّم۔ لیکن یہ یوم پیدائش پابندی سے منانے کا طریقہ اور منکرات و مکروہات سے آلودہ نمائشی محفلیں منعقد کرنے کا رواج کسی طرح شریعت کی میزان میں پُورا نہیں اُترتا۔ بزرگوں کا یوم ولادت منانا اگر برکت اور ثواب کا کام ہوتا تو ضرور آنحضور انبیائے سابق کا یوم پیدائش منایا کرتے۔ خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تو ضرور مناتے!

حدیث ہے:۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم المدینۃ فوجد الیہود صیاماً یوم عاشوراء فقال لہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما ہذا الیوم الذی تصومونہ فقالوا ہذا یوم عظیم انجی اللہ موسیٰ وقومہ وغرق فرعون وقومہ فصامہ موسیٰ شکراً فنحن نصومہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنحن احق بموسیٰ منکم فصامہ وامر الناس بصیامہ۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی یوم عاشورہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ پس آپ نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اُن لوگوں نے بتایا کہ یہ عظمت والا دن ہے اس میں اللہ نے موسیٰ کو اور اس کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون کو غرق کیا تھا۔ پس موسیٰ نے بطور شکر کے روزہ رکھا تھا۔ پس ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ تو کہا رسول اللہ نے ہم موسیٰ کے معاملہ میں تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ پس آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور لوگوں کو رکھنے کا حکم دیا۔

اس کے ساتھ دوسری حدیث دیکھئے:-

عن ابی موسیٰ قال کان یوم عاشوراء یوماً یعظمہ الیہود وتتخذہ عیداً فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صوموہ انتم!

ابو موسیٰ سے مروی ہے کہ یہودیوں کے نزدیک یوم عاشورہ ایک معظم دن تھا اور وہ اس دن عید منایا کرتے تھے۔ پس رسول اللہ نے کہا (مسلمانوں سے) کہ تم روزہ رکھو!

ان حدیثوں کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ دیکھئے روزہ بطور شکر ایک دینی فعل تھا۔ لہٰذا آنحضورؐ نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن بطور شکر سال بہ سال عید منانا قبول نہیں کیا۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس طریقہ میں کوئی بھلائی نہیں۔ حالانکہ حضرت موسیٰ کا یوم نجات اور غرقابی فرعون بداہتہً خوشی منانے کے لئے بہت کافی وجہ ہے۔ کم سے کم نفس ولادت سے تو اس کا مرتبہ زیادہ ہے اس کے برخلاف حضرت موسیٰ کا فرعون جیسے جبار وقہار پر فتح پانا اور فرعون کا غرق ہو جانا صراحتہً خاص اور اہم واقعہ ہے جس پر خوشی منائی جانی عقلاً نامناسب نہیں۔ مگر جس چیز کے بارے میں رسولِ خدا کو معلوم ہو کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں وجہ قربت نہیں بن سکتی اور عوام کے لئے اس میں فتنہ کے جراثیم پوشیدہ ہیں۔ اسے آپؐ کیسے اختیار کر سکتے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ میں نے اختیار کیا تو یہ اُمّت کے لئے سنّت بن جائے گا۔ اور دین کے اعتبار سے بے نتیجہ بلکہ فتنہ پرور باتوں کو سنّت بنانا ایک سچے نبی کے لئے ممکن نہیں ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ تو چونکہ خود ہر نبی سے بلند مرتبہ تھے۔ اس لئے آپؐ نے کسی نبی کا یوم ولادت نہیں منایا۔ چلئے مان لیا۔ لیکن کیا صحابہؓ بھی انبیاء سے افضل تھے؟ کیا حضورؐ کے نزدیک اگر یوم پیدائش منانا برکت وسعادت کا ذریعہ ہوتا تو آپؐ صحابہ کو اس کا حکم نہ دے سکتے تھے؟ پھر آنحضورؐ کے بعد خود صحابہ کو بھی اتنی دینی فہم نہ ہوئی کہ آنحضورؐ کا یوم ولادت منا لیا کریں!

ایک یہ گوشہ نکالا جاتا ہے کہ ہم تو میلاد بطور وسیلۂ خیر کرتے ہیں، تا کہ لوگ دین کی طرف مائل ہوں، اس خیال ونیت کا ثبوت اگر عمل سے ملتا تو خیر بات وزنی تھی۔ مگر حال تو یہ ہے کہ میلاد کی محفلوں میں آیت قرآنی إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ کی بھی دل کھول کر نافرمانی کی جاتی ہے۔ کتابیں بھی غیر مستند پڑھی جاتی ہیں۔ قیام بھی کیا جاتا ہے، جو خلاف شرع اعتقاد کا نتیجہ ہے۔

اور دن، تاریخ کی ایسی پابندی کی جاتی ہے کہ روزہ، نماز قضا ہو مگر یہ قضا نہ ہو۔ حالانکہ رسول اللہ اگر اس خاص مہینہ میں پیدا ہوئے تو وصال بھی آپؐ کا اسی مہینہ میں ہوا ہے، تو یہ مہینہ مسرت کے ساتھ شدید ترین عبرت کے اسباب بھی اپنے اندر رکھتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے ہالک اور فانی ہے!

بہرحال یہ ثابت ہو گیا کہ یوم ولادت منانے کا مقصد جو کچھ سمجھا جاتا ہے وہ آنحضورؐ اور صحابہ اور تابعین سب کے دور میں موجود رہا ہے اور کوئی رکاوٹ بھی ایسی نہیں رہی کہ یہ حضرات اس عمل کو نہ کر سکتے۔ جب انہوں نے نہیں کیا تو ثابت ہوا کہ یہ فعل بدعت ہے!

ہاں کسی بڑے شاعر یا ادیب یا لیڈر کا یوم پیدائش منانا چونکہ خالص دنیاوی معاملہ ہے اور تقرب الی اللہ اور ثواب و برکت سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے شریعت کی اصطلاح میں اسے بدعت نہیں کہیں گے۔ البتہ جو اسراف اور تضیع اوقات اور ممنوع افعال اس میں کئے جائیں انہیں شریعت ممنوع قرار دے گی!

دوسری صورت لیجئے کہ سبب تو موجود تھا، مگر عمل میں رکاوٹ تھی۔ اس کی مثال قرآن اور دینی کتابوں کو چھاپنا ہے ظاہر ہے کہ قرآن کی اشاعت و نشر کا مقصد دورِ مبارکؐ میں بھی موجود تھا اور آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح علوم دینیہ کو پھیلانے کا مقصد جب بھی تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن اس زمانے میں پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، لہٰذا چھپائی نہیں ہو سکی اب پریس ہے لہٰذا چھپائی ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم قرآن کو محض تجارتی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ برکت و ثواب اور نشر و اشاعت کی خاطر چھاپیں تب بھی باوجود دینی ہونے کے یہ فعل بدعتِ شرعی شمار نہ ہو گا۔ کیونکہ اگرچہ یہ عمل دورِ مبارکؐ میں نہ ہوا اور مقصدِ عمل اُس وقت بھی موجود تھا۔ لیکن اس عمل پر اُس وقت قدرت ہی نہ تھی۔ اور چھپائی کا عمل بجائے خود کسی حکم شرعی کے خلاف نہیں ہے۔ یہ معاملہ ثواب کی خاطر کتابیں چھاپنے اور پوسٹر وغیرہ شائع کرنے کا ہے!

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک نیا کام ہم نے جس مقصد کے لئے شروع کیا ہے، وہ اگرچہ آخرت سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ جس سبب کے لئے کیا جا رہا ہے وہ سبب ہی دورِ مبارک میں موجود نہ تھا۔ مثلاً آنحضورؐ کے بعد صحابہ کا قرآن جمع کرنا اور صحابہؓ و تابعین کا حدیث کی کتابیں ترتیب دینا۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں سے حفاظتِ دین اور تحفظِ مذہب مقصود ہے۔ یہ مقصود اپنی جگہ بلاشبہ حق اور دینی ہے۔ لیکن قرآن و حدیث کے جمع و تدوین کے اسباب آنحضورؐ کی زندگی میں موجود نہیں تھے۔ آپؐ کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ جمع و تدوین ضروری معلوم ہوئی۔ لہٰذا یہ وہ شرعی بدعت نہیں ہے جسے حدیث میں "ضلالت" کہا گیا ہے!

ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو سبب دورِ مبارک میں نہیں تھا بلکہ بعد میں پیدا ہوا وہ سبب بجائے خود مسلمانوں ہی کی کسی غلطی کا نتیجہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ مثلاً خطبۂ عید بعد نمازِ عید مشروع ہے۔ اب بعد میں اگر مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا کہ نماز ختم ہوتے ہی بھاگنے لگتے ہیں اور خطبہ نہیں سُنتے تو یہ سبب اس بات کے لئے کافی نہیں سمجھا جائیگا کہ خطبہ نماز سے پہلے دے دیا جائے۔ کیونکہ یہ سبب قدرتی نہیں بلکہ مسلمانوں کی بے حسی اور بدعملی سے پیدا ہوا ہے—!

بدعت کو پہچاننے کی یہ کسوٹی اگرچہ اس وقت ہمارے الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے آئی ہے، لیکن فی الحقیقت

یہ ہماری ایجاد کردہ نہیں بلکہ قرآن و سنت کے بخشے ہوئے دین نے اسے بنایا ہے۔ آخر آپ بھی تو یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اللہ کے معاملہ میں رسول اللہ کا علم ہم لوگوں سے ہزاروں گنا زیادہ اور یقینی تھا۔ وہ آخری نبی تھے جسے وسیلے کے سامنے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرکے تمام ممکنہ ذرائع کھول کر رکھ دیئے تھے۔ اور وہ اس نے رکھ دیئے۔ ہماری عقلوں کو اتنی دسترس کہاں کہ ہم اللہ کی رضا یا ناراضی کے بارے میں رسول اللہ کی تعلیم سے قطع نظر کرکے کوئی یقینی فیصلہ کرسکیں ——— ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے۔ ہم تو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ فجر کی نماز صرف دو رکعت اور مغرب کی تین کیوں ہے۔ باقی وقتوں میں چار رکعت کس لئے ہیں۔ عشاء کے بعد کس غرض سے وتر رکھے گئے ہیں۔ زکوٰۃ کی شرح ڈھائی فیصد کیوں ہے دو یا تین فیصد کیوں نہیں۔ ہمارا کام صرف اس قدر ہے کہ قرآن اور رسول اللہ نے جو حکم فرمایا اُسے پورا کریں۔ ایک غلام کو یہ زیب نہیں دیتا کہ آقا کے احکام میں حذف و اضافہ کرے۔ بدعت کو صریح طور پر بالتکرار منع کیا گیا۔ اور ہم ہیں کہ اس منع کرنے والے کی صداقت و رسالت پر ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اپنی طرف سے نئے اعمال نکالتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ ان سے رسول اللہ خوش ہوں گے۔ اللہ کی رضا ملے گی۔ برکت حاصل ہو گی۔ جب رسول اللہ کے رسول اور خدا شناس ہونے پر ہم ایمان لے آئے تو خود بخود یہ بات لازم آ جاتی ہے کہ خدا کا قرب اور ثواب و برکت حاصل کرنے کے لئے جو اعمال ہو سکتے تھے وہ حضورؐ نے قول و عمل سے واضح فرما دیئے اور جن اعمال کو اختیار نہیں فرمایا۔ حالانکہ اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ وہ یقیناً مفیدِ ثواب و برکت نہ ہوں گے !

خیال آتا ہے کہ بدعت پسند حضرات حضرت عمر فاروقؓ کے ایک جملہ کو اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ جملہ نماز تراویح کی باقاعدہ جماعت کے بارے میں ہے۔ الفاظ یہ ہیں "نعمت البدعتہ ھٰذہٖ ! (کیسی اچھی ہے یہ بدعت) یہ الفاظ آپ نے ان لوگوں کے جواب میں فرمائے تھے جنہوں نے کہا تھا کہ یہ جو آپ نے پورے رمضان میں پابندی سے تراویح باجماعت کا سلسلہ مسجد میں شروع کرا دیا ہے، یہ تو بدعت معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکل حضورؐ کی زندگی میں نہیں تھی ——— !

اس جملے سے یہ دلیل پکڑی جاتی ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ سیئہ اور حسنہ۔ حدیثوں کا مورد بدعاتِ سیئہ ہیں اور بدعاتِ حسنہ پسندیدہ و محبوب ہیں۔ جیسا کہ خود حضرت عمرؓ کے قول سے معلوم ہوا۔ بظاہر بات بڑی ظاہر فریب ہے لیکن جب تجزیہ کیجئے تو تلبیس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حدیث کی ایک ایک کتاب اٹھا کر دیکھئے۔ کسی جگہ آپ کو نہیں ملیگا کہ شریعت نے بدعت کی دو قسمیں کی ہوں۔ جتنی بھی حدیثیں آپ نے بدعت کے بارے میں ابھی پڑھیں اور جتنی ان کے علاوہ ہیں سب میں "بدعت" بغیر کسی اضافت کے مطلقاً بولا گیا ہے اور مطلق کو مقید یا عام کو خاص کرنے کے لئے جب تک مضبوط قرینہ نہ ہو، کسی کو تقیید یا تخصیص کی اجازت نہیں۔ بدعت کی تقسیم بعد کے لوگوں نے کی ہے اور اس لئے کی ہے کہ بعض امور ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بدعت کا پہلو تو معمولی سا ہوتا ہے اور دینی نفع کا پہلو ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے امور کو بعض لوگوں نے بدعتِ حسنہ کا نام دے لیا۔ مثلاً بعض بزرگوں نے اپنی خاص طبیعت اور مزاج کے تحت یہ محسوس کیا کہ معرفت و تصوف کے اشعار ان پر بہت اثر کرتے ہیں، لہذا انہوں نے خوش آواز لوگوں سے انھیں سننا شروع کیا۔ اور اگرچہ وہ جانتے تھے کہ یہ "سماع" بدعت ہے۔ لیکن اس سے اُن کی رغبت الی اللہ زیادہ بڑھی اور تزکیۂ نفس کے لئے اسے اپنے حق میں زیادہ مؤثر پایا۔ لہذا "بدعتِ حسنہ" قرار دے لیا۔ ہو سکتا ہے خاص ان کے حق میں

یہ بدعت باوجود ممنوع ہونے کے عتابِ الٰہی کا سبب نہ بنے۔ کیونکہ انہوں نے پورے اخلاص سے اسے اختیار کیا تھا۔ اور کسی طرح کی خرافات کو اس میں داخل نہیں کیا تھا۔ نہ نفسانی لذت حاصل کرنا ان کے پیشِ نظر تھا۔ نیز اُن کی زندگی چونکہ اعمالِ خیر اور عبادت و زہد سے لبریز تھی اس لئے ہو سکتا ہے کہ بفحوائے قرآن اُن کی نیکیاں اس بدعت کو اللہ کی بارگاہ میں قابلِ نظر اندازی بنا دیں۔ لیکن ہمہ شما کو یہ ہرگز جائز نہیں کہ اُن کی تقلید کرے اور سماع کی بدعت کو — جو ہر حال میں بدعت ہے — فعلِ حسنہ تصور کرلے۔

بہرحال بدعتِ حسنہ شرعی اصطلاح میں کوئی چیز نہیں ہے اور حضرت عمرؓ نے جو بدعت کا لفظ فرمایا وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کام کو پوری طرح مفید اور نفع بخش اور بہتر جان کر اختیار کر رہے ہوں اور اس پر کچھ لوگ آپ سے کہیں کہ یہ کام مفید نہیں ہے بلکہ نقصان دہ ہے۔ تب آپ ان لوگوں کو جواب دیں کہ اچھا نقصان دہ ہی سہی مگر اس کا نقصان بڑا مفید ہے۔!
ظاہر ہے یہ متضاد قسم کا جملہ آپ نے اپنے اُس لیقین کی بنا پر کہا ہے جو آپ کو اس کام کے مفید و بہتر ہونے پر ہے!

اس دلیل کو اگر کوئی نہ مانے تو دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ لفظ "بدعت" شرعی معنی میں نہیں لغوی معنی میں استعمال کیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک ہی لفظ ہم بعض دفعہ لغوی معنی میں بولتے ہیں اور بعض دفعہ اصطلاحی معنی میں۔ موقع محل خود بتا دیتا ہے کہ لفظ کس معنی میں بولا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں آپ کو خوب معلوم ہے کہ رسولؐ اللہ کے حد درجہ کے تابع فرمان اُن کی سنت کے شیدا۔ اُن کی ادا ادا کے متوالے، اُن کے دین پر ثابت قدم نہایت عظیم صحابی تھے۔ جن کی تعریف میں نہ صرف یہ کہ رسولؐ اللہ کی زبانِ صداقت نظام نے بہت کچھ کہا ہے بلکہ متعدد بار وحی بھی اُن کی رائے کے موافق نازل ہوئی ہے۔ اُن کی زبان سے اگر کبھی کوئی ایسا جملہ نکلے جس کے دو معنی ہو سکیں تو عقل اور انصاف کا تقاضا کیا یہ ہے کہ وہ معنی مراد لئے جائیں جو رسولؐ اللہ کے صریح اقوال کے مخالف محسوس ہوتے ہوں، یا وہ معنی مراد لئے جائیں جن سے مخالفت نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جس کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا اور ایمان ہوگا وہ یہی مفہوم مراد لے گا جو رسولؐ اللہ کے اقوال کی تردید نہ کرتا ہو۔ چنانچہ اس قولِ عمرؓ میں لفظ "بدعت" اگر شرعی معنی میں لیا جائے تو اقوالِ رسولؐ کی تکذیب مترشح ہوگی۔ کیونکہ رسولؐ اللہ نے تو بدعت کو "مطلقاً" بالکلیہ مردود ٹھہرایا اور حضرت عمرؓ گویا یوں کہہ رہے ہیں کہ نہیں تمام بدعتیں مردود نہیں ہیں بلکہ بعض بدعتیں محمود و مقبول بھی ہیں!

کیا حضرت عمرؓ جیسے جلیل صحابی کی طرف ایسے معانی کا گمان منسوب کرنا اہلِ علم و عقل گوارا کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتے۔ تب قرینہ خود بخود پیدا ہو گیا کہ بدعت کو لغوی معنی میں لو۔ یعنی اپنی مجموعی شکل و ہیئت کے اعتبار سے تو بے شک جماعتِ تراویح کی باقاعدگی اور پابندی اور اس سے متعلق روشنی وغیرہ کا اہتمام ایک ایسا کام تھا جو نیا تھا لیکن شرعی اعتبار سے یہ نیا نہ تھا۔ بلکہ شریعت ہی کا اقتضا اور منشا تھا اور شریعت ہی اس کے لئے دلیل و شہادت مہیا کر رہی تھی!

اصحابِ سنن کے ہاں یہ روایت ملتی ہے کہ تراویح کا باجماعت پڑھنا، تنہا پڑھنے سے افضل ہے۔ یہ بھی روایت ملتی ہے کہ آنحضورؐ نے شروعِ رمضان میں دو یا تین راتوں کو تراویح جماعت سے پڑھی تھی۔ اور رمضان کے آخری حصہ میں بھی متعدد بار پڑھی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ جب آدمی امام کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے اور آخر تک ٹھہرا رہتا ہے تو اسے ساری رات کے قیام کا ثواب ملتا ہے۔ پورے مہینہ باجماعت تراویح نہ پڑھنے کا سبب بھی خود حضورؐ ہی نے بیان فرما دیا کہ — میں اس خیال سے نماز کے لئے برآمد نہیں ہوا کہ کہیں وہ تم پر فرض نہ ہو جائے! گویا تشریف نہ لانا اور باجماعت پابندی سے نہ پڑھنا اس لئے نہیں تھا کہ اس میں کوئی قباحت تھی۔ بلکہ اس لئے تھا کہ کہیں میرے دوام و استقلال سے لوگ اسے فرض و واجب کا درجہ

دے بیٹھیں!

اب اندازہ فرمائیے کہ حضرت عمرؓ نے اگر رسول اللہ کے وصال کے بعد تراویح با جماعت کو مہینہ بھر پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا تو شرعاً یہ کیونکر بدعت ہو سکتا ہے۔ اس میں کسی بھی حیثیت سے شرعی مفہوم میں نیا پن نہیں ہے۔ ہاں لغتاً یہ نیا ہے! اس کے علاوہ خود رسول اللہ نے فرمایا "علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین" اس لئے خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کا کوئی طریقہ کوئی اجتہاد، کوئی عمل بدعتِ شرعی ہو ہی نہیں سکتا کہ اُن کے طریقہ پر چلنا تو حکمِ رسول کا اتباع و انقیاد ہے۔ ان کی جو رائے دیگر اصحاب نے درست مان لی وہ تمام اُمت پر لازم ہوئی اور جس سے کسی ایک یا چند اصحابؓ نے اختلاف کیا۔ اس میں اگرچہ ہمیں اُن کی رائے ترک کر کے دوسرے صحابی کی رائے مان لینے کا اختیار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی رائے باطل یا بدعت پر محمول تھی! ورضی اللہ عنہ۔

اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ کا یہ جملہ اہلِ بدعت کے لئے واقعتاً بھی کوئی حجت اپنے اندر رکھتا ہے تو کیا وہ حضرت عمرؓ کے دیگر اقوال و افعال کو بھی حجت مانیں گے؟ اگر مان لیں تو ہمارا اور اُن کا اختلاف ہی ختم ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ ہی تو وہ ہیں جنہوں نے شجرۃ الرضوان کو کٹوایا اور کسی بھی چور دروازہ سے چھپتے ہی بدعت کو داخلہ کی اجازت نہیں دی۔ لیکن یہ حضرات دیگر اقوالِ عمرؓ اور اسوۂ فاروقی کو لائقِ حجت نہیں سمجھتے۔ تب انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اُن کے ایک بے ساختہ اور متبادر جملہ کو بطور سند لائیں!

پھر ہم کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو تو بیشک یہ حق تھا کہ رسول اللہ کے کسی حکمِ عام میں کسی خاص دلیل سے کوئی استثنا نکال لیں۔ اُن کی دین شناسی، اصابتِ رائے اور تفقہ پر محض اُن کا اسوہ ہی نہیں بلکہ سب سے مضبوط شہادت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ علاوہ ازیں اُن کی "بدعت" کو تمام صحابہ کا بخوشی قبول کر لینا بھی اس بات کی شافی دلیل ہے کہ یہ بدعت شرعی بدعت تھی ہی نہیں۔ آخر صحابہ کے کردار اور کمالِ ایمان سے کون واقف نہیں۔ وہ دین کے معاملہ میں کیا حضرت عمرؓ سے دب کر خلافِ حق کوئی فیصلہ قبول کر سکتے تھے۔ ایسا کوئی بے سواد ہی سوچ سکتا ہے۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ صحابہ کے لئے جان دے دینا آسان تھا مگر خلافِ شریعت فیصلہ کو بخوشی قبول کر لینا ممکن نہ تھا!

بتائیے صحابہ کے بعد ایسا کون ہے جسے یہ اختیار دیا جا سکتا ہو کہ رسول اللہ کے کسی حکمِ عام میں بغیر دلیل شرعی کے اپنی رائے سے تخصیص کرے یا مستثنیات نکالے۔ کون ہے جس کی بصیرت، تفقہ، بالغ نظری، دینداری، تقویٰ، اصابتِ رائے اور حُبِ رسول پر خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہرِ تصدیق ثبت ہو۔ کوئی نہیں۔ ہرگز کوئی نہیں۔ لیس علیہم بسلطان پھر کیسے بلا سند کے نئے طریقوں کو جزوِ دین سمجھا جائے۔ کہ کوئی صالح و عابد اُمتی خدا کے آخری رسول سے زیادہ دین کا علم اور مرضیاتِ الٰہی کا وجدان و ادراک رکھ سکتا ہے!

اجتہاد و بدعت

دین میں نئی باتیں نکالنے سے ممانعت کی دلیلوں کا کوئی توڑ نہ پا کر بعض حضرات اپنی بعض بدعات کے لئے روایات تلاش کر کے لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان روایات سے ہم نے فلاں کام نکالا اور اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسے فقہی جزئیات کی۔ گویا اجتہادی مسائل جس طرح بدعت نہیں جزوِ دین ہیں اسی طرح ہمارا استنباط بھی بدعت نہیں جزوِ دین ہے!

بات قدرے جی لگتی ہے۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ کیا ان کے نزدیک اجتہاد کی تعریف یہ ہے کہ

ہر عام وخاص احادیث وآیات سے اپنے علم وعقل کے مطابق مفہوم اور مطالب نکال لیا کرے۔ خواہ اس کے نکالے ہوئے مطالب ماہرینِ علم وفن کے فیصلوں کے خلاف پڑتے ہوں یا دین کے متفقہ احکام سے ٹکراتے ہوں۔ اگر اسی کا نام انہوں نے اجتہاد سمجھا ہے تو انھیں اپنی عقل کا علاج کرنا چاہیئے۔ اجتہاد کچھ مذاق نہیں ہے۔ ساری دنیا مانتی ہے کہ کسی بھی علم وفن کے اصولوں سے فروعات کا نکالنا اور ایک جزئی کو دوسری جزئی پر قیاس کرنا انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو اس علم وفن پر پورا عبور اور دسترس رکھتے ہوں۔ اور یہی عقل وانصاف کا نہ صرف تقاضا ہے بلکہ اس کے ماننے پر انسان مجبور بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہر علم وفن فاسد د باطل ہو جائے گا ــــ تب دین وشریعت جیسے اہم بالشان علم کے باب میں یہ کون سمجھدار کہہ سکتا ہے کہ اس میں اجتہاد وقیاس کے لئے شرائط وقیود نہیں ہیں۔ شرائط ہیں اور ضرور ہیں۔ چنانچہ اہلِ علم نے جانچ تول کر صرف انہی حضرات کو مجتہد مانا جن میں شرائطِ اجتہاد پائی جاتی تھیں اور یہی مجتہدین تھے جنہوں نے زندگیاں کھپا کر قرآن وسنّت کے اصول وکلیات سے فروعات کا استنباط کر کے اسلام کا عظیم الشان قانون ودستور مدوّن کیا۔ ان کے بعد اگرچہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا اور ہونا بھی نہیں چاہیے جبکہ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کی لازماً ضرورت باقی رہتی ہے۔ لیکن انہی لوگوں کو اس کا حق دیا جا سکتا ہے جو اپنے کارناموں اور قول وفعل سے یہ ثابت کر دیں کہ اُن میں شرائطِ اجتہاد پائی جاتی ہیں۔

جب یہ طے ہو گیا تو سمجھنا چاہیئے کہ کسی شخص کا خواہ مخواہ یہ دعویٰ کرنا معتبر نہیں ہے کہ اس نے اجتہاد کے ذریعہ کوئی نیا نظریہ یا اصول یا عمل قرآن وسنّت سے نکالا ہے۔ جب تک وہ اپنا شرائطِ اجتہاد سے متصف ہونا عملاً ثابت نہ کر دے وہ جس چیز کو وہ اجتہاد کہہ رہا ہے اُسے تک بندی اور ہوائی قلعہ اور ثمرۂ ہوائے نفس کہا جائے گا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قبر پرستی اور راگ رنگ اور عرس وقوالی اور فاتحہ خوانی اور نذر لغیر اللہ اور اسی طرح کے امورِ رائجہ پر اجتہاد وقیاس کا دعویٰ کرنے والے شرائطِ اجتہاد سے تو کیا اُن شرائط سے بھی پوری طرح متصف نہیں ہیں جو ایک اچھے مسلمان کے لئے قرآن وسنّت نے بیان کئے ہیں۔ یا بعض اگر اُن میں عملاً اچھے مسلمان ہیں بھی تو علم وفن میں اپنی مہارت ودسترس کا کوئی ثبوت انہوں نے دُنیا کے آگے پیش نہیں کیا۔ ایسی صورت میں اُن کے ایسے اجتہادات کیونکر قبول کر لئے جائیں۔ جو نہ تو قرآن وسنّت کی میزان میں پورے اُترتے ہیں نہ مجتہدینِ سلف نے اُن کی تائید کی ہے۔ نہ عقلِ سلیم انھیں مانتی ہے!

یہ تو ایک خرابی ہوئی۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ یا تو بالکل بوگس روایتیں لاتے ہیں جو حدیث کی معتبر کتابوں میں نہیں ہیں۔ یا معتبر کتاب میں ہیں بھی تو ماہرینِ فنِ روایت نے ان کی کمزوری اور خطا واضح کر دی ہے۔ یا پھر صحیح روایت سے ایسے مطالب ومعانی پیدا کرتے ہیں کہ جو قطعاً من گھڑت ہوتے ہیں اور دوسری صحیح روایتیں اُن کے خلاف ہوتی ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

ایک کتاب میں ہم نے دیکھا کہ جوازِ قبر پرستی کے سلسلہ میں روایت بیان کی گئی کہ:-

"بعض علماء نے کہا ہے کہ جو کوئی رسولُ اللہ کے مزار پر یہ آیت پڑھے اِنَّ اللّٰہ وملائکتہٗ یصلّون علی النبیّ" اور پھر ۷۰ مرتبہ "صلی اللّٰہ علیک یا محمّد" کہے تو ایک فرشتہ پکار کر اس سے کہتا ہے کہ اے شخص تجھ پر خدا کا درود ہو۔ اس کے بعد اس شخص کی جو مراد ہو گی پوری ہو گی۔"

یہ روایت ہی اوّل تو ناقابلِ اعتبار ہے، باعتبارِ سند بھی اور باعتبارِ عقل وقیاس بھی۔ سند کا تو یہ حال ہے کہ اس کے راوی ایک شخص ابن ابی فدیک ہیں۔ جو تابعی تک نہیں۔ اور انہوں نے جس سے روایت لی ہے وہ مجہول الحال شخص ہے۔ اور عقلاً یوں کہ

اول تو خیر القرون کے علماء سے اس طرح کی کوئی بات منقول نہیں ہے۔ دوسرے یہ روایات اُس حدیث صحیح کے بالکل خلاف ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اُس پر اللہ دس دفعہ درود بھیجتا ہے۔ اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ ستّر مرتبہ درود بھیجنے والے کے لئے اللہ کی طرف سے سات سو درود ہوں لیکن ابی فدیک کی روایت بتاتی ہے کہ ستّر مرتبہ درود کے بدلے اللہ سے صرف ایک درود ملا!

ایک جگہ یہ روایت دیکھی کہ:-

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب کوئی معاملہ کسی طرح تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اہل قبور سے مدد حاصل کرو۔"

سو فیصدی جھوٹی روایت ہے۔ علماء جس کے کذب پر متفق ہیں۔

ایک یہ روایت دیکھی کہ:-

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص میری قبر کی زیارت کرے گا میں قیامت کے دن اس کا شفیع و شہید ہوں گا۔"

یہ روایت ابن ابی الدنیا کی کتاب القبور میں ملتی ہے جسے ابن ابی فدیک سے نقل کیا گیا ہے۔ ہم ابھی کہہ چکے کہ یہ شخص تابعی تک نہیں اور انہوں نے یہ حدیث حضرت انسؓ کے حوالے سے بیان کی ہے۔ حالانکہ جب تک ابن ابی فدیک اور حضرت انسؓ کے درمیانی سلسلۂ روایت کا پتہ نہ چلے ہرگز روایت معتبر نہیں ہو سکتی۔ کسی مستند کتاب حدیث میں اس روایت کو نہیں لیا گیا اور لوگ ہیں کہ اس سے قبر پرستی کی ترکیب نکال رہے ہیں۔

ایک یہ روایت سنی کہ:-

"فرمایا رسولؐ اللہ نے جس شخص نے میری اور میرے پدر ابراہیم خلیل اللہ کی زیارت ایک ہی سال کے اندر اندر کی۔ میں اس کے دلیے جنّت کا ذمہ دار ہوں۔"

یہ بھی ایجاد بندہ۔ قطعاً بے بنیاد!

یہ ناقابلِ اعتماد روایتوں کی مثالیں ہیں۔ ایک دو معتبر روایات سے قیاس و اجتہاد بھی دیکھئے۔ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ:-

"ام سلیمؓ نے رسولؐ اللہ کی گرسنگی (بھوکا ہونا) کی خبر پا کر دو روٹیاں دوپٹہ کے پلّو میں باندھیں — یہ قصہ لمبا ہے۔ خاتمہ یہ ہے کہ "حضورؐ نے ان روٹیوں کو ملیدے کی طرح تڑوایا اور برتن میں جو کچھ گھی لگا ہوا تھا وہ اس میں ٹپکا دیا۔ پھر حضورؐ نے از قسمِ دعا کچھ الفاظ اس پر پڑھے اور دس دس آدمیوں کو بلا کر کھلانا شروع کیا۔ اسّی آدمیوں نے پیٹ بھر کھایا اور ام سلیمؓ کے گھر بھر نے کھایا اور پھر بھی بچ رہا۔"

اس روایت سے ایک سلیم العقل اور انصاف پسند مسلمان اس کے سوا کیا مطلب اخذ کر سکتا ہے کہ یہ منجملۂ معجزات ہے جو رسولؐ اللہ سے صادر ہوتے رہے ہیں۔ آمنا و صدقنا۔ جو پل بھر میں آسمانوں کی سیر کر آیا۔ اس کے لئے ایسے معجزے اللہ نے بہت سے دیئے۔ مگر بدعت پسند حضرات کو دیکھئے کہ وہ اس سے کھانے پر فاتحہ پڑھنے کا اجتہاد فرماتے ہیں! ویا للعجب!

غور کا مقام ہے کہ آنحضورؐ نے کھانے پر فاتحہ نہیں پڑھی۔ بلکہ دعائیہ الفاظ ادا کئے اور آپ کو امید تھی کہ اللہ تعالیٰ

دعا کو قبول فرما کر کھانے میں معجزانہ برکت عطا کر دے گا۔ یہ اُمید پُوری ہوئی اور کتنے ہی بھوکوں کے پیٹ بھر گئے۔ ہمارے فاتحہ خواں حضرات کھانے پر فاتحہ پڑھتے ہیں نہ کہ کوئی دعا۔ پھر مقصد ایصالِ ثواب ہوتا ہے نہ کہ کھانے میں اضافہ۔ قیاس و اجتہاد کی آخر کوئی تک بھی ہو۔ سوچنے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ مساکین و غرباء کو رسول اللہ بھی کھانا کھلاتے تھے اور اتنا کھلاتے تھے کہ کوئی کیا کھلائے گا۔ صحابہ بھی غرباء پروری میں کم نہ تھے۔ اور سورۂ فاتحہ رسول اللہ اور ان کے اصحاب کو یاد بھی تھی۔ اور اس کے فضائل بھی وہ ہم سے زیادہ جانتے تھے۔ مگر کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے کھانوں پر اسے پڑھا ہو اور اس کا ثواب مُردوں کی روحوں کو پہنچایا ہو۔

ایک اور روایت جوازِ فاتحہ کی سنئے:۔

"مشکوٰۃ میں غزوۂ تبوک کے بارے میں مروی ہے کہ جب لوگ بھوکے ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے رسول اللہ سے دعا کرانی چاہی۔ تب حضورؐ نے دستر خوان بچھوایا اور کہا کہ آجاؤ جس کے پاس جو کچھ ہے لے آؤ۔ اس پر کوئی مٹھی بھر جوار، کوئی مٹھی بھر کھجور، کوئی روٹی کا ٹکڑا۔ غرض جس کے پاس کھانے کی قسم سے جو کچھ تھا لے آیا۔ معمولی سا ذخیرہ جمع ہوا۔ حضورؐ نے اس پر دعا فرمائی اور کہا بھر لو اپنے برتن۔ تمام لشکر نے اپنے برتن بھر لیے اور خوب کھایا اور پھر بھی بچ رہا۔"

اس حدیث کے متن میں دعا بالبرکۃ کے الفاظ ہیں۔ یعنی حضورؐ نے فاتحہ نہیں برکت کی دعا پڑھی۔ اب عقل و قیاس کی کونسی قسم سے یہ فاتحہ کے لئے دلیل بن سکتی ہے۔ فی الحقیقت یہ روایت تو دعا یا کسی بھی سورۃ قرآنیہ کے پڑھنے پر دلیل نہیں کیونکہ یہ فعلِ رسول از قسم احکام و عبادات نہیں بلکہ قبیلِ معجزات میں سے ہے۔ معجزہ انبیاء کی خاص چیز ہے۔ اسی لئے تمام کتبِ معتبرہ اٹھا کر دیکھ لیجئے کسی مشہور صحابی کو آپ نہیں دیکھیں گے کہ اُس نے حضورؐ کے اس فعل کو حجت بنا کر کھانوں پر دعا یا فاتحہ یا کوئی سورۃ قرآنی پڑھنی شروع کر دی ہو۔

ایک اور نمونہ دیکھئے:۔

"بخاری و مسلم میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ میری والدہ نے ایک برتن میں کھجور، کھانا اور گھی اور دہی کا مرکب بنا کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ حضورؐ نے اس پر کچھ پڑھا جو کچھ اللہ کو منظور تھا۔ پھر حضرتؐ دس دس آدمیوں کو بُلاتے گئے۔ تین سو کے قریب آدمیوں کو کھلایا پھر مجھ سے کہا کہ اے انسؓ! اپنا بادیہ اُٹھا لے۔ میں نے اُٹھایا تو حیران ہو گیا کہ اب بھی اس میں کھانا اُس سے زیادہ موجود تھا جتنا پہلے تھا۔"

اس حدیث سے بھی مروجہ فاتحہ کا ذرّہ برابر تعلق نہیں۔ معجزات کے باب میں جو شخص حضورؐ کی اُلٹی سیدھی نقل کرتا ہے اُسے صاحبِ علم تو کیا ہوشمند بھی کہنا مشکل ہے۔

ایسے ہی ایک حدیث قبروں پر پھول وغیرہ چڑھانے کے سلسلہ میں بطور دلیل لائی جاتی ہے کہ حضورؐ ایک مرتبہ کسی قبر سے گزر رہے تھے تو آپؐ نے کسی درخت کی ایک ٹہنی توڑ کر قبر پر پھیری یا گاڑ دی۔ جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس قبر کی میت پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ ٹہنی مُردے کے لئے دعائے مغفرت کرے گی!

مجھے مستحضر نہیں کہ یہ روایت کس کتاب میں ہے۔ نہ لکھنے والے نے کوئی حوالہ دیا ہے۔ میں اس روایت کو جُوں کا توں

صحیح مان کر بھی اہلِ عقل سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس سے کسی بھی پہلو قبورِ اولیاء پر پھول چڑھانے کا جواز نکلتا ہے۔؟ یہ روایت تو بتاتی ہے کہ حضور نے پھول نہیں ٹہنی گڑوائی تھی۔ آپ ٹہنی کی بجائے پھولوں کی بات کرتے ہیں۔ حضور نے عذاب سے نجات دلانے کے لئے یہ عمل کیا تھا۔ آپ ان بزرگوں کی قبر پر بطورِ عقیدت ونیاز مندی پھول چڑھا رہے ہیں جن کے متعلق آپ عذاب کا وہم بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ اور فرض کیجئے آپ اپنے عزیز واقرباء ہی کی قبروں پر اُن کے عذاب کو ہلکا کرنے کے لئے پھول چڑھانے لگیں تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ آپ بھی خود کو رسول اللہ کی طرح مقبولِ بارگاہِ اِلٰہ سمجھتے ہیں۔ آپ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ کے دستِ مبارک کے ڈالے ہوئے پھول عذاب ہلکا کر دیں گے۔ آپ کے نزدیک گویا میّت کے عذاب کو ہلکا کرنے کی تاثیر دستِ رسول میں اور دعائے رسول میں نہیں تھی۔ بلکہ خود ٹہنی میں تھی۔ اور آپ ٹہنی نہ ملنے کی وجہ سے پھول چڑھا رہے ہیں۔ کہ پھولوں میں بھی عذاب کم کرنے کی خاصیت ہے!۔۔۔ اللّٰھم حفظنا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ مزاروں پر پھول چڑھانا۔ منتیں ماننا۔ چادریں چڑھانا۔ کھانوں پر فاتحہ پڑھنا سب عجمی تہذیب وتمدن کے انعامات ہیں۔ جنہیں آپ نے اپنے دین کے سانچے میں ڈھال لیا ہے اور خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس پر آپکو انعامِ آخرت دے گا۔ زہے خوش خیالی!

اجتہاد کا ذکر چھڑا ہے تو ایک اور مفید بات بیان کر دوں۔ اہلِ بدعت ویسے تو دُرِ مختار اور اس نہج کی دیگر کتب فقہ کے احکامات وروایات کو خاطر خواہ لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ مگر کوئی بات اپنے مطلب کی مل جائے تو انہی کتابوں سے حجت پکڑنے لگتے ہیں۔ مثلاً دُرِ مختار وغیرہ میں انھیں یہ روایت نظر آئی کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ عید کی نماز کے بعد عین عیدگاہ میں نماز پڑھ رہا ہے۔ آپ نے اسے نہ روکا۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ آپ کیوں نہیں منع کرتے۔ حضرت علیؓ نے کہا مجھے ڈر لگتا ہے کہیں میں بھی ان لوگوں میں نہ شمار کر لیا جاؤں جنہیں اللہ تعالیٰ نے جھڑکا ہے۔ (ارأیت الذی ینھیٰ عبداً اذا صلیٰ (کیا دیکھتے ہو اُسے جو بندہ کو نماز سے روکتا ہے) ۔۔۔ اہلِ بدعت کے لئے یہ روایت تو وحی آسمانی بن گئی۔ اور ملّی ایدزابہ حجت ٹھہر گیا۔ لیکن انھیں اگر مجمع البحرین کی وہ عبارت دکھائی جائے جس سے حضرت علیؓ کا نقطۂ نظر اور عقیدہ اس مذکورہ طرزِ عمل کے برعکس معلوم ہوتا ہے تو ہرگز نہ مانیں گے۔ عبارت دیکھئے:۔

ان رجلاً یوم العید اراد ان یصلّی قبل صلوٰۃ العید فنہاہ علیؓ فقال الرجل
یا امیرالمومنین انی اعلم ان اللہ لایعذب علی الصلوٰۃ فقال علیؓ وانی اعلم
ان اللہ لا یثیبہ علیٰ فعل حتیٰ یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او یحث
علیہ فیکون صلوٰتک عبثاً والعبث حراماً۔

ایک شخص نے عید کے دن ارادہ کیا کہ نمازِ عید سے پہلے کچھ نماز پڑھے۔ اسے حضرت علیؓ نے روکا اس نے کہا یا امیرالمومنین! میں جانتا ہوں کہ اللہ نماز پڑھنے پر عذاب نہیں دیگا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اور میں جانتا ہوں کہ اللہ کسی ایسے فعل پر ثواب نہیں دیتا کہ جسے نہ تو رسول اللہ نے خود کیا ہو نہ اس کا ایماء فرمایا ہو۔ پس تیری نماز فعلِ عبث ہوگی۔ اور فعلِ عبث حرام ہے!

اہلِ بدعت کچھ کہیں لیکن طالبانِ حق ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ اعمال کے مستحقِ اجر وثواب ہونے کے متعلق اُس جلیل القدر صحابی کا کیا زاویۂ نظر تھا۔ جس سے اہلِ طریقت تمام رشتہ ہائے ولایت جوڑتے ہیں اور جسے رسول اللہ نے باب العلم کہا ہے۔

اور جس کا زہد و اتقا مشہورِ زمانہ ہے۔ ہم بدعت کے مردود اور ناقابلِ اجر ہونے پر متعدد صفحات میں جو بات سلیقے سے نہ کہہ سکے اسے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب نے چند لفظوں میں کس قدر سلیقہ، صفائی اور قطعیت کے ساتھ بیان فرمادیا۔ کرم اللہ وجہہ!

اربابًا مِنْ دُونِ اللهِ | قرآن میں ایک دو جگہ نہیں بہت آیتوں میں خدا کے سوا کسی کو "اربابًا من دون اللہ" بنانے پر تنبیہ اور وعید آئی ہے۔ پیرایہ بدل بدل کر اللہ نے شرک سے منع فرمایا ہے:

مثلاً:۔ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (سورۂ یونس)

اور مت پکار دو! اللہ کے سوا کسی کو کہ نہ کوئی تجھے نفع دے سکتا ہے نہ نقصان پس اگر تو نے پکارا تو یقیناً تو ظالموں میں سے ہے!

یا مثلاً:۔ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِ اللهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ (سورۂ سبا)

کہہ دے اے محمدؐ بھلا پکار دو تو اللہ کے سوا اُن کو جن کے بارے میں تمہیں خوش فہمیاں ہیں۔ نہیں قدرت ہے انھیں آسمانوں اور زمین میں ذرّہ برابر۔

اب اگر اس طرح کی آیتیں سنا کر اہلِ بدعت سے گزارش کی جاتی ہے کہ مرحوم یا زندہ بزرگوں سے دعا کرنا ظلم و شرک ہے، اس سے باز آئیے۔ یہ لاحاصل ہی نہیں دوزخ میں پہنچانے والا فعل ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیتیں تو اُن کے لئے نازل ہوئی ہیں جو بُتوں کو پوجتے تھے، کافر تھے، مشرک تھے، ہم نعوذ باللہ بتوں کو کہاں پوجتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کہا جائے کہ آیات میں آخر بُتوں کا ذکر کہاں ہے وہاں تو مِن دُونِ اللہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا۔ تو کیا اللہ کے سوا صرف بُت ہیں۔ مرحوم یا زندہ بزرگ اللہ میں داخل ہیں (نعوذ باللہ) وہ کہتے ہیں ہم پُوجتے کب ہیں۔ گویا اُن کے نزدیک پُوجنا بس یہ ہے کہ اُن کے آگے سجدہ کیا جائے، اُن کی نذر چڑھائی جائے۔ حالانکہ میں آپ کو قولِ رسولؐ ہی سے بتاؤں کہ پُوجنا صرف یہی نہیں ہے بلکہ پُوجنا یہ بھی ہے کہ جس چیز کو آپ کے بزرگ حلال یا حرام کہیں اُسے آپ قرآن و سنّت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے حلال یا حرام مان لیں۔ دیکھئے قرآن میں آتا ہے:۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور فقراء کو اور مسیح ابن مریم کو خدا ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک ہی خدا کی عبادت کریں۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پاک ہے اُن کے شرک سے!

حضرت عدی بن حاتم جو ایک عیسائی تھے اور بعد میں ایمان لائے۔ انہوں نے جب یہ آیت سنی تو رسول اللہ سے عرض کیا کہ اہلِ کتاب نے اپنے علماء اور درویشوں کی عبادت تو کبھی نہیں کی۔ حضورؐ نے جواب دیا عبادت تو نہیں کی۔ مگر ان علماء و فقراء نے بعض حرام چیزوں کو حلال کر دیا اور اہلِ کتاب نے ان کی بات مان لی۔ اسی طرح انہوں نے بعض

حلال چیزوں کو حرام کردیا اور اہلِ کتاب نے اسے قبول کرلیا۔
کیا یہ روایت صراحتہً نہیں بتاتی کہ "اربابًا من دون اللّٰہ" بنانے کا مطلب صرف پُوجنا نہیں بلکہ حرام و حلال کے معاملہ میں خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہوکر کسی کی بات کو حق اور قابلِ تسلیم سمجھنا بھی پُوجنے ہی میں داخل ہے۔ عقل کا واضح تقاضا بھی یہی ہے کہ حلت و حرمت کا مکمل اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے تو جسے بھی اس اختیار کا حامل سمجھ لیا جائے وہ اس سمجھنے والے کے نزدیک گویا خدا ہی ہوگا۔ چاہے وہ الفاظ کی حد تک اسے خدا نہ مانتا ہو۔ آج آپ عام طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ لوگ اپنے شیوخ اور مرشدین کی ہر بات کو بلاچون وچرا حق مان لیتے ہیں۔ خواہ قرآن وسنّت کے صریح خلاف ہو۔ پیر قوالی سننے، طبلہ، ہارمونیم بجانے اور عرس کرنے کو قولاً اور عملاً کارِ خیر ٹھہرائے گا۔ اور مریدین آمنّا وصدقنا کہہ دیں گے۔ حالانکہ یہ چیزیں قرآن وسنّت سے حرام ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ نذر ونیاز، ڈھکا لوٹنا سکھائیگا۔ باطل عقائد کا سبق دے گا، یہ مان لیں گے۔ زبان ہی سے نہیں دل سے۔ کوئی لاکھ انھیں سمجھائے، آیات واحادیث سنائے، ائمہ وفقہا کے ارشادات پیش کرے۔ مگر توبہ، یہ سب کو اس دلیل سے ٹھکرا دیں گے کہ ہمارے اتنے بڑے پیر بھلا کیسے گناہ کا کام کرسکتے ہیں؟ یہ "اربابًا من دون اللّٰہ" بنالینا نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ شرک نہیں تو شرک کس چڑیا کا نام ہے۔ یہ گمراہی نہیں تو گمراہی کسے کہتے ہیں؟
حق فرمایا صادق ومصدوق فداہٗ امی وابی نے:۔

اِنَّ لِقَلْبِ ابْنِ آدَمَ بِكُلِّ وَادٍ شُعْبَةً فَمَنْ اَتْبَعَ قَلْبَهُ الشُّعَبَ كُلَّهَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ بِاَىِّ وَادٍ اَهْلَكَهُ وَمَنْ تَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ كَفَاهُ الشُّعَبَ۔ (مشکوٰۃ)

یقیناً آدمی کے دل کی ہر سمت راہ ہے۔ پس جو شخص اپنے دل کو سب راہوں پر چلاتا ہے تو اللہ کو اس کی کچھ پروا نہیں ہوتی۔ جس راہ میں چاہے ہلاک کردے اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے سب راہوں کی کفایت کرنے والا ہے۔

یعنی دُنیا میں فکر ونظر اور حرکت وعمل کی بے شمار راہیں ہیں۔ خواہشات کی تکمیل کے گوناگوں وسائل ہیں۔ مطلب برآری اور حصولِ مقصد کے اَن گنت اسباب وذرائع ہیں۔ آدمی اگر ہوائے نفس اور عقل کے تابع ہوکر ہر طرف دوڑے، ہر قسم کے وسیلے اختیار کرے، ہر طریقہ کو حصولِ مقصد کے کام میں لائے۔ حلال وحرام، درست ونادرست اور ثواب وعذاب کی کچھ پروا نہ کرے، تو اللہ بھی اس سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ اور گمراہی اُسے آگھیرتی ہے۔ پھر وہ راہِ گمراہی پر ہی جہاں تہاں برباد و ہلاک ہوجاتا ہے۔ اور اگر وہ مناسب وجائز حد تک جد وجہد کرتے ہوئے اللہ پر بھروسہ رکھے، اس سے امید باندھے اور اسی کی طرف رجوع ہو تو اللہ بآسانی اُسے کامیاب کردیتا ہے اور وہ رنگ برنگی راہوں میں ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتا ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر قبروں اور پیروں سے امید کا رسازی رکھنے والوں کا حال یہ ہے کہ مرادیں حاصل کرنے کے لئے وہ جائز وناجائز کی ذرا پروا نہیں کرتے اور جس قبر کے بارے میں شہرت سُن لی کہ وہاں مرادیں ملتی ہیں، بس اسی کی طرف دوڑے۔
خدائے ذوالجلال مومنین کا حال یہ بتلاتا ہے کہ:۔

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (سجدہ-۱۳)
ہماری آیات پر ایمان وہ لاتے ہیں جنہیں اگر سمجھایا جائے اور ہماری آیات یاد دلائی جائیں تو سجدے میں گر پڑیں اور اپنے لائقِ تعریف رب کو یاد کرنے لگیں!

لیکن بدعت پسند حضرات ——— خواہ وہ کسی ملک، کسی شہر، کسی قریہ کے ہوں، خواہ میرے ہی شہر کے ہوں، خواہ پردہ دار ہوں یا فاحش، خواہ صوفیت کے جامہ میں ہوں یا علم و تفقہ کے لباس میں ——— اُن کا حال یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی سُن کر رب العزت کے جلال و کبریائی کے احساس سے اثر پذیر اور متاثر ہونا تو کجا وہ برملا اپنے پیروں، مرشدوں اور بزرگوں کی "آیات" مقابلہ میں لاتے ہیں اور زبان و عمل دونوں سے اُن کا یہ اعتقاد مترشح ہوتا ہے کہ اللہ کی آیات ہمارے فلک رسا بزرگوں کی "آیات" سے کچھ زیادہ ضروری نہیں ہیں!

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (روم)

آدمیوں کی اپنی کارگزاریوں اور کرتوتوں سے خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا!

جی بے اختیار چند اور آیات قرآنیہ نقل کرنے کو چاہتا ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ۔ (سورہ لقمان)

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے باب میں جھگڑتے ہیں۔ حالانکہ نہ اُن کے پاس علم ہے نہ ہدایت نہ کتاب روشن۔ اور جب اُن سے کہا جائے کہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا ہے اُسے مانو تو کہہ دیتے ہیں۔ نہیں ہم تو وہی مانیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو جمے ہوئے پایا ہے۔ بھلا اور اگر شیطان انھیں دوزخ کے عذاب کی طرف بلارہا ہو پھر بھی!

اسی سورۃ میں ذرا آگے ہے:-

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

اگر روئے زمین کے تمام درختوں کو قلم اور سمندر کو روشنائی بنا لیا جائے اور سات سمندر اور بھی روشنائی کے طور پر موجود ہوں، نہیں تمام ہو سکتیں اللہ کی باتیں۔ بے شبہ اللہ ہے بڑی قوت والا۔ زبردست حکمت والا!

ذوالجلال والاکرام۔ اللّٰھمّ لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک۔ اللّٰھمّ لک الملک ولک الحمد۔ اللّٰھمّ حفظنا من کل بلاءٍ و من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس۔

یہ آیاتِ قرآنیہ زیبِ سخن کے لئے نہیں اس غرض سے نقل کی گئی ہیں کہ برادرانِ اسلام ان پر خلوصِ نیت سے غور کریں جو لوگ کارسازی و عطا کے لئے نعوذ باللہ اللہ رب العزت کو ناکافی سمجھ کر مردہ یا زندہ بزرگوں کو پکارتے ہیں۔ قبروں اور استھانوں سے آس لگاتے ہیں۔ ٹوٹکوں، گنڈوں اور نجوم و سحر کے چکر میں پھنستے ہیں۔ کیا انھیں اللہ قدیر و توانا کی اُن لامتناہی قوتوں کا شعور و یقین ہو سکتا ہے۔ جن کو اگر لکھا جائے تو تمام روئے زمین کے درخت قلم بن کر سات سمندروں کی روشنائی سے انھیں پورا نہیں لکھ سکتے۔ یہ حضرات تو یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ نے یہ باتیں خاکم بدہن محض تفریحاً فرما دی ہیں اور بندوں کے

ان میں کوئی سبق، کوئی نصیحت، کوئی تعلیم نہیں!

غلو کا جنون

توحیدِ حقیقی کی حقیقت ولذت سے بے خبر اور اسلام کی روح سے ناواقف لوگ کسی طرح اُن حدود میں رہنا گوارا نہیں کرتے جو اللہ نے اپنے رسولؐ کے واسطے سے صریح وجلی طور پر متعین فرمادی ہیں ۔ وہ صالحین و اتقیا کو انسانیت کے مراتب وخصوصیات سے بڑھاکر الوہی صفات سے متصف کرتے ہیں اور جب صالحین کے ساتھ یہ معاملہ ہو تو ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سب کے سردار اور افضل البشر ہیں ۔ انھیں تو یہ حضرات بالکل خدا ہی بنا ڈالتے ہیں ۔ سراپا واہی عقیدے، کھلم کھلا مشرکانہ عقائد، لغو ومکروہ ولایعنی۔ مبتدعین کی کتابیں دیکھیے اور صوفیوں کی محفلوں کے اشعار ملاحظہ کیجیے اور عرس، قوالی کی محفلیں سنئے ۔ کیا نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو بڑھایا ہوگا جو مبتدعین نے رسول اللہ کو بڑھایا ــــ اور لطف یہ کہ یہ بڑھانا اور غلو کرنا اس مقصد سے نہیں کہ حضورؐ کی پیروی اور فرمانبرداری میں بھی شدت و غلو کیا جائے۔ بلکہ عمل میں تو یہ حضرات اکثر و بیشتر متساہل اور تارک ملیں گے ۔ غلو اور افراط صرف ہوائے نفس کے تحت کرتے ہیں ۔ لذتِ سخن اور گرمیِ گفتار کے لئے کرتے ہیں ۔ دل پسند افعال کے جواز کے لئے کرتے ہیں ۔ رسول اللہ اُن کے نزدیک عالم الغیب بھی تھے ۔ قادر بالذات بھی تھے ۔ حاضر و ناظر بھی تھے ۔ بلکہ آج بھی یہ سب کچھ ہیں ۔ سبحانہ تعالیٰ عما یشرکون ۔ ان کے گوناگوں مشرکانہ عقائد کی تفصیل میں جانے کے بجائے آئیے چند نصوص میں آپ کو دکھاؤں:۔

سب سے پہلے کلمۂ شہادت ہی کو دیکھئے کہ جس پر مدارِ ایمان ہے:۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہی ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اسکے بندے اور رسول ہیں ۔

اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ عبد کو یعنی بندہ ہونے کو پہلے بیان کیا گیا، رسول ہونے کو بعد میں ۔ گویا ہر مسلمان رسول اللہ کی عظمت و فضیلت جاننے سے پہلے یہ حقیقت اچھی طرح سے سمجھ لے کہ محمدؐ صرف ایک بندہ ہی ہیں ۔ اللہ کے عبد ۔ الوہی قوت و عظمت میں اُن کی کوئی شرکت نہیں ۔

پھر قرآن میں متعدد بار صراحت و وضاحت کی انتہائی ممکنہ حدود تک حضور کی عبدیت و بشریت کو بیان کیا گیا:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف)

کہہ دے (اے محمدؐ) میں تو ایک بشر ہوں ۔ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تمہیں بتاؤں تمہارا معبود خدائے واحد ہے ۔

یہی تنبیہ و توثیق سورۂ فصلت میں کی گئی ۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ !

یہ انہونی بات ہے کہ ایک بشر کو اللہ کتاب اور قوتِ فیصلہ اور نبوت دے پھر یہ بشر لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے اللہ کے سوا ۔

گویا یہاں ایک قاعدۂ کلیہ بیان کردیا گیا کہ جس کے بعد کسی بھی نبی کے لئے مافوق البشر سمجھے جانے کی گنجائش ہی نہیں ۔ اور سورۂ ابراہیم میں جملہ انبیائے سابق کے قول کو بھی اسی حقیقت کی وضاحت کے لئے بیان فرمایا گیا:۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۔

رسولوں نے اُن سے کہا کہ ہم تو صرف بشر ہیں تمہاری طرح، ہاں اللہ اپنے جس بندے پر چاہے احسان فرماتا ہے (یعنی اللہ نے احسان فرما کر ہمیں نبوت عطا کی ۔

آخر ان آیات سے زیادہ صریح اور کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ یہ بتاتا کہ ہر نبی اور رسول فقط بشر ہوتا ہے۔ مافوق البشر اس میں کوئی قوت نہیں ہوتی۔ اور جو معجزہ اس سے ظہور میں آتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا اور احسان ہے، نہ کہ بجائے خود نبی کے اقتدار و قوت کی دلیل۔ کن واضح اور بے ریب لفظوں میں اللہ نبی سے کہلواتا ہے:-

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ - (اعراف)

(اے محمدؐ) کہہ دے میں اپنی جان کے نفع نقصان کا مالک نہیں ہوں لیکن جو کچھ اللہ چاہے اور اگر میں غیب کا حال جانتا تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے بُرائی کبھی نہ پہنچتی۔ میں تو بس ڈرانے والا ہوں اور خوشخبری دینے والا ہوں۔ ایماندار لوگوں کو۔

بعینہٖ یہی شروع کے الفاظ سورۂ یونس میں وارد ہوئے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں پہلے ضرر ہے اور پھر نفع۔ سورۂ جن میں فرمایا گیا:-

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝

کہہ دے میں تو بس اپنے رب کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں کرتا۔ کہہ دے میرے قبضہ میں نہیں تمہارا نقصان اور تمہیں راہ پر لانا۔

یہ تو چند آیاتِ قرآنیہ ہوئیں۔ ذرا خود ارشاداتِ رسولؐ کو بھی دیکھئے۔ نسائی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ:-

"کچھ لوگ رسول اللہ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ اے رسول اللہ! اے وہ کہ ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے بیٹے ہو! اور سردار اور سردار کے بیٹے ہو..... !"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی حضورؐ نے قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا:-

یا ایها الناس قولوا بقولکم ولا یستهوینکم الشیطان انا محمد عبد الله و رسوله ما احب ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنی الله عزوجل۔

اے لوگو اپنی معمولی باتیں کرو اور تمہیں شیطان بہکا نہ دے۔ میں محمدؐ ہوں اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم لوگ مجھے اس درجہ سے بڑھا دو جو درجہ اللہ نے مجھے دیا ہے!

دیکھ لیجئے۔ کہنے والوں نے کوئی خلافِ واقعہ بات نہیں کہی تھی۔ کوئی شرک نہیں کیا تھا۔ لیکن حضورؐ نے اس سے بھی روکا اسے بھی شیطان کی دراندازی خیال فرمایا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ غلو پسندی آدمی کو کہاں تک لے جاتی ہے اور بے قید و بے محل تصیدہ پڑھنے والا مزاج و ذہن کس افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے!

بخاری و مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لا تطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم انما عبدٌ فقولوا عبد اللہ ورسولہ

دیکھو مجھے حد سے نہ بڑھانا جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو حد سے بڑھا دیا۔ میں صرف اللہ کا بندہ ہوں لہٰذا تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ کہو۔

مشکوٰۃ میں بخاری سے ایک حدیث منقول ہے کہ:-

"کچھ چھوکریاں حضورؐ کے سامنے آپس میں کہنے لگیں کہ ہمارے بڑے بوڑھے بدر میں مارے گئے ایک چھوکری نے کہا ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے" اس پر رسولؐ اللہ نے فرمایا:-

دعی ھٰذہ و قولی بالذی کنتِ تقولین!

یہ بات چھوڑو بلکہ وہی باتیں کرو جو تم پہلے کر رہی تھیں۔

یعنی اور باتیں کہے جاؤ یہ "کل کی بات جاننے" والا کلام چھوڑو۔ حالانکہ ہو سکتا تھا ان چھوکریوں نے یہ جملہ اس مفہوم میں بولا ہو کہ نبی چونکہ مرنے کے بعد کا حال بتا رہے ہیں اس لئے گویا وہ آئندہ کی بات بتا رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے الفاظ علم غیب کے موہم تھے اس لئے حضورؐ نے روک دیا۔

اور دیکھئے۔ مشکوٰۃ ہی میں بخاری سے نقل کیا ہے:-

قَالَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہِ لا ادری وانا رسولُ اللہ ما یُفعَلُ بی ولا بکم۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم اللہ کی میں اللہ کا رسولؐ ہونے کے باوجود نہیں جانتا کہ میرے ساتھ اللہ کا کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا۔

حد ہے اس وضاحت و تصریح کی کوئی؟ ممکن رہا مومن کے لئے رسولؐ اللہ کو عالم الغیب یا حاضر و ناظر یا اور کسی حیثیت میں مافوق البشر ماننا؟

قَالَ اللہ تعالیٰ وَعِندَہٗ مَفَاتِحُ الغَیبِ لَا یَعلَمُھَا اِلَّا ھُوَ - (انعام)

اللہ نے فرمایا کہ اسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی نہیں جانتا انھیں کوئی بھی اس کے سوا۔

یہ تو چند آیات و احادیث ہیں۔ قرآن و احادیث دونوں ہی سے ناقابلِ انکار طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ نہ عالم الغیب تھے نہ خدا کی طرح حاضر و ناظر۔ نہ معجزات میں آپؐ کی ذاتی قدرت کو دخل تھا۔ نہ آپؐ اپنے طور پر کسی کو ہدایت نصیب کرنے یا نفع و نقصان پہنچانے یا بخشنے پر قادر تھے۔ سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا۔ اور جو شخص انھیں عالم الغیب کہتا ہے۔ وہ بقول حضرت عائشہ صدیقہؓ بڑا بھاری بہتان باندھتا ہے (بخاری)۔۔۔ حدیث کی سب سے مستند اور مقبول کتابیں بخاری اور مسلم اٹھا کر دیکھئے۔ ملیگا کہ آنحضورؐ انسانوں کی طرح کبھی بھولتے بھی تھے۔ بعض خبروں کے منتظر بھی رہتے تھے۔ اصحاب سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ دنیاوی امور میں آپؐ کے خیال کا کبھی کبھار وہ نتیجہ نہیں نکلا جو حضورؐ سمجھتے تھے۔ جس پر آپؐ نے فرمایا۔

"انتم اعلمون بامور دنیاکم"!

مبتدعین کی جہالت کی انتہا ہے کہ صریح آیات و احادیث پر تو توجہ نہیں کرتے اور دور دراز باتیں ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ مثلاً وہ روایت انھیں نظر پڑ گئی جس میں حضورؐ نے ایکدمشتی کہہ کر لسٹ کا حد کم فرمایا ہے۔ یعنی "تم میں سے

کون میری مانند ہے۔ میں تم جیسا نہیں ہوں" بس پھر کیا تھا، ساری آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ صریحہ و صحیحہ پس پشت ڈال دی گئیں اور کہا گیا کہ دیکھا حضورؐ خود فرما رہے ہیں کہ میں تم جیسا نہیں۔ اور اس "تم جیسا نہ ہونے کا" مطلب اُن کی نگاہ میں یہ ہوا کہ اب جتنی چاہے صفاتِ الوہیہ اور ما فوق البشر قدرتیں حضورؐ کے لئے فرض کرتے چلے جائیں۔ اگر عرض کیا جائے کہ اس کا یہ مشرکانہ مطلب نہیں ہے بلکہ آنحضورؐ کا فضیلتِ آخروی کے علاوہ قوتِ انسانیہ پر نسبتاً کمتا زہونا سب پر ظاہر و باہر ہے، اُسی امتیاز و فرق کی طرف حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے اور خدا کے رسولِ خاص ہونے کی بنا پر اُن کے ساتھ اللہ کا معاملہ سب سے جداگانہ ہونا بھی چاہیئے۔ تب یہ کہیں گے کہ نہیں صاحب آپ غلط کہتے ہیں!

خیر ہماری بات چھوڑیئے۔ آیتِ قرآنی دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ احزاب میں امہات المؤمنین سے خطاب فرماتے ہیں:-

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ -

اے نبیؐ کی عورتو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔

اگر آنحضورؐ کے "لستُ باحدٍ کُم" کا مطلب یہی ہے کہ حضورؐ کے لئے اب ہر فوق البشر قوت و قدرت کے اثبات کا دروازہ کھل گیا تو امہات المومنین، ازواجِ مطہرات کے لئے بھی اس کا دروازہ کھول دیجئے۔ ان کو بھی عالم الغیب اور حاضر و ناظر مانیئے۔ وہ تو حدیث ہی تھی یہ قرآن ہے۔ (و نعوذ باللہ من ذالک)

میں ابھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن وقت کی کمی اور طوالت کے خوف سے رُک جاتا ہوں۔ تاہم جو کچھ میں نے کہا ہے۔ وہی اتنا کافی ہے کہ اگر اس پر خلوص اور دیانت سے توجہ کی جائے تو کتنی ہی بُرائیوں اور غلط عقیدتگیوں سے پناہ مل سکتی ہے مجھ کم حیثیت اور بے بضاعت کی نہیں اُس آمرِ مطلق اور حاکمِ حقیقی اور مالک و خالق کی سُنئے جو فرماتا ہے کہ:-

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ - (روم)

سیدھا رکھ اپنا مُنہ سیدھی راہ پر۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آپہنچے جس کا ٹلنا اللہ کی طرف سے مقدور نہیں ہے۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ اس اُمت کا آغاز جس چیز سے سنورا ہے اسی سے اس کا آخر بھی سنورے گا۔ آج کے ہمہ گیر بگاڑ کو سنوارنا ہے تو اپنے اپنے گروہی معتقدات اور عصبیتوں کو چھوڑ کر قرونِ مبارکہ کی طرح قرآن و سنت کی طرف آیئے اور قرآن و سنت ہی کو عقیدہ و عمل کا مبنیٰ بنایئے!

بدعت کے عظیم نقصانات

آپ اسلام کی تاریخ پر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کو اگرچہ غیر مسلم قوموں سے بارہا عظیم نقصان پہنچا ہے لیکن خود "اسلام" کو اُن سے ذرّہ برابر نقصان نہیں پہنچا۔ یہ حقیقت آپ اس وقت ٹھیک طرح سمجھیں گے جب غلط خیال اپنے دماغ سے نکال دیں کہ اسلام اور مسلمان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یا یہ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے نمائندے اور ترجمان ہیں۔ اس غلط خیال کو صراحتاً تو کوئی بھی سمجھدار ظاہر نہیں کر سکتا۔ لیکن عملاً دیکھا جا رہا ہے کہ مدت سے عوام میں ان دونوں کے مقام و منصب اور حقیقی فرق کا صحیح شعور نہیں ہے اور بعض پڑھے لکھے تک اپنی تحریروں میں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں کہ گویا اسلام قرآن و سنت اور اجماع و قیاس تک محدود نہیں ہے، بلکہ بعض اولیاء اور اتقیاء کے ذاتی رجحانات و عادات بھی اس کا جزوِ لازم ہے۔ یا یہ کہ کوئی عابد و زاہد شخص اگر بعض اعمال کر گیا ہے تو ان اعمال کو قرآن و سنت پر پیش کئے بغیر بھی اسلام کی ترجمانی اور نمائندگی

کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یا اگر کسی مسلمان بادشاہ نے کچھ اسلامی قوانین رائج کئے تو اس کے تمام ہی رائج کردہ قوانین اور طریقوں کو قرآن و سنت کی مطابقت کے بغیر اسلامی کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط خیال کو عام کرنے میں اس سیاسی اصطلاح کو بھی دخل ہے جو مسلمانوں کی ہر سلطنت کو "اسلامی سلطنت" کہہ دینے کی شکل میں رائج ہوئی۔ بہرحال یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام الگ چیز ہے اور مسلمان الگ۔ اسلام ایک نظامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے جو قرآن و حدیث اور اس سے مستنبط کی ہوئی مستند کتابوں میں تحریر ہے اور مسلمان وہ ہے جس نے اس نظام و دستور پر ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ مدعی اگر اس ایمان کے عملی تقاضے پورا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے اور جو امور اس دستور میں جرم و گناہ کے خانہ میں درج ہیں انھیں اختیار کر لیتا ہے تو یہ قصور خود اس کا ہے، ورنہ محض اس بنیاد پر کہ وہ اسلام قبول کرنے کا دعویدار ہے۔ اس کے جرم و گناہ کو نیکی اور بھلائی کے خانہ میں نہیں لکھا جائے گا۔

یہ سیدھی سی بات سمجھ لینے کے بعد یہ جاننا بالکل آسان ہے کہ اہلِ کفر نے مختلف زمانوں میں مسلمانوں پر جو تاخت کی اور ان کی سلطنتیں چھینیں اور جان و مال برباد کیا اور ان پر طرح طرح کے ظلم توڑے تو بے شک وہ مسلمانوں کا نقصان تھا۔ لیکن نفسِ اسلام پر اس کی زد نہیں پڑی۔ نفسِ اسلام کا نقصان تو یہ تھا کہ اہلِ کفر اس کے اصولوں یا جزئیات و فروعات میں کچھ غیر اسلامی نظریات و فروعات اس طرح خلط ملط کر دیتے کہ انھیں اسلامی دستور سے الگ ہی نہ کیا جا سکتا۔ اور جس طرح دیگر اہلِ کتاب کے دین غلط و صحیح کا ایسا مجموعہ بن گئے کہ ان کی تنقیح ممکن ہی نہیں رہی ایسا ہی یا اس سے کچھ کم حال اسلام کا بھی ہو جاتا۔ لیکن اہلِ کفر ایسی کوئی خرابی پیدا نہ کر سکے۔ اور اس کی وجہ جہاں یہ تھی کہ اسلامی مزاج براہِ راست اہلِ کفر سے کوئی نظریہ یا اصول قبول کرنے کو تیار نہ تھا وہیں یہ بھی تھی کہ اسلامی ماہرین و مجتہدین نے دستورِ اسلامی کی تدوین و تنقید کے اتنے مضبوط اور محکم طریقے اختیار فرمائے تھے کہ کسی غیر مسلم قوم کے لئے ان میں رخنہ اندازی اور فساد انگیزی ممکن ہی نہ تھی۔

ہاں نقصان اگر اسلام کو پہنچا ہے تو یا تو ان مسلمانوں سے پہنچا جو سلطنت میدانِ تکلم کی شہسواری کے شوق میں عجمی فلسفے، طرزِ فکر، رجحان و مزاج، اسٹائل آئیڈیالوجی اور افراط و غلو کو اسلام میں لا گھسایا۔ یہ حضرات چونکہ نہ صرف مسلمان تھے بلکہ بہت سے ان میں عبادت گزار اور عالم اور صاحبِ جبہ و دستار بھی تھے اور حق یہ ہے کہ ان کی متکلمانہ زور آزمائیوں سے اسلام کو کتنے ہی محاذوں پر فائدہ بھی پہنچا اور مسلمان ان کی وجہ سے باطل پرستوں کے مقابلہ میں سرخرو بھی ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی کچھ غیر اسلامی نظریات اور نکات اور طریقے ان کے ذریعہ اسلام میں اس طرح گھس آئے کہ وہ کثیر مسلمانوں کی نگاہ میں اسلامی ہی ٹھہرے اور ان کے اثرات دین کی جڑوں میں پھیلتے چلے گئے۔

یا پھر دینِ خالص کو نقصان ان لوگوں سے پہنچا ہے جو علم و عمل کے اعتبار سے بہت اچھے تھے۔ مگر انہوں نے اپنے مزاج اور افتادِ طبع اور علمی اعتبارات ناقص اجتہاد کے تحت کچھ نئی عبادتیں ڈھالیں۔ کچھ نئے طرقِ اطاعت بنائے۔ کچھ نئے معمولات بشکلِ دین اختیار کئے۔ یہ لوگ چونکہ عملاً نیکوکار اور عابد و زاہد تھے۔ اسی لئے عوام نے ان کی نکالی ہوئی بدعتوں کو دین سمجھ کر قبول کر لیا اور بہت سے ان خواص نے بھی انھیں قبول کیا جو یا تو قرآن و سنت کا گہرا علم نہ رکھتے تھے۔ یا ان حضرات سے خصوصی عقیدت ان کے دل میں تھی۔ بہرحال بدعتیں چلیں اور جیسا کہ نفسیات کا تقاضا ہے لوگوں نے ان ہی سے نئے نئے سوتے اور رشتے اور راستے نکالے۔ بدعت جو اسلام کی نگاہ میں قانون شکنی اور

بغاوت کے انداز کی تھے۔ ہے۔ اپنا مزاج بھی جرموں ہی جیسا رکھتی ہے۔ ایک جرم کرنے کے بعد آدمی دوسرا جرم بھی نسبتاً آسانی سے اور تیسرا پوری ڈھٹائی سے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بدعت اختیار کرنے کے بعد دوسری اور تیسری اور چوتھی کی طرف پیش قدمی کرنا عوام اور بعض خواص کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ شیطان کی شعبدہ گری ایک طرف، بے عملی بلکہ بدعملی کے قبیح اثرات دوسری طرف۔ کم علمی مستزاد اور عجمی ماحول وتمدن کے عوامل نورٌ علیٰ نور۔ نتیجہ وہی ہوا جو آج سب کے سامنے ہے۔ مسلمانوں نے اسلام ہی کے نام پر گمراہی کو سینوں سے لگایا۔ اندھیرے کو اجالا سمجھا، سانپ کو مچھلی جانا۔

اصل یہ ہے کہ جن متکلمین کا میں نے اشارۃً ذکر کیا۔ اُن کا پہنچایا ہوا نقصان نسبتاً کم اور مبتدعین کا اس سے بہت زیادہ تھا۔ بلکہ گہرائی میں جائیے تو متکلمین کے غیر اسلامی نظریات ومباحث بھی بدعت ہی کی قسم سے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اُن کیساتھ "علمی" کا لفظ بڑھا دیجئے۔ یعنی "بدعتِ علمی"۔ حاصل یہ کہ بدعتِ علمی کے علمبرداروں کا نقصان تو پھیلاؤ میں کم رہا۔ کیونکہ دقیق اور عالمانہ مسائل سے اس کا تعلق تھا اور علماء کے طبقہ میں ایسے لوگوں کا فقدان نہ تھا جو تجزیہ وتنقید کے ذریعہ غلط اور صحیح، اسلامی اور غیر اسلامی کو الگ الگ کر کے نہ دکھا سکیں۔ لیکن مبتدعین کا نقصان چڑھتے ہوئے دریا کی طرح پھیلا۔ کیونکہ عوام بھیڑ چال کے عادی ہوتے ہیں اور عقیدت ونیازمندی اُن کے معمولی شعور وفہم پر پوری طرح چھا جاتی ہے۔ جس کے بعد دلیل اور علم کی قوت بہت مشکل سے بہت دیر بعد اُن پر کارگر ہوتی ہے!

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ عملاً بدعات کی کثرت اور بدعات کی تعلیم دینے والی کتابوں کی اشاعت نے اسلامی قوانین میں اس طرح بدعات کو آمیز کر دیا کہ صحیح اور غلط کا جدا کرنا محال ہو گیا۔ یہ اس لئے نہیں ہوا کہ قرآن وحدیث کو مسخ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور سلف صالحین نے علم وفن اور اجتہاد وتفقہ کا جو آئینہ خلف کو دیا ہے وہ بے غبار اور بہت مضبوط تھا۔ مگر اس آئینہ سے فائدہ اٹھانا اور قرآن وسنت کو معیار ومستدل بنانا گنے چُنے خواص ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ باقی امت بدعت کا ہدف بن گئی۔ جنہیں دین کی کچھ فہم تھی وہ کم بگڑے جو نافہم تھے وہ زیادہ بگڑ گئے۔ اس بگاڑ کا ایک نقصانِ عظیم تو یہ ہوا کہ اسلام کی تحریک اور دعوتِ اقامتِ دین انبیاء وصحابہ کی راہِ عزیمت پر چلنے کے بجائے اُن غلط راہوں پر مڑ گئی جن میں رہبانیت، تقشف، اور لاحاصل شور وغوغا اور بے روح وعبث رسوم ورواج کی بہتات ہے۔ بدعتوں نے سنتوں کو نگل لیا۔ ریا نے اخلاص کو دبا لیا۔ دین میدانِ عزیمت وجہاد سے سمٹ کر مزاروں، خانقاہوں، قبروں اور محفلوں میں آگیا!

دوسرا عظیم نقصان یہ ہوا کہ غیر مسلم اقوام کی رائے اسلام کے بارے میں بگڑتی چلی گئی۔ اور جو کشش اس کے اصول واحکام میں تھی اور جس کی وجہ سے یہ حیرت انگیز رفتار سے پھیلا تھا، وہ نہ صرف معطل ہو گئی، بلکہ اس کی جگہ بدنمائی اور کراہت نے لے لی۔ ظاہر ہے کہ دیگر اقوام کے عوام کو اس کی فرصت اور اہلیت کہاں کہ وہ براہ راست قرآن وسنت اور دین کی مستند کتابوں سے صحیح اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور کیوں کریں؟ دنیا کا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے کہ کسی قوم کے دینی اعتقادات واصول کا اندازہ اس کے ان اعمال وافعال سے لگاتی ہے، جو اس میں بطور مراسم مذہبی رواج پائے ہوئے ہوں۔ اور اعتقادات واصول ہوتے بھی حقیقت میں اسی لئے ہیں کہ اعمال وافعال میں اُن کا ظہور ہو۔ دنیا نے جب عرسوں، قوالیوں، قبر پرستیوں، درگاہ سازیوں اور اسی نوع کی متعدد چیزوں کو مسلمانوں میں دینی حیثیت سے رائج پایا تو گمان کیا کہ یہ سب اسلام ہی کے احکام واصول کا ظہور ہے۔ اور اس غلط گمان کو تقویت اس نے دی کہ جو لوگ ان اعمال میں مبتلا تھے وہ زبان وبیان سے نمائندگی اسلام کے مدعی بھی تھے اور ان میں سے بہتوں کا ظاہر بھی ایسا تھا کہ سطح بین نگاہیں انھیں ترجمانِ اسلام سمجھنے پر قدرتاً مجبور تھیں۔ چنانچہ

نفسِ اسلام کے بارے میں دُنیا کو غلط فہمیاں ہوئیں۔ اور وہ توحید خالص اور تعلیم مصفّا جو اسلام میں وجہ کشش تھی، شرک و بدعت کی بدنمائی اور کثافت میں دب گئی۔ اسلام کا شکوہ، وقار، تقدّس اور جاذبیت مجروح ہو گئی۔

میں مانتا ہوں کہ اسلام کے پھیلاؤ اور اشاعت کے رُک جانے میں بڑا ہاتھ خود مسلمانوں کی بداعمالیوں اور غلط کوششوں کا ہے۔ لیکن جو بداعمالیاں مسلمانوں نے دین کی آڑ لے کر نہیں بلکہ خالص دُنیادارانہ طور پر کیں، اُن سے دیگر اقوام کی رائے خود مسلمانوں کے حق میں چاہے کتنی ہی خراب ہو گئی ہو، مگر نفسِ اسلام کے متعلق نظری طور پر انھیں بدگمانیاں نہیں ہوئیں۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ یہ مذہب کی بُرائیاں نہیں اہلِ مذہب کے اپنے کرتوت ہیں۔ اِن بُرائیوں کا سہرا مذہب کے سر نہیں اہلِ مذہب کے سر ہے۔ اس کے برخلاف دین کے نام پر عبادت و طاعت کے رنگ میں کی جانے والی بُرائیوں نے انھیں نفسِ اسلام ہی سے بدگمان کیا اور اسلام سے اُن کی دُوری صرف تعصب اور جذباتی عناد کے تحت نہیں رہ گئی بلکہ اسے عقلی و شعوری دلائل بھی مل گئے —!

دیگر اقوام کے علاوہ خود مسلمانوں ہی کے عقائد و نظریات کو بدعات نے بایں طور فاسد کیا کہ بیچارے کم علم عوام کے مخلص افراد اگر خلوص اور ایمانداری کے ساتھ احکامِ اسلامی کو جامۂ عمل پہنانے کی طرف مائل ہوئے تو اُن کی استعداد کے مطابق جو دینی لٹریچر اُن کے ہاتھ آیا اُس میں پہلے ہی سے صحیح کے ساتھ غلط اور اسلام کے ساتھ بدعت کی آمیزش تھی۔ اور جو وعظ محراب و منبر سے انھیں سُنائے گئے اُن میں بھی بدعت کی تعلیم کسی نہ کسی درجہ میں موجود تھی۔ اب اُن بیچاروں کے پاس یہ قابلیت کہاں کہ تجزیہ و تنقیح کر کے اسلام و غیر اسلام کو جُدا کر سکیں۔ معصومیت و خلوص کیساتھ رطب و یابس کو قبول کرتے چلے گئے۔ اور بدعت کا زہر اُن کے ذہن و قلب، مزاج اور اعمال و افعال میں پھیلتا چلا گیا —!

ریا کے بارے میں آپ جان چکے کہ رسُول اللہ نے اس کا اندراج شرک کے خانہ میں کیا ہے۔ بدعت اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے دکھاوے اور نمود اور گرمیِ محفل کو پسند کرتی ہے۔ یہ چیزیں ریا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ گویا بدعت کے خمیر ہی میں شرک ہے اور ابتداء میں شرکِ خفی ہوتے ہوئے یہ بہت جلد شرکِ جلی کی منزل میں پہنچ جاتی ہے۔ شجرِ بدعت کے برگ و بار دیکھئے۔ صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے ان پر شرک کی تعریف صادق نظر آئے گی —!

منکرات و محرماتِ شرعیہ کا مرتکب مسلمان تو ممکن ہے کہ کسی وقت توبہ و استغفار کی طرف مائل ہو جائے۔ کیونکہ وہ بہرحال گناہ کو گناہ ہی سمجھ رہا ہے۔ اور اس کے اعتقادات مسخ و فاسد نہیں ہوئے ہیں۔ مگر بدعت پسندوں کیلئے توبہ کا امکان بھی کم ہے۔ کیونکہ وہ جس گمراہی میں مبتلا ہیں وہ تو اُن کی نظر میں عین ہدایت ہے اور اُن کے اعتقادات مسخ و فاسد ہو چکے ہیں —!

اَللّٰھُمَّ احفظنا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والصلوٰۃ والسلام
علیٰ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

ایصالِ ثواب کیلئے قرآنِ پاک کا ختم

صدق جدید مورخہ ۱۱ جمادی الاول کے آخری صفحہ پر کسی صاحب نے دریافت کیا ہے کہ "میت کیلئے ختم قرآن کا دستور و معمول کیسے اور کب سے قائم ہوا ہے؟" اس کی نسبت گزارش ہے کہ اس رواج کی تاریخ قیام کا پتہ لگانا تو بظاہر مشکل ہے البتہ اتنا معلوم ہے کہ یہ چیز خیر القرون کے بعد کسی زمانہ میں رواج پذیر ہوئی، اسی بناء پر بہت سے علماء کرام نے اس کو بدعت قرار دیا ہے، بدعت وہ عقیدہ یا عمل ہے جو کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ یا عملِ صحابہ میں سے کسی کے خلاف ہو، اور اسے حکم شریعت یا داخلِ شریعت سمجھا جائے، بشرطیکہ وہ احکام شریعت کے تحفظ کا لازمی ذریعہ یا ارکانِ دین یا واجبات دین میں سے کسی کا موقوف علیہ اور ذریعہ حصول نہ ہو اور شبہ و تاویل کی حیثیت سے ہو، انکار اور تکذیب کے طور پر نہ ہو کیونکہ امور دین کا انکار و تکذیب کفر ہے، بدعت نہیں!

اور بیہقیؒ نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بدعت کی یہ تعریف نقل کی ہے کہ محدث کی دو قسمیں ہیں، جو نئی چیز کتاب یا سنت یا اثر یا اجماع کے خلاف ہو وہ بدعتِ ضلالہ ہے اور جو نئی چیز ان میں سے کسی کے خلاف نہ ہو وہ بدعت غیر مذموم ہے (فتح الباری) اور امام ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ سنت لغت میں طریقہ کو کہتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اہل نقل واثر جو آثار سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہؓ کے متبع ہیں، وہی اہلِ سنت ہیں۔ کیونکہ یہی لوگ اس طریق کے پیرو ہیں جس میں کوئی نئی بات داخل نہیں ہوتی اور نئی باتیں اور نئے طریقے حضرت خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے بعد نکلے ہیں اور بدعت اس فعل کو کہتے ہیں جو پہلے نہیں تھا بعد میں نکلا، اور بدعات زیادہ تر شریعت سے متصادم ہوتی ہیں یا جب بدعت پر عام عمل در آمد ہو تو شریعت میں کمی بیشی ہوجاتی ہے اور اگر کوئی ایسی بات ہو جو شریعت سے مخالف نہیں ہے اور نہ اس پر عمل در آمد کرنے سے شریعت میں کوئی نقص یا زیادت لازم آتی ہے تو ایسی بدعت سے بھی بزرگانِ سلف کراہت کرتے اور عموماً ہر قسم کے بدعتی سے نفرت کرتے تھے (تلبیس ابلیس)

اب میت کے لئے ختم قرآن کی غرض سے جمع ہونے کے باب میں علمائے حق کے چند اقوال ملاحظہ ہوں:۔

امام بزازیؒ المتوفی ۸۲۷ھ فتاویٰ بزازیہ ص۸۱ جلد۴ مطبوعہ مصر کتاب الحضر والاباحت میں فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) اہلِ میت کا تین دن تک لوگوں کی ضیافت کرنا اور لوگوں کا اسے کھانا مکروہ ہے، کیونکہ ضیافت خوشی کے لئے مشروع ہے۔ اسی طرح میت کیلئے پہلے دن یا تیسرے دن یا ایک ہفتہ کے بعد کئی دن تک اور عیدوں کے دن کھانا پکانا یا خاص موسموں میں قبر پر کھانا لے جانا اور قرآن پڑھنے کے لئے خواہ ختم کے لئے ہو یا سورۂ انعام یا سورۂ اخلاص پڑھنے کے لئے صالحین اور قاریوں کو جمع کرنا اور دعوت طعام کرنا یہ سب مکروہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ کراہیت اسی بناء پر ہے کہ دین میں ایک نئی چیز داخل کرلی گئی ہے!

اسی فتاویٰ بزازیہ کی کتاب الوصیۃ جلد۶ ص۴۳۹ میں ہے کہ اگر کوئی شخص یہ وصیت کرے کہ میرے بعد میری قبر پر کوئی قاری قرآن پڑھے یا یہ کہ میری قبر کو پختہ کیا جائے یا اس پر قبہ بنایا جائے تو یہ وصیت باطل ہے!

اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ مدارج النبوت کتاب الجنائز طبع نولکشور مطبوعہ ۱۹۱۲ء کی جلد اول ص۴۲۱ اور مطبوعہ ناصری دہلی کے ص۴۶۶ میں فرماتے ہیں :-

"وعادت نبود کہ برائے میت جمع شوند و قرآن خوانند و ختمات خوانند نہ بر سر گور و نہ غیر آں، وایں مجموع بدعت است، نعم برائے تعزیت اہل بیت و جمع تسلیہ و صبر فرمودن ایشاں راسنت و مستحب است، امّا ایں اجتماع مخصوص روز سوم وارتکاب تکلفات دیگر و صرف اموال بے وصیت از حق یتامیٰ بدعت است و حرام!"

انہی شیخ عبد الحق رحمۃ اللہ نے شرح سفر السعادت میں قریباً یہی عبارت زیب رقم فرمائی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ نماز جنازہ پڑھنے کے بعد لوگ (یعنی صحابۂ کرامؓ) ختم قرآن وغیرہ کے لئے جمع نہیں ہوتے تھے (شرح سفر السعادۃ ص۲۷۳)

اور امام ابن الحاج مالکی رحمۃ اللہ کتاب المدخل میں رقم فرما ہیں کہ صرف اسی پر اکتفا نہیں بلکہ لوگ اپنی رسم کے مطابق خاص لحن سے قرآن پڑھواتے ہیں اور قاریوں کو جمع کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں :-

وتلک القبائح والمفاسد موجودۃ فی اجتماع للثالث والسابع وتمام الشھر وتمام السنۃ وفی ای موضع فعل ذالک فیہ من بیت او قبر او غیرھما کل ذالک یمنع ولکن الک یحذر مما احدثہ بعضھم من فعل التھلیلات لموتاھم وجمعھم الجمع الکثیر لذالک! (المدخل مطبوعہ مصر جلد ثالث ص۲۷۵)

اور یہ تمام مفاسد وقبائح ہر اس اجتماع میں پائے جاتے ہیں جو میّت کی رحلت کے تیسرے یا ساتویں دن یا مہینہ یا سال بھر کے بعد منعقد کرنیکا رواج ہے، یہ افعال کسی جگہ بھی کئے جائیں، گھر ہو یا قبر یا ان دونوں کے سوا کوئی اور مقام، ہر جگہ ممنوع ہیں، اسی طرح اس بدعت سے بھی بچنا چاہیئے جو بعض لوگوں نے احداث کرلی ہے کہ اپنے اموات کے لئے لا الٰہ الا اللہ پڑھواتے ہیں اور اس کے لئے کثیر اجتماع ہوتا ہے!

امام ابن الحاجؒ دوسری جگہ مسلمانوں کو سلف صالح کا طریقہ اختیار کرنے کی ان الفاظ میں ہدایت فرماتے ہیں :-

انہ لم یکن من فعل من مضیٰ وھم السابقون والقدوۃ المتبعون ونحن التابعون فیسعنا ما وسعھم والخیر والبرکۃ والرحمۃ فی اتباعھم وفقنا اللہ لذالک بمنّہ

ہمارے اسلافِ کرام کا یہ طریقہ نہ تھا، حالانکہ وہی سبقت کرنے والے پیشوا ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے، ہم تو محض ان کی متابعت کرنیوالے ہیں ہمارے لئے اسی حد تک کسی فعل کی گنجائش ہے جہاں تک ان کے لئے تھی اور خیر برکت اور رحمت انہی کے اتباع میں ہے، حق تعالیٰ ہمیں اپنے فضل و احسان سے ان حضرات کے اتباع کی توفیق ارزانی فرمائے!

یاد رہے کہ امام ابن الحاجؒ نے آگے چل کر یہ بھی فرما دیا ہے کہ اگر کوئی مجمع کے بغیر اپنے طور پر کلمۂ توحید وغیرہ پڑھ کر میت کو اس کا ثواب پہنچائے تو ممنوع نہیں بلکہ کار خیر ہے!

(الصدیق - ملتان)

ابو منظور شیخ احمد
(ناندیڑ دکن)

قبر پرستی

"قبر" — سب جانتے ہیں کہ یہ لفظ عام طور پر اُس قد گز زمین کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں مُردہ دفن کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی بدیہی و یقینی بات ہے کہ دنیا میں ہمیشہ توحید و رسالت اور آخرت ہی کا نہیں بلکہ وجودِ باری تک کا انکار کیا گیا ہے اور آج بھی بہت سے لوگ اس کے منکر ہیں۔ مگر موت کا انکار نہ پہلے کسی نے کیا اور نہ قیامت تک اس کا انکار کرنے والا کوئی پیدا ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جہاں چار گھر بھی زندہ انسانوں کے بنے ہوئے ہوں وہاں مُردوں کے مکانات بھی بنیں۔ چنانچہ ہر خورد و کلاں، ہر غریب و امیر، ہر عالم و عامی اور ہر ولی و نبی کی قبریں زندہ انسانوں کے مسکونہ مکانات کے پہلو بہ پہلو بنتی چلی گئی ہیں اور کوئی بستی ان دونوں قسم کے مکانات سے خالی نہیں پائی جاتی۔ مگر ہر طبقہ اور ہر مرتبہ و مقام کے مُردہ انسانوں میں سے خصوصیت کے ساتھ صوفیاء و اولیاء کی قبریں زیادہ اعتنا کے لائق قرار پاتی رہی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ تمام انسانوں کی طرح صوفیا و اولیا بھی موت کا مزہ چکھتے ہیں اور زمین میں دفن ہوتے ہیں اور اُن پر دُوسروں کی طرح منوں مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ اور دوسروں ہی کی طرح قبر بھی بنا دی جاتی ہے۔ مگر اس جماعت کے بھی چند خاص خاص افراد کی قبروں پر عامۃ الناس کی توجہ زیادہ سے زیادہ مرکوز ہونی شروع ہوتی ہے اور چند ہی دنوں میں کہیں محض اینٹ پتھر اور چونہ گچ اور کہیں نہایت قیمتی پتھروں سے قبر پختہ کردی جاتی ہے۔ اور دُوسری قبروں کے مقابلہ میں دیکھتے دیکھتے یہ قبریں نمایاں اور ممتاز ہو جاتی ہیں۔

پھر قبر کے اطراف ایک کٹہرا تیار ہوتا ہے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ کہیں معمولی عمارت، اور کہیں نہایت مضبوط قبے تعمیر ہو جاتے ہیں۔ یہ قبے کہیں کہیں تو اتنے بلند و بالا اور ایسے عظیم الشان ہوتے ہیں کہ باقاعدہ آثار قدیمہ میں داخل کرلئے جاتے ہیں پھر اُن میں فن تعمیر کی ایسی ایسی نادرہ کاری پائی جاتی ہے کہ محض آثارِ قدیمہ و فنی تعمیرات سے دلچسپی لینے والوں ہی کیلئے نہیں بلکہ ہر آیند و روند کی توجہات کا مرکز بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس طرح ایک ایک قبر کئی کئی ایکڑ زمین کو مستقل طور پر گھیر لیتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ گنبد کے آس پاس دُوسری عمارتیں بننے لگتی ہیں اور چھوٹی موٹی سی نو آبادی بس جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ قبریں عوام کی توجہات کا ایسا بڑا مرکز و مرجع بنتی ہیں کہ جوق درجوق لوگ وہاں کھنچے چلے جاتے ہیں۔ توجہات کی اس درجہ مرکزیت و مرجعیت کے بعد ناممکن ہے کوئی طبقہ ایسا پیدا نہ ہو جو ان توجہات کو کیش کرے اور اس مرجعیت و مرکزیت سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ بہت سے لوگ قبروں کی خدمت کا منصب سنبھال بیٹھتے ہیں اور "خادم" "جاروب کش" "مجاور" اور "جادہ نشین" وغیرہ مختلف القاب سے پکارے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو ایسے ایسے اعزازات حاصل ہوتے ہیں کہ کسی کو ان کی عملی زندگی اور ان کے نام مشاغل پر نظر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ محض قبر کی نسبت یا اس کی خدمت ہی اُنھیں سب کچھ بنا دیتی ہے۔ اُنھیں ہر نا اہل و سیاح سے بھی کچھ نہ کچھ نذرانہ لینے کا حق ہوتا ہے۔ اور قبر کی نسبت یا خدمت کا نام لے کر لوگوں سے چندہ مانگنا بھی جائز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات

اُن کی مالی حالت پوری بستی کے لوگوں سے بہتر ہوتی ہے اور نہایت عیش و آرام سے گزرنے لگتی ہے۔ مگر ان لوگوں کے لئے اتنے ہی پر اکتفا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے وہ قبر کی نسبت کے ساتھ ساتھ صاحب قبر سے بھی کوئی نہ کوئی نسبت پیدا کر لیتے ہیں، یا کسی نہ کسی سلسلۂ تصوف سے وابستہ ہو جاتے ہیں تاکہ دُنیوی اعزاز و اکرام کے ساتھ ساتھ روحانی و دینی پیشوائی کا مقام بھی حاصل ہو جائے اور "روحانیت" کے پردہ میں اتنا کچھ مل جائے جتنا عام دُنیاداروں کو بھی بمشکل ملا کرتا ہے — !

چنانچہ عوام الناس ہی کے ذریعہ یہ معزز و مکرم نہیں بنے ہیں بلکہ مسلم حکومتیں بھی اُن پر اتنی نظرِ عنایت فرماتی رہی ہیں کہ انہیں بڑی بڑی جاگیریں اور جائدادیں ملی ہیں۔ اور اُن میں سے کتنے ایسے ہیں کہ مذہبی و روحانی مشیخت تو خیر، اُن کی دُنیوی ریاست اور مادی منفعت کو دیکھ کر بڑے بڑے دُنیادار بھی حرص و طمع کی نگاہ سے دیکھتے ہیں! اور بڑے بڑے سرمایہ دار اور کارخانہ دار بھی اُن سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے!

اچھا اب قبر کے پاس تشریف لے چلیں۔ مگر کتنی ہی قبریں ایسی ہیں کہ اصل قبر سے فرلانگ دو فرلانگ اُدھر ہی آپ کو اپنی جوتیاں چھوڑنی پڑیں گی۔ آپ چاہے عام قبروں پر سے جوتیوں سمیت ہی کیوں نہ گزر جائیں۔ مگر یہاں آپ اپنی جوتیاں قبر کے پاس بھی نہیں لے جا سکتے۔ ارے! یہاں تو چاروں طرف جھنڈے ہی جھنڈے اور نشان ہی نشان نظر آتے ہیں — ! جی ہاں! چاہے سینکڑوں غریب غرباء کے بدن جاڑے کے دنوں میں لباس کی کمی کے باعث ٹھٹھر رہے ہوں اور ان میں کوئی ٹھٹھر کر اپنی جان ہی دے دے۔ بہرحال سینکڑوں گز کپڑا یہاں نشانوں میں صرف ہوتا رہتا ہے!

آپ احاطۂ گنبد کے صدر دروازہ سے لے کر مزار شریف تک "نہ جائے گا اس در سے کوئی بھی خالی"۔ اور "نیست کعبہ در دو کون جز در گہ بندہ نواز" وغیرہ کی قسم کے سینکڑوں فقرے اور اشعار بھی پڑھتے جائیے — اندر چلئے۔ سبحان اللہ! یہاں کی پوری فضا عود، لوبان اور دوسری خوشبوؤں سے کس درجہ معطر ہے اور مزار شریف پر کتنے قیمتی غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ افوہ! اس درجہ قیمتی کپڑے تو صرف شاہانِ سلف نے پہنے ہوں گے یا پھر موجودہ دور میں امراء کے گھرانوں میں پہنے جاتے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ غرباء و مساکین نے تو انہیں خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا — خیر! وہ خواب میں دیکھیں یا نہ دیکھیں۔ وہ یہاں بیداری میں تو دیکھ سکتے ہیں۔

اور مزار پر پھول بھی کس کثرت سے چڑھائے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گلستانوں اور پھلواریوں کو لا کر یہاں اُلٹ دیا گیا ہے۔ ارے! یہ زائر صاحب تو چوکھٹ ہی کو بوسہ دے رہے ہیں اور یہ کیا؟ یہ صاحب تو قبر کے گرد بھی گھوم رہے ہیں۔ ارے! یہ تو قبر کو بھی چوم رہے ہیں۔ کبھی سر رکھ دیتے ہیں اور کبھی آنکھیں۔ ارے! یہ تو عجیب عجیب بے معنی حرکات بھی کر رہے ہیں۔ خدانخواستہ انہیں کچھ جنون تو لاحق نہیں ہو گیا ہے؟ خیر! یہ حرکات بے معنی ہیں یا بامعنی اور یہ صاحب مجنون ہیں یا عقلمند۔ اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوتا رہیگا۔ آپ نے قبر کے اُوپر کاغذوں کے لٹکتے ہوئے پلندے نہیں دیکھے بس — ارے! یہ تو باقاعدہ درخواستیں اور التجائیں ہیں۔ کسی میں لکھا ہے کہ روزگار دلوائیے۔ کسی میں تحریر ہے کہ اولاد دیجئے۔ کسی میں مقدمہ جتوا دینے اور مرض کو دُور کر دینے کی فرمائش ہے۔ کسی میں آفات و بلیات کو ٹال دینے اور بدقسمتی کو خوش قسمتی سے بدل دینے کا مطالبہ ہے — یہ صاحب تو اُلٹے پاؤں دروازہ کی طرف جا رہے ہیں — جی ہاں! جاتے ہوئے مزار کی طرف پشت ہوتی ہے نا! — اور اِدھر دیکھئے یہ بیچاری اللہ کی بندی قبر کی طرف رُخ کئے سجدہ ہی میں پڑی ہوئی ہے۔ اب چلئے یہاں عورتوں کی گزر بھی ہے!

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان مزاروں پر کہیں کہیں ہفتہ واری اور ماہانہ اور بالعموم سالانہ ایک میلہ لگتا ہے، ان میلوں

کی شان صاحبِ قبر کے شایانِ شان مذہبی جلسوں اور سیاسی تقریبات سے بھی کچھ اونچی ہوتی ہے۔ آرائش و زیبائش، اہتمام و انتظام، شان و شوکت اور وسعت و کثرت کے لحاظ سے یہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان موقعوں پر ہزاروں، لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ جو نہ معلوم کن کن جیبوں سے نکل کر کن کن طریقوں سے آتا اور چلا جاتا ہے۔ عام بولی میں ان میلوں کو "عرس" کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی عربی زبان میں "شادی" کے ہیں۔ ایک شخص اس خوشی کے موقع پر انفرادی طریقہ سے جتنا کچھ خرچ کر سکتا ہے اور کرتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ پھر جب سینکڑوں ہزاروں، لاکھوں افراد اجتماعی طور پر عرس کریں تو جو کچھ بھی خرچ ہو جائے وہ کم ہی ہے۔ یہ اعراس کہیں کہیں ایک دن کے لئے اور کہیں کہیں آٹھ آٹھ دس دس دن کے لئے منعقد ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے اشتہارات اور پوسٹروں سے لے کر دعوت ناموں تک تمام وسائلِ نشر و اشاعت استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور یوں بھی ان کی تشہیر کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ خود ہی ان تاریخوں کو جانتے ہیں۔ جن میں انھیں کسی مزار پہ حاضر ہونا ہے!

اس کے لئے وہ سال سال بھر سے پیسہ پیسہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ پیسہ نہ ہو تو قرض وام کرتے ہیں، اور بسا اوقات تن کے کپڑے اور برتنے کی چیزیں تک گرو رکھ دیتے ہیں۔ اپنے ضروری سے ضروری کاموں کا ہرج کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں سب سے زیادہ ضروری کام کے لئے جانا ہوتا ہے۔ اپنے مصارفِ سفر کا بندوبست کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس مصرف کا بندوبست نہ ہوا تو پھر آمدنی کے سارے راستے ہی بند ہو جائیں گے۔ اور ٹھیک وقت پر مزارِ شریعت کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

اس جمِ غفیر میں آپ ہر خورد و کلاں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں سمجھدار بھی ہیں اور بے سمجھ بھی۔ آوارہ و بدمعاش بھی ہیں اور سیدھے سادے بھولے بھالے بھی۔ جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ معذور بھی ہیں اور بیمار بھی۔ ڈاڑھی والے بھی ہیں اور ڈاڑھ منڈے بھی۔ نمازی بھی ہیں اور بے نمازی بھی۔ غریب بھی ہیں اور امیر بھی۔ خوش حال بھی ہیں اور بدحال بھی۔ کوئی تو چیتھڑے لگائے ہوئے آ گیا ہے اور منہ سے پھونک پھونک کر آگ جلا رہا ہے، تاکہ روٹی کی ٹکیہ پکائے اور پیٹ کی آگ بجھائے۔ یہاں کی رنگا رنگی تو بس دیکھنے ہی کے لائق ہے!

ارے! اس جمِ غفیر میں عورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ لائی ہیں۔ اور نہ معلوم کہاں کہاں سے آئی ہیں۔ ارے! یہ تو اچھی خاصی برقع پوش معلوم ہوتی ہیں۔ مگر انھیں یہاں برقع کا ہوش نہیں ——— جی! یہاں عقیدت کا جوش ہے! برقع کا کسے ہوش ہے! ——— لیجئے! یہ بی بیاں تو خوب بے پردہ ہو کر پھر رہی ہیں ——— جی! یہاں سارے زائرین قبر ہی کے زائرین نہیں ہیں۔ زائرینِ حُسن بھی ہیں۔ عورتیں یہاں مردوں کے دوش بدوش ہیں۔ کندھے سے کندھا ہی نہیں ملتا۔ نظروں سے نظریں بھی ملتی ہیں اور دل سے دل بھی ملتے ہیں۔ آپ کو یہاں اگرچہ سب کچھ ملے گا مگر تبرا اور صاحبِ قبر کی نسبت کے باعث آپ اس کا تصور آسانی کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ سب کچھ قبر کے اندر نہیں ہو رہا ہے جسے آپ دیکھ نہ سکیں۔ یہ تو باہر ہی باہر ہے۔ اس لئے اگر واقعات و حقائق کی شہادت ایک مسلّمہ شہادت ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ کھلم کھلا نظر بازی بلکہ عشق بازی بھی ہو رہی ہے۔ مگر چونکہ اس پر "روحانیت" اور "مذہبیت" کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے یہ باتیں "خلوتیانِ راز" ہی تک عام طور پر محدود رہتی ہیں ——— !

مگر چھوڑیئے مکروہ باتوں کا ذکر بھی مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے عرس کا نظام نامہ ملاحظہ نہیں فرمایا۔ یہ دیکھئے ——— !
ارے! اس میں یہ صندل، مالیدہ، چڑھاوا، نشان، فاتحہ، نیاز اور اسی قبیل کی بیسیوں عجیب باتیں موجود ہیں ——— جی! یہ عجیب ہوں تب بھی ان پر تعجب نہ کیجئے اور عجیب و غیر عجیب کا فیصلہ ابھی سے کیوں کیجئے گا۔ کچھ نیچے دیکھئے ——— ہاں! اس میں مجلسِ سماع کا

ذکر ہے — مشہور قوالوں کے نام ہیں — مگر اور بھی کچھ ہے؟ — جی! کچھ گانے اور ناچنے والیوں کے نام بھی لکھے ہیں — یہاں ناچ گانا صاحبِ مزار کی روح کو خوش کرنے کے لئے ہوگا، یہ طریقت، جذب و سوز اور کیف و عرفان کی ڈیپارٹمنٹ ہے۔ یہاں "شریعت" کے قانون نہیں چل سکتے!

اچھا! ادھر دیکھئے۔ ہزاروں جانور ذبح کئے جا رہے ہیں۔ ان جانوروں کا تقدس بھی واقعی کیا چیز ہے! کتنے ہی جانور صاحبِ قبر کے نام پر پُن کرکے چھوڑ دیئے گئے ہیں، جنہیں ہاتھ تک نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ جس کھیت میں جا پڑیں، کھیت والے کے نصیب جاگ اٹھیں گے۔ وہ جہاں سے پانی پی لیں وہاں برکت ہی برکت ہوگی۔ کتنے ہی جانور اس لئے ذبح کئے جا رہے ہیں کہ اُن کو ذبح کرنے کی منت مانی گئی تھی۔ اُن کو ذبح کرتے ہوئے چاہے جس کا نام لیا جائے مگر وہ ذبح ہو رہے ہیں ایک خاص طریقہ پر۔ خاص جگہ، خاص وقت میں، یہاں تک کہ اس طریقہ سے ہٹ کر، اس جگہ کو چھوڑ کر اس وقت کو ٹال کر کوئی شخص انہیں ذبح کرنے پر آمادہ نہیں۔ پھر جانوروں کی خریداری سے لے کر اُن کے گوشت کی تقسیم اور کھانا پکنے اور ختم ہو جانے تک کے آداب اور بے ادبیوں کی اقسام حد و شمار سے باہر ہیں —!

مزار شریف پر چلئے۔ اوہ! وہاں تو بڑی بھیڑ لگی ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کی الگ الگ صفوں کا امتیاز مفقود ہے — خیر! جو کچھ اندر ہو رہا ہے، اُسے آپ نہ دیکھ سکیں تو بھی بہتر ہے! دروازہ سے لگ کر کھڑے ہو جائیے، کم از کم ہر آیند و روند کی حرکات و سکنات ہی دیکھ لیجئے۔ اور اگر اس نظارے سے آپ تھک گئے ہیں تو عجیب و غیر عجیب اور جائز و ناجائز کی بحث کو چھوڑئیے۔ اور چُپ چاپ لوٹ آئیے مگر ان قبروں کو ضرور دیکھ لیجئے، جن میں کوئی جسم دفن نہیں ہے۔ محض قبروں کی شکل دے کر انھیں کسی بزرگ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔[1]

زائرین بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ مصنوعی قبریں ہیں۔ مگر اُنھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان قبروں پر بزرگانِ دین کا نام لینے سے اُنہیں دین میں بزرگی کا مقام حاصل ہو گیا ہے، اس لئے وہ ان کے بھی گرویدہ ہیں اور یہاں آپ وہ سب چیزیں پائیں گے جنہیں آپ "عجیب" قرار دے رہے تھے، تاہم اگر ان عجائبات سے آپ کے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہونے لگی ہے تو اب اپنے گھر آ جائیے —!

سوال یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، کیا یہ سب یونہی ہے؟ کیا اس کے کوئی وجوہ و اسباب نہیں؟ کیا دُنیا میں کوئی ایسا عمل بھی پایا جاتا ہے جو کسی نہ کسی عقیدہ و ایمان کا مظہر نہ ہو؟ کیا آپ کسی ایسی سرگرمی کا پتہ دے سکتے ہیں جس کا کوئی داعیہ، جس کا کوئی نظریہ، جس کا کوئی محرک سرے سے موجود ہی نہ ہو؟ کیا آپ کسی ایسی حرکت کے قائل ہیں جو مقصد و ارادہ اور نیت کے بغیر ہی ہو جایا کرتی ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان کا ہر عمل اس کے قلبی عقیدہ و ایمان کا مظہر ہوتا ہے، انسان کی رگ رگ میاں، اپنے داعیات، نظریات اور محرکات کا آپ پتہ دیتی ہیں۔ انسان کی حرکات و سکنات اس کے قصد و ارادے اور نیت ہی پر محمول کی جاتی ہیں۔ بلا قصد و ارادہ سرزد ہونے والی حرکات و سکنات میں نہ تو اہتمام ہوتا ہے نہ اصرار نہ استقلال ہوتا ہے نہ دوام۔ بفحوائے حدیثِ نبوی انسان کے تمام اعمال کا دار و مدار اس کی نیت ہی پر

---

[1] دکن میں ان مصنوعی قبروں کو عامۃ الناس "چھلّہ" بولتے ہیں۔

ہوتا ہے۔ پس چند مخصوص اولیاء و صوفیا کی قبروں کے ساتھ یہ غیر معمولی برتاؤ جن اعتقادات و ایمانیات پر مبنی ہے اُن کا خلاصہ یہ ہے:۔

"اللہ تعالیٰ پوری کائنات اور کائنات کی ہر جاندار و بے جان چیز کا خالق ضرور ہے۔ مگر اُس نے اتنی بڑی کائنات کے لئے تدبیرِ امر، تقسیمِ رزق، مالکیت، حاکمیت و اقتدار اور انسانی ضروریات کی بہم رسانی کے انتظام میں دُوسری بہت سی ہستیوں کو اپنا شریک بنا رکھا ہے۔ وہ حاکم ہے لیکن اتنا بڑا حاکم کہ اُسے کبھی یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی حکومت و سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں خود دخل دے اور دُوسروں کو بالکل بے دخل کر دے۔ اُس نے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں لیکن وہ اُس کا پیغام پہنچا دینے اور اپنی تعلیم کے مطابق خود عمل کر کے دکھا دینے کے بعد دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُنھیں یہ اختیارات نہیں دیئے جاتے کہ وہ خدا کی سلطنت میں کسی درجہ میں بھی مداخلت کریں۔ یا از خود دخیل ہو جائیں۔ رہ گئے پیغمبروں کے ساتھی تو بہرحال وہ پیغمبروں کو دیکھنے والے اور اُن کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اُنھیں بھی یہ منصب نہیں ملتا کہ خدائی سلطنت کا کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ البتہ بعض صوفیاء و اولیاء کو جو اللہ کے خاص چہیتے اور اس کے نظر کردہ ہوتے ہیں، یہ منصب سونپا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی سلطنت کا کام چلائیں اور اس کی صفات میں جزءً یا کلاً شریک ہو جائیں۔ بادشاہِ کائنات کی سلطنت میں اُن کا وہی مقام ہوتا ہے جو دُنیا کی سلطنت میں وزیروں، گورنروں اور چھوٹے بڑے حاکموں کا ہوا کرتا ہے۔ اُنھیں بہت سے اختیارات دیئے جاتے ہیں اور تصرفات پر اُنھیں قدرت بخشی جاتی ہے۔ خدا کی سلطنت کا ایک ایک علاقہ اور ایک ایک صوبہ اُن کے سپرد کیا جاتا ہے۔ سارے معاملات انہی کے دربار سے طے پاتے اور سارے قضیئے انہی کے ہاں فیصل ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ خدا کے اذن یافتہ ہیں اس لئے انھیں بہت ہی کم معاملات اُوپر پہنچانے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ شاید کسی معاملہ کو اُوپر لے جانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں خود اللہ تعالیٰ اُن سے راضی و خوش رہتا ہے۔ اگر کبھی ناراض بھی ہو جاتا ہے تو محبوب و معشوق کی بات تو ہر طرح گوارا ہی کرنی پڑتی ہے۔ پھر اتنی عظیم الشان سلطنت کا تنہا انتظام از خود سنبھالنے کی زحمت سے بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبوں اور پیاروں کو بھی اختیارات سونپ دیئے ہیں ـــــ یہ حضرات اللہ تعالیٰ سے اکثر بگڑ بھی جاتے ہیں مگر عشق کے میدان میں اس قسم کی باتیں تو پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ یہ اندازِ معشوقانہ ہوتا ہے اس لئے عاشق نہیں بگڑتا۔ بلکہ اُس کے دل میں عشق کی آگ اور بھڑک اُٹھتی ہے جب دُنیا میں اُن کے تعلقات اتنے مضبوط اور گہرے ہوتے ہیں تو آخرت تو دُنیا کی کھیتی کا حاصل ہی ہے اس لئے وہاں ان کا ہر عقیدت مند بخشا جاتا ہے۔ اور محض اِن کے دامن سے وابستہ ہو جانا ہی بخشش کے لئے کافی ہے۔ عاشق و معشوق کے اصل تعلقات کی شان تو دُنیا سے کہیں زیادہ آخرت ہی میں ظاہر ہو سکے گی ـــــ یہ حضرات اگرچہ دوسروں کی طرح وقت مقررہ پر مر جاتے

ہیں۔ مگر در اصل یہ مرتے نہیں ہیں بلکہ دنیا سے بیزار ہو کر صرف پردہ کر جاتے ہیں یا خدا سے مل کر بہت سی خدائی طاقتوں کا مظہر بن جاتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر اُن کا جسم دوسروں کی طرح زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے مگر چونکہ وہ دنیا میں سخت سے سخت ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ اپنی روح کو خوب طاقتور بنا لیتے ہیں، اس لئے انتقالِ مکانی کے بعد اس کے تصرف کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جب دنیا میں ان لوگوں کی روح اتنی ہلکی اور لطیف ہوتی تھی کہ اس پر جسم کا دباؤ باقی نہ رہا تھا یہاں تک کہ ہوا پر اڑنا، پانی پر چلنا اور چند ثانیوں میں فاصلۂ طویلہ طے کر جانا اس کے لئے ایک معمولی بات تھی تو پھر بعد وفات اس کے کرشموں کا کیا ٹھکانا ہے؟

روح تو امرِ رب ہے، پھر ایک ولی اللہ کی روح، جس کی صفائی و طہارت اور قوت و شہامت ناقابلِ تصوّر ہے، جب جسم سے الگ ہو جاتی ہے تو پھر وہ وہ کرامات دکھاتی ہے کہ دنیا دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ خدا کا حکم بن کر جب اپنے زیر اثر علاقہ میں نافذ ہوتی ہے تو اس کے سارے معاملات اسی روح سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر دُور و نزدیک کی بات سنتی ہے، قریب و بعید ہر معاملہ دیکھتی ہے۔ حاجتیں پوری کرتی ہے مرادیں بر لاتی ہے، تقسیمِ رزق، عطاءِ اولاد، شفاءِ امراض، دفعِ بلیات، دُنیوی امارتوں اور ریاستوں کی اُکھیڑ پچھاڑ۔ غرض کوئی معاملہ اُس کے دائرۂ تصرفات سے باہر نہیں رہ جاتا۔ وہ بگڑتی ہے تو بستیاں کو ویران کر دیتی ہے اور خوش ہوتی ہے تو خوشحالی کا دَور آ جاتا ہے۔ اس کی رضا و نارضامندی ہی سب سے اہم، اقدم اور فیصلہ کن مسئلہ ہے۔ اس لئے اس کی طرف رجوع بہرحال ضروری ہے۔

یُوں تو سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے تیسوں دن اور دن کا ہر لمحہ وہ اپنے کام سے غافل نہیں رہتی مگر خاص طور پر اُس تاریخ سے دو چار دن پہلے اور بعد، جس میں وہ جسمِ اقدس سے نکل کر حقیقی معنی میں امرِ ربی بن گئی تھی، پوری جلالی و جمالی صفت کے ساتھ قبر پر جلوہ فرما ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ انہی دنوں میں قبروں پر بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں اور لوگ اپنی اپنی حاجتیں پوری کرتے اور اپنی بدقسمتی، خوش قسمتی کے فیصلے لے کر پلٹتے ہیں۔

ان خاص مواقع پر جو کچھ معتقدین سے ظہور میں آتا ہے وہ تو اس لئے ہے کہ آبا و اجداد سے یہ طریقے اور رواج منقول ہیں، جو چیز اُوپر سے آتی ہے اس کے تقدس میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ آخر قرآن و حدیث آج کچھ نئے نہیں ہو گئے ہیں۔ وہی قرآن کی باتیں اور وہی حدیث کی روایتیں پہلے زمانے کے لوگوں کے سامنے بھی تھیں جو آج ہمارے سامنے ہیں اور وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ ان چیزوں کو جاننے اور ماننے والے تھے، لہٰذا یہ سب کچھ تو بہرحال ہونا ہی چاہیئے۔ جو ہوتا آیا ہے اور آج ہو رہا ہے!

اگر ان مزاروں کے سامنے آداب نہ بجا لائے جائیں تو پھر دنیا میں کونسی چیز لائقِ ادب رہ جاتی ہے۔ اگر یہاں بھی بے ادبیاں ہوں تو پھر دنیا میں کس چیز کا ادب کیا جائے! اگر یہاں وہ چیزیں ہوتی ہیں جو قبروں کی دنیا سے باہر عام پر نامناسب اور بے ادب سمجھی جاتی ہیں تو بہرحال یہ بھی انہی حضرات کا فیض ہے کہ ان تکلفات بار وہ سے چھٹکارا ملا۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کو کبھی بُرے

نام سے یاد نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ دراصل یہ ان درباروں کی توہین ہے۔ ان درباروں سے جو چیز وابستہ ہو جاتی ہے اُس کو بُرا کہنا صرف بُردوں کا کام ہے، ورنہ جو چیز کانِ نمک میں پہنچتی ہے، نمک بن جایا کرتی ہے اس نمک کا ذائقہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ذوق ایں مے نشناسی بخدا تا نہ چشی۔ ان بزرگوں کی شان تو یہ ہے کہ جن قبروں میں وہ دفن ہیں وہ تو خیر رحمتِ الٰہی کا مہبط ہی ہوتی ہیں۔ مگر کسی پتھر کے ڈھیر پر بھی ان کا نام لے دیا جائے تو وہاں سے بھی فوائد و برکات کا بحرِ ذخار اُبل پڑتا ہے۔ خدا نے جو شریعت اپنے بندوں کے لئے اتاری ہے، وہ ہے تو لائقِ اتباع مگر خصوصیت و عمومیت میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے۔ پیغمبروں کو اس کا اتباع اس لئے ضروری ہے کہ وہ پیغام پہنچانے والے ہیں۔ وہ خود اس کی خلاف ورزی کیسے کر سکتے ہیں۔ مگر اولیاء و صوفیا کی ایک خاص جماعت کو وہ امتیازِ خصوصی بخشا جاتا ہے کہ شریعت کا اتباع و غیر اتباع ان کے لئے بالکل یکساں ہے۔ ان میں سے اگر کچھ لوگ متبع شریعت ہوتے بھی ہیں تو وہ اپنے ابتدائے سلوک کے مرحلہ میں ہوا کرتے ہیں! مگر بعد میں وہ مرفوع القلم ہو جاتے ہیں اور بعض تو یومِ پیدائش ہی سے مرفوع القلم ہوتے ہیں!

چنانچہ وہ اگر عورتوں کے ناچ گانے سے دلچسپی لیتے ہیں تو یہ ایک پردہ ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کی آنکھوں پر پڑا ہوتا ہے ورنہ حوروں کے تصور سے ان کا کوئی لمحہ خالی نہیں جاتا۔ اور سازوں کی آوازوں میں وہ ہمیشہ مولا کی آواز سُنا کرتے ہیں۔ وہ دُنیا ہی میں جنت کے مزے لوٹنے لگتے ہیں۔ اس لئے دُنیا و آخرت کی تقسیم کرنے والے اُن کی کسی بات کو پا نہیں سکتے۔ اور یہی سبب ہے کہ جو لوگ ان کے مزاراتِ مقدسہ پر حاضر ہوتے ہیں انھیں بھی اتباعِ شریعت کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اگر نماز روزہ سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں تو محض اس لئے کہ خدا سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق باقی رہے ورنہ اہل اللہ سے تعلق قائم رکھنا خود اللہ سے تعلق قائم رکھنے کے مترادف ہے!

اس تعلق کے بعد اگر کوئی شخص پوری شریعت سے بھی منحرف ہو جائے تب بھی ڈرنے کی بات نہیں۔ یہ حضرات نہ صرف اللہ کے ہاں سفارشی بن کر کھڑے ہوں گے بلکہ ان کی بات رکھنا اللہ پر واجب ہو گا، کہیں دُنیا میں ایسے عاشق بھی پائے جاتے ہیں جو خاص اپنے ہی معشوقوں کی ناراضی مول لے لیں۔ اہل اللہ نے تو پہلے اللہ سے عشق کیا مگر بالآخر وہ خود معشوق بن کر رہ گئے!

ایسے محبوبانِ ربانی کے مزارات کیا دوسروں کی طرح کچے اور کھلے ہونے چاہئیں؟ اُن کی عظیم المرتبت ہستیوں کے شایانِ شان تو یہی بات ہے کہ نہایت عالیشان قبے اُن کے مزارات پر بنیں۔ تاکہ ان کی عظمتِ شان بھی باقی رہے اور زائرین و معتقدین کو بھی اُن کے سایہ میں آرام لینے اور راحت پانے کا موقع مل جائے۔ پھر جب یہ مزارات اس قدر مرجعِ خلائق بن جائیں تو اُن کے سجادہ نشینوں کا وجود بھی آپ سے آپ ضروری ہو جاتا ہے اور کسے خبر ہے کہ وہ بڑے ہیں یا نہیں۔ مگر بڑوں کی نسبت تو انھیں یقیناً بڑا بنا دیتی ہے۔ اور مسلم حکومتوں کی یہ انتہائی قدر شناسی اور عقیدت مندی تھی کہ انہوں نے ان مزاراتِ مقدسہ کے لئے بڑی بڑی جاگیریں اور جائدادیں وقف فرمائیں۔ ان تمام

چیزوں کو جو لوگ بُرا کہتے ہیں وہ "وہابی" ہیں۔ اس بات کی تحقیق کون کرے کہ ان کو وہاب سے نسبت ہے یا عبدالوہاب سے یا عبدالوہاب کے بیٹے سے۔ بہرحال ہیں یہ بے ایمان۔ بھلا اہل اللہ سے کٹ کر اللہ سے جُڑنا بھی کوئی معنی رکھتا ہے؟" (ان تصورات اور معتقدات سے لاکھ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ)

یہ ہیں وہ خیالات و اعتقادات جو قبر پرستی کا اصل سبب ہیں۔ یہ آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ اگر آپ اس کے کسی جُزئیہ کو بھی الگ کر دیں تو شاید اس عمارت کی پُوری اینٹیں ہی کھوکھلی ہو کر رہ جائیں اور پھر یہ عمارت بھی ایک خاص بُنیاد پر قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سارے اصول و فروع درست ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے پہلے حق و باطل کا ایک معیار متعین کرنا چاہیئے۔ جہاں تک غیر مسلم قوموں کا تعلق ہے اُن میں یہ معیار کبھی متفق علیہ نہیں رہا ہے۔ کیونکہ خدائی ہدایت پر ایمان نہ لانے کے سبب اُن کا ہر وادی میں بھٹکنا قدرتی بات ہے۔ برخلاف اس کے مسلمان، مسلمان ہونے کی حیثیت سے معیارِ حق و باطل کے تعین میں کبھی مختلف الخیال نہیں ہو سکتے۔ وہ چاہے دُنیا کے کتنے ہی گوشوں میں بکھرے ہوئے ہوں اور علم و ایمان کے کسی درجہ پر ہوں اُن کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف قرآن ہے، اور اس کے بعد رسُول کی سنّت۔ ان دونوں بھاری چیزوں[1] کے بعد اگر کوئی چیز اُن کے نزدیک لائقِ توجہ یا لائقِ پذیرائی ہو سکتی ہے تو صلحاء و علماءِ اُمّت کے صرف وہ اقوال و افعال جو کتاب و سنّت کے عین مطابق یا روحِ اسلامی سے قریب تر ہوں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو چاہے کسی بات کو ساری دُنیا کہتی ہو اور کوئی کام ساری دُنیا میں کیا جاتا ہو مسلمان کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اتنی بھی نہیں ہے جتنی مٹی کے ایک ذرہ یا گھانس کے ایک تنکے کی ہوتی ہے بلکہ وہ تو اپنے مشن کے لحاظ سے مامور ہی اس بات پر ہے کہ ہر خلافِ کتاب و سنّت چیز کی تردید کرے اور عملاً ہر منکر کو مٹانے اور ہر معروف کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتا رہے، یہاں تک کہ اس راہ میں اپنی جان دے دے!

اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ جن اعتقادات و نظریات کی بناء پر مسلمان قبر پرستی میں مُبتلا ہیں وہ سب کے سب باطل ہیں اور ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کے خیالات و اعتقادات صرف اسی شخص کے دل و دماغ میں راہ پا سکتے ہیں جس نے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش نہیں کی، یا کی تو اپنے مزعومات و مفروضات کی تائید و سند کے لئے، ورنہ قرآن نے اتنی وضاحت و صراحت کے ساتھ حق و باطل کو ممیّز کر کے رکھ دیا ہے اور دُنیا میں پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کو اتنی خوبی اور حکمت کے ساتھ صاف کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص پُورا قرآن نہ سہی اس کا کوئی ایک حصّہ بھی طلبِ ہدایت کے لئے پڑھ لے تو اس کے دل و دماغ میں اس قسم کے خیالات و اعتقادات کے در آنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم قرآن کی کون کون سی آیات اور کون کونسی سورتیں اپنے مدعا کی توضیح میں پیش کریں۔ قرآن کی تعلیم اتنی صاف اور آسان ہے کہ ہر مرتبۂ عقل کا انسان بخوبی اسے جذب کر سکتا ہے۔ پھر کیوں نہ پُورا قرآن ہی سامنے رکھ دیں اور یہ مخلصانہ گزارش کر دیں کہ خالی الذہن ہو کر چشمۂ ہدایت سے سیرابی حاصل کرنے کی نیت سے قرآن پڑھیئے ورنہ پیشگی قائم کئے ہوئے نظریات و اعتقادات لئے ہوئے (خصوصیت سے جبکہ اُن کے ساتھ انتہائی تعصب موجود ہو) اگر قرآن پڑھا جائے گا تو دراصل قرآن کی آیتیں نہیں پڑھی جائیں گی۔ بلکہ اپنے ہی خیالات و نظریات کی تلاوت ہو گی۔ تاہم چند آیات بطور مثال ملاحظہ ہوں:-

---

[1] اِنّی ترکت فیکم الثقلین (الحدیث)

سورۂ فاطر رکوع ۲ میں ہے:-

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ ۝ إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ۝

اس کے سوا تم جن کو پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اگر تم اُن کو پکارو تو وہ تمہاری پکار نہ سُنیں اور اگر سُن لیں تو تمہارا کہنا نہ کر سکیں۔ قیامت کے دن وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تجھ کو ایک باخبر شخص کی طرح کوئی نہیں بتلائے گا!

اس آیت کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ یہاں بے جان معبودوں کا ذکر نہیں ہو رہا ہے بلکہ جاندار اور ذی شعور ہستیوں کا ذکر ہے۔ کیونکہ پکار کا نہ سننا، سُن لیں تو جواب دینے یا کام بنا دینے کا اختیار نہ رکھنا اور شرک سے انکار کر دینا لکڑی پتھر کی مورتیوں کے افعال نہیں ہیں۔ اُنھیں کے متعلق اللہ نے صاف خبر دی ہے کہ اُنھیں کسی قسم کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ انھیں جو لوگ طلب حاجات کیلئے پکارتے ہیں اللہ نے ان کے اس فعل کو "شرک" قرار دیا ہے اور خبر دی ہے کہ قیامت میں وہ اس شرک کا انکار کریں گے۔ شرک کے انکار کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس فعل کے شرک ہونے کا انکار کریں گے۔ کیونکہ خدا خود جس فعل کو شرک ٹھہرائے اُس کا انکار کسی کے بس میں نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبردستی کے بنائے ہوئے معبود اس فعل سے اپنی برأت ظاہر کریں گے۔ وہ کہیں گے نہ ہم نے انھیں یہ فعل کرنے کا حکم دیا تھا اور نہ ہمیں یہ اطلاع تھی کہ ہمارے پیچھے کس نے ہمیں کیا کچھ بنا رکھا ہے۔ اللہ نے یہ خبر اس لئے دی ہے کہ جو لوگ غلط امیدوں کے سہارے اپنی زندگی گزار رہے ہیں اُن کو پیشگی متنبّہ کر دیا جائے تاکہ قیامت کے دن وہ اپنی امیدوں کے طلسم کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر پچھتانے کی بجائے ابھی سے اپنی غلط فہمیوں کو دُور کر لیں۔ اور صحیح رویّہ پر قائم ہو جائیں۔ چنانچہ آیت کا آخری فقرہ خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ مقصود بیان یہ ہے کہ خدائے خبیر سے بڑھ کر صحیح خبریں تمہیں کون بتا سکتا ہے۔ پس جو کچھ اللہ نے بتا دیا ہے اس سے کم یا زیادہ پر ایمان لانا پہلے درجہ کی حماقت ہے۔ علم و خبر کا سرچشمہ تو وہی ہے۔ جب وہیں سے تم کو وہ خبریں نہیں مل سکتیں جنہیں تم مان رہے ہو تو بے خبری کے اندھیرے میں جو کچھ تم کرو گے، اس کا نقصان تمہیں کو اُٹھانا پڑے گا۔

اسی سورۂ فاطر میں آگے ارشاد ہوتا ہے:-

قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ۝ (رکوع ۵)

کہہ دو کہ ذرا اپنے شریکوں کو تو دیکھو جنہیں اللہ کو چھوڑ کر تم پکارا کرتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کہ آخر انہوں نے زمین کا کونسا حصہ پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں اُن کا کوئی ساجھا ہے یا پھر ہم نے اُن کو کوئی کتاب دی ہے کہ یہ اس کی سند پر قائم ہیں۔ بات یہ ہے کہ ظالم ایک دوسرے سے جو کچھ وعدہ کر رہے ہیں محض دھوکا ہے۔

یعنی یہ اپنے رویّے کے حق میں عقلی و نقلی کسی قسم کی دلیل نہیں رکھتے۔ اگر رکھتے ہیں تو بتلائیں کیوں نہیں کہ زمین و آسمان کی تخلیق میں اُن کے اپنے معبودوں کا کیا حصہ ہے یا پھر یہی بتا دیں کہ ہم نے آخر کہاں کس جگہ اور کب یہ حکم دیا ہے کہ چونکہ ہماری

سلطنت چند با اختیار ہستیوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے، جن میں سے ہر ایک تمہاری پکار کا مستحق ہے لہذا انہیں پکارا کرو۔ جو لوگ عقلی ونقلی دلائل سے بے نیاز ہو کر بے بنیاد عقیدے اور طریقے اختیار کرتے ہیں وہ ظالم ہیں اور آپس میں یہ جو کچھ وعدے وعید کرتے ہیں وہ صرف دھوکا ہے ــــ!

یہی مضمون سورۂ احقاف کے پہلے رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔ فرمایا:۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَّا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ
شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝
وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُو مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ
عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ ۝ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ۝

کہہ دو ذرا دیکھو کہ تم اللہ کو چھوڑ کر جن ہستیوں کو پکارا کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ انہوں نے زمین کا کونسا حصہ پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں ان کی کوئی شرکت ہے۔ اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا کوئی علمی روایت پیش کرو۔ اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان ہستیوں کو پکارے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہیں کر سکتیں۔ بلکہ اُن کی دُعا سے بھی وہ بے خبر ہیں جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو وہ اُن کے دشمن ہو جائیں گے اور اُن کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔

ان آیات سے حسب ذیل حقائق بداہتہً ثابت ہیں:۔

(۱) "عبادت" محض نماز روزہ کا نام نہیں ہے بلکہ دُعا بھی عین عبادت ہے۔ جو شخص نماز روزہ خدا کے لئے کرے۔ لیکن مشکل کشائی، فریادرسی اور قضاء حاجات کے لئے اسے چھوڑ کر کسی اور کو پکارے، وہ خدا کے ساتھ دوسروں کو عبادت میں شریک کرنے کا مجرم ہے۔

(۲) یہ پرلے درجہ کی گمراہی ہے کہ خدا کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں کو پکارا جائے کیونکہ کوئی اور ہستی کسی کی پکار کا جواب دینے پر قادر نہیں ہے، اور جواب دینا تو ایک طرف کسی کو کسی کی پکار کی خبر تک نہیں ہوتی۔ حد یہ ہے کہ یہاں جن جن ہستیوں کو لوگوں نے معبود بنا ڈالا انھیں جب قیامت کے دن اس کی اطلاع ہوگی تو اس پر اُن کا خوش ہونا تو درکنار اُلٹے وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں لوگوں کا یہ طرزِ عمل اتنی شدید ضلالت ہے جس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا!

(۳) عقائد و اعمال کی بنیاد ہمیشہ عقلی ونقلی دلائل پر قائم ہونی چاہیئے۔ ظنیات و توہمات یا خالی خولی جذباتی باتیں لائق توجہ تک نہیں ہیں، چہ جائیکہ انہی پر مستقلاً اپنے عقائد و اعمال کی عمارت کھڑی کر لی جائے۔ پس جب یہ معلوم ومسلّم ہے کہ تخلیق کائنات میں اللہ نے کسی اور کو شریک نہیں کیا ہے اور نہ اُس نے قرآن میں یا اس سے پہلے کی کسی کتاب میں شرک فی الدعا یا شرک فی العبادت کا حکم دیا ہے تو پھر لوگوں کو خود سوچنا چاہیئے کہ اُن کی ضلالت کا انجام کیا ہوگا۔

یہ اولیاء پرستی دراصل اس عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ انھیں نفع ونقصان پر قدرت حاصل ہے اور اُن کے یہ اختیارات کچھ ایسے عالمگیر و ہمہ گیر ہیں کہ وہ اپنی کارروائیوں میں خود خدا کے اذن کے بھی پابند نہیں ہیں حتیٰ کہ اگر خدا

کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو یہ آڑے آتے اور بندوں کو اس سے بچا لیتے ہیں۔ اور فائدہ پہنچانا چاہے تو ان کی رضا مندی کے بغیر وہ بندوں کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ یہی عقیدہ ان کی رضا مندی و ناراضی کو اصل معیار قرار دیتا ہے اور پروا نہیں کی جاتی کہ خدا کس عمل سے خوش اور کس سے ناخوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت جگہ اس عقیدہ کی پُرزور تردید کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:-

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۔ (زمر رکوع ۴)

کہہ دو ذرا دیکھو تو سہی کہ اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو تم اللہ کو چھوڑ کر جن جن کو پکارتے ہو کیا وہ اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں؟ یا اگر وہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ تم کہہ دو کہ میرے لئے تو اللہ کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اُسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

سورہ جن میں فرمایا:-

قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۔ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۔ (رکوع ۲)

کہہ دو کہ میں تمہارے کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ تمہاری کسی بھلائی کا۔ تم کہہ دو کہ مجھ کو خدا سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ پا سکتا ہوں!

جو لوگ اولیاء کو اس درجہ نفع و نقصان پر قادر نہیں مانتے کہ خدا کے اذن کے وہ پابند ہی نہ ہوں، انھیں شفاعت عقیدہ ایک اور رُخ سے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان حضرات کو نفع و نقصان کے اختیارات دیئے گئے ہوں یا نہ دیئے گئے ہوں۔ بہرحال یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں اور جیسا کہ دُنیوی سلطنتوں میں ہوا کرتا ہے بسا اوقات ان سفارشیوں کو اصل حاکم سے زیادہ قدر و منزلت اور تعظیم و عبودیت کا مستحق ٹھہرا لیا جاتا ہے۔ کیونکہ انہی کی اچھی بُری سفارشوں پر حاکمِ اعلیٰ کے سارے فیصلوں اور اس کی ساری کارروائیوں کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ کی بھی جگہ جگہ تردید کی ہے:-

لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ (انعام رکوع ۶)

اُس کے سوا نہ اُن کا کوئی مددگار ہے نہ کوئی سفارشی!

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۔ (انعام رکوع ۸)

اللہ کے سوا نہ اُس کا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارشی!

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (سجدہ رکوع ۱)

اس کے سوا نہ تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارشی۔ کیا تم نہیں سمجھتے؟

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ۔ (مومن رکوع ۲)

ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی جس کا کہا مانا جائے!

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ
زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ
هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ (زمر رکوع ۱)

جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز تجویز کر رکھے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ ہم اُن کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ مرتبہ میں ہمیں اللہ سے قریب کر دیں ۔ اللہ اُن کے درمیان تمام مختلف فیہ معاملات کا فیصلہ کر دے گا ۔ اللہ کسی ایسے شخص کو راہ راست نہیں دکھاتا جو جھوٹا اور ناشکرا ہو !

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۗءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا
يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۔ (زمر رکوع ۵)

کیا ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے ۔ کہو کہ اگرچہ یہ کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ نہ سمجھتے ہوں ؟ تم کہہ دو کہ سفارش کا اختیار تو تمامتر اللہ ہی کو حاصل ہے !

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا
عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّـــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ
وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (یونس رکوع ۲)

یہ اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کر رہے ہیں وہ نہ ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع ۔ اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں ۔ اے محمدؐ ! ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں ۔ اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں اللہ پاک اور بالا و برتر ہے !

" شُفَعَاۗءُ " کا عقیدہ رکھنے والے احمقوں کا آخری حسرت ناک انجام دیکھئے ۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ
وَرَاۗءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ
شُرَكٰۗؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ (انعام رکوع ۱۱)

بیشک تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہوگئے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا جو کچھ ہم نے تم کو دنیا میں دیا تھا وہ سب پیچھے چھوڑ آئے ۔ اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے ۔ تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے !

يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ ۔۔ مِنْ شُفَعَاۗءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ
فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ (اعراف رکوع ۶)

جس روز وہ انجام سامنے آجائے گا تو وہی لوگ جو اُس کو بھولے ہوئے تھے کہنے لگیں گے کہ واقعی ہمارے رب کے رسُول حق لے کر آئے تھے پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیجدیا جائے تاکہ جو کچھ پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دُوسرے طریقہ پر کام کرکے دکھائیں ۔ بیشک ان لوگوں نے اپنا نقصان خود کیا اور اُن کی ساری افترا بندیاں آج گُم گئیں گزری ہوگئیں ۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ٥ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ٥ (روم رکوع ۲)

جس روز قیامت برپا ہوگی تو مجرم سخت نا امید ہو جائیں گے ۔ ان کے شریکوں میں کوئی اُن کا سفارشی نہ ہوگا اور یہ لوگ اپنے شریکوں سے منکر ہو جائیں گے ۔

" شفاعت " کا یہ عقیدہ چونکہ دُوسروں کیلئے علم غیب کے حاصل ہونے کے عقیدہ کو مستلزم ہے اس لئے قرآن نے اس کی بھی نفی کردی ہے :-

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ (انعام رکوع ۷)

اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ (نمل رکوع ۵)

کہہ دو کہ سوائے خدا کے زمین و آسمان کی کوئی ہستی غیب کا علم نہیں رکھتی ۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ٥ (اعراف رکوع ۲۳)

اے محمدؐ ! تم کہہ دو کہ مشیّتِ خدا کے بغیر میں اپنی ذات کے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا اگر میں عالم الغیب ہوتا تو یقیناً بہتیرا نفع اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا !

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ (احقاف رکوع ۱)

اے محمدؐ ! تم کہہ دو کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا ؟

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ آپؐ یہ کہہ دیں ۔ چنانچہ حضورؐ نے بھی اپنی زبانِ مبارک سے یہی کچھ ارشاد فرمایا ہے ایک حدیث میں ہے :-

وَاللّٰهِ لَا اَدْرِيْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۔ (مشکوٰۃ باب البکاء والخوف ۔ بحوالہ بخاری بروایت اُمّ علا)

خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ خود میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا درآنحالیکہ میں اللہ کا رسُول ہوں ۔

یہ اولیاء پرستی بالعموم دو شکلوں میں ظہور کرتی رہی ہے ، ایک یہ کہ خدا پرستی کو بالکل ترک کرکے اولیاء پرستی ہی کو عین خدا پرستی تصور کر لیا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ خدا پرستی کے ساتھ ساتھ اولیاء پرستی بھی چلتی رہتی ہے ، چنانچہ ان دونوں تصورات کو رد کرنے کے لئے کہیں اللہ تعالیٰ نے تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (تم پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر) فرمایا ہے اور کہیں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے بجائے مَعَ اللّٰهِ (اللہ کے ساتھ) کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ سورۂ مومنون کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے :-

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ
اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے!

سورۂ نمل کے پانچویں رکوع میں توحید کے دلائل دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بار بار اس سوال کو دہرایا ہے کہ:-

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے۔

چنانچہ ان آیات کے منجملہ ایک آیت یہ ہے:-

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

وہ کون ہے جو مجبور اور بے قرار آدمی کی دعا قبول کر لیتا ہے جبکہ وہ اسے پکارنے لگتا ہے اور پھر اُس کی مصیبت دور کر دیتا ہے۔ اور تمہیں زمین میں نیابت کا شرف بخشتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے؟ مگر تم لوگ بہت کم نصیحت مانتے اور اسے بہت کم یاد رکھتے ہو!

یہی غلط ذہنیت ہے جو زندہ اور مُردہ بزرگوں کی تعظیم و تکریم میں غلو کرواتی اور بالآخر اُن کی پرستش و عبودیت تک لے جا کر چھوڑ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ زندوں سے کہیں زیادہ مُردوں کی پرستش کی جاتی ہے اور یہ عقیدہ قائم کر لیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد تصرفات بیں اور اونچے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اسی عقیدہ سے اہلِ قبور کے ساتھ وہ وہ کچھ کیا جاتا ہے جو زندہ بزرگوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اہلِ قبور کی پرستش کی بھی تردید فرمائی ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل کے دوسرے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ؕ اَمْوَاتٌ
غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝

اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں۔ بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مُردہ ہیں۔ زندہ نہیں ہیں اور اُن کو کچھ معلوم نہیں کہ انھیں کب اُٹھایا جائیگا!

ان دونوں آیتوں میں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی گئی ہے وہ نہ تو فرشتے اور شیاطین ہیں اور نہ لکڑی پتھر کی مورتیاں بلکہ صرف اصحابِ قبور ہیں کیونکہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں ان پر اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ رہ گئیں لکڑی پتھر کی مورتیاں، تو اُن کے لئے شعور و عدمِ شعور کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ بعث بعد الموت ہی اُن سے متعلق ہے۔ لہٰذا الذین یدعون من دون اللہ سے صرف وہ غیر معمولی انسان مُراد ہیں جن کی وفات کے بعد غالی معتقدین انھیں داتا، مشکل کشا، فریاد رس، بندہ نواز، غریب نواز، گنج بخش، دستگیر اور نہ معلوم کن کن القاب سے ملقب کر کے اُن سے اپنی جملہ ضروریات وابستہ کر دیتے ہیں اور پھر انھیں اپنی ہر چھوٹی بڑی ضرورت یا مصیبت کے وقت پکارنے لگتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں بھی مُردہ بزرگوں کی پرستش کا مرض بہت عام تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ اساف، نائلہ، لات، منات اور عزّیٰ وغیرہ دراصل انسان تھے۔ جنہیں بعد کے جہلا نے بُت بنا ڈالا اور خدائی کی صفات سے متصف کر دیا۔ آیتِ کریمہ۔ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝ (یعنی انہوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑ بیٹھنا اور نہ ود، اور سُواع اور یغوث اور یعوق اور

قبر کو چھوڑنا۔ سورۂ نوحؑ (رکوع ۲) کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کے جو الفاظ بخاری میں مروی ہیں وہ یہ ہیں:-

كلها اسماء رجال صالحين من قوم نوح عليه السلام فلما هلكوا اوحى الشيطان الى قومهم ان انصبوا الى مجالسهم التى كانوا يجلسون فيها انصابا وسموها باسمائهم ففعلوا فلم تعبد حتى اذا هلك اولئك ونسخ العلم عبدت۔

یہ سب نوح علیہ السلام کی قوم کے بزرگوں کے نام تھے۔ جب وہ لوگ مرگئے تو شیطان نے اُن کی قوم کو یہ بات سمجھائی کہ جہاں یہ لوگ بیٹھتے تھے وہاں کچھ نشان کھڑے کر لو اور اُن کے نام ان بزرگوں کے نام پر رکھ لو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس وقت تو اُن کی عبادت نہیں ہوئی مگر جب یہ لوگ مرگئے اور علم جاتا رہا تو اُن کی عبادت ہونے لگی!

اس روایت سے حسب ذیل امور بلا کسی تاویل و ابہام کے خود بخود ثابت ہوتے ہیں:-

۱۔ رجال صالحین ہمیشہ پوجے جاتے رہے ہیں۔

۲۔ صالحین کو معبود بنانا قطعی طور پر "وحی شیطانی" کا نتیجہ ہے۔ اس کو وحی الٰہی یا مرضیات الٰہی سے ذرّہ برابر تعلق نہیں ہے!

۳۔ صالحین کی نشست گاہوں، عبادت گاہوں اور رہائش گاہوں پر یادگاری نشان کھڑے کر دینا بھی صریحاً لغو فعل ہے!

۴۔ آستانوں اور انصاب و نشانات کو بزرگوں کے نام سے موسوم کرنا بھی "وحی شیطانی" ہی کا نتیجہ ہے!

۵۔ صالحین کی عبادت اُن کی زندگی سے زیادہ اُن کی وفات کے بعد ہوتی رہی ہے!

۶۔ مُردہ بزرگوں کی پرستش محض جہالت کا کرشمہ ہے۔ اس کو علم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے!

سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی بخشی ہوئی اعلیٰ درجہ کی بصیرت سے خوب جانتے تھے کہ رجال صالحین تو دراصل اپنے پورے وجود کے ساتھ دوسرے لوگوں کو صالحیت کا سبق دیتے ہیں۔ مگر کمزور ذہن اُن کی صالحیت کا اُلٹا اثر قبول کیا کرتے ہیں۔ اور اُن کی صالحیت رفتہ رفتہ ربوبیت و معبودیت سے متصف کر دی جاتی ہے، اس لئے آپؐ نے مختلف موقعوں پر مختلف الفاظ اور عبارتوں میں اپنی اُمت کو قبروں کے ساتھ غیر معمولی اعتنا و اہتمام برتنے سے بار بار منع فرمایا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کے باب دفن المیت میں بحوالہ مسلم حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ:-

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو گچ سے پختہ کرنے۔ اس پر عمارت بنانے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔

مشکوٰۃ کے اسی باب میں بحوالہ ترمذی حضرت جابرؓ ہی سے منقول ہے کہ:-

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا وَاَنْ تُوْطَاَ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو گچ سے پختہ کرنے، اُن پر لکھنے اور ان کو روندنے سے منع فرمایا۔

ان دونوں حدیثوں پر غور کیجئے۔ بنظر ظاہر قبروں کو پختہ کرنے اور ان پر کتبے اور گنبد تعمیر کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو اس کے فوائد و مصالح بیان کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مگر حضورؐ خوب سمجھتے تھے کہ اگر اس اہتمام کا

آغاز ہوگیا۔ تو یہ اہتمام احترام تک، اور احترام، سجدہ و طواف اور عبادت تک پہنچکر رہے گا۔ اس لئے آپؐ نے بالفاظِ صریح اس سے منع کر دیا تاکہ اُن راہوں کا سدِ باب ہی ہو جائے جہاں سے شرک دبے پاؤں داخل ہوتا ہے اور آگے چل کر خرافات و بدعات کا ایک طوفان اُٹھا دیتا ہے۔ رہ گیا قبروں پر بیٹھنا اور اُن پر لکھنا تو ظاہر ہے کہ خالی خُولی بیٹھنا یا صرف صاحبِ قبر کا نام اور تاریخ وفات وغیرہ لکھنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ طلبِ حاجات کے لئے یا مراقبہ و مجاہدہ کی خاطر یا مجاور و خادم بن کر وہاں نہ بیٹھنا چاہیئے۔ اور آیات و احادیث یا ایسے اشعار اور فقرے، جن میں صاحبِ قبر کی حمد و ستائش نہایت مبالغہ کے ساتھ کی گئی ہو۔ لکھنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ سارے افعال بآسانی شرک و بدعت تک منجر ہوتے ہیں۔ اور مقصود در اصل اسی راہ کو بند کرنا ہے۔ چنانچہ قبروں کو پختہ کرنا تو ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُونچی قبریں تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔

ابو الہیاج اسدی کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے مجھ سے فرمایا:۔

"کیا میں تم کو ایسے کام کے لئے نہ بھیجوں جس کے لئے خود مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا اور وہ یہ ہے کہ تم کسی مورت کو مٹائے بغیر اور کسی اُونچی قبر کو برابر کئے بغیر نہ چھوڑو۔"

(مشکوٰۃ باب دفن المیت بحوالہ مسلم)

یہی تعلیم تھی جس کی بنا پر قُبّے اور عالیشان عمارتیں بنانا تو درکنار صحابہ کرام کسی قبر پر معمولی ساخت شامیانہ یا سائبان تک دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عبدالرحمٰن کی قبر پر ایک شامیانہ لگا ہوا دیکھا تو فرمایا کہ "یا غلام انزعه انما یظله عمله" (اے لڑکے! اس کو الگ کردے، ان پر تو ان کا عمل سایہ کر رہا ہے)

ان شروعات کا راستہ جن جن مفاسد و قبائح تک پہنچتا ہے، اُن کی نسبت بھی حضورؐ کے احکام نہایت صاف و صریح ہیں۔ مثلاً فرمایا:۔

لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا ۔ میری قبر کو "عید" نہ بناؤ۔ (مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی بحوالہ نسائی، بروایت ابوہریرہؓ۔

ایک اور جگہ ہے:۔

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ ۔ اے اللہ میری قبر کو بُت نہ بنا تاکہ پوجی جائے۔

(مشکوٰۃ۔ باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ۔ بحوالہ مالک بروایت عطاء)

قبروں کو بُت بنا کر پُوجا جانا تو ایک صاف و صریح بات ہے جس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ البتہ لفظ "عید" کچھ تشریح طلب ہے۔ عید عربی لغت میں اُس چیز کو کہتے ہیں جو عود کرے یعنی بار بار آئے۔ چونکہ خوشی اور جشن کا روز سال بہ سال آتا رہتا ہے اس لئے اسے بھی عید کہا جاتا ہے۔ عید بلا تعیینِ روز و تاریخ نہیں آتی بلکہ اس کی ایک تاریخ معیّن ہوتی ہے، جس میں لوگ جمع ہوتے اور خوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی دعا منقول ہے کہ انہوں نے کہا تھا:۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا ۔

اے اللہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما تاکہ وہ ہمارے لئے، ہمارے اگلے پچھلے سب لوگوں کے لئے ایک خوشی کا دن قرار پائے۔

یہود و نصاریٰ اپنے بزرگوں کی قبروں پر سال بہ سال جمع ہوتے اور میلے لگایا کرتے تھے۔ سرکارِ رسالت مآبؐ نے اپنی اُمت کو حکم دیا کہ اس طرح روز و تاریخ معیّن کر کے میری قبر پر اجتماع نہ کرو جیسا کہ خوشی اور جشن کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ پھر دوسری حدیث میں وہ

غرض بھی واضح فرمائی ہے، جس کے لئے یہ میلے ٹھیلے اور اجتماعات منعقد ہوتے ہیں، یعنی قبر کو بُت بنا کر پُوجنا ۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ جب حضورؐ ہی نے اپنی قبر پر میلوں اور اجتماعات کو پسند نہ فرمایا اور نہ یہ پسند کیا کہ قبر مبارک ایک بُت بن کر رہ جائے جس کی پرستش ہوتی رہے، یہاں تک کہ اس کے لئے خدا سے دعا بھی مانگی، تو پھر دوسروں کو یہ حق کہاں سے پہنچ سکتا ہے کہ اُن کی قبریں بُت بنا کر پُوجی جائیں اور سال بہ سالی نہایت شان و اہتمام کے ساتھ وہاں میلے لگتے رہیں۔

اس امر واقعی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ حضورؐ افضل المرسلین و خاتم النبیین ہیں اور پُوری کائنات میں خداوند قدوس کے بعد آپؐ ہی کی ہستی بزرگ ترین ہستی ہے۔ اگر خدا کے سوا کسی اور چیز کی عبادت جائز ہوتی اور مزاروں پر سالانہ اجتماعات کسی درجہ میں بھی محمود و مقصود یا کم از کم جائز ہوتے تو حضورؐ کی قبر مبارک اس کی اوّلین مستحق تھی۔ مگر جب حضورؐ نے خود اپنی ذات کے لئے بھی اس کی نفی فرما دی تو پھر کسی دوسری قبر کے لئے اس کا تصوّر تک کرنا ایمان کو متزلزل کرنے کے لئے ہے! رہ گئے اس کے لئے جواز و استحباب کی کوشش کرنے والے یا اسے ضروری اور لازم قرار دینے والے۔ سو حضورؐ کے صریح ارشادات کی روشنی میں اُن کو اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیئے!

حضورؐ کے بعد پُوری امّت میں سب سے افضل صحابۂ کرامؓ کی جماعت ہے۔ لیکن کسی صحابی کے متعلق یہ سُننے میں نہیں آیا کہ اُن کی قبر کو بھی بُت بنا کر پُوجا گیا ہے اور "عرس" کے نام سے وہاں سالانہ اجتماع منعقد ہوتا رہا ہے۔ پس پُوری امت میں سے چند مخصوص اولیاء و صوفیاء کی قبروں کے ساتھ یہ سارا معاملہ بیّن طور پر انتہائی فسادِ عقیدہ کا مظہر ہے۔ جس سے ہر متبع شریعت مسلمان کو توبہ کرنی چاہیئے ــــ!

قبروں کی عبادت کا ایک جزو اور نہایت اہم جزو یہ ہے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی حضورؐ کے ارشادات نہایت واضح ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا:۔

لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ ۔

اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے۔ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ (مشکوٰۃ۔ باب مساجد و مواضع الصلوٰۃ بحوالہ صحیحین)

یہی ارشاد حضرت ابو ہریرہؓ کے واسطے سے بھی منقول ہے، جسے بخاری و مسلم کے علاوہ ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ مشکوٰۃ کے مذکورہ بالا باب میں مسلم کے حوالے سے ایک اور حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ وَصَالِحِیْھِمْ مَسَاجِدَ فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّیْ اَنْھَاکُمْ عَنْ ذٰلِکَ !

خبردار رہو۔ تم سے پہلے کے لوگ اپنے انبیاء و صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے۔ پس تم کہیں قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنا لینا، میں تمہیں اس فعل سے منع کرتا ہوں!

یہاں یہ امر بھی لائقِ ذکر ہے کہ انبیاء و صالحین کی قبروں کو سجدہ کرنا تو ایک طرف خود امام الانبیاء نے اپنی زندگی میں اپنی ذات با برکات کے لئے بھی سجدہ کو جائز نہیں رکھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ مہاجرین اور انصار کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک اُونٹ آیا اور اُس نے حضورؐ کو سجدہ کیا۔ اس پر اصحاب نے کہا کہ:۔

یَسْجُدُ لَکَ الْبَھَائِمُ وَالشَّجَرُ وَنَحْنُ اَحَقُّ اَنْ نَسْجُدَ لَکَ ۔

"جانور اور درخت آپؐ کو سجدہ کرتے ہیں، پس ہم تو آپؐ کو سجدہ کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔"

آپؐ نے فرمایا:-

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ اَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ -

عبادت صرف اپنے رب کی کرو، رہ گیا تمہارا بھائی تو اس کا صرف اکرام کیا کرو۔

ملاحظہ کیجئے مشکوٰۃ باب عشرۃ النساء بحوالہ امام احمد بروایت حضرت عائشہؓ - اس حدیث میں عبادت اور اکرام کا فرق بھی بتا دیا گیا ہے۔ اور رب کے مقابلہ میں دوسرے سارے انسانوں کو "بھائی" کہہ کر یہ امر بھی ذہن نشین کر دیا گیا ہے کہ ان میں باہمی کتنا ہی فرق مراتب ہو بہرحال وہ عبدیت کے رشتے سے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس اُن کا اکرام تو جائز ہے لیکن اس میں غلو کر کے عبادت تک نوبت پہنچا دینا فی الجملہ حرام ہے!

جو قبریں سجدہ گاہ تک کا مرتبہ حاصل کر چکی ہوں۔ ناممکن ہے کہ لوگ اُن پر دُور دراز سے سفر کر کے، سفر کا ساز و سامان ساتھ لئے نہایت اہتمام کے ساتھ حاضری نہ دیں۔ چنانچہ اسفارِ زیارت کا رواج عہدِ جاہلیت میں بھی تھا اور آج بھی اس کا مشاہدہ ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ حضورؐ نے اسے ممنوع قرار دیتے ہوئے صاف فرمایا کہ:-

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰى ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى وَمَسْجِدِیْ هٰذَا - (مشکوٰۃ - باب المساجد ومواضع الصلوٰۃ بحوالہ صحیحین بروایت ابوسعید خدری)

مطلب یہ ہے کہ زیارت کے واسطے کسی استھان یا مکانِ متبرک کو سفر کر کے جانا درست نہیں ہے۔ اس قسم کا سفر صرف تین مسجدوں کے لئے جائز ہے۔ ایک مسجدِ حرام یعنی کعبہ شریف۔ دُوسری مسجدِ اقصیٰ۔ تیسری مسجدِ نبویؐ - اس حدیث سے اسفارِ زیارت کی نوعیت خود بخود متعین ہو جاتی ہے!

جو لوگ ان تمام تنبیہات کے باوجود "زیارتِ قبر" کے نام سے "عبادتِ قبر" کرتے ہیں وہ دیدہ و دانستہ خدا کی لعنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اس معاملہ میں مرد و عورت دونوں یکساں ہیں لیکن زائرین کے مقابلہ میں زائرات کے لئے اعتقادی و اخلاقی فتنوں میں مبتلا ہونے کا زیادہ اندیشہ ہے، اس لئے خصوصیت کے ساتھ اُن پر حضورؐ نے لعنت فرمائی ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "لعن اللہ زائرات القبور"۔ احمد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "لعن اللہ زوّارات القبور"!

اُوپر کی توضیحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قبر پرستی اور اولیاء پرستی بالیقین "شرک" کی تعریف میں داخل ہے۔ لہٰذا اب شرک کی اہمیت بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے:-

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کی جو نصیحتیں نقل فرمائی ہیں، اُن میں ایک فقرہ یہ ہے:-

يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ - بیٹا! اللہ کا شریک نہ کرنا۔ بلاشبہ شرک بڑا ظلم ہے[1]

[1] حضرت لقمانؑ چونکہ بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے اس لئے اس کی فہم و ذکا کے مطابق انہوں نے شرک کو صرف ظلمِ عظیم کہہ کر چھوڑ دیا مگر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے ایک ایک فرد کو بلالحاظ مرد و عورت و بلالحاظ عام و خاص جو نصیحت فرمائی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:- لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ وَاِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ (مشکوٰۃ باب الکبائر بحوالہ احمد بروایت معاذ بن جبلؓ) یعنی اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا اگرچہ تو قتل کر دیا جائے یا جلا ڈالا جائے!

قرآن میں "ظلم" بالعموم گناہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پس شرک اس لحاظ سے ایک بڑا گناہ قرار پاتا ہے۔ لیکن قرآن ہی بتاتا ہے کہ اس گناہ کی حیثیت دوسرے گناہوں سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے گناہ چاہے وہ بجائے خود کتنے ہی بڑے ہوں لائق معافی ہیں۔ لیکن شرک بالکل ناقابلِ معافی جرم ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى إِثْمًا عَظِيْمًا ۝

یقیناً اللہ اس امر کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے۔ ہاں اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں انھیں وہ جس کے لئے چاہے گا معاف کردے گا۔ کیونکہ جس نے اللہ کا شریک قرار دیا اُس نے ایک بڑا گناہ افترا کیا۔! [1]

حضرت لقمانؑ کی نصیحت میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے اسے اثم عظیم فرمایا ہے اور اس پر لفظ "افترا" ایزاد کیا ہے۔ جو جھوٹ تصنیف کرنے کا ہم معنی ہے۔ اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دوسرے گناہ تو کسی نہ کسی عارضی سبب سے سرزد ہوا کرتے ہیں لیکن شرک کی سرے سے کوئی علت ہی نہیں۔ یہ محض انسان کے توہم پرستانہ ذہن کی خلاقی ہے۔ آیت شریفہ میں مَا دُوْنَ ذٰلِكَ گناہوں کی معافی کا جو اعلان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک سے بچا رہے۔ باقی دوسرے گناہ خوب دل کھول کر کئے جائیں۔ بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک کو ایک بہت معمولی گناہ نہ سمجھا جائے۔ یہ تو تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، یہاں تک کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ گناہ قطعی طور پر ناقابلِ معافی ہے۔ اس سے ان لوگوں کا سر سر غلط ہونا پوری طرح واضح ہوتا ہے جو شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے ہیں بلکہ ان کا سارا وقت فقہیانہ جزئیات کی ناپ تول ہی میں صرف ہوتا رہتا ہے۔ لیکن شرک اُن کی نگاہ میں اتنا ہلکا فعل ہے کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ طرح طرح کی تاویلوں اور تحریفوں سے شرک کو توحید کا لباس پہنانے میں بھی تامل نہیں کرتے اور تحریف کا کمال یہ ہے کہ شرک جلی کو شرک خفیف تک بنا ڈالتے ہیں۔

اسی سورۂ نساء میں چند رکوع آگے ارشاد ہوتا ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝ (رکوع ۱۸)

یقیناً اللہ شرک کو معاف نہیں کرے گا۔ البتہ اس کو چھوڑ کر دوسرے گناہ جس کے لئے چاہے گا معاف کردے گا۔ جو شخص اللہ کا شریک قرار دیتا ہے وہ گمراہی میں بہت دُور نکل گیا۔!

---

[1] ایک حدیث قدسی میں یہی مضمون بدیں الفاظ نقل کیا گیا ہے۔

يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوْ لَقِيْتَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِيْ لَا تُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً (مشکوٰۃ باب الاستغفار بحوالہ ترمذی بروایت حضرت انسؓ)

یعنی اے ابن آدم! جب تُو مجھ سے ملے تو چاہے زمین بھر گناہوں کا بوجھ لئے ہوئے ہو مگر مجھ سے ملے اس حالت میں کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ قرار دے تو یقیناً میں تیرے پاس زمین بھر بخشش لے آؤں گا۔!

یعنی دوسرے گناہوں کے ارتکاب میں بھی آدمی وقتی طور پر راہ ہدایت سے انحراف کر جاتا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت کیچڑ سے بھری ہوئی چکنی زمین پر چلنے والے کی لغزش کی سی ہوتی ہے، برخلاف اس کے ایک مشرک راہِ ہدایت سے ہٹ کر اتنی دُور نکل جاتا ہے کہ ضلالت کے جنگل ہی میں سرگشتہ و حیران ہو کر رہ جاتا ہے اور راہ ہدایت اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں اُس کی سرگشتگی اُس کی تباہی پر ختم ہوتی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو نہایت بلیغ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔ سورۂ حج میں ہے:-

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ۝ (رکوع ۴)

جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ گویا آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اُسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا اُس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کی ہڈیاں پس کر رہ جائیں گی!

یہ تو شرک کا دُنیوی انجام ہے۔ رہا اُخروی انجام تو سورۂ مائدہ میں فرمایا کہ:-

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝ (رکوع ۱۰)

جو شخص اللہ کا شریک قرار دیتا ہے، اُس پر اللہ نے جنّت حرام کر دی ہے اور اُس کا ٹھکانا آگ ہے، ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں!

یہی شرک ہے جس کے متعلق سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ نے کم و بیش اٹھارہ پیغمبروں کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (ملاحظہ فرمائیے رکوع ۱۰) یعنی اگر ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا کیا کرایا سب غارت ہو جاتا!

ہم پوچھتے ہیں کہ شرک سے متعلق اس سے زیادہ تند رجحانات اور کیا ہو سکتے ہیں؟ جب انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ جماعت کے اعمال بھی شرک کی وجہ سے قابلِ ضبط قرار پا سکتے ہیں۔ تو وہ دوسرے کون ہیں جنہیں "شرک" کے بعد اپنے اعمال کی کوئی جزا ملنے یا شرک کی سزا سے بچ رہنے کا اطمینان حاصل ہے۔ شرک تو ظلمِ عظیم ہے۔ اور ایسے تمام ظالموں کے لئے اللہ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ ان کا کوئی مددگار نہیں۔ اب نہیں معلوم اللہ کے ارشاد کے مقابلہ میں کس کے "ارشادات" ظالموں کو کہیں سے مدد پہنچنے کا یقین دلا رہے ہیں؟

(۲)

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر قبر پرستی، اولیاء پرستی اور اس کے سارے لوازم و مقتضیات شرک یا قریب بہ شرک یا شرک کی طرف لے جانے والے وسائل و ذرائع ہیں تو پھر قرآن و حدیث کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں خود مسلمانوں کے اندر اس کا کثرت سے شیوع اس حد تک کیسے پہنچ گیا کہ آج شاید کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں ایسا نہیں جو اس کی پرچھائیں سے محفوظ رہا ہو۔ سو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۔ یعنی پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں۔ اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہارے لئے کتنی ہی تعجب انگیز کیوں نہ ہو۔ اور دوسرا جواب بس یہ ہے کہ یہ سب کچھ علمِ دین کی کمی اور انتہائی کمی کی وجہ سے ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس معاملہ کے بہت سے تاریخی،

نفسیاتی اور داخلی وخارجی اسباب بھی ہیں۔ جن کی طرف ہم یہاں مختصراً اشارہ کئے دیتے ہیں۔

مسلمانانِ ہند کی پچھلی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کسی منظم کوشش کے نتیجہ میں نہیں پھیلا ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر عمومی حالت یہ رہی ہے کہ بالکل ایک غیر منظم طریقہ سے کہیں کوئی صاحب علم گئے، جن کے اثر سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے۔ کہیں کوئی تاجر پہنچ گیا جس کے ساتھ ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا اور کہیں کوئی نیک نفس اور رخدا رسیدہ بزرگ تشریف لے آئے، جن کے بلند اخلاق اور پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ بلکہ بہت سے تاریخی تذکرے تو اس امر کی شہادت بھی دیتے ہیں کہ بہت سے غیر مسلم، اسلام کے ابتدائی مقتضیات تک کو جاننے بوجھے بغیر محض خوارق وکرامات کے مشاہدہ سے مسلمانوں میں آشامل ہوتے رہے ہے۔ اس حالت میں ضروری تھا کہ جو لوگ مسلمان ہوتے چلے گئے اُن کے فکر وعمل میں وہ پُورا انقلاب لایا جاتا جو اسلام میں مطلوب ہے۔ کیونکہ تاریخ ونفسیات پر اور بالخصوص اسلام وجاہلیت کی کشمکش پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی دُوسرے مذہب سے نکل کر اسلام میں آجانا جتنا آسان ہے۔ اعتقادات وخیالات سے لے کر رسوم واعمال تک کے ایک ایک گوشہ میں پُوری طرح اسلامی روح کو جذب کرنا اُتنا آسان نہیں ہے!

اس کے لئے باقاعدہ تعلیم وتربیت اور ایک مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے اور خود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ دین اور سعیٔ اصلاح اس پر شاہد ہے کہ جاہلیت سے نکل کر آنے والے لوگوں کو اسلام کے معیارِ مطلوب تک پہنچانے کے لئے آپ نے مستقل اور مسلسل کتنی توجہ فرمائی اور اس کے باوجود عرب کے ابتدائی معاشرے میں کبھی کبھار جاہلی فکر اُبھر آتی تھی ــــ یہ منظم اور انتھک جدوجہد کی ضرورت اُس ملک اور اس معاشرہ میں اور بھی زیادہ اہم ہوجاتی ہے، جہاں مشرکانہ عقائد اور مشرکانہ خیالات وتوہمات دل ودماغ میں خوب گہرے اُترے ہوئے ہوں۔ اور مشرکانہ اعمال ورسوم انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ کو پُوری طرح اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے سرزمینِ ہند جو حیثیت رکھتی ہے اُس سے کون واقف نہیں!

پس یہ نہایت ضروری تھا کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس کے استحکام کا اُتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہتمام کیا جاتا۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ علماء نے اپنے مدرسوں اور تعلیمی خدمات کے ذریعہ اور صوفیاء نے اپنی خانقاہوں اور اپنے سلسلۂ بیعت وارشاد کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کی اپنی سی کوششیں جاری رکھیں* مگر ایک طرف تو اُن کے پاس ایسے ذرائع نہ تھے کہ نہایت وسیع پیمانہ پر دائرہ اسلام میں آنے والے لاکھوں کروڑوں افراد کی مکمل اصلاح کر دیتے۔ دُوسری طرف اُن کی کوششوں اور کاوشوں کے اثرات فطرتاً اُونچے اور متوسط طبقے پر ہی پڑ سکتے تھے۔ اور انہی طبقوں نے کم وبیش فائدہ بھی اُٹھایا۔ لیکن عوام الناس توحید کے تقاضوں سے بے خبر اور آبائی عقائد و اوہام میں مبتلا رہے!

اسلام پھیلانے والے بزرگوں کی مساعیٔ جمیلہ کو پُوری طرح کامیاب بنانے کے لئے عین ضروری تھا کہ وقت کی حکومتیں اُن کے ساتھ تعاون کرتیں، اور دُوسرے مذاہب سے نکل نکل کر آنے والے تمام مسلمان فرداً فرداً نہ سہی، کم از کم اپنی ایک معتدبہ اکثریت کے ساتھ انفرادی واجتماعی حیثیت سے اسلام میں پُوری طرح جذب ہو جاتے۔ اسلامی حکومت تو غیر مسلموں کے لئے دعوتِ اسلام کا ایک بہترین عملی مظہر اور مسلمانوں کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک منظم ادارہ ہوا کرتی ہے۔ اس لئے مسلم حکمرانوں کا کام یہ تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ اسلام کی توسیع کی اور نظامِ تعلیم ونظامِ قانون وسیاست

* اور مسلمانوں کے فکر وعمل میں جتنی درستگی پیدا ہو سکی اور ترقی کرتی گئی، وہ انہی بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

کے ذریعہ اسلام کے استحکام کی کوشش کرتے مگر یہاں جو لوگ فتح و ظفر کے جھنڈے اڑاتے درۂ خیبر سے آگے بڑھے اور اندرون ملک چاروں طرف پھیل گئے وہ خود نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اور اسلام بھی اس وقت لائے تھے جب خود اس کے تہذیبی مرکزوں (حجاز، عراق، اور شام وغیرہ) میں انحطاط رونما ہو چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ملک گیری اور کشور کشائی ہی کو زیادہ تر اپنا نصب العین بنا لیا اور دنیوی عیش و تنعم ہی کو بہت کچھ سمجھ بیٹھے۔ اس صورتِ حال میں ان کی حکومتیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا معیاری ادارہ نہیں بن سکتی تھیں اور نہ بنیں ——!

یہ حکومتیں اسلامی دعوت و تبلیغ کا کام تو کیا انجام دیتیں جن اللہ کے بندوں نے یہ کام شروع کر رکھا تھا اور جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ اُن کے ساتھ تعاون تک نہ کیا بلکہ کتنے ہی وقتوں اور موقعوں پر وہ اپنے سارے وسائل و ذرائع اور اپنے سارے حاکمانہ اختیارات کے ساتھ اُن کی راہ میں حائل ہوئیں اور ان بیچاروں کو درباری اثر و رسوخ اور شاہی اقتدار کا سخت مقابلہ کر کر کے اپنا کام جاری رکھنا پڑا۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ سخت سے سخت مظالم کا تختۂ مشق بنے اور طرح طرح کی سختیاں جھیلتے رہے، اگرچہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہونے والے سارے ہی مسلمان بادشاہ نااہل و ناکارہ اور فاسق و فاجر نہیں تھے۔ ان میں شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود، محمد تغلق، فیروز تغلق، سکندر لودی اور ایسے ہی بعض دوسرے فرمانروا بھی گزرے ہیں۔ جنہوں نے نیکی اور پاکیزگی کے لحاظ سے تاریخ میں ایک خاص مقام پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کی دینداری اوّل تو شخصی دینداری تھی، دوسرے انہوں نے شرک کو مٹانے اور توحید کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے تعلیم و تربیت اور تنفیذ قوانینِ الٰہیہ کی جو کوششیں کیں وہ مسلمانوں کی روز افزوں آبادی میں اُن کے ایک ایک فرد کے اندر شرک کے جراثیم کو پوری طرح ہلاک کر دینے کے لئے کافی نہیں تھیں۔ پھر موروثی شاہی نظام اُن کے پوری طرح کامیاب ہونے میں بھی مانع تھا۔ کیونکہ آئے دن اچھے اور برے افراد کا اَدل بدل ہر اصلاحی کوشش پر اثر انداز ہوتا اور یہ کوششیں اپنے پورے نتائج تک پہنچنے بھی نہ پاتیں کہ اس طرح ختم کر دی جاتیں گویا یہاں دین کی خدمت اور اصلاح حال کا کوئی کام کیا ہی نہیں گیا، اس لئے شرک اپنے بال و پر نکالتا ہی رہا اور اس کی سمیت سے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کا ذہن متاثر ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ایک وہ دور بھی آگیا کہ شرک کو باقاعدہ سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی!

یہ مغلیہ خاندان کے مشہور بادشاہ اکبر کا دور تھا جس میں اگر کائناتی قیامت نہ آئی نہ سہی، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دینِ اسلام پر قیامت آ گئی۔ یہ شخص اَن پڑھ تھا اور اس کے درباری و مصاحب سخت گم کردہ راہ۔ اس کے منحوس دور میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے دائرہ میں شرک اپنے عالم آشوب ناز و انداز کے ساتھ پورے کبر و افتخار کا مظاہرہ کرتے ہوئے داخل ہوا بلکہ سرے سے دینِ اسلام ہی پر خطِ تنسیخ پھر گیا۔ اور بادشاہ کی خدمت میں ایک محضر نامہ پیش کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ۔

"بادشاہ ظل اللہ ہے، مہدی ہے، صاحبِ زماں ہے، امامِ عادل ہے، مجتہد العصر ہے،
کسی کا پابند نہیں، اُس کا حکم سب پر بالا ہے۔"

چنانچہ اسے معصومیت کی سند دے دی گئی۔ اور وہ اپنی عقل کو بھی معصوم سمجھنے لگا۔ ایک صاحب تو یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو خدا کا عکس ہی ٹھہرا دیا۔ بس پھر کیا تھا ایک نئے دین کی نیو پڑ گئی۔ اس نئے دین کا نام برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق "دینِ الٰہی" رکھا گیا۔ اور اس کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ تجویز کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے ان کو "دینِ اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ ام تُبرّا و توبہ کرنی پڑتی اور ان کو لفظ "چیلہ" سے تعبیر کیا جاتا۔

بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی جسے وہ پگڑی میں لگاتے۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری دی جاتی تو اس کے سامنے سجدہ بجا لایا جاتا۔ درباری علماء و صوفیاء بے تکلف سجدہ فرماتے اور اس صریح شرک کو "سجدۂ تحیتہ" اور "زمین بوسی" جیسے الفاظ کے پردہ میں چھپاتے، اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنے کے وقت قیام تعظیمی کیا جانے لگا۔ حضرت مریمؑ کو بھی معبود بنایا گیا۔ اور ستاروں کی پرستش بھی کی گئی۔ خود اکبر نے مشرک عورتوں سے شادیاں کیں، جس کی وجہ سے قصر شاہی میں ہندو تہذیب و معاشرت کا سکہ چلنے لگا۔ ان کے لئے قصر میں خاص عبادت خانے بنائے گئے، اور بتوں کی پوجا کا باقاعدہ انتظام ہوا — ہندو تہوار دیوالی، دسہرہ، راکھی پونم، شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ہون کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی۔ اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام زبان پر آتا تو "جلت قدرتہ" کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ دوش و کمر پر جنیو ڈالا جاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی — !

اب آپ ایک طرف اکبری حدودِ سلطنت اور حکومت کی اسلام دشمنی پر نظر کیجئے اور دوسری طرف ان کروڑوں مسلمانوں کا تصور کیجئے جو لاکھوں مربع میل زمین میں پھیلے ہوئے اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ اور پھر اندازہ لگائیے کہ جب ایک عظیم الشان شاہی حکومت کفر و شرک کی علمبردار ہو تو لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی باقاعدہ دینی تعلیم و تربیت اور ان کی مکمل ذہنی اصلاح کے لئے ان چند علماء و صوفیاءِ حق کی کوششیں کس حد تک مفید ہو سکتی ہیں جو حکومت کے ذرائع و وسائل سے نہ صرف محروم ہو کر بلکہ ان کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے متفرق طور پر اپنا کام کر رہے ہوں!

کم و بیش ربع صدی تک "دینِ الٰہی" کی شاہانہ سرپرستی کر کے جب اکبر دنیا سے رخصت ہوا تو جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ نظم و سیاست میں اس کا عدل عام طور پر مشہور ہے۔ لیکن خود دینِ اسلام پر اس نے اتنا بڑا ظلم کیا کہ محض سجدۂ تحیتہ نہ کرنے کے جرم میں خدا کے ایک صالح و مصلح بندہ کو اس نے جیل میں بھیج دیا۔

جہاں تک اقامت توحید، ازالۂ شرک، احیاء سنت اور انعدام بدعت کا تعلق ہے، نہ صرف شخصی زندگی میں بلکہ حکومت کے تمام ممکنہ وسائل و ذرائع کے ساتھ پوری اجتماعی زندگی میں اس کی مکمل جد و جہد کرنے والی مغل حکمرانوں میں صرف ایک ہی شخصیت تھی اور وہ ہے حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت۔ عالمگیر نے مشرکانہ خیالات و نظریات کی اصلاح کرنے اور مشرکانہ رسوم و رواجات کو دیس نکالا دینے کے لئے نصف صدی تک جہاد کیا۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کی حکومت بھی موروثی حکومت تھی۔ اس لئے ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کے نااہل اور بدکار جانشینوں نے ان کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

آپ اس وقت سے لے کر مسلم حکومت کے خاتمہ تک تختِ دہلی پر بیٹھنے والے بادشاہوں کے حالات و خیالات کا مطالعہ کریں۔ تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان پر ایک قیامت کی سی تاریکی مسلط تھی۔ اس زمانہ میں نہ صرف اعتقادی خرابیاں پرورش پاتی رہیں بلکہ اخلاقی بے حیائیوں اور بے راہ رویوں کا بھی وہ طوفان اٹھا کہ اس نے مسلمانوں کے پورے نظام اجتماعی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اس زمانہ میں فرج و شکم کی جس جس طرح پوجا کی گئی اور سلاطین و امراء نے بدکاریوں اور بد اخلاقیوں کے جس جس طرح مظاہرے کئے اس کے تذکرے تاریخ کے اوراق میں پڑھ کر ایک مسلمان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے دنیوی فوائد و لذائذ ہی کو معبود بنا رکھا ہو، انہیں شرک و توحید کی بحث سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

اگر قبریں پختہ رہی ہوں تو کیا مضائقہ ہے، اگر اولیاء پوجے جاتے ہوں تو کیا بُرائی ہے۔ اگر مشرکانہ بدعات کا زور ہے تو ان کا کیا بگڑتا ہے۔ اگر شرک نے پھیل کر پوری زندگی کو لپیٹ میں لے لیا ہے تو اس سے اُن کا کیا نقصان ہے۔ چنانچہ یہی صورتِ حال تھی جس میں قانونِ الٰہی کے مطابق مسلمانوں کو تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا اور ایک غیر مسلم قوم نے چیرہ دست ہو کر اپنی حکومت کے لادینی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے نہ صرف مذہب کے دائرہ کو سیاست سے الگ کر لیا۔ بلکہ اپنے نظامِ تعلیم و تربیت، اپنے نظامِ تہذیب و تمدن اور اپنے نظامِ معیشت و معاشرت کے تسلط سے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کو دین سے بیگانہ بنا ڈالا۔

پھر جب اس قوم کا تسلط ختم ہوا اور یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو جس حصۂ ملک پر ہندو حکمران ہو گئے وہ تو بہرحال شرک سے پاک نہیں ہو سکتا۔ مگر جس حصہ پر مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہوئی، وہاں بھی انتہائی منظم اور باقاعدہ اصلاحی کوششوں اور ہر طرح کی قربانیوں کے باوجود، نو دس سال ہو گئے ابھی وہ اصلاح مکمل نہیں ہو سکی۔ جس کے نتیجہ میں شرک اور اس کے لوازمات کو پوری طرح ملک بدر کر دیا جائے، کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو گمراہیاں صدیوں تک پلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہیں انھیں قدامت کی وجہ سے خواہ مخواہ تقدس اور بزرگی کا مقام حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اُن کی اصلاح کا کام بھی اسی مناسبت سے نہایت مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے —!

ان گمراہیوں کی شراب کو جس چیز نے دو آتشہ بلکہ ہزار آتشہ بنا دیا وہ بندۂ زر علماء اور دنیا پرست صوفیاء کا وجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ لوگ ان گمراہیوں کی حمایت کرنے، شرک پر توحید کا پردہ ڈالنے، بدعت کو سُنّت بنانے اور مشرکانہ طور طریقوں کو سندِ جواز دینے کے لئے موجود نہ رہتے تو مسلمانوں کو غلط کار حکمرانوں اور غیر اسلامی حکومتوں سے جتنا نقصان پہنچا اُس کا آدھا حصہ بھی نہ پہنچتا۔ انہوں نے عوام کو بھی گمراہ کیا اور حکومتوں کو بھی غلط راستہ پر ڈالا۔ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ جہاں چند علماء و صوفیاءِ حق دینِ اسلام کی اقامت و حمایت میں جانیں لڑا رہے ہیں وہیں ایسے مولوی اور صوفی بھی موجود رہے ہیں جو "جی حضوری" بن کر اہلِ جاہ و منصب اور اربابِ اقتدار و حکومت کی غلط بینی و غلط کاری میں اُن کے ساتھ ہیں۔ انہی کی سازشوں سے اہلِ حق پر بڑی بڑی آفتیں آئیں اور وہ سخت سے سخت مصیبتوں میں گرفتار ہوئے، اگر یہ ظالم ضلالتوں سے صرف رواداری برتتے یا گمراہوں اور غلط کاروں کا صرف ساتھ دینے پر اکتفا کرتے تو یہ بھی کسی بڑے مفسدہ کا موجب نہ تھا۔ مگر انہوں نے عوام اور اہلِ حکومت دونوں کے اندر اپنا تقدس قائم کرنے اور اُن کو اُن کی ضلالتوں پر مطمئن کر دینے کے لئے قرآن و حدیث کو بھی خوب خوب استعمال کیا۔ اور چونکہ یہ عوام اور اہلِ حکومت کے رہنما نہیں رہے ہیں بلکہ ان کا کام صرف ان کی چشم و ابرو کی طرف دیکھنا اور اُن کی شہوات و مرضیات کا اتباع کرنا ہی رہا ہے اس لئے جو جو کچھ وہ کہتے اور کرتے رہے۔ یہ قرآن و حدیث کی رُو سے اُسے جائز بتاتے رہے۔ اور آیات و حدیث کو توڑنے مروڑنے اور انھیں اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے بڑی دیدہ دلیری سے کام لیا اور جہاں اس کی بھی گنجائش نظر آئی، وہاں ضعیف و موضوع روایات اور من گھڑت کہانیوں کا سہارا ڈھونڈا اور اس کا بھی ایسا انبار لگایا کہ حق کا علم ہی اس کے نیچے دب کر رہ گیا۔ کہیں باطل کو حق کا رنگ دیا گیا اور کہیں حق و باطل کو ایسا گڈمڈ کر دیا گیا کہ لوگوں کے لئے حق کی صورت پہچاننا مشکل ہو گیا —!

اس قماش کے لوگوں کے تمام کارناموں کو چھوڑ کر اگر صرف ان کی تحریری و تصنیفی کاوشوں پر نظر کی جائے۔ تو معلوم ہو گا کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے لے کر بڑی بڑی کتابوں بلکہ قرآن کی تفسیروں تک انہوں نے اتنا زبردست لٹریچر مہیا کر دیا ہے کہ کوئی جو بات کسی جاہل کے مُنہ سے نکلتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی غیر معقول اور بیہودہ ہو اور جو کام جاہل لوگ کرتے ہیں، چاہے وہ کتنا ہی غلط

اور بے ڈھنگا ہو، اس کی تائید و تصویب میں بآسانی پچاسوں تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہی تحریریں لوگوں کا مرجع ہیں، اور چونکہ ان تحریروں میں قرآن و حدیث کا نام بھی بار بار آتا ہے، اس لئے لوگوں کو اس بات کا پورا اطمینان حاصل ہے کہ جو کچھ وہ کہہ اور کر رہے ہیں وہ ہرگز قرآن و حدیث کے خلاف نہیں ہے۔

یہ بڑی ہی افسوسناک صورتِ حال ہے۔ عامۃ الناس میں یہ صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے کہ وہ عربی ادب کی ایک خاص حد تک تحصیل و تکمیل کریں، قرآن و حدیث کے وسیع ذخیرہ پر خوب گہری نظر رکھیں۔ اس ذخیرہ میں جہاں جہاں معنوی تحریفیں اور تاویلیں کی گئی ہیں ان کی تہ تک پہنچیں، اختلافات میں محاکمہ کر کے جانبِ راجح کو اختیار کریں۔ شرعی احکام کی حکمتوں اور باریکیوں کو سمجھیں اور حدودِ شرعیہ کے نکتوں کو پائیں۔ پھر اگلوں کی تاریخ پر بھی وسیع نظر ڈالیں اور سلف کے تمام اقوال و افعال میں حق و ناحق اور مناسب و نامناسب کو بھی ممیز کرتے چلے جائیں۔

یہ سب کچھ اہلِ علم کا کام ہے اور جب انھیں میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی نکلتی چلی جائے جو "با زمانہ بساز" کے نظریہ پر عامل ہوں اور دنیا پرستانہ اور مطلب جویانہ ذہنیت لے کر میدان میں اتر آئیں تو عوام کو امن کہاں ملے گا۔ ان کی گمراہیوں کا دائرہ پھیلے گا اور خوب پھیلے گا۔ اس کے سکڑنے اور کم ہونے کی آخر صورت کیا ہے؟

ان مولویوں نے کتابوں اور رسالوں کا جو ڈھیر لگا دیا ہے اور اس میں کتاب و سنت کی کھلی کھلی معنوی تحریفات سے عوام کے مطلب کی جو جو باتیں چھانٹی ہیں، وہ تو بے شمار ہیں۔ مگر ہم محض ناظرین کی سرسری واقفیت کیلئے اپنے موضوع کی حد تک چند باتوں کا ذکر کرتے ہیں تاکہ ایک ہی چاول سے اندازہ کیا جا سکے کہ پوری دیگ میں کیا ہے؟

موجودہ زمانہ میں ایک صاحب نے قرآن کی تفسیر لکھی ہے۔ جب انہوں نے قرآن کھولا تو اس کی ابتدائی آیتوں ہی میں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ انھیں یہاں یہ مشکل پیش آئی کہ یہ لفظ تو اس پورے معتقدات کی جڑ ہی پر ایک کاری ضرب لگا رہا ہے جو عامۃ الناس میں شائع و ذائع ہیں اور جن کی بنیاد پر انہوں نے مشرکانہ اعمال و رسوم کی ایک نئی شریعت ایجاد کر رکھی ہے۔ چنانچہ مفسّر صاحب نے اس کانٹے کو راہ سے نکالنے یا کم از کم اسے بے ضرر بنا دینے کے لئے قرآن میں غوطہ لگانا شروع کیا۔ اور چند عقلی و تجربی دلائل کی کمک بھی ساتھ لے لی۔ پھر اس سے بھی کام نہ چلا تو مغالطے دینے اور جذباتی انداز میں گفتگو کر کے لوگوں کو عقلی و نقلی دلائل سے بے پروا کرنے کی کوشش کی۔

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں حصر موجود ہے اور عربی کا ہر مبتدی اس کا ترجمہ اردو زبان میں یہی کر سکتا ہے کہ "اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔" اگرچہ "ہی" کے حصر کو اڑا دینے کے بعد راستہ کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ مگر ترجمہ کی تحریف کے باوجود متن تو جوں کا توں رہتا ہے، اور اس میں تحریف ممکن نہیں، اس لئے مفسّر صاحب نے تفسیر کا ایک اور راستہ اختیار کیا اور وہ یہ ہے کہ اہل اللہ سے مدد مانگنا در اصل اللہ ہی سے مدد مانگنا ہے۔ اہل اللہ غیر اللہ نہیں ہوتے فنا فی اللہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی حاجتیں اُن سے مدد مانگنا اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور فرمایا کہ دیکھو! قرآن میں فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ۔ (یعنی تم قوت سے میری مدد کرو) آیا ہے۔ یہ ذوالقرنین کا قول ہے۔ جب اس جیسے زبردست اور طاقتور بادشاہ کو بھی دوسروں کی مدد ضروری ہوتی تو ہم جیسے کمزوروں کو اللہ والوں کی مدد کیوں ضروری نہیں؟

اس کے بعد وہ "عقلی و تجربی دلائل" پر آئے اور کہا کہ کوئی شخص اگر جنگل میں بھٹک جائے تو کیا وہ لوگوں کو نہیں پکارے گا کہ بھائیو! میری مدد کرو۔ بس اسی طرح ہم بھی بھٹکے ہوئے ہیں، اس لئے پکارتے ہیں کہ "یا غوث! یا خواجہ! ہماری مدد کیجیے" —

جب ان "قیمتی دلائل" پر بھی دل مطمئن نہ ہوا تو مغالطہ دینے کی سُوجھی اور ارشاد فرمایا کہ تم جس طرح پانی لانے کے لئے ملازم کو پکارتے ہو اور ملازم کی یہ مدد جائز ہے تو اولیاء اللہ کو پکارنا اور اُن سے مدد مانگنا کیوں ناجائز ہوا - یہ سب کچھ کہہ جانے کے باوجود مفسّر صاحب کی تسلی نہیں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ عوام کو نقلی و عقلی باتوں سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف جذباتی باتوں سے متاثر ہوا کرتے ہیں اس لئے انہوں نے کہا کہ جو لوگ اولیاء اللہ کو نہیں ملتے وہ ایسے اور ایسے ہیں - اولیاء کا درجہ اتنا اتنا بلند ہے اور خدا تک براہِ راست رسائی تم جیسے کمینوں کا کام نہیں ہے، اس لئے اِن کے واسطے سے پہنچو اور ان تک پہنچ جانا خدا ہی تک پہنچ جانا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ـــ!

حالانکہ ان سام باتوں میں ایک بات بھی صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک اسباب طبعی کا تعلق ہے اُن سے کام لینا اور اس کام کے دوران میں ایک دوسرے کی مدد کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے اور اسی پر سانس لینے اور زندہ رہنے کا دار و مدار ہے۔ لیکن فوق الطبعی اسباب کو پیدا کرنا اور اس سے کام لینا بالکل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اور اس کے لئے اسی سے مدد مانگنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص پیاس کی حالت میں اپنے خادم کو پانی لانے کے لئے پکارتا ہے تو وہ اسی لئے پکارتا ہے کہ خادم اُس کی آواز سُننے اور پکارنے والے کو یقین ہے کہ اس کا خادم پانی لانے پر قادر ہے۔ لہٰذا اُس کا پکارنا اور یقین کرنا بالکل درست ہے کیونکہ یہ سب سلسلۂ اسباب کے تحت ہے جس پر سارا نظامِ عالم قائم ہے۔ لیکن اگر وہ پانی کے لئے کسی ولی کو پکارے جو اس سے سیکڑوں ہزاروں میل دُور کسی قبر میں دفن ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ان ولی صاحب کو سمیع و علیم سمجھتا ہے۔ اور اس کا اعتقاد یہ ہے کہ عالمِ اسباب پر اُن کی فرمانروائی قائم ہے، جس کی وجہ سے وہ مافوق الطبعی طور پر سلسلۂ اسباب کو پیدا کرنے اور اُسے حرکت دینے پر قادر ہیں اور یہی شرک فی الصفات ہے۔ جو کسی طرح جائز نہیں ـــ!

اور ایک پانی ہی کیا۔ زمین و آسمان اور اُن کی درمیانی اشیاء میں سے کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس کے طبعی و مافوق الطبعی اسباب کا سررشتہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں نہ ہو۔ مگر طبعی اسباب سے کام لینے اور اُس میں ایک دُوسرے کی مدد کرنے کی اللہ تعالیٰ نے خود اجازت دی ہے اور اسی کا نام زندگی یا حیات ہے، اس لئے وہ تو بالکل جائز ہے، مگر اس سے ہٹ کر مافوق الطبعی طور پر اللہ تعالیٰ کے سوا یا اُس کے ساتھ کسی جاندار یا بے جان چیز کو متصرف فی الخلق سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا بالکل ناجائز ہے۔ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں حصر اسی دوسری چیز کے لئے ہے نہ کہ پہلی چیز کے لئے۔ یہی پہلی چیز ہے جس کو عمل میں لانے کا ہر انسان محتاج ہے، چاہے وہ اپنی ذات میں کتنا ہی طاقتور اور اپنی صفات میں کتنا ہی برگزیدہ ہو۔

یہی چیز تھی جس کے لئے ذوالقرنین نے فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ کہا تھا۔ اُس نے اپنے اردگرد کے زندہ لوگوں سے اپنے زیرِ تعمیر بند کے استحکام کے لئے جسمانی محنت و مشقت کی مدد مانگی تھی۔ اس نے یہ نہیں کیا تھا کہ بند کی ضرورت محسوس ہوئی تو گزرے ہوئے زمانے کے لوگوں کو قبروں سے بُلانا شروع کر دیا۔ یا اُن کو اس لئے پکارنے لگا کہ وہ مافوق الطبعی اسباب کو حرکت دے کر ایک کرشمہ یا کرامت کے ذریعہ اُس کے لئے ایک عظیم الشان بند بنا کر دے دیں۔

رہ گیا عبد و معبود کا تعلق تو عبد خواہ کتنے ہی اُونچے مقام پر پہنچ جائے اور اس سے معبود کا اور معبود سے اُس کا تعلق کتنا ہی گہرا اور مضبوط ہو وہ عبد ہی رہتا ہے، اس کے اندر معبودیت یا الوہیت کا کوئی شائبہ تک نہیں آنے پاتا۔ اس عقیدہ پر خود وہ کلمۂ شہادت ہی دال ہے جسے ادا کر کے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ - اس میں اللہ کے سوا کسی کے اِلٰہ ہونے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ آپ لفظ اِلٰہ کے لغوی معانی کی تحقیق کریں تو پکڑ

معلوم ہوگا کہ اس میں حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی اور نفع نقصان پہنچانے کے تمام مافوق الطبعی تصورات موجود ہیں۔ پھر حضورؐ پر جس حیثیت سے ایمان لانا اور اس کی بار بار گواہی دیتے رہنا فرض ہے وہ یہی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول تو ہیں لیکن آپؐ سب سے پہلے اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کے ساتھ انتہائی برگزیدگی کا تعلق رکھنے کے باوجود آپؐ میں الوہیت کی ایک صفت بھی نہیں پائی جاتی—!

اب فرمائیے کہ کلمہ کی رُو سے ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہیئے اس کے برخلاف عقائد رکھتے ہوئے کلمہ پڑھتے رہنا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ بھٹکے ہوئے ہیں تو خدا نے ہدایت کا راستہ روشن کر کے رکھ دیا ہے، اُس پر چلئے۔ اسے چھوڑ کر اور ہدایت یافتہ اسلاف کو بکار کر تو آپ اور زیادہ بھٹکے جا رہے ہیں—!

لطف یہ ہے کہ مفسر مذکور نے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن کی تفسیر میں محض استعانت بغیر اللہ ہی کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ لگے ہاتھوں فاتحہ وغیرہ قسم کی بہت سی چیزوں کا بھی اسی شان کے ساتھ ذکر فرما دیا۔ اب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں قرآن کی بسم اللہ ہی ایسی "نکتہ آفرینیوں" سے کی گئی ہو، وہاں پورے قرآن کی تفسیر کا کیا رنگ ہوگا—!

ایک اور مثال لیجئے:-

عامۃ الناس میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ مرنے کے بعد بڑی زبردست قوت کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ ساری دُنیا کی باتوں کو جانتے، ساری آوازوں اور دعاؤں کو سُنتے، تمام حرکات وسکنات کو دیکھتے، اُن کے حضور پیش کی جانے والی تمام درخواستوں کو پڑھتے اور ہر کار روائی کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ وہ نذر دینے والوں سے خوش اور منت پوری نہ کرنے والوں سے ناخوش ہوتے ہیں اور دفع مضرات و دفع بلیات اور عطاء و بخشش کے بڑے وسیع اختیارات رکھتے ہیں۔ اس خیال کی تائید و تصویب کے لئے جب قرآن پر نظر ڈالی گئی تو وہ اس آیت پر جا کر ٹھہری:-

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ [1]

بس کہہ دیا گیا کہ دیکھو! یہ حیات بعد مردن کا کتنا کھلا اثبات ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے ان بزرگوں کو اَحْیَاءٌ (زندہ لوگ) فرمایا ہے۔ اور وہ بھی اتنی تاکید کے ساتھ کہ "انھیں مُردہ نہ کہو"۔ پس معلوم ہوا کہ زندہ نہ سمجھنا تو ایک طرف انھیں زبان سے مُردہ تک کہنا جائز نہیں۔ جو شخص "مردہ" کا لفظ زبان سے نکالتا ہے وہ سخت گستاخ اور بے دین ہے۔ پھر یہ حیات، انتقال مکانی کے بعد کی ہے اس لئے وہ حیاتِ دُنیوی کے مقابلہ میں اتنی اعلیٰ و اشرف ہے کہ اس دُنیا کا کوئی شخص اُس کا تصور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی لئے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لَا تَشْعُرُوْنَ (تم سمجھ نہیں سکتے)، رہ گئی یہ بات کہ اس آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے۔ جو فی سبیل اللہ قتل کئے جائیں۔ تمام اولیاء و بزرگانِ دین کا عموم اس سے نہیں نکلتا تو اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا گیا کہ کافر کے ہاتھ سے قتل ہونے والا انسان جب یہ مرتبہ حاصل کرتا ہے تو بھلا عشقِ الٰہی کی تلوار سے قتل ہونے والا یہ مرتبہ کیوں نہیں حاصل کر سکتا۔ بلکہ غور کیجئے تو اس قسم کے لوگ ہی عام شہداء سے بہت بلند و بالا ہیں [2]

[1] اس آیہ مقدسہ کی شرح و تفسیر کے لئے اسی شمارہ کا "نقش اوّل" ضرور ملاحظہ فرما لیا جائے (ایڈیٹر)

[2] غازی ز پئے شہادت اندر تگ و پوست | غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازوست
در روز قیامت ایں باوکے ماند | ایں کشتۂ دشمن است وآں کشتۂ دوست

اگرچہ آیت کی یہ تفسیر ہی عامۃ الناس کے عقیدہ کو خوب مضبوط کر دیتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ کچھ ڈھیلی ڈھالی اور ناکافی سی ہے۔ کیونکہ بزرگانِ دین کی حیاتِ برزخ سے جس جس طرح الوہیت کی صفات کو وابستہ کیا گیا ہے اُس کے لئے مزید تائید کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ کسر بھی پوری کر دی گئی۔ کہا گیا کہ بزرگانِ دین طرح طرح کے سخت مجاہدوں سے اپنی روح کو دنیا میں اتنا طاقتور بنا لیتے ہیں کہ انتقالِ مکانی کے بعد اُن کی روح بلندی میں پرواز کرتے وقت امرِ رب ہی بن جاتی ہے۔ پھر وہ جو کچھ کرتی ہے، خدا کا فیصلہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے:-

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي -

یعنی لوگ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ روح تو امرِ رب ہے

اور آدمؑ کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے چند مقام پر اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں:-

اِذْ نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي -

یعنی جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں!

حالانکہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، اُس میں سب سے اوّلین قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بل احیاءٌ کی تفسیر میں شہداء و اولیاء کی جانوں سے متعلق جتنی باتیں چاہے کہہ لیجئے لیکن اس کو الوہیت کی صفات سے متصف نہ کیجئے۔ یہی تو شرک ہے، جس کی تردید سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ قرآن کی پوری دعوت ہی توحیدِ الٰہ کی بنیاد پر ہے۔ اس لئے اس کی کسی آیت کی ایسی تفسیر ہرگز جائز نہیں جو اس کی پوری تعلیم اور اس کے سارے اصول و کلیات کے خلاف ہو بلکہ اس قسم کی تفسیری کوشش در اصل معنوی تحریفیں ہیں۔ رہ گئیں آیات قل الروح اور اِذْ نَفَخْتُ۔ تو جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے، اس میں لفظ "روح" ہی کے متعلق اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے کہ اس سے مراد جان ہے یا کچھ اور؟

ابنِ عباس، قتادہ، حسن بصری وغیرہم نے روح کے معنی وحی یا وحی لانے والا فرشتہ بیان کئے ہیں۔ تاہم اس سے مراد جان ہی ہو تب بھی اس کے لئے مِنْ اَمْرِ رَبِّي کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یعنی وہ میرے رب کے حکم سے ہے نہ کہ خود امرِ رب ہے۔ لفظ مِنْ کو نظر انداز کر دینے سے مفہوم کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ یہی حال دوسری آیت کا ہے۔ اس میں اوّل تو یہ نہیں فرمایا کہ "میں اپنی روح پھونک دوں" بلکہ یہ فرمایا ہے کہ "اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں"۔ دوسرے اس کا مفہوم محض یہ ہے کہ انسانی روح صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے اور اسی عکس یا پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔ اس سے یہ مطلب نکال بیٹھنا کہ صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصّہ پانا الوہیت کا کوئی جزو پا لینے کا ہم معنی ہے۔ اتنی بڑی غلط فہمی ہے کہ قرآن کی پوری تعلیم ہی پر خطِ نسخ پھیر دیتی ہے۔ قرآن نے اپنی تعلیم مبہم و مُغلق بنا کر پیش نہیں کی ہے۔ اگر کہیں اختصار سے کام لیا ہے تو دوسری جگہ توضیح و تفصیل بھی کر دی ہے۔ اور اس کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جو اس کے پیش کردہ تصوّرِ الٰہ پر غلط طریقے سے اثر انداز ہوتی ہو۔ یہ تو خود لوگوں کی اپنی ہی مشرک پرستانہ ذہنیت اور اس ذہنیت کو تقویت دینے والی فتنہ جویانہ نیت ہے۔ جس کے زیرِ اثر توحید کی تعلیم دینے والی کتاب میں شرک کے جراثیم کلبلاتے نظر آتے ہیں!

مزید ایک مثال سنئے:-

عوام کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ دوسری تمام بخششوں کی طرح عطاءِ اولاد کے لئے بھی اولیاء اللہ نہ صرف خدا سے دعا کرتے ہیں بلکہ خود بھی اُسے بخشنے پر قادر ہیں۔ چنانچہ اس کا اظہار اُن کی زبانوں ہی سے نہیں بلکہ باقاعدہ اُن کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔ جو وہ

درخواستوں کی شکل میں مزارات اولیاء پر لٹکاتے ہیں۔ اِن میں صاف صاف اہلِ قبور سے خطاب کیا جاتا ہے کہ "ہمیں اولاد دیجئے"۔ اب کیسے ممکن تھا کہ جن مولویوں کا سارا مفاد ہی عوام کے عقائد و اعمال سے وابستہ ہو، وہ اسے بھی سندِ جواز نہ دیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے انہوں نے قرآن میں ٹوہ لگائی اور تلاش و تفحص کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اگر وہ طلبِ ہدایت کے لئے قرآن پڑھتے تو کسی مقام کی دو چار آیتیں ہی اُن کی ہدایت کے لئے کافی تھیں۔ مگر وہاں سرے سے طلبِ ہدایت ہی مقصود نہ تھی۔ وہاں تو مقصود صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح کہیں سے کوئی اشارہ ہی ایسا نکل آئے جس سے اُن کے "پیارے عوام" کے عقائد کی صحت پر مُہرِ تصدیق ثبت ہو سکے۔ چنانچہ وہ بیسیوں ایسی آیات پر سے گزرے جن میں نہایت صاف و صریح الفاظ کے ساتھ اُن کے عقائد کا ابطال اور صحیح عقائد کا اثبات موجود ہے۔ اللہ نے پھیر پھیر کر حقائقِ واقعیہ کو بیان فرمایا ہے۔ مگر اُن کے بھرے ہوئے ذہن میں کوئی بات اُتر نہ سکی — جب قرآن کے مجموعی مضامین و مطالب میں اپنے مفیدِ مطلب بات کے پالنے سے وہ مایوس ہو گئے تو پھر لفظ لفظ اور حرف حرف کو دیکھنا شروع کیا۔ تاکہ اگر کوئی رائی بھی کہیں مل سکے تو وہ اپنے نحوی اور صرفی علم کی مدد سے اسے پہاڑ بنا دیں۔ بالآخر اُن کی نگاہ سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں آیت:-

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝

پر جا کر ٹھہر گیا اور جب انہوں نے غور کیا تو لفظ لِاَهَبَ پر پہنچ کر وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑے۔ اُنہوں نے کہا دیکھو! یہ ہے دلیل اس بات کی کہ اولیاء اللہ کو عطاءِ اولاد پر پوری قدرت حاصل ہے۔ یہاں فرشتہ نے اولاد کی بخشش کو اپنی طرف منسوب کیا۔ لہٰذا مسجودِ ملائک انسان اور انسانوں میں بھی نہایت بزرگ و برتر ہستیوں کے لئے بھلا یہ کیسے ناممکن ہے کہ وہ اولاد جیسی چیز نہ دے سکیں —!

حالانکہ اس معاملہ کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ فرشتہ نے "بخشنے" کا فعل محض مجازی طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ

"میں آپ کے رب کا بھیجا ہوا ہوں"

آیت مذکورہ کا سیاق و سباق دیکھئے! اللہ تعالیٰ خود اس فرشتے کے متعلق فرماتا ہے کہ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا (مریم کے پاس فرشتہ کو ہم نے بھیجا) مریم علیہا السلام بے شوہر بچہ پیدا ہونے پر تعجب کا اظہار کرتی ہیں تو فرشتہ کہتا ہے

قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (آپ کا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے)

فرشتہ کا یہ قول اس کے زیرِ بحث قول کو قطعی طور پر مجاز کا رنگ دے رہا ہے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو کیا اللہ تعالیٰ نے کارِ تخلیق میں فرشتوں یا کسی اور مخلوق کو اپنا شریک بنا رکھا ہے؟

خدا کے ماننے والوں میں نہ کوئی انسان ایسا پایا گیا ہے اور نہ کبھی پایا جائے گا جو خدا کے خالقِ واحد ہونے اور کائنات کی ہر جاندار و بےجان چیز کے مخلوق ہونے کا انکار کرتا ہو۔ جب انسان اور فرشتے اس لئے مخلوق ہیں تو مخلوق ہی کو کارِ تخلیق میں شریک کر دینے کا کیا مطلب ہے؟ پھر حق تعالیٰ جلّ شانہٗ خود فرماتے ہیں:-

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ

(ہم یہ اس لئے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی اور اپنی طرف سے ایک رحمت بنا دیں)

یہی واقعہ سورۂ آلِ عمران کے پانچویں رکوع میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ایک فرشتہ نہیں بلکہ فرشتوں کی ایک جماعت حضرت مریمؑ کے پاس آئی تھی اور اس لئے آئی تھی کہ مریمؑ کو لڑکے کی بشارت دے۔ مگر وہ کی حیثیت سے

جب ایک فرشتہ حضرت مریمؑ سے مخاطب ہوا تو کہا کہ:-

كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ إِذَا قَضٰىٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۝

ایسا ہی ہوگا - اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس یہ

کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔

کیا یہ کُنْ فَیَکُوْنُ کی شان بھی اللہ کے سوا کسی اور کے لئے مختص ہے؟ کیا اس میں بھی اُس نے فرشتوں اور انسانوں کو شریک ٹھہرالیا ہے؟ اگر بات یہ نہیں ہے تو ماننا چاہیئے کہ فرشتہ لڑکا دینے کے لئے نہیں بلکہ صرف بشارت دینے کے لئے آیا تھا - مگر جب وہ انسانی شکل میں متمثل ہوکر حضرت مریمؑ کے سامنے آگیا تو اُس نے بشارت کی تقویت کے لئے لڑکا بخشنے کا فعل مجازی طور پر اپنی طرف منسوب کر لیا - پورا قرآن تو خیر خود اس لفظ لِاَهَبَ کا سباق وسباق ہی اس ذرا سے مجاز کو حقیقت کی طرف لے جانے کے سارے راستے بند کر دیتا ہے -

اس سلسلہ میں سورہ اعراف کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات کا مطالعہ نہایت بصیرت افروز ہوگا - فرمایا ہے:-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا ۚ فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے - پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لئے لئے وہ چلتی پھرتی رہی - پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے مل کر اپنے رب اللہ سے دعا کی کہ اگر تُو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے مگر جب اللہ نے اُن کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ بہت بلند و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں!

ان آیات پر "تفہیم القرآن" میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ نے جو حاشیہ لکھا ہے اُس کا حسب ذیل پیراگراف بار بار پڑھنے اور عبرت حاصل کرنے کے لائق ہے - فرماتے ہیں:-

"ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مذمت کی ہے وہ عرب کے مشرکین تھے اور اُن کا قصور یہ تھا کہ وہ صحیح و سالم اولاد پیدا ہونے کے لئے تو خدا ہی سے دُعا مانگتے تھے مگر جب بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو اللہ کے اس عطیہ میں دُوسروں کو شکریہ کا حصہ دار ٹھہرا لیتے تھے۔ بلاشبہ یہ حالت بھی نہایت بُری تھی لیکن اب جو شرک ہم توحید کے مدعیوں میں پا رہے ہیں وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ ظالم تو اولاد بھی غیروں ہی سے مانگتے ہیں۔ حمل کے زمانہ میں منتیں بھی غیروں کے نام ہی کی مانتے ہیں اور بچہ پیدا ہونے کے بعد نیازیں بھی انہی کے آستانوں پر چڑھاتے ہیں - اس پر بھی زمانۂ جاہلیت کے عرب مشرک تھے اور یہ موحّد ہیں - اُن کے لئے جہنم واجب تھی اور ان کے لئے نجات کی گارنٹی ہے - اُن کی گمراہیوں

پر تنقید کی زبانیں تیز ہیں مگر ان کی گمراہیوں پر کوئی تنقید کر بیٹھے تو مذہبی درباروں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اسی حالت کا ماتم حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں کیا ہے:۔

کرے غیر گر بُت کی پوجا تو کافر — جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر — کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رُتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ جا جا کے نذریں چڑھائیں — شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے!"

یہ نمونہ تو تھا قرآن کی "تفسیر" کا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ہاں قبروں اور قبر والوں کے تعلق سے جو رسمیں رائج ہیں اُن کے کوئی اصطلاحی نام تو قرآن و حدیث میں نہیں ملتے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اُن کے ایسے نام تجویز کر دیئے جائیں جو فی نفسہ قابل اعتراض بھی نہ ہوں اور شرک جلی کی تعریف میں بھی نہ آ سکیں۔ چنانچہ مولویوں نے یہ فنی خدمت بھی خوب انجام دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

آپ اُن تمام کھانوں سے واقف ہی ہوں گے جو خاص خاص تاریخوں میں، بڑے اہتمام و احترام کے ساتھ، مخصوص آداب و قواعد کے تحت مسلمانوں کے ہاں پکائے جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک باقاعدہ نظام فکر و عمل ہے۔ اس کے الگ الگ اجزاء کو لیجئے تو خواہ مخواہ ان کے تعین و عدم تعین اور جواز و عدم جواز کی بحث پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس مجموعہ کا ایک مختصر اور مفید نام فاتحہ رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ کوئی بُرا اور بے معنی ہے۔ ایک اچھا اور بامعنی لفظ ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام بھی ہے اور سورۃ بھی وہ جو جسے خود قرآن نے سبع من المثانی کہا ہے۔ یعنی سات ایسی آیتیں جو بار بار دُہرائی جانے کے لائق ہیں۔ اس کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ!

یعنی سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ بھلا اس پر اعتراض کی گنجائش ہی کیا ہے۔ لیکن آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ لفظ "فاتحہ" کے معنی اور خود سورۂ فاتحہ سے عقیدہ و عمل کے اس پورے نظام کو کوئی دُور و قریب کا تعلق نہیں ہے جو مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اب آپ اگر "فاتحہ" کے قائلین سے یہ فرمائیں کہ تم جو نمازیں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہو یا غیر از نماز کہیں بیٹھے بیٹھے پڑھ لیتے ہو، اسی کو کافی سمجھو اور اس کے سوا "فاتحہ" کے نام سے کچھ نہ کرو تو ان میں سے کوئی شخص اس کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ مگر اس کے باوجود "فاتحہ" کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے، اس کو یہ ایک لفظ اعتراض کی زد سے نکال لیتا ہے۔

رہ گئی فاتحہ کی غرض تو اس کے لئے بھی کوئی ایسا ہی بامعنی بلکہ شرعی تصورات سے قریب تر کوئی لفظ چاہیئے تا کہ مقصد کی پاکیزگی ثابت ہو جانے کے بعد عمل کی پاکیزگی خود بخود ثابت ہو جائے۔ چنانچہ فاتحہ کی غرض کو "ایصال ثواب" کا نام دیا گیا۔

جس کے معنی ہیں "ثواب پہنچانا"۔ جہاں تک مُردوں کو ثواب پہنچانے کا تعلق ہے، اس کی تو بعض شکلیں خود حدیثِ نبوی میں موجود ہیں اور ائمہ فقہ بھی قائل ہیں کہ بدنی اور مالی عبادات کا ثواب پہنچ سکتا ہے، پس عقیدہ و عمل کی بہت سی خرابیاں اس لفظ کے پیچھے جا چھپیں اور کسی فقیہ کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ وہ "ایصالِ ثواب" کو ناجائز کہہ دے۔ مگر اس سلسلے میں جو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اُن کو چھوڑ کر صرف دو باتیں قابلِ توجہ ہیں:-

(۱) ایک تو یہ کہ قرآن و حدیثِ نبوی میں ایصالِ ثواب کی بہترین صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ آدمی اپنے ساتھ اپنے اسلاف کو بھی دعواتِ خیر میں شریک رکھے۔ دعاءِ خیر سے زیادہ بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہے اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایصالِ ثواب کے لئے بدنی یا مالی عبادت کی اجازت دی بھی ہے تو وہ بھی کبھی کبھار۔ یہ کہیں نہیں پایا جاتا کہ آدمی اسے معمول ہی بنا لے اور فرائض تک سے بے پروا ہو کر اس کام میں اپنی قوت اور دولت کا ایک بڑا حصہ خرچ کر دے پھر یہ "ایصالِ ثواب" کے نام سے کئے جانے والے لمبے چوڑے کاموں کی اصل علت کیا ہے ؟

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ایصالِ ثواب کے اصل مستحق ہمارے وہ اعزہ و اقربا یا دوست احباب ہیں جن کی وفات ہمارے سامنے ہوئی ہے، اور جن کے حالات سے ہم واقف رہے ہیں، یا پھر وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کم از کم ہمارا گمان یہ ہو کہ وہ ثواب کے محتاج یا مستحق ہیں۔ مگر جن بزرگوں نے خود اپنی نیکی اور پرہیزگاری سے اپنے لئے ثواب کا بہت کچھ سرمایہ اکٹھا کر لیا ہو بلکہ اُن کی بزرگی یہاں تک تسلیم کر لی گئی ہو کہ وہ "ایصالِ ثواب" کرنے والوں کے نزدیک الوہیت تک میں شریک ہو گئے ہوں۔ جس کی بنا پر وہ انھیں پکارتے اور اپنی حاجات میں مدد مانگتے ہیں تو انھیں "ثواب" پہنچانے کا کیا مطلب ہے ؟ آخر کوئی یہ بھی تو سوچے کہ ثواب کس قسم کے لوگوں کی طرف سے کس قسم کے لوگوں کو پہنچایا جا رہا ہے ؟ کیا آپ کے خزانہ میں ثواب اتنی بڑی مقدار میں جمع ہے کہ آپ کو اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے اور آپ مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا زائد از ضرورت ثواب دوسروں کو پہنچا دیا جائے ؟ اور پہنچے بھی وہ آپ کی طرف سے حضرت پیرانِ پیر اور خواجہ اجمیری وغیرہ جیسے بزرگوں کو ؟

یہی حال قبر پرستی اور اس کے سارے لوازم و مقتضیات کا بھی ہے۔ "قبر پرستی" کو "زیارتِ قبر" کا شرعی نام دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ "زیارتِ قبر" نہیں "عبادتِ قبر" ہے۔ قبروں پر حاضری دینے کی اصل غرض کو توسُّل اور اکتسابِ فیض وغیرہ جیسے الفاظ کے خوشنما پردوں میں چھپایا گیا ہے۔ حالانکہ کسی ولی کی قبر پر حاضری دے کر یہ سمجھنا کہ چھوٹے صاحب تک رسائی ہو چکی ہے۔ اب وہ ہمیں بڑے صاحب کے ہاں پہنچا لیں، اُن کے ہاں ہماری سفارش کرنے اور ہمیں اُن کا مقرب بنانے کا اختیار رکھتے ہیں یا اُس قبر کو فیض کا ایک بحرِ ذخار سمجھ بیٹھنا۔ جہاں سے ہر حاجت مند کو اپنی ہر چھوٹی بڑی مادی و روحانی ضرورتیں پوری کرنے کا سامان مل جایا کرتا ہو بے ریب و شک ایک مشرکانہ عقیدہ ہے نام کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی اور نہ حقیقت کی تبدیلی کو نام کی تبدیلی کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ توسُّل کی حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے ذواتِ صالحہ کو وسیلہ بناتے ہوئے دُعا کی جائے [۵] جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی دعا میں کہا تھا کہ

---

[۵]۔ واضح رہے کہ اس مسئلہ میں جواز، عدمِ جواز اور سکوت کے لحاظ سے علماءِ محققین کے تین مسلک ہیں اور تینوں کے دلائل میں حسبِ مراتب کچھ نہ کچھ وزن پایا جاتا ہے۔ جو لوگ اس مسئلہ کے تمام اطراف سے پوری آگاہی حاصل کرنا چاہیں اُنھیں خود مطالعہ و تحقیق سے کام لینا چاہیئے۔ ہم نے محض برسبیلِ ذکر یہاں جواز کے پہلو کو پیشِ نظر رکھا ہے ؛

اِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا (اے اللہ! ہم اپنے نبی کے چچا سے تیرے دربار میں توسّل صلعم کرتے ہیں یا ہم اپنے نبیؐ کے چچا کو تیرے پاس وسیلہ بناتے ہیں) مگر اس کا التزام کر لینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو خدا وسیلہ کے بغیر کسی دعا کو قبول ہی نہیں کرتا۔ یا اس پر مخلوق کا کوئی حق ہے کہ جس کا واسطہ بار بار دلایا جا رہا ہے اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

رہا اکتسابِ فیض کا معاملہ تو اس کی حقیقت اُن تصوّرات سے خود بخود نکھر کر سامنے آ جاتی ہے جو شریعت نے اپنے پیروؤں کو دیئے ہیں۔ ہر مسلمان کو سلفِ صالحین کے حالات و خیالات اور اُن کی باقیات سے پُوری واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اس کے مطابق خود اتباعِ شریعت اور ارتقاءِ روحانیت میں سرگرم رہنا چاہیئے۔ اس حال میں اگر وہ کسی مردِ صالح کی قبر پر جائے تو اسے یقیناً روحانی بالیدگی اور قلبی نورانیت حاصل ہوگی اور یہی آخری حد ہے جہاں تک ایک مسلمان حدودِ شریعت میں رہ کر جا سکتا ہے! (قلبی نورانیت اور روحانی بالیدگی کا سبب یہ ہوگا کہ زائر*

اگر یہی چیز "اکتسابِ فیض" ہے تو اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر جا نذر منظور اور دوسری اشیاء کے ساتھ جن منتوں، مرادوں اور قربانیوں وغیرہ کا ہنگامہ قبروں پر جاری ہے، اُس پر تو اکتسابِ فیض کا اطلاق نہ لفظی حیثیت سے ہو سکتا ہے نہ معنوی اعتبار سے۔ تاہم اس خاص فعل کے لئے بھی مولویوں نے چند اصطلاحات عوام کو دے رکھی ہیں۔ "بھینٹ" کا لفظ چونکہ ایک ہندی لفظ ہے اور مندروں اور استھانوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے آپ کسی مسلمان کی زبان سے یہ لفظ نہ سُن سکیں گے، البتہ اسی چیز کے لئے جو الفاظ انھیں علماء کے دربار سے مل گئے ہیں وہ ہیں نذر، نیاز وغیرہ۔ دیکھئے! کس قدر بے ضرر اور معصوم الفاظ ہیں۔ اگرچہ لغوی و معنوی اعتبار سے اُن کا استعمال غیر اللہ کے لئے بہت کچھ محلِ نظر ہے مگر نذر تو نذرانہ اور تحفہ کے معنی میں مستعمل ہی ہے اور نیاز کے لفظ کو بھی لوگ ایک دوسرے کے لئے بے تکلفانہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے اس میں کراہت، نفرت اور حرمت کی وہ شدت نہیں ہے، جو بھینٹ، چڑھاوا اور نذر لغیر اللہ وغیرہ الفاظ میں پائی جاتی ہے!

مگر یہ تو محض ایک فعل ہے، ایسے کتنے ہی مختلف افعال کا ارتکاب سال بہ سال قبروں پر ہوتا رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس پُورے بکھیڑے میں دولت، قوّت اور محنت کا صَرف کہاں تک جا پہنچتا ہے اور گانے بجانے اور ناچ رنگ تک کی رنگینیاں اس میں کس طرح جلوہ دکھاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ہنگامہ کا، جو کہیں کہیں اور کبھی کبھی نہیں ہوتا بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت اس کی بہار دیکھی جا سکتی ہے، کوئی ایسا مختصر اور جامع نام ہونا چاہیئے جس کے پسِ پردہ احکامِ شریعت کی دل کھول کر توہین و تذلیل کی جا سکے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ نام کیا ہے؟ جاترا نہیں بلکہ "عُرس"۔ کیونکہ "جاترا" اُس

* اس قبر پر موت اور آخرت کو یاد کرے گا۔ اس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوگی اور یہ سبب ہوگی دل کی نورانیت اور روح کی بالیدگی کا! — (ایڈیٹر)

لہ قرآن پاک میں جتنی دعائیں ملتی ہیں اُن میں "توسّل" کہیں نہیں آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ماثورہ دعائیں اُمّت تک پہنچی ہیں اُن میں بھی براہ راست اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا اور التجا کی گئی ہے کسی کا توسّل اس میں نہیں ہے اور صحابہ کرام بھی اپنی دعاؤں میں "توسل" کا التزام نہیں کرتے تھے۔ ان درجنوں قرآنی دعاؤں اور سینکڑوں احادیث و آثار سے ثابت شدہ دعاؤں کے مقابلہ میں ایک دو "حدیث و آثار" میں "توسل" بھی اگر ملتا ہے تو ایک محتاط مسلمان کا رجحان "شذوذ" کے مقابلہ میں "کثرت" کی طرف ہی ہوگا اور ہونا چاہیئے۔ "الوسیلہ" کے موضوع پر محترمہ عطیہ خلیل عرب کا مقالہ اسی "توحید نمبر" میں ضرور پڑھ لینا چاہیئے! (ایڈیٹر)

وقت تک کرتے تھے جب تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اب اس کی جگہ "عرس" کرتے ہیں۔ یہ لفظ اپنی معنویت کے اعتبار سے فی الواقع لائقِ داد ہے۔ "عرس" عربی میں شادی بیاہ کو کہتے ہیں اور شادی بیاہ لازماً ایک خوشی کا کام ہے لہٰذا خوشی اور جشن کے موقع پر جو کچھ انسان کرسکتا ہے اور کرتا رہا ہے وہ سب قبروں کے عرس میں از خود حلال ہوگیا۔ رہ گیا یہ شبہ کہ بزرگوں کے یومِ وفات کو شادی کا دن کس معنی میں قرار دیا گیا ہے تو ہمارے علماء کرام کی باریک بیں اور نکتہ چیں نگاہوں نے اسے بھی دُور کردیا۔ جب ان کے سامنے وہ حدیث آئی جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر میّت صالح ہوتی ہے تو فرشتے سوال و جواب کے بعد اس سے کہتے ہیں نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوسِ (سوجا، جس طرح دلہن سوتی ہے) بس انہوں نے فرمادیا کہ لو دیکھو! یہی ہے عُرس۔ چونکہ اولیاء اللہ اُس دن عروس کی طرح سوجاتے ہیں۔ اس لئے اُس دن یا اُس سے آگے پیچھے جو کچھ اُن کی قبروں پر ہوتا ہے، وہ عُرس ہے!

اس تحقیق انیق پر بہت سی باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے مگر اس سے کلام بہت طویل ہوجائے گا۔ اس لئے ہم اشارۃً دو ہی باتیں عرض کئے دیتے ہیں:۔

ایک یہ کہ صالحین کو دلھن کی سی میٹھی، پیاری اور گہری نیند محض اس لئے نصیب ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو عملِ صالح سے دُلہن کی طرح آراستہ کیا تھا، آخر اُن کی خوشی میں آپ کے شریک ہونے کا کیا موقع ہے؟ آپ بھی جائیے اور ویسی ہی زندگی اختیار کرنے کی کوشش کیجئے۔ قبروں پر ہنگامے بپا کرنے اور میلے لگانے سے تو صالحیت نہیں پیدا ہوسکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر صالحین اپنے یومِ وفات ہی میں گہری نیند سوگئے ہیں تو ان سے اپنی حاجات طلب کرنے اور انھیں اپنا معبود بنانے کا کیا موقع باقی رہا؟ کیا معبود بھی سوجایا کرتے ہیں؟ اگر معبود سوجائیں اور دُلہن کی سی نیند سوجائیں تو وہ اپنے عابدوں اور نیاز مندوں کا کیا بناسکیں گے؟ اور اگر ان کی نیند بیداری ہی کی مترادف ہے تو پھر سونے کا کیا مطلب ہے؟

مگر کسی مسلمان کی زبان پر اللہ کے سوا کسی ہستی کے لئے معبود، خدا اور اِلٰہ وغیرہ کے الفاظ نہیں آسکتے، اس لئے ان صالحین، میّت کے ساتھ وہ سب کچھ معاملات رکھنے کے باوجود جو صرف اللہ ہی کے ساتھ رکھے جاسکتے ہیں، انھیں معبود، خدا اور اِلٰہ نہیں کہا جاتا۔ معبود بھی او معبود نہ کہہ دے، اِلٰہ بھی ہو اور اِلٰہ نہ ٹھہرے۔ ایسا مشکل مسئلہ ہے جسے کوئی بے علم اور اناڑی شخص حل نہیں کرسکتا۔ چنانچہ آپ خود اس کا تجربہ کرسکتے ہیں۔ آپ کسی شخص سے یہ کہہ دیجئے کہ تُو اولیاء اللہ کو اپنا معبود سمجھتا ہے یا اُنھیں اپنا خدا بنا رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک جاہل کندۂ ناتراش، دیہاتی اَن پڑھ آدمی بھی اس کا انکار کردے گا۔ اور آپ کا مُنہ نوچنے اور آپ کو پتھر مارنے کے لئے دوڑے گا۔ اس لئے حسبِ دستور مولویوں ہی نے اس مشکل کو حل کردیا اور وہ یہ ہے کہ اولیاء و صالحین کو خدا اور معبود بنا نا کیا ضرور، ان کے ساتھ معاملہ تو وہی رکھو جو خدا کے ساتھ ہونا چاہئیے۔ مگر انھیں غوث، قطب، دستگیر، گنج بخش، بندہ نواز، مشکل آسان، اولیاء اللہ، اہل اللہ وغیرہ سے اُوپر نہ لے جاؤ۔ ان الفاظ کی تاویل آسان بھی ہے اور اس سے تمہاری مسلمانی پر حرف بھی نہیں آتا ورنہ ذرا تجاوز کرجاؤ تو ہر فقیہ تمہیں مشرک ٹھہرائے گا اور خواہ مخواہ کی پریشانی مول لینی پڑے گی!

ناظرین اندازہ فرمائیں کہ عقائدِ باطلہ و فاسدہ کی تائید و حمایت کے لئے اگر علماء سوء اس طرح کمربستہ نہ رہتے تو بھلا اسلام میں شرک بیچارا کہاں بار پاسکتا اور مسلمانوں میں اس کے اثرات اتنی کثرت و وسعت کے ساتھ کیوں نمایاں ہوتے!

یہ تو نمونہ ہے اُن علماء کی کاوشوں کا جو کسی نہ کسی طرح شریعت کے دائرہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ مگر اُن سے کہیں زیادہ نقصان جس طبقے نے پہنچایا ہے وہ جاہل اور بے شرع صوفیوں کا طبقہ ہے جنہوں نے شریعت اور طریقت کو ایک دوسرے سے بلکہ متضاد قرار دے رکھا ہے۔ ان کے نزدیک ظاہر و باطن کے گوشے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں اور دونوں کوچوں

کے قانون بھی جُدا جُدا ہیں۔ حتیٰ کہ ایک قانون میں جو چیز حلال ہے وہ دوسرے میں بالکل حرام۔ اور ایک میں جو چیز قطعی حرام ہے وہ دوسرے میں بالکل حلال بلکہ فرض اور کارِ ثواب۔ چونکہ یہ طبقہ مسلمانوں ہی میں شامل رہنا چاہتا ہے، اس لئے وہ شریعت کا نام لینے اور قرآن وحدیث کی باتیں کرنے پر بھی مجبور ہے مگر راہِ فرار اتنی کشادہ ہے کہ جب اور جس طرف سے چاہے نکل بھاگے۔ شریعت کی پابندیوں کا ذکر کیجیے تو وہ طریقت میں جا پناہ لے گا۔ مگر طریقت بھی بہرحال ایک قانون ہے اور قانون کی بندش بہرحال اُس کے ہولئے نفس پر سخت گراں ہے، اس لئے وہ وہاں سے بھی نکل بھاگے گا اور حقیقت تک جا پہنچے گا۔ پھر چونکہ مسلمانوں کا وہی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے اور اس کلمہ سے فرار اسلام ہی سے فرار ہے۔ اس لئے وہ مقامِ حقیقت پر کھڑا ہوکر پکارے گا کہ لا الٰہ الا اللہ کے معنی ہیں "کچھ نہیں سوائے اللہ کے"۔ جب اس کے سامنے قرآن کھول کر آئیے اور اس کے مزعومہ معنی کی تردید کرنے بیٹھے تو وہ سینہ اور سفینہ کی بحث چھیڑ دے گا۔ کہے گا کہ یہ اوراق کیا لئے بیٹھے ہو۔ جو کچھ ہمارے لوحِ دل پر نقش ہے اور جو ہم تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوکر پہنچا ہے وہ تو کچھ اور ہی ہے!

اس گروہ کی تحریریں اور تقریریں دراصل ہفوات وہزلیات کی ایک پوٹ بلکہ ایک بحران زدہ بیمار کے ہذیانات ہیں۔ قبرپرستی اور اولیاء پرستی کے لئے ان لوگوں نے وہ وہ طوفان اُٹھائے ہیں کہ زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین بنا ڈالا۔ وہ قبر پر پیشانی رکھ دیں گے مگر کہیں گے کہ تم اندھے ہو! تم کیا جانو کہ ہم کس کو سجدہ کرتے ہیں۔ دراصل کعبہ سامنے آگیا تھا اس لئے ہم نے فوراً خدا کے آگے اپنی جبیں رکھ دی۔ وہ عُرسوں میں عورتوں کا ناچ دیکھیں گے اور نظارہ بازی سے لطف اندوز ہوں گے۔ مگر کہیں گے کہ "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" (مجاز حقیقت کا پُل ہے) تم کو کیا خبر کہ ہم اس حُسن میں کون سے حُسن کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ وہ رات دن سازوں کے مشغلہ میں مگن ہوں گے۔ مگر کہیں گے کہ ان سازوں میں ہم خدا کی آوازسن رہے ہیں۔ وہ شراب تک پی جائیں گے مگر کہیں گے کہ یہ دراصل شرابِ طہور کی یاد ہے، بلکہ خود شرابِ طہور ہے! (جی! کیوں نہیں؟ دُوسروں کو تو شرابِ طہور آخرت میں ملے گی مگر اِن خدا رسیدہ بزرگوں" کو دُنیا ہی میں دی جا چکی ہے) وہ بدکاری تک کر گزریں گے۔ مگر کہیں گے کہ خدا کی مشیّت کے بغیر دُنیا میں پتہ تک حرکت نہیں کرسکتا!

ظاہر ہے کہ اس طرز کے لوگوں کی بکواس کا جواب کسی ہوشمند انسان کے بس کی بات نہیں ہے، اس لئے ہم اسے یہیں ختم کئے دیتے ہیں مگر ناظرین سے ضرور عرض کریں گے کہ جب گمراہی کے آنے اور پھیلنے کے اتنے بے شمار راستے ہیں تو آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ اگر آپ دیکھیں کہ مسلمانوں میں مُشرکانہ اعمال ورسوم کا خوب چرچا ہے اور یہ کہاں سے ہوتا آیا ہے!

(۳)

ہماری اُوپر کی ساری بحث صرف "قبرپرستی" کے رد میں ہے۔ اسی لئے ہم نے اپنے مضمون کا زیرِعنوان "قبرپرستی" قرار دیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم قبور اور اہلِ قبور کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کرنے ہی کو ناجائز ٹھہرا رہے ہیں۔ دوسرے تمام مسئلوں کی طرح شارع نے اس مسئلہ میں بھی واضح حدود مقرر فرمائے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کرکے دکھایا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈال دیں۔ اچھا۔ اب آئیے دربارِ رسالتؐ میں چلیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ایک مسلمان کو خیروں اور قبر والوں سے کس قسم کا اور کتنا تعلق رکھنا چاہیئے:۔

فرمایا ہے:۔

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ!

میں نے تم کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا سو اب قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ چیز دنیا سے
بے رغبت کرتی اور آخرت کی یاد دلاتی ہے!
(مشکوٰۃ باب زیارۃ القبور بحوالہ ابن ماجہ بروایت ابن مسعودؓ)

اس حدیث سے تین باتیں معلوم ہوئیں:-

۱ - حضورؐ نے ابتداء میں زیارتِ قبور سے منع فرمایا تھا - اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حکمتِ تشریع اسی کی مقتضی تھی ایک کام خواہ وہ بجائے خود صحیح اور مفید ہی کیوں نہ ہو - اگر اس کے ساتھ غلط اعتقادات اور غلط رسوم و رواجات کا جوڑ لگ گیا ہے تو جب تک اعتقادات کی بخوبی اصلاح نہ ہو جائے، اس سے منع کرنا چاہیئے - یہ ممنوعیت عارضی ہوتی ہے - مگر ضروری بھی ہوتی ہے - کیونکہ اس روک کے بغیر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی کہیں مزید مفسدوں کا شکار نہ ہو جائے اور اگر یہ بات نہ بھی ہو تب بھی فسادِ عقیدہ کے باعث دوسرے طریقوں سے اس کی اصلاح دیر طلب ہو جایا کرتی ہے، چونکہ عہدِ جاہلیت کے عرب قبر پرستی میں مبتلا تھے اس لئے ان کے عقائد کی مکمل اصلاح تک حضورؐ نے قبروں کے پاس جانے سے انھیں روک دیا ـــ!

۲ - جب حضورؐ نے یہ محسوس فرمایا کہ لوگوں کے ذہن و فکر کی اس حد تک اصلاح ہو چکی ہے جہاں تک انھیں اسلام پہنچانا چاہتا ہے تو پھر آپؐ نے یہ عارضی روک ہٹالی اور فرمایا کہ زیارتِ قبور کیا کرو - یہ اجازت بھی ہے اور حکم بھی - کیونکہ اس سے دینی فکر کو قوت اور دینی جذبات کو حرکت ملتی ہے لہٰذا یہ چیزیں معینِ مقصد و مفید مقصد ہیں - مسلمانوں کو ان سے یاد رہنا چاہیئے ـــ!

۳ - دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد مسلمان کی اعلیٰ صفات ہیں اور چونکہ زیارتِ قبور ان میں اس کی مددگار ہے اس لئے مسلمان کو اسے اختیار کرنا چاہیئے - اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زیارتِ قبور میں لازماً یہی مقصد پیشِ نظر رہنا چاہیئے - جن زیارتوں میں یہ مقصد سرے سے پیشِ نظر ہی نہیں ہوتا وہ حدودِ شرع سے صریحاً متجاوز ہیں اور حسبِ مراتب شرک، قریب بہ شرک یا بدعت وغیرہ کی موجب ہیں ـــ!

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریمؐ اپنی والدہ صاحبہ کی قبر کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تو آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا - حضورؐ کی یہ حالت دیکھ کر صحابہ بھی رو پڑے - آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کی مغفرت کے لئے دعا کرنے کی اجازت چاہی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے منع فرمایا - پھر میں نے زیارتِ قبر کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت دے دی گئی لہٰذا تم لوگ قبروں پر جایا کرو کیونکہ اس سے موت کی یاد تازہ ہوتی ہے -

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:-

۱ - یہ کہ بمقتضائے آیت کریمہ:-

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ
مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ٥

(نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہو کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں - سورۂ توبہ رکوع ۱۴)

کسی مشرک کے لئے دعائے مغفرت جائز نہیں۔ اگرچہ اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ بی بی آمنہ کے لئے شرک کے سوا کسی اور سبب سے دعائے مغفرت کی اجازت نہ دی گئی ہو۔ مثلاً یہ اُن کا انتقال حضورؐ کی بعثت سے پہلے ہو چکا تھا، اُن کے لئے دعائے مغفرت کی اجازت دی جاتی تو عہد جاہلیت میں مرنے والے تمام لوگوں کے لئے اس کی اجازت کا دروازہ کھل جاتا — درآنحالیکہ ان تمام لوگوں کے کفر و ایمان کا صحیح فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ تاہم اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مشرکوں اور مجہول الحال لوگوں کے لئے خصوصیت کیساتھ نام لے کر دعائے مغفرت کرنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا!

۲۔ یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کی قبروں کو دیکھ کر بھی موت کو یاد کر سکتا ہے اور اُسے عبرت حاصل ہو سکتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ ایک مرتبہ مدینہ کے قبرستان سے گزرے تو فرمایا کہ السلام علیکم یا اهل القبور یغفر اللہ لنا ولکم انتم سلفنا ونحن بالاثر ط

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! زیارت قبر کے وقت میں کیا پڑھا کروں، آپؐ نے جواب دیا کہ یہ پڑھا کرو۔ السلام علی اهل الدیار من المؤمنین والمسلمین ویرحم اللہ المستقدمین منا والمستاخرین و انا ان شاء اللہ بکم لاحقون ط۔

حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ اقدس لوگوں کو قبرستان میں جا کر پڑھنے کے لئے یہ دُعا تعلیم فرمایا کرتے تھے:۔

السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون نسئل اللہ لنا ولکم العافیۃ ط

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ زیارتِ قبر کے موقع پر پڑھنے کے لئے ایک خاص دعا خاص الفاظ کے ساتھ خود حضورؐ نے سکھائی ہے اس لئے یہ مسنون ہے اور ہر زائر کو پڑھنی چاہیئے۔ اگرچہ دعا کے الفاظ میں تھوڑی سی ردّ و بدل موجود ہے۔ لیکن سب میں زیارتِ قبر کے مقصد کی اصل روح جاری و ساری ہے اور اس کے پڑھنے سے زیارت کا اصل مقصد بدرجۂ کمال حاصل ہو جاتا ہے!

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ حضورؐ والا جس رات میرے ہاں رہتے، آدھی رات کے وقت جنت البقیع تشریف لے جاتے اور یہ دعا فرمایا کرتے:۔

السلام علیکم دار قوم مومنین واتاکم ما توعدون غدا مؤجلون وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون اللّٰھمّ اغفر لاھل البقیع ؕ

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

۱۔ یہ کہ حضورؐ زیارتِ قبور کی کثرت فرماتے اور کم و بیش ہر ہفتہ قصداً زیارت کے لئے جاتے۔[1]

۲۔ یہ کہ زیارتِ قبور کے لئے رات کا وقت اور خصوصاً وہ وقت جبکہ تمام لوگ سو چکے ہوں اور بستیوں پر سناٹا چھا گیا ہو۔ ایک موزوں ترین وقت ہے۔ کیونکہ اس وقت زیارت کا مقصد بدرجۂ اتم پورا ہوتا ہے اور قلب بہت زیادہ اثر قبول کرتا ہے!

حضرت محمد ابن نعمانؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس شخص نے ہر جمعہ کو والدین کی زیارت کی، اس کو بخش دیا جائے گا اور

---

[1] یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ حضورؐ کا زیارت قبور کیلئے تشریف لے جانا استمداد اور طلب برکت کیلئے ہرگز نہ تھا اور نہ حضورؐ نے یہ فرمایا ہے کہ قبروں پر طلب برکت، اکتسابِ فیض اور استمداد کیلئے جایا کرو۔ حضورؐ کا قبروں پر جانا اہلِ قبور کیلئے دعائے مغفرت کیلئے تھا اور اس لئے بھی کہ موت یاد آئے! اور اپنے فانی و ہالک اور اللہ تعالیٰ کے حی و قیوم ہونے کا یقین پختہ تر ہو بلکہ تازہ ہوتا ہے (ایڈیٹر)

اس کو نیکوں کے زمرہ میں لکھا جائے گا —!

اس حدیث سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:-

۱۔ آدمی پر اس کے متوفی عزیزوں اور دوستوں کا زیادہ حق ہے کہ وہ ان کی زیارت کیا کرے۔ خصوصاً وہ لوگ جو تعلقات میں قریب تر رہے ہوں۔

۲۔ زیارت کے لئے کسی دن کو مخصوص کر لینا بُرا نہیں ہے۔ اس کے لئے جمعہ کا دن اپنی افضلیت کی وجہ سے بہت موزوں ہے!

۳۔ زیارتِ قبر ایک ایسی نیکی ہے جس سے خود زائر کی مغفرت متوقع ہے۔ کیونکہ بار بار موت کو یاد کرنے سے اس کے اندر دُنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صفت اُسے بے راہ اور بے عمل نہیں بننے دیتی!

اب ہم زیارت کے لئے چار قسم کے لوگوں کی قبروں کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں:-

۱۔ عوام کی قبریں

اگرچہ زیارتِ قبور کی جو غرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے اس کی رُو سے عوام و خواص اور مسلم و غیر مسلم سبھی کی قبریں یکساں ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ غریبوں اور عام لوگوں کی قبروں کی زیارت کر کے جو فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے وہ دوسروں کی قبروں سے کم ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں بے کسی و بے بسی، خستہ حالی و پریشاں حالی اور فنائیت کی ایک مکمل تصویر بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اور آس پاس کوئی ایسی چیز بھی موجود نہیں ہوتی جو خیالات کو مرکوز کرنے اور توجہات کو قائم کرنے میں مانع ہوتی ہو۔ اور اگر یہ زیارت حضورؐ انور کے اپنے عمل کے مطابق رات کے سنّاٹے میں کی جاتی رہے تو آخرت کی فکر کرنے اور حالات بعد الموت پر توجہ دینے کی اچھی خاصی تربیت بھی ہوتی چلی جاتی ہے!

اگر آپ کو ابھی تک اس کا تجربہ نہیں ہوا ہے تو ایک مرتبہ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ رات کو سوتے سے اُٹھیئے اور چپکے سے قریب کے کسی قبرستان میں چلے جائیے۔ آپ کو پہلا خیال یہی آئے گا کہ یہ تو شہر خموشاں ہے ہی لیکن زندہ انسانوں کی بستی بھی تھوڑی دیر کیلئے قبرستان ہی بنی ہوئی ہے اور اسی لئے نیند کو موت کی بہن کہا بھی جاتا ہے۔ مگر یہ گھروں میں سونے والے صبح جاگیں گے اور پھر وہی زندگی کا ہنگامہ جاری ہو جائے گا۔ جو روزانہ دن میں جاری رہتا ہے۔ لیکن قبروں کے سونے والے اس لیل و نہار کے ہنگامہ سے گزر چکے ہیں اور اپنی مدتِ حیات ختم کر کے اس طرح ہمیشہ کے لئے سو گئے ہیں کہ بس انھیں اسرافیل کا صور ہی جگائے گا۔

اُس وقت آپ کے ذہن پر موت کی یاد اور آخرت کی فکر کے سوا کوئی اور چیز غالب نہ آسکے گی۔ آپ مختلف قبروں کو دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ کچھ تو کچی ہیں اور کچھ بوسیدہ۔ بہت سی قبروں کا تو نام و نشان بھی باقی نہیں رہا ہے[1] اور کتنی قبریں ہیں جو دوسری قبروں پر بنتی چلی گئی ہیں۔ کچھ قبریں پختہ بھی ہیں تو اُن میں تزک و احتشام اور شان و اہتمام موجود نہیں ہے۔ یہ مشاہدہ آپ کے قلب میں بڑی رقّت پیدا کرے گا اور اگر وہاں آپ کے دوست احباب اور اعزار و اقربا بھی دفن ہیں تو اُن میں سے ایک ایک کی یاد آپ کو تڑپائے گی اور دُنیا سے بیزاری پیدا کرے گی۔

پھر آپ حضورؐ کی سکھائی ہوئی دعا پڑھیں گے تو یہ محسوس ہوگا کہ گویا آپ دُنیا سے چلنے کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ اگر اسی طرح زیارت کی کثرت ہو تو یہ قلبی کیفیات زیادہ سے زیادہ بڑھتی چلی جائیں گی۔ آپ قبروں کے پاس حضورؐ کی بتائی ہوئی دُعا

---

[1] امیر مینائی مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں　　پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے!

کے ساتھ دوسری دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ مگر ان میں روح زیادہ سے زیادہ یہ ہونی چاہیئے جو حضورؐ کے بتائے ہوئے الفاظ میں موجود ہے —!

۲۔ سلاطین و امراء کی قبریں

سلاطین و امراء کی قبروں کی زیارت بھی کچھ کم مفید نہیں ہے[۵] اگرچہ ان لوگوں کی قبریں بہت ہی کم کہیں کچی اور سادہ حالت میں ملتی ہیں۔ ورنہ تقریباً تمامتر قبریں نہایت پختہ ہیں۔ اور ان پر نہایت عالیشان قبے بنے نظر آتے ہیں۔ جن میں فنِ تعمیر کی خوبیاں اور نادرہ کاریاں نمایاں ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین و امراء کی شان و شوکت مرنے کے بعد قائم ہے مگر اس کے باوجود اُن کی دُنیوی شان و شوکت کے مقابلہ میں یہ شان و شوکت بالکل مختلف نظر آتی ہے اور اسلئے دلوں پر اس کا اثر بھی بہت مختلف ہوتا ہے!

مثلاً ایک طرف مقبروں کی عظمت و بلندی آپ کو محوِ حیرت کرے گی مگر دوسری طرف خود صاحبِ قبر کی بے بسی اور خاموشی پر آپ کو حسرت بھی ہوگی، اُن کے مقبروں کی عظمت و شوکت چاہے جیسی کچھ ہو مگر قبر والوں کی عظمت و شوکت تو ختم ہو چکی ہے اور اُن کا نام صرف تاریخوں میں باقی رہ گیا ہے۔ اب نہ ان کا حکم و اقتدار چلتا ہے نہ کوئی اپنے کو اُن کی رعایا تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔ نہ اُن کی درباردایاں ہیں نہ عیش کوشیاں۔ اگر وہ نیک اور عادل تھے تو اُن کی یہی صفت اس بات کے لئے کافی ہے کہ ان کا نام ادب سے لیا جائے۔ اور دل میں اُن کی عزت و محبت پیدا ہو اور اگر وہ فاسق اور ظالم تھے تو خواہ اُن کے مقبرے کتنے ہی عالیشان ہوں اُن کو کوئی شخص اچھے الفاظ میں یاد نہیں کر سکتا۔

بادشاہوں اور امیروں کے مزارات پر پہلا خیال اُن کے دُنیوی ٹھاٹھ باٹ ہی کا آتا ہے۔ مگر یہ دیکھ کر دُنیا کے متاعِ غرور ہونے کا کتنا شدید احساس پیدا ہوتا ہے کہ آج ان کے مزاروں پر کہیں کوئی حاجب و دربان نہیں پایا جاتا جو زائرین کو ادب قاعدے سکھاتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر آپ لاہور میں جہانگیر کے مقبرہ پر حاضر ہوں تو کیا آپ کو اس کا خیال نہ آئے گا کہ دُنیوی جاہ و جلال کے زمانہ میں اس کے ہاں ادب قاعدہ کی انتہا یہ تھی کہ حاضرین کو اس کے سامنے سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ اس میں ذراسی کوتاہی بھی آدمی پر مصیبت کے پہاڑ لا گراتی تھی۔

یہی جہانگیر تھا جس نے حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجدّد و مصلح بزرگ کو اپنے ہاں طلب کیا تھا اور انہوں نے اپنے عقیدہ کی رُو سے اسے سجدہ نہ کیا تھا تو اُن پر برقِ غضب چمک گئی تھی۔ اور اُن جیسا گوشہ نشین فقیر دیکھتے دیکھتے جیل کی چار دیواری میں پہنچا دیا گیا تھا۔

آج یہی زبردستی کے مسجود ہیں کہ زمین بوس اور خاموش ہیں۔ اور انھیں کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کا دربار کہاں ہے اور آپ کس حال میں ہیں؟

---

[۵] سلاطین و امراء کی قبروں پر اس نیت سے جانا کہ ان کے لئے دُعائے مغفرت کی جائے، وہاں کی قبروں کو دیکھ کر دُنیا کی بے ثباتی کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے، یقیناً فائدہ سے خالی نہیں۔ مگر امیروں اور بادشاہوں کی قبروں پر جو اونچے گنبد، شاندار قبے اور دیدہ زیب مجر تعمیر کئے گئے ہیں، انھیں دیکھ کر زائر کو موت شاذونادر ہی یاد آتی ہے، وہ تو گنبد کی شان و شوکت، دیواروں کی مینا کاری اور تابوت کے نقش و نگار ہی میں کھو کر رہ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تاج محل اور جہانگیر کے مقبرہ پر جا کر لوگ "پک نک" مناتے ہیں اور بجائے اس کے کہ موت کی یاد دلا کے دُنیا کی خرافات سے بے رغبتی پیدا ہو، دُنیا کی تفریحات کے جھرمٹ وہاں پھیلائے جاتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

آپ آگرہ تشریف لے جائیں اور شاہجہاں کی قبر پر جانا ہو۔ تو تاج محل کی خوبی وخوبصورتی کو دیکھ کر آپ چاہے جتنی حیرت اور مسرت کا اظہار کریں مگر خاک میں سونے والے کے لئے تو بہرحال حسرت کے چار آنسو ہی بہا سکیں گے۔ آپ کو ضرور یہ خیال آئے گا کہ شاہجہاں نے اپنی بیوی کی محبت میں چاہے لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کرکے دنیا کی ایک بے نظیر عمارت ہی کیوں نہ بنادی ہو اور خود بھی اپنی بیوی کے پہلو میں کیوں نہ سو رہا ہو۔ مگر دُنیا کے محلۂ عیش سے اس کو آخر کیا اور کس قسم کی مناسبت ہو سکتی ہے؟ کیا اس وقت آپ کی دیدۂ عبرت سے دو آنسو بھی نہ ٹپک سکیں گے؟

اگر آپ خلد آباد (ضلع اورنگ آباد دکن) میں حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پہ جائیں تو شاید سب سے زیادہ سبق آپ یہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو دُنیا میں کچھ نہ ملا ہو۔ اگر وہ فقیر و درویش بن کر رہیں تو یہ بڑا کمال نہیں ہے۔ مگر جن کو دُنیا کی ہر چھوٹی بڑی نعمت ملی ہوئی ہو اور دُنیا کے سارے فوائد و لذائذ اُن کے قدموں میں لوٹ رہے ہوں۔ مگر وہ اُن سے بے رغبت ہوں اور فکرِ آخرت انھیں فقر کی دولت سے نواز دے تو وہ بڑے صاحبِ کمال ہیں ؎

باده ها خوردن و ہشیار نشستن سہل است

گر بدولت برسی مست نگردی مردی!

حضرت موصوف کے مزار پر اُن کی پاکیزہ زندگی کے اوراق آپ کے ذہن میں تیزی سے پلٹتے چلے جائیں گے اور آپ محسوس کریں گے کہ جس شخص کو اکبر و جہانگیر کی سلطنت سے بھی کہیں زیادہ وسیع اور بڑی سلطنت ملی ہوئی تھی اور جس کے سامنے اس کے آباو اجداد کے خدائی ٹھاٹھ باٹ کے نمونے بھی موجود تھے، وہ عمر بھر فقر کے نشہ میں ایسا سرشار رہا کہ ''فقر او از ترتمش پیدا ستے''۔ اُس نے یہ بھی نہ چاہا کہ اس کی قبر کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں اور امیروں کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے[1]

اگر آپ رنگون جائیں اور بہادر شاہ ظفر کے مزار پر جانا ہو جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی قبر کا صحیح نشان تک موجود نہیں ہے۔ اُس وقت اگر آپ ذوق مرحوم اور دوسرے شعراء کے اُن قصیدوں کو ذہن میں رکھ لیں جو اُس کی شان میں کہے گئے ہیں اور خود اس کے دلّی سے نکل کر رنگون پہنچنے اور مرنے تک کی تاریخ بھی ساتھ ساتھ یاد کرلیں تو دُنیا کی بے ثباتی کا ہی نہیں، دوسرے متعدد سبق آپ حاصل کر سکتے ہیں[2]

علامہ اقبال جب کابل میں بابر کے مزار پر گئے تو فرمایا ؎

خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید ایں جا | کہ ایں زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاد است!

---

[1] ۱۳۴۱ھ میں عثمان علی خاں سابق فرمانروائے دکن نے عالمگیر کے مزار کو سنگِ مرمر سے پختہ کروا دیا ہے، مگر قبر کا درمیانی حصہ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اور قبر بھی اُونچی نہیں بنائی گئی۔ قبر کی چار دیواری اتنی مختصر اور محدود ہے کہ پانچ سات آدمی ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ اور اس چار دیواری پر چھت بھی نہیں ہے!

[2] ظفر نے کہا تھا۔ شاہِ رہ کے مقبروں سے الگ دفن کیجئو ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے!

اتفاق دیکھیے کہ اس کی موت بھی اسی کی پسند کے مطابق واقع ہوئی۔ دلّی میں تو سات پشت خاندان زیرِ زمین آباد ہے۔ کابل میں بابر، سکندرہ میں اکبر، لاہور میں جہانگیر۔ آگرہ میں شاہجہاں، دکن میں عالمگیر، یہ غریب مرا تو کہاں؟ رنگون میں۔ جلّ شانہٗ وجلّ جلالہٗ!

چونکہ بابر ہندوستان پر چڑھائی کرنے کے باوجود ہندوستان میں نہیں مرا اور اُس وقت ہندوستان "طلسمِ فرنگ" میں گرفتار اور افغانستان آزاد تھا۔ اس لئے معاً انھیں بابر کی خوش نصیبی کا خیال آگیا۔ مگر یہ ایک ضمنی بات تھی اور بادشاہت کے تصور سے فقر کا تصور پیدا ہونا لازمی تھا۔ اور خود علامہ اقبالؔ فقیر اور فقر دوست تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی ذات کی نسبت فرمایا:۔

درونِ دیدہ نگہ دارم اشکِ خونیں را — کہ من فقیرم و ایں دولت خدا داد است!

سلطان محمود غزنوی کے مزار پر گئے تو سلطان کا ذکر ان الفاظ میں کیا:۔

برقِ سوزاں تیغِ بے زنہارِ او — دشت و در لرزندہ از یلغارِ او
زیرِ گردوں آیت اللہ را تیغش — قدسیاں قرآں سرا بر تربتش

پھر اپنے ذاتی تاثرات اِن الفاظ میں بیان فرمائے:۔

شوخیٔ فکرم مرا از من ربود — تا نبودم در جہانِ دیر و زود
رُخ نمود از سینہ ام آں آفتاب — پردگیہا از فروغش بے حجاب
مہرِ گردوں از جلالش در رکوع — از شعاعش دوش می گردد طلوع!
وارہیدم از جہانِ چشم و گوش — فاش چوں امروز دیدم صبحِ دوش

پھر شہر غزنی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

قصرہائے او قطار اندر قطار — آسماں با قبہ ہائش ہمکنار
نکتہ سنجِ طوس را دیدم بہ بزم — لشکرِ محمود را دیدم بہ رزم
روح سیرِ عالمِ اسرار کرد — تا مرا شوریدۂ بیدار کرد

یعنی غزنی کے قطار در قطار قصروں اور آسمان سے ہمکنار ہونے والے قبوں کو دیکھنے کے باوجود اُن کی نظر انہی چیزوں میں اٹک کر نہیں رہ گئی بلکہ اُن کی چشمِ تصور نے فردوسی کو بزم میں اور محمود کو رزم میں بھی دیکھا اور روح نے عالمِ اسرار کی ایسی سیر کی کہ انھیں بیدار کر دیا۔ پھر غزنی کے ویرانے میں پہنچے تو پہلے "کمرا یا م" سے پناہ مانگی اور پھر خدا سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

مردِ حق آں بندۂ روشن نفس — نائبِ تو در جہاں او بود و بس
او بہ بندِ نقرہ و فرزند و زن — گر توانی سومناتِ او شکن
ایں مسلماں از پرستارانِ کیست؟ — در گریبانش یکے ہنگامہ نیست!
سینہ اش بے سوز و جانش بے خروش — او سرافیل است و صورِ او خموش!

احمد شاہ ابدالی کی قبر پر گئے تو فرمایا:۔

ملتے را داد ذوقِ جستجو — قدسیاں تسبیح خواں بر خاکِ او
از دل و دستِ گہر ریزے کہ داشت — سلطنت ہا بردو بے پروا گزاشت

سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو شہید کے مقبرہ پر تشریف لے گئے تو شہادت کے تصور کو تازہ کیا اور دوسروں کے اندر بھی اس کا صحیح تصور پیدا کرنے کے لئے دریائے کاویری کے نام سلطان شہید کا ایک پیغام نظم کیا۔ جس میں حیات، موت اور شہادت کی حقیقت سمجھائی۔ یہ نظم طویل ہے اور پوری کی پوری پڑھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے (ملاحظہ کیجئے جاوید نامہ۔ آں سوئے افلاک) اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

سینہ داری اگر در خوردِ تیر — در جہانِ شاہیں بزی شاہیں بمیر!
زانکہ در عرضِ حیات آمد ثبات — از خدا کم خواستم طولِ حیات
زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟ — یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش
بندۂ آزاد را شانے دگر — مرگ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست! — مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست
بگذر از مرگے کہ سازد با لحد — زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد!
مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک — آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک!
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر — مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر!
جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است — جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است!
آنکہ حرفِ[1] شوق با اقوام گفت — جنگ را رہبانیِ اسلام گفت

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

غرض بے شمار مزاروں پہ بے شمار کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں اور آپ ان سب سے سبق لے کر وہی کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جس سے آپ کی زندگی ایک مسافرانہ زندگی بن کر رہے اور دُنیا میں رہ کر بھی دُنیا سے دل نہ لگے!

۳۔ علماء و صلحا کی قبریں

علماء و صلحاء دراصل قوم کے رہنما ہوتے ہیں اور انہی کی علمی و دینی خدمات سے دُنیا میں اسلام کا چراغ روشن رہا ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ رہیگا۔ ان کی قبروں کی زیارت تذکرِ آخرت اور تصوّرِ موت کے ساتھ یہ سبق بھی دیتی ہے کہ آدمی کو آخرت کا سامان کرنے کے لئے اس دُنیا میں کیا کچھ کرنا چاہیئے۔ اور سلفِ صالحین نے اس سلسلہ میں کیا کچھ نمونہ چھوڑا ہے۔ اگر وہ نامعلوم الاسم ہوں تو اجمالی سبق بہرحال حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اُن کے نام معلوم ہوں اور نام کے ساتھ ساتھ اُن کے کام سے بھی آدمی کو ضروری واقفیت حاصل ہو تو یہ بہت زیادہ مفید[2] ہے۔ اور اگر زائر کو ان کے ساتھ اعتقادی اخلاقی اور روحانی نسبت بھی حاصل ہے تو اس نسبت میں جتنی زیادہ مضبوطی اور گہرائی ہوگی اتنا ہی زیادہ یہ زیارتیں زائر کو متاثر کریں گی۔ علامہ اقبال کو حکیم سنائی غزنوی سے گہری عقیدت تھی کیونکہ علامہ اقبال مولانا روم کو اپنا پیر سمجھتے تھے۔ اور حکیم صاحب موصوف خود مولانا کے اکابر میں سے تھے جن کا ذکر مولانا نے اپنی مثنوی میں ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ علاوہ ازیں

---

[1] پہلے مصرعہ میں حضور سرورِ کائنات مراد ہیں اور دُوسرے مصرعہ میں حدیث الجهاد رهبانية الاسلام کی طرف اشارہ ہے!

[2] فاضل مقالہ نگار کی رائے صائب ہے اور قرینِ حق و صواب ہے۔ مُدیرِ "فاران" کو اس سلسلہ میں صرف ایک ضروری بات کی طرف متوجہ کر دینا ہے۔ وہ یہ کہ آجکل اولیاء اور صلحاء کی قبروں پر عام طور پر لوگ نذر و نیاز گزارنے اور استمداد کی نیت ہی سے حاضر ہوتے ہیں، عرس کے علاوہ بعض قبروں پر دن رات میلہ سا لگا رہتا ہے، ان حالات میں جنابِ شیخ احمد صاحب جیسے صحیح عقیدے کے لوگ قبروں پر جاتے ہیں تو انھیں وہاں "حاضر" (؟) دیکھ کر اہلِ بدعت یہی سمجھتے ہیں کہ جن معتقدات اور مُرادوں کو لے کر ہم "مزارِ اقدس" پہ آتے ہیں اسی کام کے لئے یہ صاحب بھی گئے ہیں۔ ان دنوں اولیاء و صلحاء کی قبروں کی زیارت اگر اس "فتنہ" میں اضافہ کر رہی ہو، تو کیا کیا جائے! الفہم فتدبر! (ایڈیٹر)

علامہ اقبال نے حکیم صاحب کی کتابوں کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے جب انھیں ۱۹۳۳ء میں حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کا موقع ملا تو وہ مزار کے پاس جاتے ہی بے اختیار ہو گئے اور سرہانے کھڑے ہو کر دیر تک زور زور سے روتے رہے۔ خود علامہ[1] نے اپنی مثنوی "مسافر" میں اس روحانی نسبت کو خوبی سے نظم کیا ہے۔ شہر غزنی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

خفتہ در خاکش حکیم غزنوی — از نوائے او دلِ مرداں قوی
آں حکیمِ غیب، آں صاحب مقام — ترکِ جوشِ رومی از ذکرش تمام
من ز پیدا، او ز پنہاں، در سرور — ہر دو را سرمایہ از ذوقِ حضور
او نقاب از چہرۂ ایماں کشود — فکرِ من تقدیرِ مومن وا نمود
ہر دو را از حکمتِ قرآں سبق — او ز حق گوید من از مردانِ حق

در فضائے مرقدِ او سوختم
تا متاعِ نالۂ اندوختم

جہاں تک اسفارِ زیارت کا تعلق ہے، آپ زیارت ہی کے لئے بالقصد سفر نہ کریں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ سیر و سیاحت یا اپنی دیگر ضروریات سے آدمی جہاں جہاں جا سکے وہاں چاہے تو قبروں پر بھی کبھی ہو آئے یا کبھی کبھار قرب و جوار میں چلا جائے۔ جہاں التزام و اہتمام، باوقت و دولت کا بڑا صرف موجود ہو وہاں چاہے ابتداءً مقصد صحیح اور نیت نیک ہی رہے مگر اس میں اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ کہیں فسادِ عقیدہ یا فسادِ عمل میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے ایک محتاط و متقی انسان کو احتیاط و تقویٰ ہی کے مقتضیٰ پر عمل کرنا اور شدِّ رحال والی حدیث کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے ——!

مزاروں کے پاس آپ دعائے مسنونہ کے ساتھ کوئی اور دعا خدا سے مانگ سکتے ہیں، کیونکہ اس وقت تاثر کے باعث قبولیت دعا کا زیادہ امکان ہوتا ہے مگر صاحبِ مزار سے یہ نہ کہیئے کہ آپ میرے لئے خدا سے دعا مانگیں۔ اگرچہ بعض علمائے کرام نے اس فعل کو حدِ جواز میں لانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے اس میں سخت کلام ہے اور میں ان علماء کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جنہوں نے اس فعل کو "بدعت" قرار دیا ہے[2] کیونکہ اوّل تو اموات پر سلام بھیجنے کی اجازت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ ہر قسم کی آوازوں اور دعاؤں کو سنتے بھی ہیں۔ اور اگر سنتے بھی ہیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے مطابق انھیں کچھ کرنے کی آزادی بھی دی گئی ہے۔ عالم برزخ

[1] علامہ اقبال مرحوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ دین کی بلاشبہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اور وہ عقائد کے اعتبار سے بھی بہت صحیح الخیال تھے۔ مگر اُن کے ہر قول و فعل کو فقیہ یا محدث کے قول و فعل کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال نے اپنے کلام میں موضوع حدیثوں تک کو نظم کر دیا ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی منقبت میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے۔ ؎

مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا!

حالانکہ کوئی ولی کسی نبی سے بلند نہیں ہو سکتا۔ یہ اقبال کے "مزلات" ہیں، ان پر نگاہ رہنی چاہیئے۔ (ایڈیٹر)

[2] علامہ آلوسی بغدادی، شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمہم اللہ اور بہت سے علمائے سلف و خلف کی یہی رائے ہے!

ہمارے لئے غیب کا حکم رکھتا ہے اور ہم وہیں تک جا سکتے ہیں جہاں تک حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات ہمیں لے جاتے ہیں۔ اس کے آگے استنباط و اجتہاد یا استنتاج و استدلال سے کسی چیز کا تعین ہمارے علم و یقین کے دائرہ سے باہر ہے پس جبکہ حضورؐ سے اس کی اجازت منقول نہیں ہے اور نہ صحابہ، تابعین اور ائمہ اسلام نے کبھی ایسا کیا تو ہمیں بھی اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ معاملہ بہرحال مشتبہ ہے اور بندۂ مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کو ہر قسم کے اشتباہات سے پاک رکھے، دوسرے یہ کہ اموات قبر کے عذاب و ثواب سے دوچار ہیں۔ اگرچہ ہمیں ہر ولی و صالح کے ساتھ بلکہ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے ساتھ بھی حسنِ ظن رکھنا چاہیئے۔ لیکن اگر ہم اُن کے کاموں اور حالات کو پیشِ نظر رکھیں تب بھی ہم ظنِ غالب سے آگے نہیں جا سکتے یقینی علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے کہ اس کی صالحیت و ولایت کیا درجہ و مقام رکھتی ہے، کیونکہ وہی نیتوں کا جاننے والا اور غیب و شہادت کا عالم ہے!

حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت سعدؓ بن معاذ کی تدفین عمل میں آئی تو حضورؐ نے تسبیح و تکبیر کہی۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس نیک بندے پر قبر تنگ ہوگئی تھی۔ اس کے ذریعہ اللہ نے کشادہ فرمادی۔ انہی سعد بن معاذ کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ان کی وفات پر عرش حرکت میں آگیا تھا۔ اُن کے لئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ اور اُن کے جنازے میں ستّر ہزار فرشتے شریک تھے۔ مگر اُن کی قبر پہلے تو تنگ ہوگئی، اس کے بعد کشادہ کردی گئی!

اس سے اندازہ فرمایئے کہ کون یہ جان سکتا ہے کہ کون کس حال میں اپنی قبر کے اندر پڑا ہے۔ ہمیں بلاشک اولیاء و صالحین سے حسنِ ظن رکھنا چاہیئے۔ مگر بہرحال ہر ایک کی صحیح حالت صرف خدائے علیم و خبیر ہی کے علم میں ہے اس لئے ہمیں اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے!

اگر آپ اولیاء و صالحین کی ذات کو وسیلہ بناتے ہوئے خدا سے دعا کریں تو اس کے جواز و عدم جواز میں بھی اختلاف ہے اور جہاں تک میں نے غور کیا ہے، دونوں گروہوں کے دلائل میں خاصا وزن پایا جاتا ہے، اس لئے صحیح مسلک یہ ہے کہ کبھی کبھار ایسا کرلیا جائے تو ناجائز نہیں ہے۔ مگر اس کا التزام نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بغیر توسّل کے خدا کسی کی دعا سنتا ہی نہیں اور یہ خیال بالبداہت غلط ہے۔ خدا فرماتا ہے:-

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ!

اے نبی! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتادو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں!

مزارات کے پاس خواہ وہ عوام کے ہوں یا سلاطین و امراء کے یا اولیاء و صالحین کے، تلاوتِ قرآن کرنا میرے نزدیک جائز بلکہ مستحسن ہے۔ چاہے صرف حصولِ ثواب کی خاطر کی جائے یا صاحبِ مزار کے ایصالِ ثواب کے لئے۔ مگر تلاوتِ قرآن یا کسی بدنی عبادت کے ایصالِ ثواب میں ائمہ اسلام کا اختلاف ہے۔ امام اعظمؒ اور امام احمد بن حنبل اسے درست بتاتے ہیں اور امام مالک و امام شافعی نادرست! تاہم نفسِ تلاوتِ قرآن خود ایک ایسا فعل ہے جو نزولِ رحمت کا موجب ہے۔ اس لئے خواہ کوئی شخص قصداً ایصالِ ثواب نہ کرے مگر اہلِ قبور اللہ کی رحمت سے محروم نہیں رہ سکتے!

۴۔ غیر مسلموں کی قبریں

اگر غیر مسلموں کی قبر دیکھنے کا اتفاق ہو تو وہ دعا نہ پڑھی جائے جو مسلمانوں کے قبرستان میں پڑھی جاتی ہے۔ کیونکہ سلام و دعا کا یہ طریقہ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہاں صرف

اپنی موت کو یاد کرے اور آخرت کی طرف دھیان دینے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پر اکتفا کرے۔ اور اگر غیر مسلموں کی زندگیوں میں کوئی عبرت کا پہلو موجود ہے، تو اس سے عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرے! علامہ اقبال نے نپولین کی قبر پر ایک نظم لکھی ہے جس میں وہ کہتے ہیں :-

ساز ہے راز ہے تقدیر جہانِ تگ و تاز — جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع — کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر — سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر — جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس — عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

"عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز!"

ایک غیر مسلم کی قبر دیکھنے سے ایک بندۂ مومن کے سینہ میں جو جذبات و احساسات پیدا ہوتے ہیں، اس نظم میں علامہ نے اُن کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلم اور غیر مسلم سبھی یہاں "جوشِ کردار" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر مردانِ خدا کا "جوشِ کردار" ایک دُوسری ہی چیز ہے کہ میدانِ جنگ میں اُن کی تکبیر خدا کی آواز بن جاتی ہے۔ اس لئے جوشِ کردار رکھنے والوں کو اپنے عمل کی راہ سوچ لینی چاہیئے۔ اور جلد سرگرمِ عمل ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ "فرصتِ کردار" تھوڑی ہے اور قبر کی رات لمبی۔ مُسلم و غیر مُسلم سب کی آخری منزل تو وہی "وادیِ خموشاں" ہے، جس کی طرف سب گئے ہیں اور روز چلے جا رہے ہیں۔ رہے نام اللہ کا!

(فاضل مضمون نگار کے اس گرانقدر مقالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قبروں پر عُرس وغیرہ کے نام سے جو کچھ ان دنوں ہو رہا ہے، اُن میں سے بعض چیزیں تو "شرک" کی تعریف میں داخل ہیں اور بعض خطرناک قسم کی بدعات ہیں۔ مسلمانوں کو ان سب سے قطعاً اجتناب کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قبروں کی زیارت دُنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہے نہ کہ کسبِ فیض و برکت کے لئے!)

(م۔ق)

اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کیلئے نذر و نیاز

نذر لغیر اللہ

مشرکین کی عبادت کا ایک اور عمل جس پر ہمارے مقالہ کے آخر میں بحث کرنی باقی ہے، وہ "نذر لغیر اللہ" ہے۔ مشرکین اپنے مال کا ایک حصہ غیر اللہ کی نذر و نیاز کے لئے صرف کرتے تھے، اُن کے لئے جانور ذبح کرتے تھے، اس طرح اُن کی تعظیم و تکریم کرتے تھے:۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَائِنَا (پ۸ ع ۳)

"اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کئے ہیں، ان لوگوں نے اُن میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا" ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ تَاللّٰهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ (پ۱۴ ع ۱۳)

یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں ان کا حصہ لگاتے ہیں جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں۔ قسم ہے خدا کی تم سے تمہاری اس افترا پردازیوں کی ضرور باز پرس ہوگی!

حضرت شاہ عبدالقادرؒ ان آیات کی تفسیر میں صراحت فرماتے ہیں کہ کافر اپنی کھیتی اور مواشی کے بچوں میں اور تجارت میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے تھے، جنہیں وہ اپنی جہالت اور بے خبری سے معبود، یا مالک نفع و ضرر سمجھتے تھے حق تعالیٰ اُن کے اس ظلم اور بے انصافی اور افترا پردازی کی مذمت فرما رہے ہیں!

نذر و نیاز کا رواج اسلام کی "غربت" کے اس زمانہ میں اس کثرت سے ہوگیا ہے کہ ہمیں یہاں اس کی تحقیق ضرور نظر آتی ہے۔ ہر زمانہ کے مشرکین کے قلوب میں ایک نمایاں تشابہ ہوتا ہے۔ وہ وہی بات کہتے ہیں اور وہی عمل کرتے ہیں جو اُن سے پہلے گزرنے والے مشرکین نے کہی تھی اور اُس پر عمل کیا تھا۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ (پ۱ ع ۱۴)

نذر (نیاز) لغت میں وعدہ کرنا ہے، نیکی کا ہو یا بدی کا اور شرع میں کسی عبادت کا لازم کر لینا ہے، جو لازم نہیں تھی، نذرت نذراً اذا اوجبت علیٰ نفسک شیئاً تبرعاً من عبادت او صدقۃ او غیر ذلک (نہایہ)

تمام فقہا نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نذر اللہ کی قربت اور عبادت ہے، چنانچہ قاضی حسین اور متولی اور رافعی اور سوا ان کے دوسرے علماء شافعیہ اور زین الدین بن نجیم اور علامہ قاسم وغیرہ علمائے حنفیہ نے اپنی تصانیف میں اسی کی صراحت کی ہے اور

وَمَا اَنْفَقْتُمْ نَفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ (پ۳ ع ۵)

اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو تو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے!

سے بھی یہی بات مترشح ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابو السعود میں وضاحت کی گئی ہے کہ "او نذرتم، النذر عقد الضمیر علی شئ والتزامه" یعنی نذر دل میں کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کو لازم کر لینا ہے!

جب نذر عبادت[1] ہوئی تو غیر اللہ کے لئے اس عبادت کا بجا لانا شرعاً صریح شرک ہے، عوام الناس بزرگوں کی جو نذر دنیا کرتے ہیں، وہ حاجت برآری کے خیال ہی سے کرتے ہیں۔ یا تو کسی مقصد کا حصول پیش نظر ہوتا ہے یا پھر کسی بلا کا ٹالنا۔ گویا اس طرح وہ ان بزرگوں کو رشوت دینا چاہتے ہیں۔ اس خیال سے تو حق تعالیٰ کی نذر بھی روا نہیں کہ وہ ذاتِ مقدس بھی اخذِ رشوت سے پاک ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

لا تنذروا فان النذر لا يغني من القدر شيئا وانما يستخرج به من البخيل (متفق علیہ)

یعنی نذر نہ مانو اس لئے کہ نذر تقدیر کے نوشتے کو نہیں مٹا سکتی۔ اس کے ذریعہ تو فقط بخیل کا مال نکالا جاتا ہے۔

طیبی نے اس حدیث کی شرح میں وضاحت کر دی ہے کہ "جس نذر سے روکا گیا ہے وہ نذر مقید ہے، جس کا ماننے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تقدیر کے لکھے سے بچا لیتی ہے، جیسا کہ بہت لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور ہم اپنے زمانہ کی کتنی جماعتوں کو اسی اعتقاد پر پلتے ہیں"

غرض عوام جو بزرگوں کی نذر کرتے ہیں، اُن سے پوچھنا چاہیئے کہ تمہاری اس نذر کا مقصد کیا ہے؟

۱۔ تقرب اور عبادت؟ یہ تو صریحاً شرک ہے۔

۲۔ مقصود یابی اور حاجت برآری؟ یہ بھی شرک و حرمت دونوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ ایصالِ ثواب؟ ہاں یہ جائز ہے، لیکن یہاں نیت کی تصحیح سخت ضروری ہے۔ غور کرو، تمہیں خود اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیئے، خود ثواب کمانے پر مائل ہونا چاہیئے۔ اس کو چھوڑ کر تمہیں دوسروں کو ثواب پہنچانے کی فکر زیادہ دامنگیر معلوم ہوتی ہے اور پھر تمہارے آباؤ اجداد اس امر کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم انھیں ثواب پہنچاؤ۔ اس کا تم کو زیادہ خیال نہیں ہوتا۔ پیروں اور شہیدوں کی نیاز اور فاتحہ التزام کے ساتھ کرتے ہو۔ ذرا اپنے قلب کی طرف ایمان کی روشنی میں دیکھو۔ کیا تمہاری غرض یہ تو نہیں کہ ایسا کرنے سے تمہارے مال میں برکت ہوگی، بال بچے تندرست اور عافیت سے رہیں گے، تجارت میں خسارہ نہ ہوگا۔ زمانہ کے لکد کوب سے نجات ملے گی۔ اگر تم اس غرض سے نذر و نیاز بزرگوں کی کیا کرتے ہو (مثلاً حضرت پیرؒ کی گیارھویں۔ یا کونڈوں کی دستر خوان یا سہمنی) تو مشرکین کی طرح تم ان بزرگوں کو اپنا معبود بنا رہے ہو۔ ان کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ رہے ہو۔ اور یہ کھلا شرک ہے، اس کی تشریح قرآن و حدیث سے اُوپر تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ علامہ قاسم شارح درر کے اس بیان پر غور کرو:-

النذر الذی ینذرہ اکثر العوام کان یقول یا سیدی فلان ان رد غائبی او عوفی مریضی او قضیت حاجتی فلک من الذھب او الفضۃ او الطعام والشراب

---

[1] مقابلہ کرو شامی جلد ۲ صفحہ ۱۳۹۔ والنذر للمخلوق لا یجوز لانہ عبادۃ والعبادۃ لا تکون للمخلوق!

او الزیت کذا فھذا باطل بالاجماع لانہ نذر لمخلوق وھو لایجوز، لان النذر عبادۃ والعبادۃ لایکون لمخلوق والمنذور لہ میت والمیت لایملک وانہ ان ظن ان المیت یتصرف فی الامر کفر الا ان قال یا اللہ انی نذرت لک ان نجلت معی کذا ان اطعم الفقراء الذین بباب السیدۃ النفیسۃ او الامام الشافعی ونحوہ فیجوز حیث یکون فیہ نفعاً للفقراء والنذر اللہ !

یعنی وہ نذر جو عوام الناس کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اے میرے بزرگ (کسی ولی یا نبی کو مخاطب کرکے) اگر میرا غائب واپس آجائے، یا بیمار اچھا ہو جائے، یا میری حاجت بر آئے تو آپ کے لئے اتنا سونا یا چاندی یا طعام وشربت یا تیل بطور نذر پیش کروں گا۔ سو یہ باطل ہے بالاجماع۔ اس لئے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور یہ جائز نہیں۔ کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کی روا نہیں۔ جس کے لئے نذر مانی ہو وہ میّت ہے اور میّت کسی چیز کی مالک نہیں۔ اور اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نذر ماننے والا یہ بھی خیال کرے کہ میّت کو کاموں میں اختیار حاصل ہو تو وہ کافر ہو جائے، ہاں اگر وہ یہ کہے کہ "یا اللہ! میں نے تیری نذر کی کہ اگر تو میرے ساتھ یہ معاملہ کرے تو میں سیدہ نفیسہ[1] فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا، یا امام شافعیؒ کے دروازہ والوں کو کھانا دوں گا" تو یہ جائز ہے کیوں کہ اس میں نفع ہے فقیروں کا اور نذر ہے اللہ عزوجل کی"

دیکھو اس بیان کا تجزیہ کرنے سے مندرجہ ذیل امور واضح طور پر پیش ہو جاتے ہیں:۔

۱۔ عوام کالانعام جو نذر اپنے پیروں، بزرگوں کی حاجت برآری کی خاطر کرتے ہیں وہ بالاجماع باطل ہے اور قطعاً شرک ہے کیونکہ

۲۔ مخلوق کی نذر کسی معنی میں جائز نہیں، اس لئے کہ وہ عبادت ہے اور سوائے خالق کے کسی کے لئے روا نہیں۔

۳۔ عوام کی غرض بزرگوں کی نذر و نیاز سے یہی ہوتی ہے کہ آفات و بلیات سے وہ محفوظ رہیں۔ مال و دولت میں اضافہ ہو، صحت و عافیت حاصل ہو، اگر وہ زبان سے اس امر کا اقرار بھی کریں کہ ہمیں صرف ایصالِ ثواب ہی منظور ہے تو بھی وہ اپنے نفس کو دھوکا دے رہے ہیں، انھیں ایمانداری کے ساتھ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ یہ بھی کہنا درست نہیں کہ یہ فلاں ولی یا نبی کی نذر ہے۔ بلکہ انھیں یہ کہنا چاہیئے کہ یہ اللہ کی ہے اور ثواب اس کا فلاں کو پہنچے۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی ولی یا نبی کی نذر مانی بھی جائے تو وہ منعقد نہیں ہوتی — کیونکہ لاوفاء لنذر فی معصیۃ۔ یعنی نذر معصیت کی وفا ضروری نہیں، اور ظاہر ہے کہ عبادت غیر اللہ معصیت ہے اور نذر منجملہ عبادات ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ:۔

من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ ومن نذر ان یعصیہ فلا یعصہ[2] !

"جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر کی اس کو چاہیئے کہ اطاعت کرکے اپنی نذر پوری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کی نذر کرے وہ نافرمانی نہ کرے"

(قرآن اور تعمیر سیرت، از ڈاکٹر میر ولی الدین)

[1] اس جگہ پر سیدہ نفیسہ اور شافعیؒ کے دروازہ کے فقیر کیا چیز ہیں؟ قبروں اور آستانوں کے دروازوں پر فقراء کا مجمع ہونا ہی غلط ہے۔ (م-ق)

---

[2] یہ حدیث مسلم بن عمران بن حصین سے مرفوعاً مروی ہے !

مولانا عبدالحمید ارشد

اَللّٰہُ وَاحِدٌ لَاشَرِیْکَ لَہٗ !

اسلام کیوں آیا؟

دنیا عقیدۂ "توحید الٰہ" سے بیگانہ ہو کر، بدکرداری اور بداخلاقی کی عمیق ذلت و پستی میں جا گری تھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے بروقت دستگیری فرمائی، اسلام آیا تاکہ پھر سے اس سچے عقیدے توحید الٰہ کی بنیاد پر اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ کی تعمیر مکمل کرے۔ دنیا دو فریقوں میں بٹ گئی۔ اسلام ماننے والے اور نہ ماننے والے۔ نہ ماننے والوں نے اس بنا پر نہیں مانا کہ آبائی تقلید اور شیوخِ ضلال کی پیروی میں اس بری طرح سے مبتلا تھے کہ عقل و ہوش کے جملہ تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے خودساختہ معبودوں کی غلامی کی نجاستوں کے وہ اس حد تک خوگر ہو گئے تھے کہ "توحید الٰہ" کے بے نظیر شرف و فضیلت کو نہ پا سکے۔ اور ماننے والوں نے اسلام کو اس بنا پر مانا کہ فی الحقیقت کفر و شرک انسانیت کے لئے ایک شرمناک ذلت ہے۔ اور عقیدۂ توحید الٰہ جل شانہٗ سب سے بڑی صداقت ہے جو انسان کی سعادت و نجات کی ضامن ہے!

اسلام نے اپنے ماننے والوں کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا کہ اسی عقیدۂ وحدانیت الٰہ پر قائم رہ کر اپنی سیرت و کردار کو اسی کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے سامنے اخلاق و اعمال کا بلند نمونہ پیش کریں۔ اور اسلام کے نظامِ حق کو دنیا میں غالب و برتر رکھنے کے لئے اپنے جملہ امکانی وسائل و مساعی کو بروئے کار لائیں۔ مخلصوں نے اپنے اپنے وقت میں اس فریضہ کو بوجہ احسن انجام دیا۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء ــــ! لیکن نہایت تاسف سے کہنا پڑتا ہے کہ برائے نام ماننے والوں کا ایک گروہ اٹھا اور اس نے اسلام کے بنیادی عقیدہ "توحید الٰہ" پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔ اور اپنے آباء و شیوخ کی قبروں کی پرستش شروع کر دی، اور بدعات و رسومات کا شکار ہو گئی ــ اور مخلوق کی پوجا میں لگ گئی۔ ایک دوسرے گروہ نے اسلام کے "نظامِ عدل و انصاف" کی وفاداری میں تذبذب کا ثبوت دیا۔ اور عملی اسلام سے رو گرداں ہو گئے۔

اس مضمون میں پھر سے سب دنیا والوں کو اُعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (ایک اللہ کی بندگی کرو۔ کیونکہ، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ ــ لائق پرستش و بندگی ــ ہے ہی نہیں) کی مومنانہ دعوت عقل و برہان اور دلیل سے دی گئی ہے۔ کوئی ہے جو اس پر غور کرے!! اللہ ہدایت دے، آمین!!

اللہ ایک (واحد) ہے اس کا کوئی شریک نہیں

ارشادِ ربانی ہے:-
وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۝

(لوگو!) تم سب کا معبودِ برحق، حاجت روا اور کارساز، حاکم و بادشاہِ حقیقی ایک اللہ،
اللہ، فقط اللہ ہے۔ جس کے سوا کوئی بھی دوسرا الٰہ نہیں۔ وہ بڑا مہربان بے حد رحم
فرمانے والا ہے! (سورۂ بقرہ آیت ۱۶۳)

"اِلٰہ" کا لفظ الوہیت و خدائی کے تمام صفاتِ کاملہ کو شامل و حاوی ہے۔" اِلٰہ برحق" صرف وہی ہوگا جو اقتدار و اختیار کے بلند ترین درجہ پر فائز ہوگا۔ اور تخلیق و تکوین کی بے مثال طاقت و قوت کا سرچشمہ اور مصدرِ فیوض و برکات اور سرچشمہ کمالات و فضائل اور جامعِ محاسن ہوگا اور جملہ عیوب، قبائح اور رذائل سے مبرا اور منزّہ ہوگا۔ وہ ہر حال میں جملہ مخلوقات کی حالت سے باخبر اور اُن کے دُکھ درد اور راحت و آرام اور اُن کی ضرورتوں اور حاجتوں سے واقف اور اُن کے پورا کرنے پر قادر ہوگا اور ان کمالاتِ علمی و عملی (فعلی) کے باعث استحقاقِ عبادت و بندگی اور طاعت و فرمانبرداری اور اہلیتِ فرمانروائی و شہنشاہی بھی رکھتا ہوگا۔ سو ہم ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ ایسی ذاتِ برتر بجز اللہ رحمٰن و رحیم کے اور کوئی نہیں۔ وہی اکیلا ان صفاتِ کاملہ اور کمالاتِ فاضلہ سے متصف ہے اور جملہ عیوب و نقائص سے مبرا اور تمام فضائل و محاسن کا جامع ہے!

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ
سُبْحَانَ الْعَلِيِّ الْاَعْلٰى ، سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى

اللہ ایک ہے

عقلِ صحیح اور شریعتِ الٰہی اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ذات و صفات اور افعالِ الٰہیہ میں ایک ہے، بے مثل و بے مثال اور بے چون و بے چگوں، نرالا اور واحد و لاشریک لہٗ۔ یگانہ و یکتا اور سب سے اعلیٰ و برتر ہے۔ نہ ذات میں اُس جیسا کوئی دُوسرا ہے نہ صفتوں میں اس کا کوئی ہمسر اور مماثل اور نہ اپنے خدائی کاموں میں کوئی اس کا معاون و شریک ہے۔ لہٰذا استحقاقِ عبادت و بندگی میں بھی وہ یکہ و تنہا مستحقِ عبادت و پرستش اور پرستارانہ تعظیم و اجلال کا حقدار ہے! فرمانروائی اور شہنشاہی اور کارسازی و حاجت روائی اور بندہ پروری اُسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان الٰہی خصوصیات میں کسی بڑی سے بڑی مخلوق حتیٰ کہ فرشتہ، نبی یا ولی کو بھی ادنیٰ شائبۂ اشتراک نہیں ہے۔ ذرّہ ذرّہ اس کی وحدانیت و صمدیت پر گواہ اور اس کے تفرّد و یگانگت پر شاہد عدل ہے۔ ہم بھی اس سچی گواہی میں باقی فرمانبردار مخلوق کے ساتھ پوری ایمانداری اور یقین و طمانیت کے ساتھ شامل ہیں اور ڈنکے کی چوٹ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اعلانِ حق کرتے ہوئے پوری خوشی اور شادمانی محسوس کرتے ہیں۔ اور جس رسولِ برحق کے ذریعہ ہمیں یہ بے بہا دولت ــــ دولتِ توحید نصیب ہوئی ہے، اُس کی رسالت و نبوت کا اقرار بھی پوری شرحِ صدر اور کامل فرح و انبساط کے ساتھ کرتے ہوئے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی شہادتِ حقہ کا واضح اعلان کرتے ہیں ـــ!

اسلام جس کی بدولت یہ دونوں صداقتیں، یہ بیش بہا نعمتیں ــــ نعمتِ توحید و رسالت ہمارے حصہ میں آئی ہیں واقعی اللہ تعالیٰ کا واحد و تنہا دینِ حق ہے اور اس قابل ہے کہ وہی دُنیا بھر میں سربلند و سرفراز رہے۔ ہمیں

اس کی سربلندی اور برتری کے لئے ہر امکانی جدوجہد کے لئے ہر وقت تیار و مستعد رہنا چاہیئے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید ہمارے شاملِ حال رہے اور ہم دنیا و آخرت کی کامیابیوں اور سعادت مندیوں سے سرفراز و کامگار ہوں:۔

رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

اے ہمارے پروردگار! صبر و ثبات سے ہمیں مالا مال کردے اور ہمارے قدم (دینِ حق پر اور محاربۂ اعدائے اسلام کے وقت) جمادے اور ہمیں قومِ منکرینِ حق پر فتحیاب فرما! (آمین)

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۰)

سب سے بڑی صداقت

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ وہ سب سے بڑی صداقت ہے جو تمام صداقتوں، نیکیوں اور سعادت مندیوں کا واحد سرچشمہ اور منبع خیر و برکت اور مصدرِ فیوض و انعاماتِ الٰہیّہ ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور اُن کے سچے متبعین، صدیقین، شہداء، صالحین، اولیاء، اصفیاء، علماء، فقہاء، عُبّاد اور زُہّاد نے جو کچھ پایا ہے اسی حق توحید کی بدولت پایا ہے۔ اور کفار و منکرین، منافقین، ملحدین اور اہلِ بدعت جو حقیقی خیر و برکت سے محروم ہیں، وہ بھی اسی وجہ سے کہ حقیقی اور مخلصانہ عقیدۂ توحید اللہ جلّ شانہٗ سے خالی اور اس سعادتِ کبریٰ سے تہی دامن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور جملہ اہلِ ایمان کو اس صداقتِ کبریٰ اور نعمتِ عظمیٰ پر ابدالآباد تک ثابت قدم، قائم و دائم رکھے۔ آمین!

جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کی متفقہ دعوتِ حق ہے:۔

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط

لوگو! ایک اللہ جل شانہٗ کی بندگی کرو، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا معبود، کارساز و حاجت روا قطعاً نہیں۔ (سورۂ ہود، آیت ۵۰ و دیگر مقامات)

ہست اللہ ربِّ ما واحد — ذوالمنن، ذوالجلال والماجد
ہست توحیدِ اُو شہادتِ حق — ہم محمدؐ رسولِ او برحق
ذاتِ پاکش نہ مستعدِ فنا است — ہر کجا جلوۂ از و پیدا است
حُسنِ رویش چو پرتوے افگند — زو دو عالم شد است بہرہ مند
ذاتِ اُو مجمعِ کمالات است — خالق الارض والسموات است
حضرتِ حق یگانہ و یکتا است — مالکِ مُلک، داورِ اعلا است
نعتش را چو نیست پایانے — کے توانیم مدح شایانے
ہیچ کارے زغیرِ اُو ناید — جز ساقی و پیش اُو شاید

دلائلِ توحید

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و یکتائی کے دلائل بے شمار ہیں۔ جن کا ضبط کرنا مخلوق کی طاقت و وسعت سے بالاتر ہے۔ یہاں ہم نمونہ کے طور پر، اپنے فہم کے مطابق و اللہ تعالیٰ کی تائید و امداد سے چند ایک دلائل کا مختصراً ذکر کئے دیتے ہیں۔

دلیلِ اوّل:۔ خالق و پروردگارِ عالم ایک ہے۔ کیونکہ اگر ایک سے زائد ہوں تو ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اُن میں سے ہر ایک مستقلاً تخلیق و ربوبیتِ عالم پر قادر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو بس ایک ہی اُن میں سے خالق ٹھہرے گا اور دوسرا بیکار محض۔ کیونکہ سارا کام وہی اکیلا سرانجام دے گا، دوسرے کے لئے نہ کوئی کام رہے گا اور نہ اُس کی ضرورت رہے گی۔ یعنی عالم میں کام اور ضرورتاً

تو ایک ہی سے پوری ہو جائیں گی۔ دوسرے کے لئے جب کام نہیں ہوگا تو اس کی ضرورت بھی نہیں ہوگی، اور مخلوق اس سے مستغنی ہوگی۔ لہٰذا وہ بیکارِ محض ہوگا۔ ظاہر ہے کہ خالق و پروردگارِ عالم تو بے کارِ محض نہیں ہو سکتا۔ اور مخلوق اس سے کسی وقت مستغنی نہیں ہو سکتی۔ اور جو بیکارِ محض ہوگا اور مخلوق اس سے مستغنی ہوگی وہ خالق و پروردگارِ عالم یا اِلٰہ کائنات نہیں ہو سکتا۔

پس اِلٰہ وہی واحد موجودِ برحق ہوگا جو سارے عالم کا بالفعل مستقلاً خالق و پروردگار ہے اور یہی مقصود ہے۔ عرفِ عام اور سانِ شریع میں اس "اِلٰہ واحد و برحق" کا "اسمِ ذات" "اللّٰہ" ہے۔ اس کے صفاتی نام — رحمٰن و رحیم اور سمیع و بصیر اور علیم و خبیر وغیرہ ہیں —!

اور اگر شقِ دوم اختیار کی جائے کہ ان میں سے ہر ایک عالم کی تخلیق و ربوبیت پر مستقلاً اور تنہا قادر نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے کے اشتراک سے یہ کارروائی انجام دیتے ہیں۔ یا اپنے سے بالاتر کسی اور ہستی کی امداد سے عالم کا کاروبار چلاتے ہیں۔ جو بھی صورت فرض کی جائے، تو ان میں سے کوئی بھی اِلٰہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ عاجز اور محتاج ہے اور اِلٰہ عاجز و محتاج نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جس چیز کا وہ محتاج ہوگا وہ اس سے بالاتر اور فائق تر ہوگی۔ یعنی محتاج، کمتر اور محتاج الیہ فائق تر ہوگا۔ اور جس صورت میں وہ "مفروضہ دو اِلٰہ" ایک دوسرے کے محتاج ہوں گے تو دونوں ایک دوسرے سے (مِنْ وَجْہٍ) کمتر اور (مِنْ وَجْہٍ) فائق تر ہوں گے۔ محتاج ہونے کی حیثیت سے کمتر اور محتاج الیہ ہونے کی حیثیت سے فائق تر ہوں گے اور چونکہ یہ دونوں حیثیتیں ہمہ گیر اور مستقل ہوں گی (کہ کوئی کام بھی ایک دوسرے کے اشتراک کے بغیر انجام پذیر نہیں ہوگا) لہٰذا ہر ایک کا عجز اور احتیاج بھی مستقل ہوگا۔ پس بدیں وجہ ان میں سے کوئی بھی "اِلٰہ" یعنی مختارِ مطلق اور مستقل فی الخلق والرّبوبیّت نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی لازم آئیگا کہ ایک ہی چیز دوسری چیز سے[1] (بصورتِ تعددِ آلِھَہ) ایک ہی وقت میں، ہر لحاظ سے مستقلاً کمتر بھی ہو اور فائق تر بھی۔ اور محتاج ہونے کی حیثیت سے مؤخر ہو اور محتاج الیہ ہونے کی حیثیت سے مقدّم اور ان دونوں حیثیتوں کے بیک وقت اجتماع سے اجتماعِ ضدین بلکہ اجتماعِ نقیضین (یعنی تقدّمِ شئے بر شئ و عدمِ تقدّمِ شئے بر آں شئ) لازم آئے گا۔ جو عقلاً و شرعاً صریحُ البطلان ہے۔ نیز فوقیت و تقدّمِ شئ بر ذات و نفسِ خود[2] لازم آئے گا۔ جو بداہتہً باطل ہے!

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں اپنے کاروبار میں اپنے سے بالاتر ایک تیسری ہستی کے محتاج ہیں جو منفرد و یگانہ ہے تو لازم آئے گا کہ "اِلٰہ" وہی بالاتر واحد و یگانہ ہستی ہے۔ نہ کہ اس کے ماتحت وہ محتاج ہستیاں۔ اور الوہیت میں نائب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ وہ بالاتر واحد ہستی ہر لحاظ سے خلق و ربوبیت میں کامل و مستقل ہے۔ اس کا کوئی کام نائب کے لئے ادھورا اور نامکمل نہیں چھوڑا گیا۔ ورنہ اس کا احتیاج لازم آئے گا اور فرض یہ کیا گیا کہ نہ کسی لحاظ سے بھی محتاج

---

[1] - یعنی ایک مفروضہ اِلٰہ "دوسرے مفروضہ اِلٰہ" سے کمتر بھی ہو اور بالاتر بھی۔ تعالی اللّٰہُ عَنْ ذٰلِکَ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔

[2] - ایک سے زائد ایسے اِلٰہ فرض کر لینے سے جو ایک دوسرے کے محتاج ہوں اور باہم اشتراک و تعاون سے خلق و ربوبیت کا کاروبار چلا رہے ہوں لازم آئے گا کہ ان میں سے ہر ایک محتاج بھی ہو اور محتاج الیہ بھی اور محتاج ہونے کی حیثیت سے متاخر ہو اور محتاج الیہ ہونے کی حیثیت سے متقدّم (خواہ یہ تقدّم و تاخر رُتبۃً ہو) پس ان میں سے ہر ایک اپنے متقدّم سے بھی متقدّم ہوگا جس سے تقدُّمِ الشئ علیٰ نفسِہٖ لازم آتا ہے۔ جو ظاہرُ البطلان ہے!

نہیں (کیونکہ اگر وہ موجودِ بالاتر بھی نائبوں کا محتاج ہو تو پھر وہی محتاج و محتاج الیہ والا چکر چل جائے گا جس کا باطل ہونا ابھی ابھی بیان کیا گیا ہے۔) لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ واحد و بالاتر موجود ہی اپنے سارے کاروبارِ خلق و ربوبیت میں مستقل اور منفرد ہے۔ نہ شریکوں کی اسے حاجت ہے اور نہ نائبوں کا وہ محتاج۔ اور نہ اس شرکت و نیابت کی وہ اجازت دیتا ہے۔ اور نہ اسے برداشت کرتا ہے بلکہ سرے سے اس کا امکان ہی نہیں۔ اور وہ ذاتِ متفرد شرائع انبیاء کرام علیہم السلام میں "اللّٰہ" کے مبارک اور معزز و گرامی اسمِ پاک سے موسوم و متعارف ہے۔ (اور دوسرے نام بھی لوگوں نے اپنی اپنی زبان میں اس ذاتِ متفرد و یگانہ کے لئے اطلاق کئے ہیں۔ لیکن اہلِ علم اس کے لئے وہی اسمائے حسنہ استعمال کرتے ہیں جو اس نے انبیائے کرامؑ کے ذریعہ بتائے ہیں)

خلاصہ:۔ اگر ایک سے زائد "اِلٰہ" (یا خدا) فرض کئے جائیں تو اگر ان میں سے کوئی ایک بھی خلق و ربوبیتِ عالَم میں مستقل ہوگا تو "اِلٰہ" بس وہی ہوگا، باقی فالتو اور محض بے کار رہیں گے اور اگر ان میں سے کوئی بھی مستقل و متفرد نہیں ہوگا تو ہر ایک محتاج و عاجز ہوگا۔ اور ان میں سے کوئی بھی صورت ہو (بے کار رہو یا عاجز) تو وہ اِلٰہ نہیں ہوگا ——

لہٰذا "اِلٰہ" وہی متفرد ذاتِ اقدس ہے جو نہ محتاج و عاجز ہے اور نہ بیکار۔ بلکہ خلق و ربوبیت میں واحد و مستقل ہے اور سب اس کے محتاج ہیں اور وہ اللہ جل شانہٗ ہے۔ الحمد للہ۔

اس دلیل کو ہم "بُرہانِ استقلال" کہتے ہیں۔

ارشادِ الٰہی ہے:۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝

وہی (عقلاً) متعین ذاتِ برحق اللہ ہے جو تم سب کا (مستقلاً) پروردگار ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا "اِلٰہ" (یا پروردگار) نہیں ہے۔ وہی ہر ایک چیز کا (مستقلاً اور تنہا، بلا شرکتِ غیرے) پیدا کرنے والا ہے۔ پس تمہیں بندگی و غلامی بھی اسی ایک کی کرنی چاہیئے اور وہی ہر ایک چیز کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا ہے۔ (سورۃ الانعام، ۱۰۲)

دلیل دوم:۔ اگر دو یا زیادہ اِلٰہ فرض کئے جائیں تو زمین و آسمان اور باقی سب مخلوقات کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا اور یہ ساری دُنیا فساد و بربادی کا پورا پورا منظر پیش کرتی۔ اس لئے کہ "اِلٰہ" وہ ہوتا ہے جو سب مقدورات پر کامل قدرت رکھتا ہو۔ اب دُنیا کا ہر کام جب ایک "اِلٰہ" سے متعلق ہو گیا اور اس کے دائرۂ اختیار و قدرت کے تحت آ گیا تو واجبُ الوقوع ہو گیا اب دوسرے "اِلٰہ" کی طرف اس کی نسبت مستحیل ہو گئی۔ کیونکہ تحصیلِ حاصل کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لیکن ہر ایک "اِلٰہ" چونکہ ہر لحاظ سے دوسرے "اِلٰہ" کے ساتھ قوت و قدرت اور ارادہ وغیرہ امور میں برابر ہے (کہ اگر کم ہو تو پھر وہ اِلٰہ نہیں ہوگا) لہٰذا (بصورتِ تعددِ آلہہ) ہر ایک اِلٰہ لازماً یہ تقاضا کرتا ہے کہ دُنیا کے سب خدائی کام اس کی قدرت و ارادہ سے متعلق ہوں اور اس طرح وہ اپنی خدائی کا مظاہرہ کر سکے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی چیز بھی موجود نہ ہو سکے۔ کیونکہ جب دو یا زیادہ "اِلٰہ" اس کے ایجاد و تخلیق کی طرف بیک وقت متوجہ ہوں گے تو ایک کی مراد و مطلوب ہونے کی وجہ سے اس چیز کا دوسرے کی مراد ہونا محال ہو جائے گا۔

اس لئے کہ امکان ہی کے باعث اس سے ارادۂ موجد متعلق ہو رہا تھا اب جبکہ کسی ایک موجد (یعنی اِلٰہ) کا ارادہ و قدرت

اس سے متعلق ہو رہا ہے تو اس کا وجود ضروری (اور وہ جب لغیرہٖ[1]) ہو گیا۔ اور یہاں چونکہ اس چیز سے دو یا زائد اِلٰہ کا ارادہ و قدرت متعلق ہو رہا ہے تو ضروری ہے کہ وہ بیک وقت ان سب کی مراد ہو۔ لیکن ایک کی مراد اور مقدور ہونے کی وجہ سے وہ دوسرے کی مراد و مقدور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایک ہی مقدور پر بیک وقت دو مستقل قدرتیں وارد نہیں ہو سکتیں۔ (ورنہ تحصیلِ حاصل لازم آئے گا جو عبث بلکہ محال ہے)

اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ چیز بیک وقت ایک سے زائد اِلٰہ کی مراد ہو اور مراد نہ بھی ہو، اُن کی محتاج ہو اور اُن سے مستغنی بھی ہو۔ موجود ہو اور غیر موجود بھی۔ بدیں وجہ کہ ایک اِلٰہ کے ارادۂ ایجاد سے مانع ہے اور وہ دوسرا پہلے کے تعلقِ ارادہ سے مانع ہے، ایک دوسرے کے راستہ میں مستقل حائل ہیں۔ پس لازم آئے گا کہ کوئی چیز بھی اس مستقل کشمکش کے باعث موجود نہ ہو۔ کسی کو ترجیح حاصل نہیں ہے کہ اس کی مراد پوری ہو اور دوسرے کی پوری نہ ہو۔ کیونکہ "اِلٰہ" ہونے کی وجہ سے وہ ہر دو (یا وہ سب) طاقت و قوت اور ارادہ و اختیار میں برابر فرض کئے گئے ہیں اور ترجیح کی صورت میں راجح و غالب اِلٰہ ہوگا، مرجوح و مغلوب اِلٰہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا ایک سے زیادہ اِلٰہ کی صورت میں اجتماعِ نقیضین (وجودِ اشیاء و عدمِ اشیاء بیک وقت) لازم آئے گا اور اجتماعِ نقیضین کو ارتفاعِ نقیضین لازم ہے، جو سراسر باطل ہے اور یہی وہ فساد ہے جو اللہ جلّ شانہٗ کے سوا کوئی بھی دوسرا اِلٰہ فرض کر لینے سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ آسمان و زمین اور کائناتِ عالم پوری خوبی و حکمت کے ساتھ موجود ہیں تو لامحالہ یہ سب ایک اللہ جلّ قدرہٗ کی حکیمانہ صنعت ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور نہ کسی کے لئے اس مداخلت کا امکان ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ـــ!

اس دلیل کا نام "بُرْهَانِ تمانع" ہے!

اس دلیل کو اس طرح بھی بیان کر سکتے ہیں کہ کائناتِ عالم کی تدبیر اگر ایک سے زائد مدبّر (یعنی اِلٰہ) سے متعلق ہوتی تو لازم آتا کہ کوئی بھی تدبیر اور کوئی بھی کام پورا نہ ہوتا۔ کیونکہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کی تدبیر میں حائل ہوتا۔ جب ایک کی تدبیر ہوتی تو دوسرے کی تدبیر کی نہ ضرورت ہوتی اور نہ اس کا امکان ہوتا۔ اس لئے کہ "اِلٰہ" کی تدبیر کامل ہوتی ہے۔ اس میں کسی لحاظ سے کمی نہیں ہوتی، تاکہ دوسرے کی امداد و تعاون سے اُس نقصان کی تلافی کی جاتی۔ کسی کو ترجیح بھی نہیں کہ وہ تدبیر کرتا اور دوسرا فارغ رہتا۔ نیز ترجیح کی صورت میں راجح اِلٰہ ہوتا نہ مرجوح۔ لہٰذا یہ دونوں مستقل تدبیریں (بصورتِ تعددِ اِلٰہ) ایک دوسرے کے تعلق سے (کائناتِ عالم کے ساتھ) مانع ہوتیں۔ اور اس طرح کوئی بھی تدبیر متعلق نہ ہو سکتی اور دنیا میں کوئی چیز بھی موجود نہ ہوتی کہ تدبیرِ خالق کے بغیر مخلوق کے وجود کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ عالم اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجود و مشاہد ہے۔ جس میں ایک زبردست علیم و خبیر اور صنّاع و مدبّر کی حکیمانہ تدبیر اس کے ذرّہ ذرّہ سے نمایاں طور پر تاباں و درخشاں ہے۔ وہی مدبّر و حکیم اللہ جلّ شانہٗ ہے اور بس۔ ارشاد ہوتا ہے:-

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ
يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

---

[1] یعنی ایسی چیز جو تخلیقِ خالق اور ایجادِ مُوجِد کی وجہ سے اُس کی ہستی ضروری ہو گئی ہے۔ خواہ فی نفسہٖ اور اپنی جگہ وہ ممکن الوجود ہے کہ اس کی ہستی و نیستی قبل از ایجادِ مُوجِد برابر ہے۔

یقیناً تم سب کا پروردگار ایک اللہ ہے۔ جس نے یہ سب آسمان و زمین (اپنی حکمت سے) چھ دنوں میں پیدا کئے ہیں۔ پھر تدبیر و انتظام جملہ امور فرماتے ہوئے (شہنشاہانہ نرالی شان کے ساتھ) "عرشِ عظیم" پر انوار و تجلیاتِ الوہیت کی خصوصی پرتو ڈالی۔ (سبحان اللہ) (اس شانِ جلال و کبریائی کے ساتھ) کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اس کے حضور میں کسی کی سفارش کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ان خصوصی صفاتِ جلیلہ سے متصف بس اکیلا اللہ ہے۔ تمہارا پروردگار۔ پس خاص اُسی کی بندگی کرو (ان حقائق کے سمجھنے کے بعد) سو کیا اب بھی عبرت و نصیحت نہیں حاصل کروگے۔ (سورۂ یونس۔ ۳)

(کیا اب بھی کفر و شرک سے باز آکر ایک اللہ جلّ شانہٗ کی وحدانیت و ربوبیت مختصہ کا تہ دل سے اعتراف نہیں کروگے؟ لازماً ایسا اعتراف ڈنکے کی چوٹ کردینا چاہیئے۔ اللہ توفیق دے)

ایک شبہ اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ "الٰہ" میں چونکہ فہم و تدبّر اور رواداری لازماً ہوگی تو عین ممکن ہے کہ دو (یا دو سے زیادہ) "الٰہ" تخلیق عالم پر اتفاق کرلیں اور اس کی تفاصیل بھی باہم اتفاق، مصالحت اور مسالمت سے طے کرلیں یا پھر تقسیم کار کے طور پر اپنا اپنا دائرۂ عمل اور دائرۂ تخلیق و تکوین متعین کرلیں اور اس طرح تصادم کی کوئی صورت نہ پھوٹنے دیں اور کاروبارِ عالم درہم برہم اور اُس میں فساد برپا نہ ہو!

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امکان بوجوہِ ذیل باطل ہے:-

اَوّلاً - یہ کہ اس میں "خالق اور الٰہ" کا مخلوق اور عبد پر قیاس کیا گیا ہے۔ جو سراسر غلط ہے۔ کیونکہ مخلوق اور عباد کا سارا کاروبار ہی تعاون باہمی اور اتفاق و اتحاد سے چلتا ہے۔ لیکن "خالق و الٰہ" کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ بندہ ضعیف اور محتاج ہے اور "الٰہ" مستغنی اور بے نیاز، قادر و توانا ہوتا ہے۔ جو محتاج ہوگا وہ "الٰہ" نہیں ہوگا۔ بلکہ جس کا محتاج ہوگا وہ (محتاج الیہ) اس سے فائق و برتر ہونے کی وجہ سے الٰہ ہوگا۔ اور اس صورت میں چونکہ ہر ایک انتظام و تخلیق میں دُوسرے کے تعاون کا بصورتِ اتفاق یا تقسیم کار محتاج ہے کہ اس کے بغیر یہ کارخانۂ عالم موجود ہی نہیں ہوسکتا۔ اور اگر کسی نہ کسی طرح سے موجود ہو بھی جائے (جس کا امکان کم ہے) تو پھر قائم نہیں رہ سکتا۔ تو ہر ایک اُن آلِہَہ میں سے محتاج ٹھہرا اور محتاج الیہ بھی۔ جس سے لازم آتا ہے کہ ہر ایک الٰہ ہو بھی اور الٰہ نہ بھی ہو جس سے اجتماع ضدین بلکہ اجتماع نقیضین لازم آتا ہے!

ثانیاً:- اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک دُوسرے کے اتفاق یا تقسیم کار کے بغیر تخلیق و تکوینِ اشیاء اور تدبیرِ امور عالم سے عاجز ہے اور عاجز "الٰہ" نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عجز کو احتیاج لازم ہے اور بصورتِ احتیاج محتاج الیہ فائق و مقدّم ہوگا۔ پس ہر ایک فائق و مقدّم بھی ہوگا اور متاخر و کمتر بھی۔ اور یہ قطعاً باطل ہے!

ثالثاً:- اس لئے باطل ہے کہ ایسا اتفاق یا ایسی تقسیم کار ذات و صفات "الٰہ" سے خارج ایک چیز ہے، اور تصادم سے بچنے کے لئے تخلیقِ عالم کے وقت، بنا بر ضرورت، ارادہ کو اس سے متعلق کرکے اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ پس لازم آئے گا کہ "الٰہ" کاروبارِ الوہیت میں اپنی ذات و صفات کے سوا غیر کا اور اپنے افعال کے سرانجام دینے میں ایک خارجی چیز کا ضرورت مند ہو۔ اور اپنی ذات میں کامل نہ ہو۔ ناقص ہو۔ اور یہ ظاہر البطلان ہے۔ کیونکہ الٰہ ہوتا ہی وہ ہے جو

اپنی ذات وصفات میں کامل اور اپنے افعالِ حکیمانہ میں کسی خارجی چیز کا قطعاً محتاج نہیں ہوتا۔
اسی اساس پر آپ اور معقول دلائل بھی استخراج کر سکتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ مفروضہ اتفاق یا تقسیم کار "اِلٰہ" کے حق میں قطعاً غلط اور باطل ہے۔ نیز اس سے یہ لازم آئے گا کہ جب تک اتفاق کرنے والے "اِلٰہ" اور مدبّرِ عالم بن ہی نہ سکے، حالانکہ "اِلٰہ" اور اس کی صفاتِ الوہیّت وتدبیر اور ربوبیت ازلی، ابدی ہوتی ہیں۔ اشیاء خارجیہ یا شرائط کے ساتھ وابستہ اور اُن پر موقوف نہیں ہوتیں!
ساتھ ہی تقسیمِ کار کی صورت میں لازم آئے گا کہ پورے عالم کا اُن میں سے کوئی بھی "اِلٰہ" و مدبّر نہ ہو۔ بلکہ مقرر حصہ کا اِلٰہ ہو۔ گویا خدائی بھی تقسیم ہو جائے گی، اور پوری خدائی کسی کے حصے میں نہیں آئے گی۔ اور یہ "ناقص اور ادھورا اِلٰہ" اِلٰہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ "اِلٰہ" کو کامل ہونا چاہیئے۔ نیز ہر ایک کے دوسرے حصے میں تصرف کرنے سے عاجز ہوگا۔ اور عاجز "اِلٰہ" نہیں ہو سکتا۔ (اس کی تفصیل ہم پہلے بتا چکے ہیں)
ان سب دلائلِ قاطعہ سے ثابت ہے کہ اِلٰہ کائنات ایک اور فقط ایک ـــ واحد ولاشریک اور یگانہ ویکتا ہے اور وہ اَللّٰہ جلّ شانہ ہے کہ اُس نے خود اپنا یہی نام بتایا ہے اور انبیاء ومرسلین نے بھی اس کو اسی مقدّس ذاتی نام سے یاد فرمایا ہے۔ یا بہ اختلافِ لغات، وحی کے ذریعہ بعض دوسرے مقدّس ناموں سے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اور اس کے صفاتی ناموں سمیع وبصیر، رحمٰن ورحیم اور علیم وخبیر وغیرہ سے بھی لوگوں کو واقف کرایا ہے!
حقیقت یہ ہے کہ "اِلٰہ" کے مفہوم ومدلول ہی میں جملہ صفاتِ کمال مثلاً وحدت ویکتائی، اعلیٰ ترین علمی وعملی کمال، قدرتِ کاملہ، جود وسخا اور استغناء وغیرہ شامل ہیں۔ لہٰذا اِلٰہ برحق ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے "اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ" ـــ!
دلیل دوم میں ہم نے جس قدر تفصیلات بتلائی ہیں وہ سب دوسرے مضامین کثیرہ سمیت ذیل کی آیتِ کریمہ میں اعجازی حکمت کے ساتھ سمو دی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ (سورۃ الانبیاء ۔ ۲۲)

اگر آسمان وزمین میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے اِلٰہ (ایک یا زیادہ) ہوتے تو یہ ارض وسما (یعنی سب کائنات) تباہ وبرباد ہو چکے ہوتے۔ (لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا تو ثابت ہوا کہ "اِلٰہ" ایک ہے یعنی اللہ جلّ شانہٗ) سو عرش کا مالک اللہ تعالیٰ ان الزامات سے پاک ہے جو یہ مشرک لوگ اُن سے اُسے متصف کرتے ہیں!

دلیل سوم:۔ اگر ایک سے زائد "اِلٰہ" ہوں تو لامحالہ اُن کی اپنی اپنی مخلوق اور اپنا اپنا عالَم امر وتدبیر ہوگا۔ اس لئے کہ بادشاہ بغیر رعیت کے اور "اِلٰہ وخالق" بغیر محکوم ومخلوق کے متصور نہیں۔ اب اس صورت میں تصادم سے بچنا محال ہے۔ کیونکہ ہر ایک "اِلٰہ" اپنی الوہیّت کی وسعت وقدرت کے پیشِ نظر لازماً اس بات کا متقاضی ہوگا کہ دوسرے کے امورِ خلق وتدبیر میں مداخلت کرے اور سب مخلوق وجملہ عوالم کو بلا شرکتِ غیرے اپنے تصرف کے تحت لائے اور اپنے قبضۂ اقتدار میں رکھے۔ ترجیح وغلبہ کسی کو نہیں کیونکہ دونوں ہم مرتبہ "اِلٰہ" فرض کئے گئے ہیں، اتفاق

و اتحاد اور تقسیم کار کی بات بھی نہیں چل سکتی، کیونکہ ایسی کوئی بھی مفاہمت محض ضرورت اور خوفِ تصادم کی بنا پر کی جاتی ہے اور "اِلٰہ" کو نہ ضرورت لاحق ہو سکتی ہے اور نہ خوف دامنگیر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان میں ایسی ٹکر کا ہونا ضروری ہے۔ جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ پاش پاش ہو جائے اور پھر کبھی نہ جڑ سکے، لیکن ایسے فساد سے عالم بفضلہٖ تعالیٰ محفوظ ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ اِلٰہِ کائنات اور مدبر و خالقِ جملہ عوالم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ وہذا ہو المقصود!

مدت دراز تک زمین و آسمان اور باقی کائنات کو عمدہ تدبیر سے قائم رکھنا اور پوری کامیابی سے نظامِ عالم کو چلاتے رہنا اور پھر قیامت کے وقت اس موجودہ سلسلہ کو درہم برہم کر کے ایک نیا عالم (عالمِ آخرت) قائم کرنا اور مجرمین و مومنین کا امتیاز فرما کر سب کو ان کے عقائد و اعمال کے مطابق سزا و جزا دینا خود اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ یہ سب تصرفات اور یہ سب حکم ایک ہی اقتدارِ اعلیٰ کی طرف سے ہے۔ اور وہ اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ ہے!

ارشاد ہوتا ہے:-

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ۚ ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ
دَعْوَةً مِنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ ۝ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ
كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ ۝ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ
عَلَيْهِ ۚ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

اللہ تعالیٰ کی وحدت اور اس کی قدرتِ کاملہ کی زبردست نشانیوں میں سے ایک نشانی آسمان اور زمین کا اس کے حکم سے قائم رہنا ہے۔ پھر جب وہ رب تعالیٰ تم کو زمین کے اندر سے باہر آنے کے لئے ایک ہی بار پکار دیں گے تو تم جھٹ ہی نکل کھڑے ہو گے۔ آسمانوں اور زمینوں میں جو مخلوقات ہے وہ سب اس کی ملکیت ہے اور وہ سب کے سب (چار و ناچار) اس کے فرمانبردار ہیں۔ (نافرمان بندے بھی اس کے تکوینی حکموں کے سامنے بے بس ہیں) اور وہی ہے وہ قادر و توانا جو پہلی مرتبہ ساری مخلوق کو پیدا فرماتا ہے، پھر وہی ان کو (قیامت کے دن) دوبارہ پیدا فرمائے گا۔ اور آسمان و زمین میں اس کی شان بہت بلند ہے۔ اور وہ بڑا زبردست اور بڑی حکمت والا ہے! (سبحان اللہ) سورۃ الرّوم ۲۵ - ۲۷)

قیامت اور اس کی بربادیوں کو دو اِلٰہ کے تصادم کا نتیجہ کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ جب قیامت کو مانا جائے گا تو اس کی وہ سب ضروری تفصیلات بھی ماننی پڑیں گی جو کتبِ الٰہیہ اور شرائعِ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں بیان کی گئی ہیں۔ اور ان تفصیلات پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ قیامت میں صرف تخریبی پہلو نہیں۔ بلکہ تعمیری پہلو بھی نمایاں طور پر، ساتھ ہی ساتھ ملحوظ ہے۔ ایک عارضی نظام کو ختم کر کے ایک مستقل اور پائیدار نظام قائم کیا جائے گا۔ اور استحقاق کے مطابق ہر شخص کو اپنے اعمال کی جزاء اور سزا ملے گی۔ جنہیں کو سزا ملے گی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو نہیں مانا تھا اور اس کے دینِ حق —— اسلام —— کی پیروی نہیں کی تھی۔ اور اہلِ ایمان کو جو عقیدۂ توحیدِ اِلٰہ جلّ شانہٗ پر قائم رہ کر تعلیماتِ الٰہیہ کے پیرو کار رہتے ایسے بڑے بڑے انعامات اور صلے ملیں گے جن کا تصور بھی اس دنیا اور اس زندگی میں نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ جزا اور وہ سزا دونوں

مستقل، پائیدار اور ایک مکمل عادلانہ اور حکیمانہ نظم ونسق کے ساتھ جاری رہیں گی۔ پس بدنظمی، بے انصافی، جور وستم، ظلم واستبدادیت یا تخریب وفساد کا وہاں گزر بھی نہیں ہوگا۔ ہر ایک چیز پوری حکمت وعدالت کے معیار پر پوری اترے گی، پرانی عمارت کی جگہ جو مفسدوں اور مجرموں کی پیہم بدکرداریوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گرائے جانے اور بدل دینے کی متمنی ہوگی، ایک نئی عمارت (جہانِ آخرت) قائم کردی جائے گی۔ لہٰذا یہ تخریب برائے تخریب وزور آزمائی نہیں اور نہ اقتدار کی کشمکش ہے۔ بلکہ اس ڈیلنے فانی کے اندر ہر شخص نے جو بھی نیک وبد اعمال کئے ہیں، اُن کے ٹھوس نتائج بھگتنے کے لئے یہ فانی بساط لپیٹ دی جائے گی اور اس کی جگہ آخرت کی دوامی بساط رکھ دی جائے گی۔ لہٰذا یہ تخریب "تعمیرِ نو" کی ابتداء اور اس کا سنگِ بنیاد ہے، سو یہ قیامت اور اس کے مختلف مراحل ومنازل خود اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قاہرانہ قوت وجبروت، اور اس کی رحمت ورافت اور بطش وقدرت کے بہت سے قوی دلائل پر مشتمل ہیں۔

ارشادِ الٰہی ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (سورۃ المومنون۔ ۹۱۔۹۲)

اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی اپنی اولاد نہیں بنایا (کہ اس کا امکان ہی نہیں) اور اس کے ساتھ کوئی بھی دوسرا "اِلٰہ" یعنی خدا نہیں ہے (اگر کوئی دو اِلٰہ ہوتا) تب تو ہر ایک اِلٰہ اپنی اپنی مخلوق کو لے کر (دوسرے کے مقابلہ کے لئے) میدان میں آجاتا اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لئے چڑھ آتا۔ ایسی باتوں سے جو کفار ومشرکین بیان کرتے ہیں (کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد یا شریک ٹھہراتے ہیں) اللہ تعالیٰ کی ذات اطہر پاک اور مبرا ہے۔ اللہ تعالیٰ چھپی اور ظاہر باتوں کو یکساں طور پر جاننے والا ہے۔ وہ مشرکوں کے شرک اور گھڑے ہوئے شریکوں سے بہت ہی بلند اور بالاتر ہے۔ (سبحان اللہ)

اس دلیل کے لئے "برہانِ وحدتِ اقتدارِ اعلیٰ" کا نام موزوں ہے۔

دلیل چہارم: "اِلٰہ" واجب الوجود ہے، اور واجب الوجود ایک ہے، ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا "اِلٰہ" ایک ہے۔ ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔

صغریٰ اس طرح ثابت ہے کہ اگر "اِلٰہ" واجب الوجود، یعنی خود بخود موجود، قدیم اور ازلی وابدی نہ ہو تو پھر ممکن الوجود ہوگا کہ اس کی ہستی کسی دوسرے کی عطا کردہ ہوگی۔ تو اس صورت میں وہ اس غیر کا محتاج ہوگا اور اس سے کمتر، پس "اِلٰہ" وہی ہوگا جس نے اُسے ہستی عطا کی ہے اور اس سے فائق ہے۔ یہ کمتر اِلٰہ نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوا کہ "اِلٰہ" کے لئے ضروری ہے کہ واجب الوجود ہو۔

کبریٰ اس طرح ثابت ہے کہ اگر "واجب الوجود" ایک سے زیادہ فرض کیا جائے تو لازم آئے گا کہ ان کے اندر "وجوبِ وجود" میں اشتراک کے علاوہ کوئی ایسی چیز بھی موجود ہو جو ان دونوں کی شخصیتوں کو علیحدہ علیحدہ متمیز کرتی ہو تاکہ اُن کی دوئی اور کثرت (برخلافِ وحدت) ثابت ہو۔ اب یہ "ما بہ الامتیاز" ان کے "ما بہ الاشتراک" سے بالکل ایک علیحدہ چیز ہوگی اور

اصل حقیقت میں داخل ہوگی۔ پس لازم آئے گا کہ اِلٰہ مختلف اجزاء (یعنی مشترک اور ممیز) سے مرکب ہو اور اپنی ترکیب میں ان اجزاء کا محتاج ہو۔ اور چونکہ جزو عین کُل نہیں بلکہ غیر ہوتا ہے لہٰذا غیر کا محتاج ہوا۔ اور اپنی اسی ترکیب میں اسے کسی ترکیب دہندہ کی بھی ضرورت ہوگی جو درحقیقت اس کا خالق ہوگا۔ بلکہ ممکن الوجود اور حادث ہوگا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ "واجب الوجود" ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا!

جب یہ دونوں مقدمات (صغریٰ وکبریٰ) ثابت ہوگئے تو ان سے بدیہی نتیجہ بھی ثابت ہوگیا کہ "اِلٰہ" ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ اور وہ اِلٰہ برحق بس اللہ جل شانہٗ ہی ہے۔ وہو المراد۔ الحمدللہ!

اس دلیل کو ہم "برہانِ حکمت" یا "برہانِ فلسفۂ حقّہ" کہتے ہیں۔

دلیل ششم:۔ مشرکین کے مختلف طبقات حسب ذیل چیزوں کو پوجتے ہیں:۔

اشجار و احجار، اصنام، کواکب، دیوی، دیوتا، جن، شیطان، اہواء و خواہشات، جاہ و اقتدار، سیم و زر، مورتیوں، پہاڑوں، ندیوں، دریاؤں، سمندروں، آبشاروں، تیرتھوں، سورج، چاند ستاروں، نور و ظلمت، آگ، فرشتوں، نبیوں، ولیوں، قبروں، شہیدوں، زندہ اور مردہ پیروں، پیشواؤں، حاکموں اور بادشاہوں، نفس، مُلک، وطن، حکومت، قوم، اپنا من اور اپنا نفس، نظریات و افکار، نفسیاتی لذتوں اور خواہشوں، بھوت یا پری، زر، زن، زمین، رواج و دستور۔ رسومات و توہمات، اولاد اور کنبہ وغیرہ وغیرہ!

ان کے علاوہ بعض لوگ اور بعض قومیں گئے، بیل، ریچھ، بندر اور شیر، بھیڑیا وغیرہ۔ بعض دوسرے درندوں، پرندوں اور چرندوں اور بعض خاص مقامات اور استھانوں وغیرہ کی پوجا کرکے شرک و کفر کا ارتکاب کرتی ہیں!

بعض نا اہل قبروں، گدیوں، گدی نشینوں، روضوں، تعزیوں، جھنڈوں وغیرہ کی پرستش کرتے ہیں۔ نذر و نیاز طواف، قربانی وغیرہ مراسم عبودیت ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اُن سے حاجتیں مانگتے ہیں۔ اور بعض اہلِ قبور کو پکارتے اور عالم الغیب مانتے ہیں۔ بعض مخلوق کو کارساز اور حاجت روا گردانتے ہیں۔ بعض مشرک جمادات، نباتات اور حیوانات میں سے پسند کے مطابق یا باپ دادا اور اگلوں کی تقلید میں بعض خاص خاص چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اُن کے سامنے سجدے کرتے ہیں۔ ہاتھ جوڑتے ہیں۔ قربانیاں کرتے ہیں۔ اُن کی نذریں مانتے ہیں۔ اُن سے شفا کے طالب ہوتے ہیں۔ یا اُن سے مرادیں طلب کرتے ہیں۔ بعض مشرک اوثان و اصنام کے علاوہ تماثیل و تصاویر کی پوجا کرتے ہیں!!

ان سب سے زیادہ عجیب حالت اُن گور پرستوں کی ہے جو باوجود ادعائے ایمان و اسلام اور کلمۂ توحید و شہادت محض زبانی پڑھنے کے گور پرستی اور بدعت و شرک میں مبتلا ہیں۔ قریب و بعید سے اُن کو پکارتے ہیں۔ اُن کو سجدے کرتے ہیں یا جھک کر چوکھٹ چومتے ہیں۔ اُن کو حاضر و ناظر یا مجیب الدعوات بیان کرتے ہیں۔ (خواہ زبان سے نہیں، اُن کا عمل ہی یہ ظاہر کرتا ہو کہ حاجت روائی کے لئے اُسے پکارتے ہیں) حاجتیں اُن سے مانگتے ہیں۔ اُن کی نذریں ادا کرتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور دوسری بدعات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ گویا اُن کو ایک حد تک عالم الغیب اور حاجت روا اور لائق پرستش سمجھتے ہیں۔ (اللہ محفوظ رکھے)

زیارتِ قبورِ اہلِ صلاح برائے استغفار و تذکرِ موت بشرائطِ پابندیٔ سنّت و اجتناب از شرک و بدعت مستحب و مسنون ہے۔ لیکن شدِّ رحال، میلہ یا عُرس مروّجہ کی کوئی بھی صورت نہ ہو کہ یہ خلافِ سنّت ہے!

ایک اور گروہ بھی اُن سے کمتر تباہ حال نہیں ہے اور وہ وہ ہے جو سیاسی تہذیب اور پولیٹکل شرک میں مبتلا ہے۔ یہ لوگ فرنگی نظام، فرنگی تمدّن، اور فرنگی سیاست کو باوجود ادّعائے مسلمانی، قرآنی نظامِ حق و انصاف۔ اسلامی تمدّن اور الٰہی سیاست کے بجائے، برضا و رغبت اختیار و پسند کئے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی ذہنی پستی سے ہم کو محفوظ فرمائے (آمین!)

بدبختوں کا ایک وہ گروہ بھی مشرکوں میں شامل ہے، جو خدائے پاک کا منکر ہو کر مادہ، نیچر، طبیعت، دہر، زمانہ اور سائنس کی کڑیوں میں مختلف مظاہرِ قدرت اور مناظرِ فطرت کا پرستار ہے۔ اُن میں نیچری اور دہری، فلاسفہ اور سائنس دانوں کا روپ دھار کر مادہ پرستی کے لئے راستہ ہموار کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ مشرکوں کا عیارترین گروہ ہے جو علم و فلسفہ کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتا ہے اور اپنی ہفوات و کفریات کی ترویج میں لگا رہتا ہے۔

مبتدعین کے بعض انتہا پسند طبقات بھی بتدریج اسی شرک کی سرحدات جا پہنچتے ہیں۔ اُن میں گور پرستوں اور اپنے آباء و شیوخ کے نام و نسبت سے دُنیا کا دھندہ کرنے والوں اور دین کے نام پر سیم و زر سمیٹنے والوں کو اس طبقہ کی صفِ اوّل میں رکھا جا سکتا ہے!

بعض مشرکین خیالی اور وہمی چیزوں کے پجاری اور توہمات و خرافات کا شکار رہتے ہیں۔ بعض مفروضہ، مخفی ارواح اور پوشیدہ خیالی قوتوں کے پرستار رہتے ہیں!

یہ سب طبقاتِ شرک و ضلال ہیں۔ ان سب کے مقابلہ میں بس ایک طبقہ اہلِ ایمان کا ہے، جو ایک اللہ کو اپنا مولا و آقا یقین کرتا ہے اور جملہ عبودیت و پرستاری اور اس کے لوازمات و مبادیات، کو اُسی کے لئے مخصوص گردانتا ہے۔ جو کچھ مانگتا ہے اُسی سے مانگتا ہے۔ خوشی اور غم، یُسر اور عُسر ہر حالت میں صرف اُسے پکارتا ہے اور اسی سے استغاثہ کرتا ہے۔ اور بس اسی سے استمداد و استعانت کرتا ہے اور اس کے نظامِ حق کا اعتقاداً، قولاً و عملاً وفادار رہتا ہے!

مخلص مومن کامل موحد ہوتا ہے اور وہ بس اللہ جل شانہٗ کا ہی پرستار ہوتا ہے، ذات و صفات، کاروبارِ خدائی، کارسازی و حاجت روائی، علمِ غیب اور استحقاقِ عبادت و شہنشاہی میں اُسے واحد و یگانہ اور متفرد و یکتا یقین کرتا ہے۔ اور قوّتِ ایمانی اور توفیقِ الٰہی کی بدولت وہ طاعت و عبودیت میں سرگرمِ عمل ہوتا ہے۔ ایسا مردِ مومن نظامِ دینِ حق۔ اسلام۔ کا سچا وفادار اور اس کے نفاذ کی خاطر مجاہدانہ کارناموں کے لئے ہر وقت تیار۔ اور باطل سے ٹکرانے کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ کا دین سربلند ہو اور چار دانگ عالم میں اس کا نور جگمگا اٹھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل و کرم سے ہمیں بھی ایمان و عرفان کا یہی بلند مقام مرحمت فرمائے۔ آمین!

اب ہم دلیل کی ترتیب کی طرف آتے ہیں۔ مذکورہ بالا طبقاتِ اہلِ شرک و ضلال جن جن چیزوں کی پُوجا کرتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی پرستش و بندگی کے لائق نہیں ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی "الٰہ" رب، خالق، کارساز و حاجت روا نہیں۔ بلکہ ہر ایک دوسری مخلوق کی طرح حادث (موجود بعد العدم) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا محتاج اور عوارضاتِ مختلفہ سے گزر کر بالآخر فنا سے دوچار ہونے والا ہے۔ لہٰذا اللہ جل شانہٗ اکیلا ہی ہماری اور سب مخلوقات کی بندگی کا مستحق ہے۔ چونکہ وہی اکیلا "الٰہ" "رب" "خالق و رازق" "کارساز و حاجت روا" "منعم و متفضّل" اور "دائم و باقی" ہے!

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (سورہ الرحمٰن ۲۶-۲۷)

دُنیا پر بسنے والے سب فنا ہونے والے ہیں۔ اور بس تیرا بزرگ اور صاحب عزت و عظمت پروردگار ۔

اللہ جل شانہٗ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ہے!

ان خود ساختہ معبودوں نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ کوئی کتاب نازل کی ہے اور نہ کوئی اپنا رسول بھیجا ہے۔ اور نہ کوئی دلیلِ عقل و نقل اُن کی خدائی پر آج تک قائم ہو سکی ہے۔ بلکہ قدم قدم پر اُن کا عجز و نیاز اور اپنے خالق و مالک اللہ جل شانہٗ کی طرف احتیاج بالکل واضح اور نمایاں ہے۔ پس مشرکوں کا اُن کو "خدائی مسند" پر بٹھلانا "مدعی سست گواہ چست" کے مصداق جھوٹ اور افترا پردازی کے سوا کچھ نہیں۔ بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے سچے شاہد اور عادل و گواہ ہیں!

جن گنے چنے فرعون منش متکبرین نے نشۂ اقتدار میں اپنی خدائی کا خرافہ کھڑا کیا۔ جلد ہی اُن کی خدائی کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹا اور دُنیا نے اُن کی تباہی اور ملعونیت کا عبرت ناک منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آج کے فراعنہ کا حشر بھی اپنے پیشرووں سے کچھ مختلف نہیں ہوگا!

جملہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اُن کے سچے متبعین — مومنین صالحین — ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اپنی عبدیت کا اعلان فرماتے رہے اور اس "مقصدِ عظیم" کے لئے ہر تکلیف، دُکھ اور مصیبت کو خندہ پیشانی سے سہتے رہے، اور ہر مخالفت کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے عَلَمِ حق کو بلند کئے رکھا اور دینِ توحید — دینِ اسلام — پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ انہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی سچی شہادت دی ہے! بدیں وجہ وہ مکرم ہستیاں انتہائی توقیر و احترام کی مستحق ہیں۔

جزاهم الله عنّا وعن سائر المسلمين جزاءً لا ينقطع ابدًا ۔

ہم اُن کی سچی اطاعت و پیروی میں "دینِ حق" — دینِ توحید اللہ جل شانہٗ — پر قائم اور ثابت قدم رہ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ان داعیانِ حق کے اتباع اور اُن کے "سُنَنِ حق" کی پیروی پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین!

ان "دعاۃِ توحید" کو "اِلٰہ" یا "ولدُ اللہ" (ابن اللہ) کہنا یا "عالم الغیب" قرار دینا یا کارساز و حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا اور کاروبارِ الوہیت میں اُن کے حصے بخرے مقرر کرنا یا اِن کو دائرہ عبدیت و بشریت سے نکالنا اور نورِ ذاتِ الٰہ کا حصہ[1] قرار دینا وغیرہ وغیرہ ہزلیات و خرافات، یہ سب عقیدۂ توحیدِ اللہ جل شانہٗ کے سراسر منافی، کفر و شرک کی باتیں ہیں — اور خود اُن کی اپنی تعلیمات اور ہدایت کے بالکل خلاف اور ان کی لائی ہوئی خدائی کتابوں کے سراسر برعکس و منافی ہیں —!

لہٰذا ان مشرکین و مبتدعین اور ملحدین کی کوئی بات بھی عقل و نقل، روایت و درایت سے ادنیٰ مطابقت نہیں رکھتی۔

---

[1] ان عقیدۂ بشریت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کو "نورانی بشر" یا "سراجِ منیر" کہنے میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات ذہن نشین رہے کہ نبی صلعم کا یہ نور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اطہر کا وہ نورِ ازلی و ابدی نہیں جو وحدتِ غیر منقسمہ ہے۔ بلکہ یہ مخلوق نور ہے، نورِ ایمان، نورِ نبوّت و حکمت، نورِ علم و عرفان، نورِ اخلاق وغیرہ!

اور جن کی طرف یہ خدائی کی نسبت کرتے ہیں وہ خود اس سے دست بردار ہیں اور اس سے برابر اور مسلسل اپنی برأت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ اور آئندہ بروزِ قیامت بھی علیٰ رؤس الاشہاد وہ ان سے بیزاری کا اظہار فرمائیں گے۔ پس حقیقت میں یہ مشرکین و مبتدعین وغیرہ اپنی خواہشات کے پرستار اور شیطان کے پجاری ہیں۔ نہ انھیں اللہ کی حرمت و تعظیم کا کچھ خیال ہے اور نہ نبیؐ اور ولی کا احترام و توقیر ملحوظِ خاطر ہے۔ نہ یہ اللہ تعالیٰ کا ادب کرتے ہیں اور نہ نبی اور ولی کا۔ بس ان کے سامنے اپنے باطل مزعومات اور من گھڑت توہمات کی ترویج کا ایک ہی مقصد ہے۔ جس کے لئے وہ اُن محترم ہستیوں کے نام اور ایک خاص "خانہ ساز معیارِ ادب" کو محض آڑ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ تاکہ اس طرح وہ اپنے لئے اَرۡبَاباً مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (خدا تعالیٰ سے ورے ورے خانہ ساز خدا) بننے کا راستہ ہموار کر سکیں۔ اور پھر اس دنیا میں مزے لوٹیں۔ اور داد و ستد اور نذر و نیاز کے ذریعہ دولت کے انبار اکٹھے کریں اور اپنی خواہشات کی پوجا کریں۔ اور کرائیں!

مبتدعین کا ایک بہت بڑا گروہ خانہ ساز پیری، مریدی، نیابت و خلافت، مُلّائیت و رہبانیت اور گدی نشینی کی چالوں سے اس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ اہلِ ایمان و تقویٰ کو ان کی عیاریوں سے پوری طرح واقف ہو کر عامۃ المسلمین کو آگاہ کرنا وقت کا اہم ترین فریضہ ہے۔ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عقائد و اعمالِ سلف صالحینؒ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اور تعلیم و تعلّم کا انتظام کرنا چاہیئے —!

اس سلسلہ میں متبعینِ کتاب و سنّت علماء اور صلحاء اپنے علم و صلاحیت کو ظاہر فرمائیں۔ اور بے دینی کے اس سیلاب کے بروقت سدِّ باب کا انتظام کریں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے!

اللہ تعالیٰ مشرکین، مبتدعین، ملحدین، منافقین، جملہ کفّار، و اشرار اور فسّاق و فجّار کے شر سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ و مصون رکھے۔ آمین —!

ایک اور گروہ متفرنجین (فرنگ زدہ) لوگوں کا ہے۔ جو یورپ کی اندھی تقلید میں اس پستی تک جا پہنچا ہے کہ اسلام کا نام لیتے ہوئے بھی اسلام کا وفادار نہیں۔ اور بعض "اسلامی مسلمات" تک میں شک و شبہ اور تذبذب کا شکار ہے۔ ان لوگوں کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ "نظامِ اسلام" کے قیام و نفاذ میں جہاں تک ممکن ہو، روڑے اٹکائے جائیں۔ تاکہ جس سیرت و کردار کے وہ (یورپ کی تقلید میں) خوگر ہو چکے ہیں۔ اس کے بدلنے کے لئے کسی طرف سے بھی کوئی دباؤ نہ پڑنے پائے۔ اہلِ ایمان کو مردانہ وار میدان میں آکر مومنانہ کردار اور عزائم سے انھیں شکست دینے کے لئے بروقت اقدام کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت ان کے ساتھ ہو گی —!

ان سب تفصیلات کی اساس پر ہم جملہ طبقاتِ شرک و ضلال کے علی الرّغم، علیٰ رؤس الاشہاد اعلان کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ اللّٰہ جَلَّ مَجۡدُہٗ وَعَزَّ قَدۡرُہٗ واحد و یگانہ، لَا شَرِیۡکَ لَہٗ ہے۔ اُس کا دین، اُس کی نصرت و تائید سے ہم انشاء اللہ تعالیٰ قائم کر کے رہیں گے۔ مومنو! مبارکباد، مبارکباد۔ یہ "برہانِ شہادتِ کائنات" ہے —!

دلیلِ ہفتم:— بالاختصار یہ ہے کہ فطرتِ کائنات میں یہ چیز ودیعت ہے کہ وہ ایک اللہ کا اقرار کرے، شیوخ و آباء اور ماحول اور سوسائٹی اگر بد ہوں تو اُن کے بُرے اثرات سے یہ فطری خوبی (عقیدۂ توحید) غیر فطری بدی (کفر و شرک و ضلالت) سے بدل جاتی ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اصل فطرت پر قائم رہے تو خداداد عقل و فہم اور بصیرت سے

اُسے یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ جلّ شانہٗ واحد و لاشریک لہٗ ہے۔ یہ برہانِ فطرت ہے!

"الٰہ" کا مفہوم و مصداق ہی وہ ذاتِ احد و یگانہ ہے جس کی کوئی مثال اور نظیر نہ ہو اور جو علم و قدرت اور ربوبیت کے جملہ کمالات سے متصف ہو، اور ایسی ذاتِ اقدس و اطہر اللہ جل شانہٗ ہی ہے۔ دوسرا کوئی بھی نہیں۔ ذرّہ ذرّہ اُس کی وحدانیت کی گواہی دے رہا ہے۔ دُنیا بھر کے قلم اور سات سمندروں کی سیاہی بھی اس کے دلائل و شواہدِ وحدانیت کی تحریر و ضبط کے لئے کافی نہیں۔ دلائل کی فراوانی اور پختگی کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سبحان اللہ!!

وَفِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَہٗ آیَۃٌ
تَدُلُّ عَلٰی أَنَّہٗ وَاحِدٌ

ہر گیاہے کہ از زمیں روید　　وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ گوید
برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

بیرانِ پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرض الموت کے وقت جب آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ سیف الدین عبدالوہاب قدس سرہٗ نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمایئے، تو آپ نے فرمایا۔

علیک تقوی اللہ عزوجل ولا تخف احداً سوی اللہ ولا ترج احداً سوی اللہ
وکل الحوائج الی اللہ عزوجل ولا تعتمد الا علیہ واطلبھا جمیعاً منہ ولا تثق
باحد غیر اللہ عزوجل، التوحید، التوحید۔　　(فتوح الغیب)

(اللہ سے ڈر اور اللہ کے سوا اور کسی کا خوف نہ کر، اور اللہ کے سوا کسی اور سے کوئی اُمید نہ رکھ۔ اور اپنے سب کام اللہ تعالیٰ ہی کو سونپ! اپنی تمام حاجتیں اُسی سے طلب کر، جو کچھ مانگنا ہو، اُسی سے مانگ! اُس کے سوا کسی اور کی مدد پر بھروسہ نہ رکھ، وہ بڑی عزت والا اور بڑے جلال والا ہے۔ توحید کو لازم طور پر اختیار کر۔ توحید کو۔)

☆

مولینا محمد ناظم ندوی
(پرنسپل جامعہ عباسیہ بہاولپور)

شرک کیا ہے؟

شرک کیا ہے؟ جس سے تمام سچے اور غیر محرّف سماوی ادیان نے منع کیا ہے اور جس کے خلاف انبیاء علیہم السلام نے جہاد کیا، اور ہر نبی نے اپنے اپنے زمانہ میں اس سے لوگوں کو متنبہ کر کے باز رکھنے کی سعی کی، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام وسیع رحمتوں، عفو و درگذر و بے پایاں مغفرت کے باوجود جرم شرک کو معاف نہ کرنے کا اعلان فرمایا، ہر گناہ کو اگر اللہ چاہے گا تو معاف فرما دے گا مگر شرک کو معاف نہیں کرے گا۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر دون ذالک لمن یشاء

شرک عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی لغت میں شریک اور شرکت کرنا ہیں، لیکن شریعت سماوی کی اصطلاح میں شرک نام ہے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں غیر کو شریک کرنے کا، کوئی مخلوق خواہ وہ نبی ہو یا ولی، بزرگ ہو یا شیخ طریقت، فرشتہ ہو یا جن یا اجرام سماوی۔ جیسے دمکتا آفتاب، چمکتا ہوا چاند یا ٹمٹماتا ہوا ستارہ یا زمین کے عظیم الشان مظاہر قدرت، جیسے موجیں مارتا ہوا سمندر، آبادیوں کو برباد کرنے والا رُخ بدلتا ہوا دریا، خوفناک سر بفلک پہاڑ، ہیبتناک غار، لق و دق میدان، بڑے بڑے سایہ دار درخت، زہریلا اژدھا، دودھ دینے والی گائیں یا کوئی دوسری عظیم الشان مخلوق! ان میں سے کسی کو تدبیر عالم میں موثر حقیقی سمجھنا یا انسانوں کی موت و حیات، بیماری و شفا، رزق و افلاس میں براہ راست وکیل ماننا شرک ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ "خلق" پیدا کرنا۔ "تکوین" بنانا۔ رزق دینا، احیاء (زندہ کرنا) اماتہ (مارنا) ابداع تندرستوں کو شفا دینا یا مرادیں پوری کرنا، یا حاجت روائی کرنا وغیرہ صفات کمال پر قوائے طبعی و اسباب مادی کے توسط کے بغیر براہ راست متصرف و قادر ہے، اور تدبیر عالم کے باب میں عالم کی مخفی قوتیں اس کے دست تصرف میں ہیں۔ اور وہ محض اپنے ارادہ و عزم سے جو چاہے کر سکتا ہے یہ سب شرک ہے۔

شرک کا آغاز کس طرح ہوتا ہے

نیکوں کی باتیں نیک اور پاکوں کی باتیں پاک ہوتی ہیں۔ صلحاء اور عبادت گذار بندے بلاشبہ اللہ کے مقرب ہوتے ہیں، ان میں سب سے بلند و ارفع مقام انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرماتا ہے اور پیام الٰہی و دعوت و رسالت کی تبلیغ میں ان کی تائید الٰہی ہوتی ہے، ان سے خوارق عادات اور معجزے ظاہر ہوتے ہیں، ان کی زندگی ممتاز، ان کا طریق عمل پاک، ان کی سیرت بے داغ اور دوسروں کے لئے نمونہ ہوتی ہے۔ اسی طرح اولیاء کرام و بزرگان دین کا حال ہے۔ عبادت و ریاضت سے ان کے قلوب مصفیٰ، زہد و تقویٰ سے ان کے نفوس مزکیٰ ہوتے ہیں، ان کی دعائیں اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ ان کی بہت سی پیشین گوئیاں سچی ہوتی ہیں۔ اور ان کے بہت سے کشف صحیح ہوتے ہیں۔ جب لوگ انبیاء علیہم السلام کے معجزات، اولیاء کے کشف و کرامات وغیرہ دیکھتے ہیں تو لوگوں پر حیرانی و ذہول کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور انھیں ایسے برگزیدہ افراد سے حسن ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد رفتہ رفتہ یہ عقیدت و محبت اپنے جلو میں احترام و تعدس کے ہزاروں مراسم و آداب ساتھ لاتی ہے اور کچھ لوگ ایسی برگزیدہ و پاک ہستیوں کو انسان سمجھنا اور عام انسان کی طرح انھیں مخاطب کرنا گستاخی اور سوء ادب سمجھتے ہیں۔ یہ جذبۂ احترام تدریجاً تقدیس و عبادت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے معجزات یا کشف و کرامات کی حکایات سن کر انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ عالم کی تمام مخفی طاقتیں براہ راست ان کے دست

تصرّف میں ہیں۔ وہ چاہیں تو اپنے عزم وارادہ کی بے پناہ طاقت سے غریب کو امیر اور گدا کو شاہ بنا سکتے ہیں، وہ مُردوں کو زندہ کر سکتے ہیں۔ اور بیماروں کو شفا دے سکتے ہیں اور بے اولادوں کی خالی گودوں کو اولاد سے ہری بھری کر سکتے ہیں اور ان کی ہر مراد پوری کر سکتے ہیں وہ قوائے طبعی اور اسباب مادی کے توسط کے بغیر اپنی مرضی سے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ چونکہ ایسے افراد کو تدبیر عالم میں دخیل و مؤثر سمجھا جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس سے تقرب کا ذریعہ ان بندگان خدا یا مخلوقات خدا کی پرستش میں مضمر سمجھا جاتا ہے۔ مشرک اللہ کی عبادت کے منکر نہیں ہوتے بلکہ ان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات اس قدر ارفع اور بلند ہے کہ ان کی عبادت، ان کی نیاز مندی اور ان کی عبدیت کا اظہار اس کی بارگاہ تک نہیں پہونچ سکتا لہٰذا ان برگزیدہ ہستیوں ہی کے ذریعہ اس کا تقرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے مشرکین کے قول کو اس عقیدہ باطل کی تردید کے لئے نقل کیا ہے۔

وما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ — ہم ان کی (معبودان باطل) اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے بہت قریب کر دیں۔

ایسے لوگوں کے دلوں میں یہ یقین جاگزیں ہوتا ہے کہ ان برگزیدہ ہستیوں کو بغیر راضی کئے ہوئے ان کے اعمال قبول نہیں ہو سکتے۔ نہ ان کی دعائیں قبول ہو سکتی ہیں نہ ان کی عبادتیں، نہ ان کی مرادیں پوری ہو سکتی ہیں نہ ان کی نذریں کیونکہ یہ کارگاہ عالم ان کے نزدیک ایسی شہنشاہیت ہے جس میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں اور ان سب کا ایک شہنشاہ ہے۔ اس شہنشاہ نے اپنے ماتحت بادشاہوں کو خلعتِ ملوکیت سے سرفراز کیا ہے اور انھیں بہت سے اختیارات دے دیئے ہیں، اب یہ شہنشاہ کسی فرد کی کوئی درخواست بغیر اپنے ماتحت کی سفارش کے نہیں سنتا۔ لہٰذا ان کو راضی رکھنا اور ان کی انتہائی تعظیم بجا لانا ضروری ہے۔ ٹھیک اسی طرح مشرکین کا عقیدۂ باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے اپنی ریاضت و عبادت، زہد و تقویٰ سے اللہ کو راضی کر لیا ہے اور اس نے انھیں خلعتِ الوہیت سے سرفراز کیا ہے اور تدبیر عالم میں وہ براہ راست دخیل ہیں، عالم کی مخفی قوتیں ان کے دست تصرف میں ہیں اور نفع و نقصان پہونچانے پر قدرت رکھتے ہیں تدبیر عالم کے ساتھ عبادت کا تصور لازم و ملزوم ہے، کیونکہ جس ہستی کو مدبر عالم مانا جائے گا جس کے ہاتھ میں نفع و ضرر کی کلید ہوگی اس کی عبادت ناگزیر طور پر کی جائے گی۔ شرک کا سرچشمہ یہی باطل عقیدہ ہے۔ اس باطل عقیدہ سے شرک کے تمام مظاہر پیدا ہوئے اور زمانہ قبل اسلام میں شرک و کفر عام ہوا یہود و نصاریٰ نے حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ کو اسی تقرب و محبوبیت کی بنا پر اللہ کا بیٹا کہا اور خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰ کو ان کے معجزات اور بن باپ کی پیدائش کی وجہ سے اللہ کا درجہ دیا بلکہ عین اللہ قرار دیا۔ مسلمانوں میں اولیاء اور انبیاء کرام کے متعلق بعض نام نہاد مسلمانوں میں اسی قسم کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اور ان کی قبروں پر اسی عقیدۂ باطل اور غلو محبت کی وجہ سے سجدہ تک کیا جاتا ہے۔ اور ان سے مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ خود رسول کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ لوگ بشر نہیں سمجھتے اور بشر کہنے والوں کو گستاخ بے ادب اور آداب رسالت سے بے خبر کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ کے ہاتھ میں عالم کی تمام مخفی طاقتیں ہیں۔ اور ایک من چلے شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمدؐ سے (معاذ اللہ)

انسانوں کو اللہ کے برابر سمجھنے والوں کے علاوہ دنیا میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اجرام سماوی کو ذی شعور، ذی عقل اور ذی فہم سمجھتے ہیں۔ ان کی عبادت کرنے والوں کو مصائب سے بچا سکتے ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں نفع دے سکتے ہیں۔ یہ ستارہ پرست اب بھی پائے جاتے ہیں، افریقہ اور ہندوستان و پاکستان میں بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو آفتاب و ماہتاب اور دوسرے سیاروں کی

عبادت کرتے ہیں۔

اجرام سماوی میں سب سے بڑا سیارہ آفتاب ہے۔ آفتاب کو اللہ تعالیٰ نے حرارت و نور کا سرچشمہ بنایا ہے۔ اس کی گردش سے لیل ونہار، صبح و شام بنتے ہیں، اس کے قرب و بعد سے موسمی تغیرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ گرما، سرما، بہار و خزاں کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی حرارت سے کھیتیاں اُگتی اور پکتی ہیں، پودوں میں پھول، درختوں میں پھل آتے ہیں، غرضکہ زمین پر اس کے بیشمار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انسان نے جب ان امور کو محسوس کیا تو وہ خالق آفتاب کے بجائے خود آفتاب کو قابل تعظیم و تقدیس سمجھ بیٹھا۔ اس کا عقیدہ ہو گیا کہ جو عالم میں تغیرات و انقلابات کا اتنا بڑا سرچشمہ ہے وہ یقیناً اپنے پجاریوں کی مصیبت کے وقت کام آئے گا اور اس کی مرادیں پوری کرے گا۔ چنانچہ ستارہ پرستوں نے اس کی عبادت کو مذہب کا جزو قرار دیا اور طلوع و غروب کے وقت اس کے سامنے رکوع کر کے اور ہاتھ جوڑ کر اس کی عبادت کی جاتی ہے۔

اسی طرح ماہتاب کو بھی دیوتا سمجھا گیا۔ کیونکہ یہ دلکش و دلفریب سیارہ نہ صرف اندھیری راتوں میں اپنے نور سے اجالا کرتا ہے بلکہ اس کے بھی ہمہ گیر اثرات محسوس کئے گئے ہیں۔ سمندر میں مدوجزر کا ماہتاب کے گھٹنے اور بڑھنے سے تعلق ہے۔ خاص خاص قمری تاریخوں میں سمندر میں مدوجزر ہوتا ہے۔ ساحل سمندر اور جزیروں کے باشندوں کو مدوجزر کا ہر ماہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ ابتداءً جب انسان نے چاند کی مخصوص تاریخوں میں بار بار ہر ماہ ایک ہی قسم کا عمل دیکھا اور سمندر کی طغیانی سے اسے جانی و مالی نقصان ہوا تو اس نے ایک طرف سمندر کو اور دوسری طرف چاند کو راضی کرنے اور اس کے شر سے بچنے کے لئے چاند کی پرستش شروع کر دی اور چاند کے نام پر بڑے بڑے مجسمے اور ہیکل تعمیر کئے۔ سومناتھ کا مندر اسی عقیدہ ماہتاب پرستی کا مظہر تھا۔ یہ کاٹھیاواڑ کے ساحل پر چاند کی پرستش کے لئے بنایا گیا تھا۔ جس میں چاند کے نام پر ایک عظیم الشان بت تھا۔ سنسکرت میں "سوم" چاند کو کہتے ہیں۔ اور "سوم وار" کا دن بھی اسی چاند کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ہے جیسا کہ ہفتہ کے دوسرے نام بھی سات ستاروں کی طرف منسوب ہیں۔ اتوار جو سنسکرت میں ادیت وار ہے، "آیدت" آفتاب کو کہتے ہیں اور یہ دن آفتاب کی طرف منسوب ہے۔ اور اسی طرح سنیچر وغیرہ۔ انگریزی میں SUNDAY, MONDAY بھی آفتاب و ماہتاب کی طرف منسوب ہیں۔

اسی طرح پہاڑ کی بلند چوٹی کو دیوتا کا درجہ دیا گیا، بڑے بڑے دریاں کی عظمت کا راگ الاپا گیا۔ پہاڑوں، دریاؤں، درختوں اور جانوروں کے منفعت بخش ہونے کا کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن حضرت انسان نے ان سب کو رفتہ رفتہ مقدس بنا لیا اور ان کی عبادت کی جانے لگی۔

قرآن حکیم نے سب سے پہلے توحید کی دعوت دی۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کا اعلان کیا اور تیرہ برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکی زندگی میں اسی توحید کی تبلیغ فرمائی۔ اس ساری مدت میں نماز کے سوا کسی دوسرے حکم پر اس تفصیل کے ساتھ قرآن حکیم نے اور رسول اللہ نے زور نہیں دیا، "ایاک نعبد و ایاک نستعین" (ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) کو ہر نماز میں دہرا کر اس عملاً مسلمانوں کی زندگی کا جز بنا یا گیا۔ اور غیر اللہ سے ہر قسم کا غیر مرئی رشتہ توڑ دیا گیا۔ ماسوا اللہ کے ہر ایک کے عجز و ضعف اور اللہ کے مقابلہ میں اس کی بے چارگی اور درماندگی کی تلقین کی گئی۔ لا رافع لمن وضعہ اللہ ولا واضع لمن رفعہ اللہ۔ اللہ جس کو پست کرے اس کو کوئی بلند کرنے والا نہیں اور اللہ جس کو بلند کرے اسے پست کرنے والا نہیں۔ نفع و نقصان، راحت و تکلیف، امارت و غربت، خوش حالی و تنگدستی، صحت و بیماری، زندگی و موت کا تعلق صرف قضاء و قدر سے وابستہ کر کے تمام معبودان باطل اور غیر اللہ کے متعلق اس غلط عقیدہ کو مٹا دیا کہ وہ کسی کو بطور خود کسی قسم کا نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یا ان کے ہاتھ میں تدبیر عالم کی مخفی طاقتیں ہیں۔

لہٗ مقالید السموٰت والارض۔ "اسی کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں"۔ بغیر اللہ کی اجازت اور اذن کے کسی کو اللہ کے سامنے گفتگو کرنے کی مجال تک نہیں ہوگی لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن وقال صوابا "یہاں تک کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت وسفارش کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکے گا۔ ومن ذا الذی یشفع عندہٗ الا باذنہ۔ "اور کس کی مجال ہے کہ اللہ کے حضور میں شفاعت کر سکے مگر اس کے اذن واجازت سے"۔ انبیاء علیہم السلام بلکہ صلحاء واتقیاء بھی شفاعت کریں گے لیکن بطور خود نہیں بلکہ اللہ کی اجازت کے بعد۔

قرآن حکیم نے شرک کی تمام اساس کو کھود کر گرا دیا حضرت عُزَیر اور حضرت عیسٰی کی ابنیت کو کفر قرار دیا، تثلیث کو کفر وشرک کہا۔ آفتاب و ماہتاب کو انسانوں کا چاکر بتا کر اس کی بیچارگی اور اس کے مخلوق ہونے کا اعلان کیا ولا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للّٰہ الواحد القہار۔ "نہ آفتاب کو سجدہ کرو نہ ماہتاب کو بلکہ صرف ایک اللہ کو سجدہ کرو جو بڑی قوت والا ہے"۔ کسی انسان کی ایسی تعظیم سے جو عبادت کے حدود میں داخل ہو جائے رسول اللہؐ نے منع فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کرامؓ کی مجلس میں تشریف لاتے تو ... کرام تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔ آپ نے فوراً تعلق احترام اور عبادت انگیز تعظیم کے درمیان فرق پر متنبہ فرمایا۔ اور فرمایا کہ میرے لئے تم اس[1] طرح کھڑے نہ ہو جس طرح عجمی اپنے بادشاہوں کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ جس طرح خشوع وخضوع اور عبدیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بادشاہوں کی تعظیم کرتے ہیں تمہیں ایسے مظاہرے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ ایک صحابی[2] نے کہا یا رسول اللہ! عجمی اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں ہم بھی آپ کو کیوں نہ سجدہ کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں ایسا نہ کرو۔ اگر کسی انسان کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

ایک صحابی نے کہا یا رسول اللہ! ہم ملنے کے وقت کیوں[3] نہ جھک کر آپ سے ملیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، تم صرف مصافحہ کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے تمام رخنے کو بند فرما دیا کہ مبادا یہی احترام واکرام کا جذبہ رفتہ رفتہ امت محمدیہ میں سجدۂ تعظیمی کی شکل اختیار کرلے، اور تدریجاً غیر اللہ کی عبادت کی جانے لگے۔

عبادت وریاضت، تقویٰ وطہارت، شرافت ومروت، غم خوارگی وامداد، اتحاد وتنظیم، اخوت وبرادری، اور عدل عمرانی ومساواتِ انسانی اور دوسرے تمام صفات حمیدہ اسی توحید کی تفصیلی تعلیمات کے نتائج ہیں اور اسی شجر کے ثمرات ہیں۔ جب تک مسلمان صحیح توحید کے حامل رہے۔ دنیا کی عظیم الشان قوت بنے رہے اور جب سے اسلامی توحید کو پسِ پشت ڈال کر عجمی اور غیر اسلامی فلسفہ الٰہیات میں الجھ گئے، توحید کا چہرہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور بہت سے مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہوگئے۔

قبروں پر مسلمان خواتین کا جھرمٹ
اور اُن پر مجاوروں کی وہ دزدیدہ نگاہی
(ماہی)

---

[1] صحیح بخاری [2] صحیح بخاری [3] ابوداؤد

مولوی عبدالرحمن حماد
(استاذ جامعہ دارالسلام عمرآباد)

انسانی زندگی پر توحید کے اثرات

حیات و کائنات کے بارے میں مختلف نظریات اور تصورات ہیں، جن کے اثرات بھی نوع انسانی پر مختلف انداز سے مترتب ہوتے ہیں۔ اور سب نظریات میں ایک ہی نظریہ ایسا ہے جس کی صداقت وحقانیت پر کائنات و پروردگار کائنات، ملائکہ مقدسہ، ارباب دانش و بینش، اور عالم آب وگل کا ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (خود اللہ تعالیٰ نے بنفس نفیس اس حقیقت نفس الامری کی گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور اس گواہی میں اللہ کے فرشتوں کے ساتھ وہ بندگان الٰہی بھی شامل ہیں جن کو علم وعرفان اور عقل و وجدان کی نعمت اللہ نے ودیعت فرمائی ہے۔ اور ان تمام کی شہادت اس امر واقعہ پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کے درمیان پوری طرح عدل وانصاف اور اعتدال و توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہے کہ ہر مخلوق کی فطرت کے ساز سے بے ساختہ یہ نغمۂ جانفزا پھوٹ نکلتا ہے کہ اللہ رب العزت کے سوا کائنات کا پروردگار اور معبود ومسجود کوئی دوسرا نہیں ہے، نہ صرف اتنی ہی بات کہ عبودیت وپرستش کی مستحق تنہا خدائے واحد کی ذات بزرگ وبرتر ہے۔ بلکہ یہ بھی حقیقت ثابتہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہی مملکت عالم پر بلا شرکت غیرے سلطانی وفرمانروائی کر رہی ہے، کائنات پر غلبہ وقبضہ اللہ ہی کا ہے، عزت و قدرت اسی کو سزاوار ہے، اور تخلیق عالم اللہ تعالیٰ کی حکمت ودانائی کی مرہون منت ہے۔ یہ ہے وہ نظریۂ حق جسے نظریۂ توحید کہا جاتا ہے۔ اور اس نظریہ کے علاوہ باقی تمام نظریات باطل، غلط اور خود ساختہ ہیں اور ان کی پشت پر نہ کوئی دلیل عقلی ہے اور نہ ثبوت نقلی۔ اور اس کے مقابلہ میں تصور توحید پر آفاق وانفس میں اس قدر دلائل واضح اور براہین ساطعہ موجود ہیں کہ ان کا انکار صرف وہ کور باطن ہی کر سکتا ہے جسے روز روشن پر بھی شب دیجور کا وہم وگمان ہونے لگتا ہے ؎

آنکھ والا تری قدرت کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

یہ عقل باختگی اور دانش فروشی نہیں تو اور کیا ہے کہ آدمی اپنے وجود فانی کا تو قائل ہو جائے اور اس ذات باقی کا صاف انکار کر دے جس نے اسے خلعت وجود سے سرفراز کیا ہے۔ مدعا پوری طرح واضح نہیں ہوگا اگر ان تصورات کی جانب بھی مختصراً اشارہ نہ کر دیا جائے جو خالق کائنات کے بارے میں نوع انسانی کے گمراہ طبقوں نے گھڑ لئے ہیں۔

ایک خیال تو یہ ہے کہ یہ کائنات بے خدا ہے کسی نے اسے بنایا نہیں، خود ہی بن گئی ہے، خود ہی چل رہی ہے اور ایک دن خود ہی ختم بھی ہو جائے گی۔ کچھ لگے بندھے قوانین ہیں جن سے ہنگامۂ کون وفساد کی گرم بازاری ہے۔ مخلوقات پیدا ہوتے رہتے ہیں، مرتے رہتے ہیں، آغاز حیات کا انجام مرگ مفاجات ہے اور موت کے بعد کسی کے سامنے اعمال کی جوابدہی کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس سے زیادہ مہمل لایعنی اور خیال باطل اور کیا ہو سکتا ہے کہ مشاہدہ صنعت کے باوجود صانع کا انکار کر دیا جائے۔ دنیا کا ہر انسان یہ بخوبی جانتا ہے کہ ہوائی جہاز سے لے کر ایک معمولی سوئی تک کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتی پھر دنیا کا یہ عظیم الشان کارخانہ کیسے بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر پیغمبر نے وجود

باری تعالیٰ کے انکار پر حیرت و تعجب کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ یہ ایسی ظاہر و باہر حقیقت ہے جس کا انکار کوئی شخص نہ قائم ہوش و حواس نہیں کر سکتا۔ کائنات کی خارجی شہادت کے علاوہ ہر آدمی کا ضمیر و وجدان بھی ہر آن بہت سے داخلی براہین فراہم کرتا رہتا ہے کہ باری تعالیٰ کے وجود کو ایک بدیہی واقعہ کی طرح تسلیم کیا جائے۔ انبیاء کرام کو انکار خداوندی کے نظریۂ باطل پر کس قدر حیرت ہوتی رہی ہے اس کا اندازہ اس آیت کریمہ سے کیا جا سکتا ہے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ؕ

ان کے پیغمبروں نے کہا کیا اس اللہ کے بارے میں بھی کوئی شک شبہ ہو سکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے وہ تمہیں اسلئے (اپنے رسولوں) کی معرفت حق کی دعوت دے رہا ہے کہ تمہارے گناہوں کی مغفرت کیجے اور ایک مقرر مدت تک مہلت عطا فرمائے۔

جو بر خود غلط لوگ اپنے خالق کے وجود کا انکار کرنے کی حماقت میں مبتلا ہوتے ہیں انہی کو مادہ پرست، دہریے اور ملحدین کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ اسی قسم کے منکرین خدا سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ چند ملحدین امام اعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو وجود باری کے مسئلہ پر مناظرہ کرنے کی دعوت دے ڈالی۔ حضرت امام نے ملحدین کا چیلنج قبول تو کر لیا مگر تین دن بعد مناظرہ کی تاریخ مقرر فرمائی۔ چنانچہ وقت مقررہ پر منکرین خدا حضرت امام کے پاس پہونچ گئے۔ مناظرہ شروع کرنے سے قبل امام موصوف نے ان ملحدوں سے دوران گفتگو میں یہ فرمایا کہ دوستو! مناظرہ کے آغاز سے پہلے میں ایک دلچسپ واقعہ تمہارے گوش گذار کر دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ میں کل شام کو تفریح کے لئے ساحل سمندر پر گیا ہوا تھا وہاں میں نے ایک عجیب و غریب ماجرا دیکھا، اور یہ اپنی نوعیت کا ایک نرالا واقعہ تھا، ساحل پر میں ٹہل رہا تھا کہ سمندر میں کچھ شور ہوا میں نے نظر اُٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا سا درخت سمندر کی سطح پر نمودار ہو رہا ہے، پھر وہ خود ہی کٹتا اور مختلف ٹکڑوں میں بٹتا جا رہا ہے، اس کے بعد وہ کشادہ تختوں میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ پھر وہ تختے ایک خاص تناسب کے ساتھ باہم جڑتے جا رہے ہیں۔ میں دیکھ ہی رہا تھا کہ اچھا خاصا جہاز میرے سامنے تیار کھڑا ہے۔ جہاز کو مکمل ہوئے کچھ زیادہ عرصہ گذرا بھی نہیں تھا کہ ساحل پر مختلف قسم کے ساز و سامان اور اسباب کا ڈھیر لگ گیا۔ پورا سامان خود ہی جہاز میں منتقل ہو گیا اور وہ جہاز بغیر کسی ملاح کے خود بخود چل پڑا اور پھر میری نگاہوں سے اوجھل بھی ہو گیا۔

یہ واقعہ سنکر تمام منکرین خدا حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مضحکہ اڑاتے ہوئے بول پڑے۔ امام صاحب آپ کی عقل و دانش کا بڑا شہرہ ہم سُن رہے تھے۔ لیکن آج آپ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں کہ اگر ایک بچہ بھی انھیں سُن پائے تو بے ساختہ ہنس دے۔ کیا آج تک کبھی ایسا ہوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ جہاز خود ہی تیار ہو جائے۔ اپنی بناوٹ کی ابتدا سے آخر تک سارے مراحل خود ہی طے کر لے اور ساز و سامان لا کر خود ہی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جائے۔ یا تو آپ کا دماغ چل گیا ہے یا آپ ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ حضرت امامؒ نے سنجیدگی سے ارشاد فرمایا۔ میرے بھولے دوستو! تمہاری عقل جب یہ بات تسلیم نہیں کر سکتی ہے کہ ایک جہاز آپ سے آپ تیار ہو سکتا ہے تو پھر وہی تمہاری عقل یہ عظیم جھوٹ کیسے تمہاری زبان سے کہلواتی ہے کہ اس عالم کا کوئی خدا نہیں ہے اور یہ زمین و آسمان، مہر و ماہ، انجم و کہکشاں اور عالم کا پورا کارخانہ بغیر کسی خدا کے نہ صرف یہ کہ وجود میں آگیا ہے بلکہ باقاعدگی اور باضابطگی کے ساتھ چل بھی رہا ہے، اپنے خالق و معبود کا انکار کر کے کیا تم افلاس فکر و نظر اور اپنی عقل کے دیوالیہ پن کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہو؟

حضرت امامؒ کے اس انداز استدلال سے ملحدین کے حجابات نظر اٹھ گئے اور ان سبھوں نے امام موصوف کے دست حق پرست پر الحاد و زندقہ سے توبہ کر لی اور پرستاران توحید کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔

ہر انسان کی فطرت میں حقیقت توحید کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح سمو دیا ہے کہ وہی اس امر واقعہ سے روگردانی کر سکتا ہے جس نے اپنی فطرت ہی کو ہوا و ہوس اور جحود و عناد سے مسخ کر لیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت پیدا کیا تھا اسی وقت عالم مثال میں قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کی ارواح کو جمع کر کے اللہ نے ان کے سامنے بر ملا اس حقیقت کا اعلان فرما دیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور سب بندوں سے توحید پر قائم رہنے کا وعدہ اور اقرار بھی لیا تھا۔ اس طرح گویا سلطان کائنات نے اپنے خلیفۂ ارضی سے حلف وفاداری اٹھوایا تھا۔

مشہور مفسر قرآن حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ایک آیت کریمہ کی تشریح کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے :-

وَعَنْ اُبَیِّ ابْنِ کَعْبٍ فِیْ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ قَالَ جَمَعَھُمْ فَجَعَلَھُمْ اَزْوَاجًا ثُمَّ صَوَّرَھُمْ فَاسْتَنْطَقَھُمْ فَتَکَلَّمُوْا ثُمَّ اَخَذَ عَلَیْھِمُ الْعَھْدَ وَالْمِیْثَاقَ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی قَالَ فَاِنِّیْ اُشْھِدُ عَلَیْکُمُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَالْاَرَضِیْنَ السَّبْعَ وَاُشْھِدُ عَلَیْکُمْ اَبَاکُمْ اٰدَمَ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ لَمْ نَعْلَمْ بِھٰذَا اِعْلَمُوْا اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ غَیْرِیْ وَلَا رَبَّ غَیْرِیْ وَلَا تُشْرِکُوْا بِیْ شَیْئًا اِنِّیْ سَاُرْسِلُ اِلَیْکُمْ رُسُلِیْ یُذَکِّرُوْنَکُمْ عَھْدِیْ وَمِیْثَاقِیْ وَاُنْزِلُ عَلَیْکُمْ کُتُبِیْ قَالُوْا شَھِدْنَا بِاَنَّکَ رَبُّنَا وَاِلٰھُنَا لَا رَبَّ لَنَا غَیْرُکَ وَلَآ اِلٰہَ لَنَا غَیْرُکَ فَاَقَرُّوْا بِذٰلِکَ وَرَفَعَ عَلَیْھِمْ اٰدَمُ عَلَیْہِ السَّلَامُ یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ فَرَاَی الْغَنِیَّ وَالْفَقِیْرَ وَحَسَنَ الصُّوْرَۃِ وَدُوْنَ ذٰلِکَ فَقَالَ رَبِّ لَوْلَا سَوَّیْتَ بَیْنَ عِبَادِکَ قَالَ اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ اَنْ اُشْکَرَ وَرَاَی الْاَنْبِیَآءَ فِیْھِمْ مِثْلَ السُّرُجِ عَلَیْھِمُ النُّوْرُ خُصُّوْا بِمِیْثَاقٍ اٰخَرَ فِی الرِّسَالَۃِ وَالنُّبُوَّۃِ وَھُوَ قَوْلُہٗ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَھُمْ اِلٰی قَوْلِہٖ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ کَانَ فِیْ تِلْکَ الْاَرْوَاحِ فَاَرْسَلَہٗ اِلٰی مَرْیَمَ عَلَیْھَا السَّلَامُ فَحُدِّثَ عَنْ اُبَیٍّ اَنَّہٗ دَخَلَ مِنْ فِیْھَا۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ۔

(ترجمہ) حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ (اور جب تیرے پروردگار نے ...) کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل، ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو جمع کیا پھر ان کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا پھر انھیں مثالی صورتیں دے کر اُن سے کہلوایا، چنانچہ وہ بول پڑے، پھر ان سے اللہ نے اپنی کبریائی و یکتائی کا قول و قرار لیا اور اولاد آدم کو خود ان کی اپنی جانوں پر گواہ بنایا، گواہ بناتے ہوئے ان سے پوچھا۔ کیا میں تم سب کا پروردگار نہیں ہوں۔ سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا، ہاں کیوں نہیں، تو ہی ہمارا پالنہار ہے۔ اس پر اللہ نے فرمایا دیکھو میں تمہارے اس اعتراف حق پر ساتوں آسمانوں، ساتوں زمینوں اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ بنا رہا ہوں۔ مبادا تم روزِ قیامت یہ کہہ کر مکر جاؤ کہ ہمیں اس واقعہ کا کوئی علم نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جان لو کہ نہ میرے سوا کوئی تمہارا معبود ہے اور نہ میرے علاوہ کوئی تمہارا پروردگار ہے۔ لہٰذا تم کسی کو میرا شریک نہ ٹھہراؤ۔ تمہارے دنیا میں بھیجے جانے کے بعد مختلف اوقات میں تمہاری ہدایت کے لیے میں اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو بھیجا کروں گا اور وہ تمہیں یہ قول و قرار جو اب تم نے مجھ سے کیا ہے یاد دلاتے رہیں گے اور تمہاری رہنمائی کے لیے میں اپنی کتاب بھی نازل کروں گا۔ یہ سن کر سبھوں نے فوراً یہ جواب دیا۔ الٰہی ہم اس امر پر گواہ ہیں کہ تو ہمارا پروردگار ہے اور تو ہی ہمارا معبود ہے۔ تیرے سوا نہ کوئی ہمارا رب ہے اور نہ کوئی ہمارا معبود ہے۔ چنانچہ پوری نوع انسانی نے اللہ کی توحید کا اقرار کر لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مختلف درجات و طبقات کے لوگ نظر آئے مالدار بھی تھے، نادار بھی تھے، حسین و جمیل افراد بھی تھے اور معمولی شکل و صورت والے انسان بھی تھے، حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں جو یہ فرق و تفاوت دیکھا تو باری تعالیٰ سے گذارش کی۔ مالک! تو نے اپنے تمام

بندوں کو یکساں کیوں نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے اسی لئے میں نے بندوں کے درمیان فطری طور پر امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انسانوں کے اس ہجوم میں انبیاء کرام کو بھی دیکھا جو روشن چراغوں کی مانند جگمگا رہے تھے۔ اور ان سے نبوت و رسالت کے ضمن میں ایک خصوصی عہد بھی الگ سے لیا گیا تھا اور اسی کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ الآیۃ۔ اور گروہ انبیاء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی موجود تھے ان کی روح کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہ السلام کی طرف بھیجا اور وہ ان کے منہ کی طرف سے داخل ہو گئی تھی۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔"

الحاد و دہریت کا نتیجہ اس شکل میں برآمد ہوتا ہے کہ انسان خدا کا بندہ بننے کے بجائے بندوں کا خدا بن جاتا ہے اور زندگی گذارنے کے لئے خود ہی دستور و قانون بنانے لگتا ہے یہ خالص جاہلیت کا نظریہ ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کائنات آپ سے آپ تو نہیں چل رہی ہے اس انجن کا چلانے والا ہے تو ضرور مگر ایک نہیں بلکہ ان گنت الٰہ اور بیشمار خداوندگان تعتیم کار کے اصول پر نظام عالم کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس خیال باطل کی بنا پر انسان کی زندگی اوہام و خرافات کا شکار ہو کے رہ جاتی ہے۔ اور وہ جس کسی میں بھی نفع و نقصان محسوس کرتا ہے اس کی پرستش شروع کر دیتا ہے۔ چاہے وہ اجرام سماوی ہوں یا اصنام خاکی۔ اور یہ مشرکانہ نظریہ ہے جسے قبول کر لینے کے بعد مسجود ملائک، لکڑی، کاغذ اور پتھر کے بتوں سے لے کر سانپ بچھو، قبور و مزارات اور اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی میں اپنی قیمتی زندگی تباہ کر لیتا ہے اور وہ مراسم و بدعات کے نرغے میں کچھ اس طرح گھر کے رہ جاتا ہے کہ پھر اسے عمر بھر الجھنوں سے نجات نہیں ملتی اور اس کا سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے۔ نظام کائنات میں جو ربط و ضبط، نظم و حزم اور ہم آہنگی و یکسانی نظر آتی ہے وہ خود عقیدہ توحید کی تائید اور شرک کی تردید میں ایک مستقل دلیل ہے، اور یہی وجہ ہے کہ مشرکانہ تصور پر تنقید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں یہ دلیل پیش فرمائی ہے۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ اگر ان دونوں یعنی زمین و آسمان میں ایک معبود کے بجائے کئی معبود ہوتے تو وہ دونوں کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ایک درس گاہ کے دو ناظم، ایک کارخانے کے دو منتظم اور ایک جہاز کے دو کپتان جب نہیں ہو سکتے تو سلطنت کائنات کے دو فرمانروا کیسے ہو سکتے ہیں۔ تو بالفرض ایک خدا کے بجائے کئی خدا ہوتے تو ان کی تدابیر و آرا میں تصادم ہوتا ایک چاہتا کہ سورج پورب سے طلوع ہو، اور دوسرا اسے پچھم کی طرف سے نکلنے کا حکم دیتا۔ اس طرح وہ دونوں آپس ہی میں ٹکرا کے خود بھی ختم ہوتے اور عالم کو بھی فنا کر دیتے۔ جو ذات زوال آمادہ ہو وہ خدا نہیں اور جو خدا ہے اسے کبھی فنا نہیں۔ زندگی کا دھارا ازل سے ایک ہی رخ پر اور ایک ہی انداز سے بہہ رہا ہے اور وہ خود اس حقیقت کبریٰ کا ترجمان ہے کہ یہ عالم بے خدا نہیں، پروردگار اپنی ذات و صفات کے ساتھ موجود ہے اور وہ صرف ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق ایک اور غلط خیال یہ ہے کہ وہ موجود بھی ہے اور معبود بھی ہے، لیکن اسے دنیا اور دنیا والوں کے کاموں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ایک بار اس نے کارخانہ عالم چلا دیا ہے اور خود گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ نظام عالم خود بخود چلتا رہے گا اور کبھی رکے گا نہیں، آخرت اور جنت و دوزخ کا الگ سے کوئی وجود نہیں۔ انسان اپنے اعمال کی جزا اور کرموں کا پھل پانے کے لئے مختلف جنم لیتا رہتا ہے اور مختلف روپ دھارن کرتا رہتا ہے۔ یہ عقیدۂ تناسخ ہے جس کا بطلان بادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے۔ عقل سلیم اس امر کو کیسے باور کر سکتی ہے کہ ایک ہی وجود کبھی انسان کبھی حیوان، کبھی درخت اور کبھی پتھر بن جائے۔ اور ایک جنم میں ماں بیٹے کا رشتہ جن کے درمیان قائم رہا ہو وہ دونوں اگلے جنم میں میاں بیوی بن جائیں، اس سے زیادہ لچر اور بے ہودہ عقیدہ شاید ہی کسی کے گھڑا ہو۔

ایک تصور یہ ہے کہ باپ بیٹا اور روح القدس تینوں مل کر ایک خدا کے پیکر بن گئے ہیں۔ یہ عقیدہ تثلیث ہے جو اقانیم ثلاثہ کے محور کے گرد گھومتا رہتا ہے، ایک میں تین اور تین میں ایک والی یہل بات وہی نادان کہہ سکتا ہے جس کی عقل و دانش بھی ایک تہائی سے زیادہ باقی نہ رہ گئی ہو۔

ایک اور رائے خدا کے بارے میں یہ ہے کہ وہ ہے تو صرف ایک ہی لیکن اس نے بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا دیوتاؤں اور دیویوں کی شکل میں پیدا کرلئے ہیں تاکہ اس کا بارگراں ہلکا ہوجائے۔ اور اس نے دنیا کے امور اپنے ماتحت خداؤں کے حوالے کردیئے ہیں۔ چنانچہ یہ سارے خدائیگان کو جک، خدائے خدائیگان کی ہدایت کے مطابق کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں۔ اس عقیدہ سے اللہ کی بےبسی، بےچارگی اور فقر و احتیاج کا تصور جنم لیتا ہے۔ اور جو ہستی بےکس و محتاج ہے وہ آخر کیسے خدائی کا دعویٰ کرسکتی ہے؟ (معاذ اللہ)

ایک اور غلط فہمی جس میں بعض مسلمان تک مبتلا ہیں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور وہ بالکل اکیلا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اپنے بندوں سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ صرف نماز، روزہ، پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کی حد تک اللہ سے وابستگی رکھیں، باقی زندگی کے دوسرے معاملات میں انھیں آزادی ہے کہ وہ اپنے لئے جو طریقہ پسند کریں اختیار کرلیں۔ اُن کا طرزِ عمل گویا اس فکر و خیال کا نمایاں مظہر ہوتا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کے حوالے کرو۔ ایسے لوگ بہ یک وقت، رحمان اور شیطان دونوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حلال و حرام، جائز و ناجائز، در خوف و ناخوف کی تمیز کئے بغیر اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق من چاہی زندگی گذارتے ہیں اور عبادات کے علاوہ کسی اور معاملہ میں اللہ اور رسولؐ کی ہدایات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ نظامِ باطل کے زیر سایہ بڑے اطمینان کے ساتھ نہ صرف نماز روزہ اور دوسرے ارکان عبادت کی پابندی کرتے ہیں بلکہ تسبیح و تہلیل، ذوق و سجادہ اور وظائف و اوراد کے مشاغل میں بھی کوئی فرق و کوتاہی نہیں ہونے دیتے۔ بایں ہمہ اُن کو کسی وقت بھی اس امر کا احساس نہیں ہوپاتا کہ ان پر سلطانِ کائنات کی فرمانروائی کے بجائے غیر اللہ کی حکمرانی ہے۔ اسی غلط فہمی کے باعث آج دنیا کی بہت سی مسلمان حکومتیں اسلام کے اصول سلطنت سے آزاد ہوکر کاروبارِ مملکت چلا رہی ہیں اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھانے کے باوجود اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کر رہی ہیں۔ دین و سیاست کی جدائی اور مذہب و سلطنت کی دوئی کا تصور ملتِ اسی غلط عقیدہ کا کہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے صرف عبادات کافی ہیں زندگی کے دیگر امور میں اسے دخل دینے کی کیا ضرورت۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق مذکورہ افکار و تصورات کے علاوہ اور جس قدر بھی نظریات ہیں وہ سب انہی خیالات سے ملتے جلتے ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کا نظریہ توحید کیا ہے، اور اسے انبیاء کرام کس شکل میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اسلام کا نظریہ توحید مختصر الفاظ میں یہ ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ	اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نوع انسانی سے فرما دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بالکل
لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ	بے نیاز ہے اس نے کسی کو جنا ہی نہیں اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے اور کوئی بھی اسکی ذات و صفات
كُفُوًا اَحَدٌ ؏	اور حقوق و اختیارات میں شریک و سہیم نہیں ہے۔

تمام انبیاء کرام اس نظریہ توحید پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ یہ ساری کائنات جو بنی آدم کے گرد و پیش پھیلی ہوئی ہے وہ، اور خود ذاتِ بشری بے خدا نہیں ہے۔ اللہ ہی نے سب کو وجود بخشا ہے، سر و سامان عطا کیا ہے، زندگی کی ضروریات بخشی ہیں، مادی وسائل و اسباب بھی دیئے ہیں، اور روحانی ہدایت و اخروی سعادت کا انتظام بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے اکیلا اور تنہا ہے اپنے کاموں میں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہی سب کا پروردگار ہے اور متصرف و مختار ہے، جلاتا وہی ہے اور موت بھی اسی کے حکم سے آتی ہے نفع و نقصان کا اختیار اس کے سوا کسی کو نہیں۔ رزق کے خزانے اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، انقلابِ عالم اور حالات کا اتار چڑھاؤ اسی کی مشیت کا مرہونِ منت ہے۔ یہ کائنات ایک منظم سلطنت ہے، صرف اللہ تعالیٰ ہی اس کا حاکم و فرمانروا ہے، تمام اختیارات کا منبع اسی کی ذات والا صفات ہے۔ انسان فطری اور پیدائشی اعتبار سے ہی اللہ کی رعیت ہے۔ جس قدر اختیار اللہ نے انسان کو بخشا ہے وہ بغرض آزمائش ہے۔ عقیدۂ توحید سے انسانی زندگی پر خوش آئند و خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ عقیدہ توحید کو قبول کرنے اور زندگی کو مُسکّے

سانچے میں ڈھالنے سے انسان کو طمانیت قلب کی وہ دولت نصیب ہو جاتی ہے جس کا تصور بھی کسی دوسرے عقیدہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بدولت زندگی کی الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں، اور دل کی بے چینیاں تھم جاتی ہیں۔ ہر انسان کے اندر ایک مرکز محبت کا ذوق طلب ودیعت کر دیا گیا ہے۔ صرف عقیدہ توحید ہی سے اس ذوق کو مکمل آسودگی ہوتی ہے۔ عقیدۂ توحید کا قائل کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔ نسل و رنگ، خاندان و قبیلہ، فرقہ و قوم اور وطن و مرز بوم کی تنگنائیوں میں وہ کبھی محصور نہیں ہوتا بلکہ سارا، دنیا کو اپنا وطن اور تمام انسانوں کو ایک ہی برادری کے افراد تصور کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان میں جرأت، غیرت، خودداری اور عزت نفس کا جوہر پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی میں بھی نفع و نقصان پہونچانے کی ذرا بھی مقدرت نہیں ہے۔ خودداری کے ساتھ تواضع و انکسار کا پیوند بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے لیکن عقیدۂ توحید کا کمال ہے کہ شخص واحد میں یہ دونوں خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ موحد اپنے ہر کمال کو خدا کی دین سمجھتا ہے اور اس پر پھولتا نہیں عقیدۂ توحید فلاح و نجات کے لئے چونکہ نیک عملی، پاکیزگیٔ نفس اور رفعت کردار کو ضروری ٹھہراتا ہے اس لئے موحد صرف گفتار کا غازی نہیں ہوتا بلکہ جو کہتا ہے وہ کرتا ہے۔ فسخ عزائم اور ناکامیوں سے موحد کبھی مایوس و دل برداشتہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک اَن دیکھی بالاتر قوت موجود ہے جو اس کے ارادوں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ عقیدۂ توحید کا قائل حوصلہ مند، اولوالعزم اور صبر و توکل کا پیکر ہوتا ہے۔ اور اس کے ضمیر و ایمان کو نہ کچلا جا سکتا ہے اور نہ خریدا جا سکتا ہے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش　⁂　چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس　⁂　ہمین است بنیادِ توحید بس

موحد کے پاؤں پر چاہے اشرفیوں کے انبار لگا دیں یا اس کے سر پہ تلوار چلا دیں لیکن خدا کے سوا کسی سے اس کو نہ خوف ہوتا ہے نہ امید۔ الغرض توحید اسلام کا سرچشمہ اور طغرائے امتیاز ہے ؞

بقیہ اسلام میں توحید

نہیں آتا، ایسے اضطراب و اضطرار کے وقت بھی ان کے دل کی صدا بے اختیار "یا شیخ فلاں المدد!" ہی ہوتی ہے۔ کوئی علامۂ آلوسی کے اس سوال کا جواب دے کہ اَیّ الفریقین اھدیٰ سبیلا! دونوں گروہوں میں سے کون راہ ہدایت سے زیادہ قریب ہے؟

علامہ سید رشید رضا نے تفسیر المنار میں ایک حکایت لکھی ہے کہ مصر کے کچھ لوگ سمندر کے سفر کیلئے روانہ ہوئے راستہ میں طوفانی ہوائیں چلنے لگیں اور جہاز جھونٹے کھانے لگا۔ چاروں طرف سے فریاد و زاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں، کوئی پکارتا یا سید بدوی" کوئی چیختا یا سید رفاعی" کسی کی زبان سے نکلتا" یا شیخ عبد القادر جیلانی"! ایک صاحب ایمان اہل دل بھی اتفاق سے جہاز میں موجود تھے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ بھی دعا کیجئے۔ اس درخواست کے جواب میں انھوں نے ہاتھ اٹھا کر چیخنا شروع کیا:

یارب اغرق اغرق مابقی احد یعرفک　　　اے خدا ان سب کو غرق کر دے کیونکہ ان میں کوئی تیرا پہچاننے والا باقی نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو گمراہی سے بچائے اور راہ ہدایت پر چلائے! (آمین)

مولانا مفتی محمد شفیع
(مؤسس و شیخ الجامعہ دارالعلوم کراچی)

بدعت اور اُسکی خرابیاں

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق آخر زمانہ میں فتنوں کی کثرت ہونے والی تھی، وہ ہوئی اور ہم جیسے ضعیف القوۃ، ضعیف الہمۃ، ضعیف الایمان لوگوں کی نوبت اس دور میں آئی جبکہ دنیا کو فتنوں نے گھیر لیا ہے، روز و شب نئے نئے فتنوں کی بارش ہے۔

لیکن جیسے فتنوں کا زمانہ مشکلات کا خارزار ہے ویسے ہی اس زمانہ میں صحیح طریق سنت پر قائم رہنے اور دوسروں کو قائم رکھنے کے فضائل بھی بے حد و قیاس ہیں۔ حدیث میں ہے:

العبادۃ فی الھرج کھجرۃ اِلیّ (رواہ مسلم (مشکوٰۃ)) فتنہ کے زمانہ میں عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہجرت کرکے میرے پاس آجائے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص فسادِ امت کے زمانہ میں میری سنت کو زندہ کرے اس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ فتنہ کے زمانہ میں سنت کے مطابق نیک عمل کرنے والے کا ثواب پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر ثواب رکھتا ہے، اور وہ پچاس آدمی آج کے نہیں بلکہ صحابہ کرام میں سے پچاس آدمی۔ اور جس وقت بدعات و منکرات دنیا میں پھیل جائیں اس وقت اہل علم کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان کو اُس وقت اپنے علم کا اظہار کرنا چاہیئے اور جو ایسا نہ کرے اس پر سخت وعید فرمائی ہے (کما اخرجہ الآجری فی کتاب السنۃ عن معاذ بن جبل وسیأتی تمامہ) چنانچہ ہر زمانہ، ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے زمانہ کے فتنوں کے طوفان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے صحیح طریقہ کو روشن کیا اور بدعات و محدثات کی تلبیس کو رد کر دیا۔ لیکن آج کل جن فتنوں کا طوفان ہے ان میں ایک طرف لادینی، انکارِ خدا، انکارِ رسالت، انکارِ حدیث، انکارِ ختمِ نبوت کے وہ فتنے ہیں کہ جن کی ضرب براہ راست اسلام کی بنیادوں پر پڑتی ہے۔ راقم الحروف نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے دینی تعلیم و تبلیغ اور فتویٰ و تصنیف و تالیف کے مثبت کام کے ساتھ جو کچھ بھی ہو سکا وہ انہی فتنوں کا مقابلہ کیا جو اعتقادی بدعات ہیں۔ عملی بدعات و محدثات کے سلسلہ میں اب تک کوئی خاص کام نہ ہو سکا۔

حال میں ایک محترم دوست نے اپنے ماہنامہ کے لئے بدعت کی تعریف اور اس کی خرابیوں پر مشتمل ایک مقالہ لکھنے کے لئے مجھے فرمایا اور خلافِ عادت کچھ ایسے اصرار سے فرمایا کہ اپنی بے شمار ذمہ داریوں، مصروفیتوں اور اس پر طبعی ضعف کے باوجود وعدہ کر لینے کے سوا چارہ نہ رہا، کچھ لکھنا بھی شروع کیا لیکن صبح سے رات کے بارہ بجے تک تمام اوقات مشغول، وقت کہاں سے لاؤں؟ مگر ان حالات میں جو کچھ بھی ہو سکا، حاضر ہے۔

بدعت و سنت کی جنگ میں ایک لمحہ فکریہ

بدعت کی تعریف اور اس کی خرابیاں از روئے قرآن و سنت آگے آتی ہیں لیکن اس جگہ ایک بات ہر وقت پیش نظر رکھنے کے قابل ہے کہ جو شخص سنت کے اتباع اور بدعت کی مخالفت کی دعوت دیتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا منشاء بجز اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت، اور اس کے دین کی حفاظت، اور کچھ نہیں۔ اسی طرح جو شخص کسی بدعت میں مبتلا ہے، منشاء اس کا بھی اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کی رضا حاصل کرنا ہی ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق بدعت کو وہ بھی گمراہی کہتا اور برا سمجھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ علم صحیح نہ ہونے کی وجہ سے، وہ کسی بدعت کو بدعت

نہیں سمجھتا بلکہ اس کو عبادت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہر مسلمان کی خیر خواہی کو اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے ہمدردی و خیر خواہی کے لہجہ میں مسلمانوں کو حقیقت الامر سے واقف کیا جائے۔ تشدد، طعنہ زنی، الزام تراشی کے طریقوں سے کلی اجتناب کیا جائے کہ ان سے کبھی کسی اصلاح نہیں ہوتی۔ بدخلقی اور وہابی کے طعن آمیز خطابات سے پرہیز کیا جائے۔ اور کسی کے کلام کو توڑ مروڑ کر اس کے منشاء و مقصد کے خلاف اس پر الزام لگانا کھلا بہتان ہے جس کے حرام ہونے میں کسی کو تردد کی گنجائش نہیں۔ آخرت کے حساب کو سامنے رکھتے ہوئے ان حرکات سے باز رہا جائے۔

اس مختصر سی گذارش کے بعد اصل مقصد پر آتا ہوں اور چونکہ اصل خرابی ناواقفیت اور بدعت کو بدعت نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے اس لئے پہلے بدعت کی تعریف اور پھر اس کی حقیقت لکھتا ہوں۔ ان اریدت الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

بدعت کی تعریف

اصل لغت میں بدعت ہر نئی چیز کو کہتے ہیں خواہ عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے۔ اور اصطلاح شرع میں ہر ایسے نو ایجاد طریقہ عبادت کو بدعت کہتے ہیں جو زیادہ ثواب حاصل کرنے کی نیت سے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے بعد اختیار کیا گیا ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عہد مبارک میں اس کا داعیہ اور سبب موجود ہونے کے باوجود نہ قولاً ثابت ہے نہ فعلاً نہ صراحۃً نہ اشارۃً۔ بدعت کی یہ تعریف علامہ برکوی کی کتاب "الطریقۃ المحمدیہ" اور علامہ شاطبی کی کتاب "الاعتصام" سے لی گئی ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ عادات اور دنیوی ضروریات کے لئے جو نئے نئے آلات اور طریقے روزمرہ ایجاد ہوتے رہتے ہیں ان کا شرعی بدعت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بطور عبادت اور بہ نیت ثواب نہیں کئے جاتے بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم کے خلاف نہ ہوں، نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو عبادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام سے قولاً ثابت ہو یا فعلاً، صراحۃً یا اشارۃً وہ بھی بدعت نہیں ہو سکتی۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس کام کی ضرورت عہد رسالت میں موجود نہ تھی، بعد میں کسی دینی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پیدا ہو گئی وہ بھی بدعت میں داخل نہیں، جیسے مروجہ مدارس اسلامیہ اور تعلیمی، تبلیغی انجمنیں اور دینی نشر و اشاعت کے ادارے اور قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے صرف و نحو اور ادب عربی، فصاحت و بلاغت کے فنون یا مخالف اسلام فرقوں کا رد کرنے کے لئے منطق و فلسفہ کی کتابیں، یا جہاد کے لئے جدید اسلحہ اور جدید طریق جنگ کی تعلیم وغیرہ کہ یہ سب چیزیں ایک حیثیت سے عبادت بھی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عہد میں بھی موجود تھیں۔ مگر پھر بھی ان کو بدعت اس لئے نہیں کہتے کہ ان کا سبب داعی اور ضرورت اس عہد مبارک میں موجود نہ تھی، بعد میں جیسے جیسے ضرورت پیدا ہوتی گئی علماء امت نے اس کو پورا کرنے کے لئے مناسب تدبیریں اور صورتیں اختیار کر لیں۔

اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں نہ اپنی ذات میں عبادت ہیں نہ کوئی ان کو اس خیال سے کرتا ہے کہ ان میں زیادہ ثواب ملے گا۔ بلکہ یہ چیزیں عبادت کا ذریعہ اور مقدمہ ہونے کی حیثیت سے عبادت کہلاتی ہیں گویا یہ احداث فی الدین نہیں بلکہ احداث للدین ہے، اور احادیث میں ممانعت احداث فی الدین کی آئی ہے احداث للدین کی نہیں۔ یعنی کسی منصوص دینی مقصد کو پورا کرنے کے لئے بضرورت زمان و مکان کوئی نئی صورت اختیار کر لینا ممنوع نہیں۔ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن کاموں کی ضرورت عہد رسالت میں زمان یا بعد میں کسی ہے ان میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے ثابت نہیں اس کو بدعت کہا جائے گا۔ اور یہ از روئے حدیث ممنوع و ناجائز ہو گا۔

مثلاً درود و سلام کے وقت کھڑے ہو کر پڑھنے کی پابندی، فقراء کو کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنے کیلئے کھانے پر مختلف سورتیں پڑھنے کی پابندی۔ نماز جماعت کے بعد پوری جماعت کے ساتھ کئی کئی بار دعا مانگنے کی پابندی، ایصال ثواب کے لئے تیجہ، چہلم وغیرہ کی پابندی، رجب و

شعبان وغیرہ کی متبرک راتوں میں خود ایجاد قسم کی نمازیں اور ان کے لئے چراغاں وغیرہ اور پھران خود ایجاد چیزوں کو فرض و واجب کی طرح سمجھنا، ان میں شریک نہ ہونے والوں پر ملامت اور لعن طعن کرنا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ درود و سلام، صدقہ و خیرات، اموات کو ایصال ثواب، متبرک راتوں میں نماز و عبادت، نماز کے بعد دعا، یہ سب چیزیں عبادات ہیں، ان کی ضرورت جیسے آج ہے ایسے ہی عہد صحابہ میں بھی تھی۔ ان کے ذریعہ ثواب آخرت اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذوق و شوق جیسے آج کسی نیک بندے کو ہوسکتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کو ان سب سے زائد تھا۔ کون دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کو صحابہ کرام سے زیادہ ذوق عبادت اور شوق رضائے الٰہی حاصل ہے۔ حضرت حذیفہ ابن یمان فرماتے ہیں۔

كل عبادة لم يتعبد ها اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فلا تعبدوها، فان الأول لم يدع للآخر مقالاً فاتقوا الله يا معشر المسلمين وخذوا الطريق من كان قبلكم۔

یعنی جو عبادت صحابہ کرام نے نہیں کی وہ عبادت نہ کرو کیونکہ پہلے لوگوں نے پچھلوں کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کو یہ پورا کریں، اے علماء خدا سے ڈرو اور پہلے لوگوں کے طریقہ کو اختیار کرو۔ اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی منقول ہے۔ (الاعتصام الشاطبی ص ۳۱/۲)

بدعت کے ناجائز و ممنوع ہونے کی عقلی وجوہ!

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب یہ سب کام عہد صحابہ کرام میں عبادت کی حیثیت سے جاری تھے تو ان کے لیے طریقے اختیار کرنا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اختیار نہیں کئے ان کا فلسفہ اور حکمت کیا ہے، کیا یہ مقصد ہے کہ ان عبادات کے یہ نئے طریقے معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو معلوم نہ تھے، آج ان دعویداروں پر انکشاف ہوا ہے، اس لئے انھوں نے اختیار نہیں کئے، یہ لوگ کررہے ہیں۔

دین میں کوئی بدعت نکالنا رسول اللہ پر خیانت کی تہمت لگانا ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ ان کو معلوم تھے مگر لوگوں کو نہیں بتلایا، تو کیا یہ معاذ اللہ ان حضرات پر دین میں بخل و خیانت اور تبلیغ رسالت میں کوتاہی کا الزام نہیں ہے، اسی لئے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص بدعت ایجاد کرتا ہے وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ رسالت میں خیانت کی کہ پوری بات نہیں بتلائی۔

بدعت نکالنا یہ دعوی کرنا ہے کہ دین عہد رسالت میں مکمل نہیں ہوا۔

ایک طرف تو قرآن کا یہ اعلان الیوم اکملت لکم دینکم یعنی میں نے آج تمہارا دین مکمل کرلیا۔ دوسری طرف عبادات کے نئے نئے طریقے نکال کر عملاً یہ دعویٰ کہ شریعت اسلام کی تکمیل آج ہورہی ہے۔ کیا کوئی مسلمان جان بوجھ کر اس کو قبول کرسکتا ہے، اس لئے یقین کیجئے کہ عبادات کا جو طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اختیار نہیں کیا وہ دیکھنے میں کتنا ہی بہتر اور دلکش نظر آئے نہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک اچھا نہیں، اسی کو حضرت امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ لم یکن یومئذ دینا لایکون الیوم دینا۔ جو کام اُس زمانہ میں دین نہیں تھا وہ آج بھی دین نہیں کہا جاسکتا۔ انھوں نے ان طریقوں کو معاذ اللہ نہ تو ناواقفیت کی بنا پر چھوڑا تھا، نہ سستی اور غفلت کی بنا پر، بلکہ ان کو غلط اور مضر سمجھ کر چھوڑا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جو ثانی فاروق اعظم سمجھے جاتے تھے انھوں نے یہی مضمون اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے۔

آج اگر کوئی شخص مغرب کی نماز میں تین کے بجائے چار رکعت اور صبح کی دو کی بجائے تین یا چار پڑھنے لگے، یا روزہ مغرب تک رکھنے کے

بجائے عشاء کے بعد تک رکھے تو ہر مجہد دار مسلمان اس کو بُرا ، غلط اور ناجائز کہے گا ، حالانکہ اس غریب نے بظاہر کوئی گناہ کا کام نہیں کیا کچھ تسبیحات زیادہ پڑھیں ، کچھ اللہ کا نام زیادہ لیا ۔ پھر اس کو بالاتفاق بُرا اور ناجائز سمجھا گیا صرف اس لئے نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے اور سکھلائے ہوئے طریقہ عبادت پر زیادتی کرکے عبادت کی صورت بدل ڈالی اور ایک طرح سے اس کا دعویٰ کیا کہ شریعت کو آنحضرت صلعم نے مکمل نہیں کیا تھا اُس نے کیا ہے ۔ یا معاذ اللہ آپ نے ادائے امانت میں کوتاہی اور خیانت برتی ہے کہ یہ نئے اور مفید طریقہائے عبادت لوگوں کو نہیں بتلائے ۔

اب غور کیجئے کہ نماز کی رکعات تین کے بجائے چار پڑھنے میں اور نمازوں ، دعاؤں ، درود و سلام کے ساتھ ایسی شرطیں اور طریقے اضافہ کرنے میں کیا فرق ہے ؟ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے منقول نہیں حقیقت یہ ہے کہ عبادات شرعیہ میں اپنی طرف سے قیدوں شرطوں کا اضافہ شریعت محمدیہ کی ترمیم اور تحریف ہے ۔ اس لئے اس کو شدت کے ساتھ رد کیا گیا ہے ۔

بدعت تحریف دین کا راستہ ہے ! بدعت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اگر عبادات میں اپنی طرف سے قیدیں شرطیں اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کی اجازت دیدی جائے تو دین کی تحریف ہو جائے گی ۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی پتہ نہ لگے گا کہ اصل عبادت جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی تھی ، کیا اور کیسی تھی ۔ پچھلی امتوں میں تحریف دین کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنی کتاب اور اپنے پیغمبر کی بتلائی ہوئی عبادات میں اپنی طرف سے عبادات کے نئے نئے طریقے نکالے اور ان کی رسم چل پڑی کچھ عرصہ کے بعد اصل دین اور ایجاد اشیاء میں کوئی امتیاز نہ رہا ۔

شریعت اسلام میں نفل فرض کو جدا کرنے کا اہتمام ! شریعت اسلام نے چونکہ ہر فتنہ کے دروازہ کو بند اور فساد دین کے راستے کو رد کیا ہے اسی لئے اس کا بھی خاص اہتمام فرمایا کہ فرائض اور نوافل میں پورا امتیاز رہے ۔ حقیقت کے اعتبار سے بھی اور صورت کے اعتبار سے بھی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا تو یہ معمول رہا کہ مسجد میں صرف فرض نماز جماعت سے ادا فرمائے ، باقی نوافل اور سنتیں بھی گھر جا کر پڑھتے تھے ۔ اور جن نمازوں کے بعد سنت یا نفل نہیں ہے ان میں اگر نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنا اور کوئی وظیفہ پڑھنا ہے تو بصورت نماز قبلہ رخ نہیں بیٹھتے بلکہ داہنی یا بائیں جانب پھر کر بیٹھتے ہیں تاکہ دور ہی سے ہر شخص یہ سمجھ لے کہ نماز فرض ختم ہو چکی ہے اب امام جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ اختیاری چیز ہے ۔ اصل سنت تو یہی ہے کہ نوافل اور نفلی عبادات سب تنہائی میں اپنے گھروں میں ادا کی جائیں ۔ اور اگر مسجد میں ہی سنتیں پڑھنی ہوں تو بھی مسنون طریقہ یہ ہے کہ جماعت فرض کی ہیئت کو ختم کر دیا جائے ۔ صفیں توڑ دی جائیں ۔ لوگ آگے پیچھے ہو کر سنتیں پڑھیں ۔ اسی طرح روزہ شرعاً صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہے ۔ لیکن چونکہ رات کو سب لوگ عادۃً سوتے ہیں اور سونے کی حالت میں بھی کھانے پینے سے آدمی ایسا ہی رکا رہتا ہے جیسا روزہ میں ، اس لئے سحری کھانا مسنون قرار دیا گیا تاکہ سونے کے وقت جو صورت روزہ کی ہو گئی تھی اس سے امتیاز ہو جائے اور روزہ ٹھیک صبح صادق کے بعد سے شروع ہو ۔ اسی لئے سحری کھانا بھی بالکل آخر وقت میں مستحب ہے ، اسی طرح غروب آفتاب کا یقین ہو جاتے ہی روزہ فوراً افطار کرنا چاہیئے ، دیر کرنا مکروہ ہے تاکہ روزہ کی عبادت کے ساتھ زاید وقت کا روزہ میں اضافہ نہ ہو جائے ۔

آج بھی یہ سب چیزیں بحمد اللہ مسلمانوں میں جاری ہیں مگر جہالت و نادانفیت سے ان چیزوں کی حقیقت سے بے خبری ہے صبح اور عصر کی نماز کے بعد عام طور پر ائمہ مساجد قبلہ کی جانب سے مڑ کر تو بیٹھ جاتے ہیں مگر اس پر نظر نہیں کہ یہ مڑنا کس غرض سے تھا کہ عملاً اس کا اعلان کردیں

کہ اب فرض ختم ہو چکے، ہر شخص کو اختیار ہے جو چاہے کرے، جہاں چاہے جائے، مگر یہاں پوری جماعت کو پابند کر لیا ہے کہ جب تک تین مرتبہ دعا جماعت کے ساتھ نہ کر لیں اس وقت تک سب منتظر رہیں۔ پھر ان دعاؤں میں بھی خاص خاص چیزوں کی ایسی پابندی ہے جیسے کوئی فرض ہو، جب تک وہ خاص دعائیں نہ پڑھی جائیں عوام یوں سمجھتے ہیں کہ نماز کا کوئی جزو رہ گیا۔

یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور شریعت اسلامیہ کی احتیاط کی صریح مخالفت ہے، دعاؤں اور وظیفوں کو نماز فرض کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا کہ دیکھنے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ یہ وظیفے اور دعائیں بھی گویا نماز کا جزو ہیں جو امام یہ دعائیں اور وظائف تمام مقتدیوں کو ساتھ لے کر نہ پڑھے اس کی نماز کو مکمل نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جاتے ہیں۔

بدعت حسنہ اور سیئہ | صحیح حدیث میں ہے کہ "کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار" یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح شرع میں ہر بدعت سیئہ اور گمراہی ہے، کسی بدعت اصطلاحی کو بدعت حسنہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ لغوی معنی میں نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں اس اعتبار سے ایسی چیزوں کو بدعت حسنہ کہہ دیتے ہیں جو صریح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد مبارک میں نہیں تھی بعد میں کسی ضرورت کی بنا پر ان کو اختیار کیا گیا جیسے آج کل کے مدارس اسلامیہ میں اور ان میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون، کہ اصل بنیاد تعلیم وتدریس اور مدرسہ کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے آپ نے خود فرمایا: **انما بعثت معلما** یعنی میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، لیکن جس طرح کے مدارس کا قیام اور ان میں جس طرح کی تعلیم آج کل بضرورت زمانہ ضروری ہو گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں اس کی ضرورت نہ تھی آج ضرورت پیش آئی تو احیائے سنت کے لئے اس کو اختیار کیا گیا۔ جو تعریف بدعت کی اوپر لکھی جا چکی ہے اس کی رو سے ایسے اعمال بدعت میں داخل نہیں، لیکن لغوی معنی کے اعتبار سے کوئی ان کو بدعت کہہ دے تو بدعت حسنہ[عہ] ہی کہا جائے گا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے تراویح کی یکجا جماعت کو دیکھ کر اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا: **نعمت البدعۃ ھذہ** یعنی یہ بدعت تو اچھی ہے۔ کیونکہ ان کو اور سب کو معلوم تھا کہ تراویح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی اور پڑھائی اور زبانی اس کی تاکید کی اس لئے حقیقۃً اور شریعۃً تو اس میں بدعت کا کوئی احتمال نہ تھا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک خاص عذر کی وجہ سے تراویح کی جماعت کا ایسا خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا جو بعد میں حضورؐ کی تعلیم کے مطابق کیا گیا۔ اس لئے ظاہری اور لغوی طور پر یہ کام نیا تھا اس کو نعمت البدعۃ فرما دیا۔ بدعت حسنہ کا اس سے زائد کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ **من ابتدع بدعۃ یراھا حسنۃ فقد زعم ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالۃ لان اللہ تعالیٰ یقول "الیوم اکملت لکم دینکم" فما لم یکن یومئذ دینا لا یکون الیوم دینا۔** (اعتصام ص۱۴۲)

فاروق اعظمؓ کے ارشاد یا بعض بزرگوں کے ایسے کلمات کی آڑ لے کر طرح طرح کی بدعتیں بدعت حسنہ کے نام سے ایجاد کرنے والوں کے لئے اس میں کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ بلکہ جو چیز اصطلاح شرع میں بدعت ہے وہ مطلقاً ممنوع اور ناجائز ہے۔ البتہ بدعات میں پھر کچھ درجات ہیں۔ بعض سخت حرام قریب بشرک کے ہیں، بعض مکروہ تحریمی، بعض تنزیہی۔

قرآن وحدیث اور آثار صحابہ وتابعین وائمہ دین میں بدعات ومحدثات کی خرابی اور ان سے اجتناب کی تاکید پر بیشمار آیات وروایات ہیں، ان میں سے بعض اس جگہ نقل کی جاتی ہیں۔

عہ　صرف لغوی اعتبار سے، ورنہ حدیث میں ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے، وہاں "ہر بدعت" کو گمراہی کہا گیا ہے　(ایڈیٹر)

بدعت کی مذمت قرآن و حدیث میں | علامہ شاطبی نے کتاب "الاعتصام" میں آیات قرآنیہ کافی تعداد میں اس موضوع پر جمع فرمائی ہیں۔ ان میں سے دو آیتیں اس جگہ لکھی جاتی ہیں۔

(۱) ولاتکونوا من المشرکین ٥ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعًا کل حزب بما لدیھم فرحون۔ — مت ہو مشرکین میں سے، جنہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا اپنے دین کو اور ہو گئے فرقے اور پارٹیاں۔ ہر ایک پارٹی اپنے طرز پر خوش ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا کہ اس سے مراد اہل بدعت کی پارٹیاں ہیں۔ (اعتصام ص ۶۵ ج ۱)

(۲) قل ھل ننبئکم بالأخسرین اعمالاً الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعًا — آپ فرمائیے کہ کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ کون لوگ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ خسارہ والے ہیں، وہ لوگ جن کی سعی و عمل دنیا کی زندگی میں ضائع اور بیکار ہو گئی اور وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم اچھا عمل کر رہے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ نے تفسیر اخسرین اعمالاً اہل بدعت سے کی ہے اور بلاشبہ اس آیت میں اہل بدعت کی حالت کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خود تراشیدہ اعمال کو نیکی سمجھ کر خوش ہیں کہ ہم ذخیرہ آخرت حاصل کر رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک ان کے اعمال کا نہ کوئی وزن ہے نہ ثواب بلکہ الٹا گناہ ہے۔

روایات حدیث بدعت کی خرابی اور اس سے روکنے کے بارہ میں بے شمار ہیں ان میں سے بھی چند روایات لکھی جاتی ہیں۔

(۱) صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من احدث فی امرنا الیس منہ فھو رد (اعتصام بحوالہ بخاری) — جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز داخل کرے جو دین میں داخل نہیں وہ مردود ہے!

(۲) اور مسلم نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبہ میں فرمایا کرتے تھے۔

امابعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدیٰ ھدی محمد و شر الأمور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ اخرجہ مسلم وفی روایۃ النسائی کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ فی النار (اعتصام ص ۶۶ ج ۱) — حمد و صلوٰۃ کے بعد سمجھو کہ بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ اور طرز عمل محمد (صلعم) کا طریقہ اور طرز عمل ہے۔ اور بدترین چیز نوایجاد بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اور نسائی کی روایت میں ہے کہ ہر نوایجاد عبادت بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ بھی یہی خطبہ دیا کرتے تھے اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اپنے خطبہ میں الفاظ مذکورہ کے بعد یہ بھی فرماتے تھے۔

انکم ستحدثون ویحدث لکم فکل محدثۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔ (اعتصام ص ۶۶ ج ۱) — تم بھی نئے نئے کام نکالو گے اور لوگ تمہارے لئے نئی نئی صورتیں عبادت کی نکالیں گے خوب سمجھ لو کہ ہر نیا طریقہ گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا جہنم ہے۔

(۳) صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من دعا الی الھدیٰ کان لہ من اجر — جو شخص لوگوں کو صحیح ہدایت کی طرف بلائے تو اس کو ان تمام لوگوں کے

مثل اجور من یتبعہ لا ینقص ذالک
من اجورھم شیئا، ومن دعا الی ضلالۃ
کان علیہ من الاثم مثل آثام من یتبعہ
لا ینقص ذالک من آثامھم شیئا۔

عمل کا ثواب اسکو ملے گا جو اس کا اتباع کریں بغیر اس کے کہ ان کے ثواب میں کچھ کمی کی جائے۔ اور جو شخص کسی گمراہی کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو اس پر ان سب لوگوں کا گناہ لکھا جائے گا جو اس کا اتباع کریں گے بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے۔

بدعات کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے والے اور ان کی طرف لوگوں کو دعوت دینے والے اس کے انجام بد پر غور کریں کہ اس کا وبال تنہا اپنے عمل ہی کا نہیں بلکہ جتنے مسلمان اس سے متاثر ہوں گے ان سب کا وبال بھی ان پر ہے۔

(۴) ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز ہمیں خطبہ دیا جس میں نہایت مؤثر اور بلیغ وعظ فرمایا جس سے آنکھیں بہنے لگیں اور دل ڈر گئے۔ بعض حاضرین نے عرض کیا "یا رسول اللہ! آج کا وعظ تو ایسا ہے جیسے رخصتی وصیت ہوتی ہے تو آپ ہمیں بتلائیں کہ ہم آئندہ کس طرح زندگی بسر کریں؟" اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعۃ
لولاۃ الامر وان کان عبداً حبشیا فانہ من
یعیش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیرا
فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین
المھدیین، تمسکوا بھا وعضوا علیھا
بالنواجذ، وایاکم ومحدثات الامور فان
کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ۔

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اور حکام اسلام کی اطاعت کرنے کی۔ اگرچہ تمہارا حاکم حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بڑا اختلاف دیکھیں گے اسلئے تم میری سنت اور میرے بعد خلفاء راشدین مہدیین کی سنت کو اختیار کرو اور اسکو مضبوط پکڑو۔ اور دین میں نو ایجاد طریقوں سے بچو کیونکہ ہر نو ایجاد طرز عبادت بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی۔

(اعتصام)

(۵) اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ۔

"جو شخص کسی بدعتی کے پاس گیا اور اس کی تعظیم کی تو گویا اس نے اسلام کو ڈھانے میں اس کی مدد کی"۔ (اعتصام الشاطبی ص۹۴ ج۱)

(۶) اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"اگر تم چاہتے ہو کہ پل صراط پر تمہیں دیر نہ لگے اور سیدھے جنت میں جاؤ تو اللہ کے دین میں اپنی رائے سے کوئی نیا طریقہ نہ پیدا کرو"۔ (الاعتصام)

(۷) آجری کی کتاب السنۃ میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا احدث فی امتی البدع وشتم اصحابی
فلیظھر العالم علمہ فمن لم یفعل فعلیہ
لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین۔

جب میری امت میں بدعت پیدا ہو جائیں اور میرے اصحاب کو برا کہا جائے تو اس وقت کے عالم پر لازم ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے اور جو ایسا نہ کریگا تو اس پر لعنت ہے اللہ کی فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔

(اعتصام ص۸۵ ج۱)

عبد اللہ بن حسن نے فرمایا کہ میں نے ولید بن مسلم سے دریافت کیا کہ حدیث میں اظہار علم سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "اظہار سنت"۔

(۸) حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

"مسلمانوں کے لئے جن چیزوں کا مجھے خطرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خطرناک دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ جو چیز وہ دیکھیں اس پر

ترجیح دینے لگیں جو ان کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ غیر شعوری طور پر گمراہ ہو جائیں۔ سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ یہ لوگ اہل بدعت ہیں۔

(۹) اور حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ:

"خدا کی قسم آئندہ زمانہ میں بدعتیں اس طرح پھیل جائیں گی کہ اگر کوئی شخص اس بدعت کو ترک کریگا تو لوگ کہیں گے کہ تم نے سنت چھوڑ دی"۔ (اعتصام ص۹۱ ج۱)

(۱۰) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ:

"اے لوگو! بدعت اختیار نہ کرو اور عبادت میں مبالغہ اور تعمق نہ کرو، پرانے طریقوں کو لازم پکڑے رہو اس چیز کو اختیار کرو جو از روئے سنت تم جانتے ہو اور جس کو اس طرح نہیں جانتے اس کو چھوڑ دو"۔

(۱۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ:

"آئندہ لوگوں پر کوئی نیا سال نہ آئے گا جس میں وہ کوئی بدعت ایجاد نہ کریں گے اور کسی سنت کو مردہ نہ کر دیں گے یہانتک کہ بدعتیں زندہ اور سنتیں برباد ہو جائیں گی"۔ (اعتصام ص۹۱ ج۱)

(۱۲) حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ

"بدعت والا آدمی جتنا زیادہ روزہ نماز میں مجاہدہ کرتا جائے اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا جاتا ہے"۔

نیز حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ "صاحب بدعت کے پاس نہ بیٹھو کہ وہ تمہارے دل کو بیمار کر دے گا"۔

(۱۳) حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ:

"کوئی قول بغیر عمل کے مستقیم نہیں اور کوئی قول و عمل بغیر نیت کے مستقیم نہیں، جب تک کہ وہ سنت کے مطابق نہ ہو"۔

(۱۴) ابو عمرو شیبانی فرماتے ہیں کہ

"صاحب بدعت کو توبہ نصیب نہیں ہوتی (کیونکہ وہ تو اپنے گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا تو یہ کیسے کرے)"۔

(۱۵) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ کلام حضرت امام مالکؒ اور تمام علماء وقت کے نزدیک ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے!

سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سننا وولاۃ الامر من بعدہ سننا الاخذ بہا تصدیق لکتاب اللہ واستکمال لطاعۃ اللہ وقوۃ علی دین اللہ لیس لاحد تغییرہا ولا تبدیلہا ولا النظر فی شیئ خالفہا من عمل بہا مہتد ومن انتصر بہا منصور ومن خالفہا اتبع غیر سبیل المومنین وولاہ اللہ ما تولی واصلاہ جہنم وساءت مصیرا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سنتیں جاری فرمائیں اور آپ کے بعد خلفاء راشدین نے کچھ سنتیں جاری فرمائیں ان کو اختیار کرنا کتاب اللہ کی تصدیق اور اطاعت الٰہی کی تکمیل اور اللہ کے دین میں قوت حاصل کرنا ہے نہ ان میں تغیر کرنا کسی کے لئے جائز ہے، نہ بدلنا اور نہ اس کے خلاف کسی چیز پر نظر کرنا جو ان پر عمل کریگا ہدایت پائیگا جو ان سنتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنا چاہے گا اس کی مدد ہوگی اور ان کے خلاف کرے گا مسلمانوں کے راستہ سے مخالف راستہ اختیار کیا اللہ تعالیٰ اس کو اسکی تجویز و اختیار پر چھوڑ دے گا اور پھر جہنم میں چلا جائے گا، اور جہنم برا ٹھکانا ہے۔

مولانا محمد اسحٰق (ندوۃ العلماء)

توحید اور مُسلمانوں کی مروّجہ رسمیں

اسلام کا جوہر اور جزو اعظم کیا ہے؟ اس سوال کا جواب صرف لفظ توحید سے دیا جا سکتا ہے۔ توحید کامل اسلام اور صرف اسلام کا حصہ ہے۔ اور یہی وہ شے ہے جس پر اللہ کے ہر نبی اور اللہ کی ہر کتاب نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبویہ کو دیکھو۔ کیا تعلیمات الٰہیہ اور دعوت نبویہ میں یہ سب سے زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی حق یہ ہے کہ پورے دین کا ماحصل "توحید" ہے۔ اور نوعِ انسانی کا کمال اسی پر موقوف ہے۔

ہمیں بجا طور پر فخر ہے کہ ہم موحد اعظم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کے غلام اور خزانۂ توحید کے امین ہیں۔ آئیے! اپنے نفوس کا جائزہ لیں کہ ہم نے اس امانت میں خیانت تو نہیں کی ہے؟

اقسامِ توحید لیکن اس تفتیش سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ اسلام ہم سے جس توحید کا مطالبہ کرتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس مسئلہ کو چھیڑنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ علم دین کی کمی اور ماحول کے اثرات نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے بلکہ ان کی اکثریت کو اس سے بے خبر بنا دیا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ لفظ توحید کا اسلامی مفہوم بس اتنا ہی ہے جتنا باعتبار لغت اس سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جو طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

توحید کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کو ایک سمجھنا۔ اگر صرف اتنا ہی مفہوم توحید کی حقیقت قرار دیا جائے تو اس بارے میں اسلام کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ میرے علم میں دنیا کے موجودہ مذاہب میں کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہے جو اصل اندر توحید کا مدعی نہ ہو۔ قرآن مجید کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین عرب بھی اتنی توحید کے قائل تھے۔ وہ بھی الٰہ العالمین صرف ایک ہی ذات کو سمجھتے تھے اور اس کی ذات میں کسی کو شریک نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے معبودوں کو بھی اس سے فروتر اور اس کا بندہ جانتے تھے لیکن باوجود اس کے قرآن حکیم نے انھیں مشرک فرمایا ہے۔ اور آج ہم بھی اسلام کے علاوہ کسی مذہب کو بھی دین توحید نہیں سمجھتے۔ اگر توحید کا اسلامی مفہوم اتنا ہی ہوتا جتنا اپنی ناواقفیت کی وجہ سے آج ہم سمجھ رہے ہیں تو ان اہل عرب کو قرآن مجید مشرک کیوں فرماتا اور آج کے بہت سے مدعیان توحید کو ہم اہل شرک میں کیوں شمار کرتے؟

ان واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلامی توحید لغوی توحید سے بالاتر ہے۔ اس کا مفہوم لغوی توحید سے جداگانہ وسیع تر اور اعلیٰ ہے

فطری توحید رب العالمین کو یگانہ و یکتا تسلیم کرنا فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ انسان فطرتاً اس کا خواہشمند ہوتا ہے

کہ اُس کی سب احتیاجات کا تعلق صرف ایک ہی ذات سے ہے اسی تقاضے کا ظہور ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدے سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوسکتا ہے؟ معمولی سی بات ہے کہ ہم بازار کے قریب رہنا پسند کرتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہماری ضروریات ایک ہی جگہ سے پوری ہوں۔ ایک افسر کی ماتحتی کو ہر ملازم بہت سے افسروں کی ماتحتی پر ترجیح دیتا ہے کسی معاملہ میں اگر ایک شخص کی خوشامد کافی ہوجاتی ہے تو متعدد آدمیوں کی خوشامد سے آدمی احتراز کرتا ہے۔ اسی قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جن کا مشاہدہ روزمرہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ اس نفسی حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ انسان کا فطری میلان یہ ہے کہ اس کی احتیاجات کا تعلق صرف ایک ہی محتاج الیہ سے ہو۔

احتیاج عبادت کا سب سے قوی محرک ہے۔ انسان معبود اسی ہستی کو بناتا ہے جسے اپنا حاجت روا سمجھتا ہے۔ وہ فطرتاً چاہتا ہے کہ وہ ایک ہی ہو۔ فطرت اسے یہاں تک پہنچا دیتی ہے لیکن اس سے آگے لے جانے سے قاصر رہتی ہے اگر خارجی اثرات اسے کمزور نہ کردیں تو ہر فرد انسان اس حد تک ضرور قائل ہوگا کہ معبود برحق ایک ہی ہے۔ لیکن نبوی تعلیم سے محرومی اور خارجی اثرات فطرت کو مسخ کردیتے ہیں اور آدمی شرک میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ آیۂ کریمہ اور حدیث نبوی میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے:-

فطرة الله التی فطر الناس علیها ما کل ولد یولد علی الفطرة فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه

(اللہ کی فطرت جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ہر بچہ دین فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کے والدین (خارجی اثرات) اسے یہودی نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں)

فطرت باوجود کمزور و مغلوب ہوجانے کے بالکل مردہ نہیں ہوجاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی زبان سے بھی توحید کا دعویٰ سنتے ہیں جن کی پوری زندگی شرک و بت پرستی کی گندگی میں آلودہ ہے۔

اسلامی توحید

کھانا اور پینا، سونا اور جاگنا بالکل طبعی چیزیں ہیں لیکن انبیاء کرام نے بتایا کہ کیا چیز کھانا چاہئے اور کیا نہیں، کس چیز کا پینا جائز ہے اور کس کا ناجائز۔ اور سونا کب مباح ہے اور کب حرام۔ اسی طرح انبیاء و مرسلین نے اس فطری توحید کی تفصیل فرمائی۔ حیات انسانی پر اسے منطبق کیا اور ہمیں بتایا کہ اس اجمالی عقیدے کے اندر ایک عالم پوشیدہ ہے۔ اس کی سب سے زیادہ تفصیل معلم اعظم سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ جو شخص محض فطری توحید کو رضائے الٰہی کے لئے کافی سمجھتا ہے وہ گویا بعثت انبیاء کو بے مقصد قرار دیتا ہے

فطری توحید تخم ہے اور اسلامی توحید وہ شجرہ طیبہ ہے جو صرف تعلیمات محمدیہ (علیہ آلاف تحیة) کی آبیاری سے پیدا ہوسکتا ہے۔ کیا کسی نے ثمر بے شجر دیکھا ہے؟ محض فطری توحید کو اختیار کرکے ان بہترین ثمرات کی توقع کرنا جو اسلامی توحید کے شجرہ طیبہ کے ساتھ مخصوص ہیں کیسی شدید غلطی ہے۔

اسلامی توحید کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اتنا وسیع کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کے باہر نہیں رہتا۔ اسلام اس شخص کو موحد کہتا ہے جس کی پوری زندگی اور اس کے ہر شعبہ میں توحید کا اظہار ہو۔ اور اُس کی زندگی کا ہر حصہ شرک سے پاک ہو اس اجمال کی تفصیل سمجھنے کے لئے ایک مختصر تمہید کی حاجت ہے۔

عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شخص جو عبادت کرتا ہے خواہ اللہ تعالیٰ کی یا غیر اللہ کی۔ وہ تھوڑا سا غور کر کے اس سوال کا جواب دے سکتا ہے جب آپ عبادت کرتے ہیں تو دو کیفیتیں آپ کے ذہن پر طاری ہوتی ہیں۔

(۱) آپ معبود کے سامنے اپنی انتہائی پستی و ذلت کا اظہار کرتے ہیں۔ لفظ "انتہائی" میں کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ یہ لفظ باب عبادت کی کنجی ہے۔ آدمی اپنے باپ کے سامنے بھی اپنی پستی کا اظہار کرتا ہے۔ حکومت اور دوسری قوتوں کے مقابلے میں بھی تذلل اختیار کرتا ہے۔ لیکن ذلت و پستی کے اس اظہار اور معبود کے سامنے اس کے اظہار میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اپنی انتہائی پستی و ذلت کا اظہار انسان معبود کے سوا کسی کے سامنے نہیں کرتا۔ یہ ایک وجدانی چیز ہے جسے ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس نے ایک مرتبہ بھی عبادت کی ہو۔

(۲) یہاں ایک دوسرا سوال ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ انسان ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس کا جواب بھی ہر شخص اپنے وجدان سے معلوم کر سکتا ہے بشرطیکہ اس نے ایک مرتبہ بھی عبادت کی ہو۔

ہم حکام کی تعظیم کرتے ہیں کیونکہ ان میں ہمارے لئے نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت و طاقت ہے۔ ہم علماء و مشائخ کی تکریم کرتے ہیں کیونکہ ان میں علم و پاکیزگی کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اپنے والدین کا احترام بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں اس لئے کہ انھیں اپنے وجود کا سبب اور اپنا بہت بڑا محسن جانتے ہیں۔ اسی قسم کی مثالیں تلاش کرنے پر بکثرت مل جاتی ہیں جو اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہیں کہ انسان کسی کی تعظیم اسی وقت کرتا ہے جب وہ اسے اپنے سے قوی تر سمجھتا ہے یا وہ (۲) اپنا حاجتوں کا پورا کرنے والا جانتا ہے یا (۳) اپنا محسن خیال کرتا ہے۔

ابھی مثال کی طرف سے توجہ نہ ہٹائیے۔ غور کیجئے کہ حکومت یا علماء و مشائخ یا والدین کی جتنی تعظیم ایک سمجھدار اور صحیح العقیدہ شخص کرتا ہے کیا وہ عبادت کے حدود میں داخل ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ان اشخاص میں مندرجہ بالا تینوں اوصاف کا قائل تو ہے مگر اس درجہ میں نہیں جس درجہ میں وہ ان اوصاف کو معبود میں تسلیم کرتا ہے۔ یہ مثال ہمارے وجدان کی آنکھیں کھول دیتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان اوصاف کمال کے دو درجے ہیں ایک درجہ ادنیٰ ہے جسے ہم مخلوق کے لئے بھی ثابت کرتے ہیں اور ایک درجہ اعلیٰ ہے جسے ہم صرف خالق و معبود کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ حکومت کو بھی ایک قسم کی قدرت و طاقت حاصل ہے لیکن اسے قادر مطلق کی قدرت عظیمہ سے کوئی نسبت و مشابہت بھی نہیں ہے۔ زید عمرو بکر سے بھی ہماری احتیاجات پوری ہوتی ہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس حاجت روائی کو حق تعالیٰ کی شان حاجت روائی سے وہ نسبت بھی نہیں جو ذرہ کو آفتاب سے ہوتی ہے۔ انسان کے احسان کا انکار ناشکری ہے مگر ایسے محسن حقیقی کے احسانات سے کیا نسبت؟ دونوں میں مقدار اور کمیت ہی کا فرق نہیں ہے بلکہ نوعیت کے لحاظ سے بھی کوئی مشابہت و نسبت نہیں ہے۔ علم اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ ہے اس کا انکار کیسے کریں لیکن مخلوق کے علم کو ملک علام کے علم کے ساتھ نہ کیفیت میں کوئی مشابہت نہ کمیت میں ہے۔ عبد و معبود کا یہ فرق اس قدر روشن اور جلی ہے کہ جاہل سے جاہل آدمی بھی وجدانی طور پر اسے محسوس کرتا اور اپنے اعتقاد کے مطابق اس پر عمل کرتا ہے

تمہید قدرے طویل ہو گئی مگر اسلامی توحید کے منور چہرے سے نقاب کشائی میں یہ اعانت کرے گی۔ اسلام جس توحید کا داعی ہے وہ صرف ذات حق تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کی دعوت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو ذات اور صفات

دونوں کے اعتبار سے یگانہ و یکتا سمجھو۔ دوسرے مذاہب کی توحید صرف ذات یا زیادہ سے زیادہ بعض صفات تک محدود ہے۔ ان کی توحید ناقص بلکہ درحقیقت توحید کے لقب کی مستحق ہی نہیں ہے۔ کتاب مبین کا ارشاد ہے۔

لیس کمثلہ شیٔ

(اس کے (اللہ کے) مثل کوئی بھی نہیں ہے)

نہ اس کی ذات کے مثل کسی کی ذات ہے نہ اس کی کسی صفت کے مثل کسی میں کوئی صفت پائی جا سکتی ہے۔ وہ جس طرح اپنی عظیم الشان ذات کے لحاظ سے بے نظیر و بے مثال ہے۔ اسی طرح ہر صفت کے لحاظ سے بھی یکتا و یگانہ بے نظیر و بے مثال ہے۔

یہ ہے مفہوم اس توحید کا جس کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے۔ اس حقیقت کا مستحکم یقین اور اعتقاد راسخ مسلمان ہونے کے لئے لازم و ضروری ہے۔ لیکن اسلام کا مطالبہ صرف اس عقیدے پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد اس کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ کا سرچشمہ درحقیقت یہی عقیدۂ توحید ہوتا ہے۔ حیات موت کو پسند کرتی ہے۔ نور کو ظلمت ناگوار ہے صلح فساد کے خلاف ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ توحید شرک کو گوارا کرے ؟ توحید الٰہ العالمین کا یقین مستحکم فطرتاً اس کا طالب ہوتا ہے کہ مسلم کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس کے حدودِ حکومت سے خارج نہ ہو۔ حیاتِ مسلم کے ہر حصہ پر اس کا سکہ رواں ہو اور اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے اور مخفی سے مخفی گوشہ میں بھی اشراک باللہ کا منحوس سایہ نظر نہ آئے۔ اسلام کے اس وسیع مطالبہ کا مختصر عنوان یہ ہے کہ وہ توحید اعتقادی توحید عملی اور توحید حالی کا طالب ہے۔ یہ جامع تقسیم پوری انسانی زندگی کو اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔ رب العالمین کا ارشاد ہے :-

وماکان لبشر ان یؤتیہ اللّٰہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللّٰہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون

(کسی انسان کی یہ مجال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب حکمت و نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہے کہ میرے بندے بن جاؤ۔ لیکن ان حضرات کی یہ دعوت ہوتی ہے کہ اللہ والے بن جاؤ۔ کتاب الٰہی پڑھنے پڑھانے کا یہی اقتضاء ہے)

توحید اعتقادی

یہاں اس واقعہ کا اظہار بہت مفید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس میں کسی کو شریک ماننے والے دنیا میں قلیل ہیں۔ لیکن انھیں مفقود نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ جو لوگ شرک میں مبتلا ہیں۔ ان کی غالب اکثریت حق تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی دوسرے کو شریک کرتی ہے۔ اس لئے اسلامی توحید اعتقادی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس بات کا پختہ اور غیر متزلزل یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی کسی صفت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ اور جس طرح اس کی ایسی کوئی دوسری ذات نہیں پائی جا سکتی اسی طرح اس کی کوئی صفت بھی کسی دوسری ذات میں نہیں ہو سکتی قرآن حکیم اور سنتِ سید المرسلین کا بھی یہی مطالبہ ہے لیکن مقام حیرت و عبرت ہے کہ آج حقیقت ان لوگوں سے بھی مخفی ہو گئی ہے جو توحید کامل کے تنہا علمبردار ہیں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ

(تم پہلے لوگوں (یہود و نصاریٰ) کی پیروی کرو گے)

یہ پیشین گوئی اس زمانہ میں پوری ہو رہی ہے۔ مندرجہ ذیل واقعات میں سے بکثرت میرے ذاتی مشاہدات ہیں۔ سنئے اور عبرت حاصل کیجیے:۔

اسلام کے نام لیواؤں کا ایک اچھا خاصہ گروہ ایسا بھی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان "عبداللہ" نہیں سمجھتا بلکہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ (معاذ اللہ) خود حق تعالیٰ نے صورت محمدیؐ میں ظہور فرمایا تھا۔ یہ باطل اور لغو عقیدہ کھلا ہوا شرک اور کفر ہے۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام اور سنت کے سب سے بڑے دعویدار ہیں۔ اور جو شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر اور اللہ تعالیٰ کا بندہ کہے اسے خارج از اسلام ورنہ کم از کم اہلسنت والجماعۃ سے خارج سمجھتے ہیں۔

اس عقیدے کا باطل اور خلاف اسلام ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ قرآن حکیم نے بار بار سید عباد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت و عبدیت کا صاف و صریح اعلان فرمایا ہے۔ ارشاد حق ہے:۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الٰھکم الٰہ واحد

(آپ فرما دیجئے کہ بے شک میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ میرے اوپر وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے)

قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا

(آپ فرمایئے کہ میرا پروردگار پاک ہے اور میں تو صرف ایک انسان اور اللہ کا رسول ہوں)

سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ

(پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف بھیجا)

چند آیات بطور نمونہ نقل کر دی گئیں ورنہ کتاب مبین میں یہ مضمون کثرت و تکرار اور صراحت و وضاحت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ یہ اسلام کا ایک بدیہی مسئلہ ہے جس پر دلیل قائم کرنے کا مطالبہ ایسا ہی ہے۔ جیسے روز روشن میں آفتاب کے وجود کی دلیل طلب کی جائے۔

مندرجہ بالا مشرکانہ عقیدہ باطلہ غالباً ہندوانہ ماحول اور ویدانت فلسفہ کا اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زیادہ تر ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جو حقیقی تصوف سے ناآشنائے محض ہیں۔ لیکن صوفیائے کرام کی شکل بنا کر ہندوانہ یوگ کو تصوف قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے مشائخ یہود و نصاریٰ کی طرح دوسرے مذاہب کے بہت سے باطل عقائد و خیالات کو اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ یہ باطل عقیدہ بھی ہندوانہ عقیدہ اوتار کا دوسرا جنم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بندوں میں ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ سب سے بلند و برتر ہے۔ شہنشاہ حقیقی کی بارگاہ عالی میں جو مرتبہ قرب و رفعت سید کونین کو حاصل ہے۔ وہ نہ کسی فرشتہ کو حاصل ہے نہ کسی نبی کو۔ معلم اعظم اور اعفانداہ

کو ملک علّام نے اپنے خزانۂ علم سے اس قدر وافر حصہ عطا فرمایا ہے کہ سید العالمین کے مرتبہ عظمیٰ پر بھی فائز ہو گئے۔ مخلوقات الٰہیہ میں دولت علم کا سب سے بڑا خزانہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کے پاس ہے۔ لیکن باوجود اس کے سید الاوّلین والآخرین حق تعالیٰ کے بندے ہی ہیں۔ ان کے علم کو عالم الغیب والشہادہ کے علم سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ مخلوق اور خالق عبد اور معبود کسی چیز میں بھی شریک نہیں ہو سکتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب کہنا اور آنحضور کے علم شریف کو ہی کل معلومات پر محیط و لامحدود سمجھنا حق تعالیٰ کی صفت علم میں آنحضور کو شریک بنانا ہے۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ مسلمانوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی موجود ہے جو اس باطل کو حق کے ساتھ آمیز کرتے رہتے ہیں اور اسلام میں اس مشرکانہ عقیدے کی گنجائش نکالتے ہیں۔ بعض تو یہ غضب کرتے ہیں کہ بہت سے اولیاء اللہ کو بھی اسی طرح عالم الغیب سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم نے خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے اس باطل عقیدے کی تردید کرائی ہے:-

ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسّنی السوء

(اگر میں عالم الغیب ہوتا تو بہت فائدہ اٹھالیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔

یہ آیت ایک مثال ہے۔ ورنہ اس مضمون کی آیتیں بکثرت ہیں۔

احتیاجات کا پورا کرنا، نفع یا نقصان پہنچانا، ان سب امور کا حقیقی تعلق حق تعالیٰ جل شانہٗ کی صفت ربوبیت سے ہے۔ اسلام تعلیم دیتا ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے وہی رب العالمین ہے اور اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ بطور نمونہ دو ایک آیتیں درج ذیل ہیں:-

ان ھذہٖ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون

(یہ تمہارا دین ہے جو ایک ہی ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس میری ہی عبادت کرو)

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملٰئکۃ (الآیۃ)

(بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب تو اللہ ہے۔ پھر اس بات پر جم گئے۔ ان کے پاس (مرتے وقت) فرشتے آتے ہیں) (الآیۃ)

سلطان دارین داعیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کو دعوت توحید دیتے ہیں۔ اس کا حصہ قرآن کی زبان میں یہ ہے:-

ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ

(اور اسی بات کو اختیار کریں کہ) اللہ کو چھوڑ کر ہم میں سے بعض بعض کو رب نہ بنائیں)

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی، ولی، شہید، فرشتہ، جن وغیرہ کسی مخلوق کو نفع نقصان کا مالک و مختار کارساز و حاجت روا سمجھنا اسے رب قرار دینا ہے جو کھلا ہوا شرک ہے۔ لیکن مقام رنج والم ہے کہ سلطان الموحدین کی غلامی پہ فخر کرنے والوں میں ایسے افراد اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جو اولیاء اللہ اور بزرگان دین کو کارساز حاجت روا اور نفع و نقصان کا مالک و مختار سمجھتے ہیں۔ اپنے اسلام کی لاج رکھنے کے لئے عبد و معبود میں یہ فرق بیان کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی قدرت ذاتی ہے اور اولیاء اللہ کی عطائی۔ یعنی رب العالمین نے فلاں فلاں اولیاء اللہ یا انبیاء

کو فلاں فلاں احتیاجات پوری کرنے کا یا فلاں قسم کے نفع ونقصان کا مکمل اختیار عطا فرما دیا ہے۔ اب وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ یہ بعینہٖ وہی عقیدہ ہے جو اکثر مشرکین عرب رکھتے تھے اور جس کی تردید قرآن مجید نے بار بار فرمائی ہے۔ سلطان کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ ہر مخلوق سے بلند ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آنحضور کو اعلان کا حکم دیتا ہے:۔

قل لا املك لنفسی نفعا ولا ضرا الا ما شاء الله

(آپ فرما دیجئے کہ مجھے اپنے نقصان ونفع کا کوئی اختیار نہیں ہے مگر جو اللہ چاہے)

قل انی لا املك لکم ضرا ولا رشدا

(آپ فرما دیجئے کہ مجھے تمھیں نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں ہے)

اس ارشاد حق کے بعد کسی دوسرے کے متعلق خواہ وہ ولی ہو یا نبی یا اور کوئی اس باطل عقیدے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟

یہ مشرکانہ عقیدہ باطل بھی غالباً ہندوانہ ماحول اور شیعوں سے اختلاط کا نتیجہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اس قسم کے عقائد رکھتے ہیں۔

سعدی علیہ الرحمۃ کا مشہور شعر ہے ؎

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

شیخ نے اس شعر میں اہلسنّت والجماعت کے عقیدہ شفاعت کی ترجمانی کی ہے۔ شفاعت برحق اور اس کا عقیدہ بھی حق۔ لیکن اس کے بارے میں بھی مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں شدید غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے جو شرک تک پہنچ گئی ہے۔

ان لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اولیاء اللہ کا ایسا دباؤ ہے کہ وہ ان کی شفاعت قبول کرنے پر معاذ اللہ مجبور ہے۔ عام طور پر اسے محبت کا دباؤ سمجھا جاتا ہے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات شفاعت کے بارے میں مختار مطلق ہیں۔ بلکہ جنت انھیں دے دی گئی ہے جسے چاہیں اس میں بھیج دیں۔ یہ عقیدہ سراسر باطل اور خلاف اسلام ہے۔ جزا وسزاء آخرت کا کامل اختیار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لئے ثابت کرنا حق تعالیٰ کی صفت

مالك یوم الدین

(اللہ تعالیٰ، مالک یوم جزا)

میں اسے شریک کرنا ہے۔

مندرجہ بالا مفہوم میں عقیدۂ شفاعت درحقیقت یہود ونصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت کا نقش ثانی ہے۔ اسلامی عقیدہ شفاعت کو اس سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اس باطل عقیدے کی بار بار تردید کی ہے۔ اور صحیح عقیدۂ شفاعت کی تعلیم دی ہے۔ ایک دو آیتیں سن لیجئے

ومن یشفع عندہٗ الا باذنہ
(بغیر اس کی (اللہ کی) اجازت کے اس کے سامنے کون شفاعت کرسکتا ہے)
لایملکون الشفاعۃ الامن اتخذ عند الرحمٰن عھدا
(کوئی شفاعت کا اختیار نہ رکھے گا۔ مگر صرف وہ جس نے رحمٰن سے اجازت لی ہوگی)

بے شک شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم، دوسرے انبیاء مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اور ان کے طفیل میں اولیاء اللہ اور بزرگان یہ سب روز قیامت شفاعت فرمائیں گے۔ لیکن ان کی شفاعت حق تعالےٰ کی اجازت کی محتاج ہوگی اور اسی کے بعد ہوگی۔ شہنشاہ حقیقی ان کی شفاعت قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ ایسے ایسی شفاعت کو قبول کرنے نہ کرنے کا کامل اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو حق شفاعت اس لئے عطا فرمائینگے کہ اپنی بارگاہ میں ان کا مقرب ہونا مخلوق پر ظاہر فرمائیں اور ان کے درجات و مراتب میں ترقی عطا فرمائیں یہ انہیں لوگوں کی شفاعت فرمائیں گے جن کے متعلق مالک حقیقی کی اجازت ہوگی۔ بغیر اذن الٰہی یہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکیں گے۔

ضمناً شفاعت کے متعلق ایک اور باطل عقیدے کی تردید یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے جو غالباً شیعوں کی صحبت کا اثر ہے۔

کربلا کے اندوہناک واقعہ کو عوام اہل سنت نے دوسروں سے متاثر ہوکر اسے ایک دوسرا ہی رنگ دے دیا ہے مشہور یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ نے امت کی مغفرت کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آنحضور کے دونوں نواسوں کی قربانی پیش کرنے کی شرط رکھی تھی۔ رحمۃ للعالمین اس سے انکار کیسے فرما سکتے تھے۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی قربانی باب جنت کی کنجی ہے۔ جس نے امت محمدیہ کے لئے اسے کھول دیا اور جہنم کا دروازہ اس کے لئے بند کردیا۔ اس کے لئے مختصر کی ایک من گھڑت روایت بھی شہادت ناموں میں لکھ دی گئی۔ اس باطل عقیدۂ کفارہ کی جڑیں مسیحیت میں ملیں گی۔

شفاعت کے متعلق مندرجہ بالا تفصیل کے بعد اس عقیدہ کا مہمل، باطل اور گمراہ کن ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہوجاتا ہے۔

یہ عقیدہ اگرچہ شرک میں داخل نہیں ہے لیکن انتہائی گمراہ کن ہے۔ اس لئے ضمناً اس کا تذکرہ کردیا۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ حاضر و ناظر ہے اور اس کے احاطۂ علم سے کوئی شے بھی باہر نہیں ہے۔ مسلمانوں میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اولیاء اللہ اور بزرگان دین کو بھی ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔ بعض صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ اعتقاد کھلا ہوا شرک ہے جس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔

آئندہ صفحات میں جن مشرکانہ رسوم و اعمال کا تذکرہ کرنا ہے۔ ان کی بنیاد کسی نہ کسی مشرکانہ عقیدہ پر قائم ہے۔ اس لئے توحید اعتقادی پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوا۔ عمل پر غور کرنے کے بعد اس کے متعلقہ کو معلوم کرلینا زیادہ دشوار نہیں ہے۔

توحید عملی انسانی تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ لیکن ان کی نوعیت اور ان کی عملی شکلوں میں اختلاف ہے

جو برتاؤ والدین کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ بیوی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ بھائی بہنوں کے ساتھ وہ طریقہ نہیں برتا جا سکتا جو دوست احباب کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ارباب حکومت سے ملنے کا طریقہ تاجروں سے ملاقات کے طریقے سے مختلف ہوتا ہے۔ طرزِ عمل کا یہ اختلاف نوعیت تعلق کے اختلاف پر مبنی ہوتا ہے۔ کس قدر بدذوق اور بدسلیقہ ہے وہ شخص جو اس اختلاف کو نظر انداز کر دے۔ کیا رائے ہے آپ کی اس شخص کے متعلق جو اپنے والدین کے ساتھ وہی طرزِ گفتار اختیار کرے جو وہ اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ اختیار کرتا ہے؟ ایسے رکیک الحرکات آدمی کی صورت دیکھنا بھی شاید آپ گوارا نہ کریں۔

حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کی ایک خاص نوعیت ہے۔ وہ خالق ہے ہم مخلوق، ہم عبد ہیں وہ معبود، وہ مالک ہے ہم مملوک۔ کیا ہمیں اس قسم کا تعلق اللہ کے علاوہ کسی دوسرے سے بھی ہے۔ یقیناً نہیں۔ اس کا نتیجہ صحیح یہ ہے کہ جو طرزِ عمل ہم اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے ساتھ اختیار کرتے ہیں وہ کسی اور کے ساتھ اختیار کرنا جائز نہیں ہے عملی زندگی کا ہر قدم اسی اصول کی روشنی میں اٹھانا اور اس کے ہر جزو کو اسی رنگ میں رنگ دینا توحید عملی ہے۔ اس کی خلاف ورزی یقیناً شرک ہے۔ کاش اُمت محمدیہ (علیہ الف الف تحیۃ) اس سے محفوظ رہتی۔ لیکن صد افسوس کہ یہود و نصاریٰ کی طرح مسلمانوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد اس مہلک مرض میں مبتلا ہے اور ایسے رسوم و اعمال کی پابند ہے جو صریحاً توحید کے منافی اور نجاست شرک میں آلودہ ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں۔

عالم میں عجائبات بکثرت ہیں لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز اگر آپ کو دیکھنا ہو تو کسی بزرگ کے مزار پر چلے جائیے۔ اگر آپ میں شعور دینی کا کوئی حصہ بھی موجود ہے تو آپ متحیر و ششدر ہو کے رہ جائیں گے کہ یا اللہ یہ کون مخلوق ہے جو ایک طرف توحید کی مدعی ہے اور دوسری طرف مزاروں کے سامنے سجدے بھی کر رہی ہے۔ ان پر چڑھاوے بھی چڑھا رہی ہے۔ صاحب مزار سے دعائیں بھی مانگ رہی ہے۔ اپنی حاجتیں ان کے سامنے پیش کر کے نذریں اور منتیں مان رہی ہے۔ غرض جو کچھ مندروں میں ہوتا ہے۔ وہ سب آپ وہاں بھی ہوتا ہوا دیکھیں گے فرق یہ ہے کہ مندروں میں بت پرستی کرنے والے اپنی بت پرستی کے معترف ہیں۔ مگر مزار پرستی اور اولیا پرستی کے شرک صریح کا ارتکاب کرنے والے وہ لوگ ہیں جو توحید کامل کے دعویدار اور سلطان الموحدین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں شمار کئے جاتے ہیں۔

دعا کے معنی ہیں پکارنا۔ یہ پکارنا حاجت روائی کے لئے ہو یا دفع مصیبت کے لئے یا امداد و اعانت کے لئے یا عنایت توجہ حاصل کرنے کے لئے، سب صورتیں دعا میں شامل ہیں اور حدیث نبوی ہے:

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃ

(دعا عبادت کا مغز ہے)

دوسری روایت میں ہے:۔

الدُّعاءُ ھوالعبادہ

(دعا ہی عبادت ہے)

اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو مندرجہ بالا مقاصد میں سے کسی مقصد سے پکارنا یا بالفاظ دیگر غیر اللہ سے دعا کرنا

اس کی عبادت کے مرادف ہے۔ کس قدر حیرت انگیز اور افسوسناک ہے یہ بات ؟ کہ لا الٰہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے) کا قائل اس شرک صریح کے گندہ نالے میں غوطہ لگائے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ایک بزرگ کے بقول احتیاج شیروں کو "روباہ مزاج" بنا دیتی ہے۔ مشہور مثل ہے "صاحب الغرض مجنون" کون ہے جسے احتیاجات نہ ہوں اور رکھتے ہیں جو اس جنون سے بالکل مامون ہوں۔ اس کے بعد شرک میں مبتلا کا خطرہ بھی قوی ہوجاتا ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے اسی توحید دعائی پہ بار بار زور دیا ہے اور حق تعالیٰ کی صفت ربوبیت کی خوب وضاحت فرمائی ہے۔ کیونکہ اللہ رب العالمین کے علاوہ کسی دوسرے سے دعا کرنا اسے حق تعالیٰ کی صفت ربوبیت میں شریک کرنا ہے۔ اور اشراک باللہ کی یہ قسم سب سے زیادہ عام ہے۔ چند ارشادات الٰہیہ پر اکتفا کرنا توضیح دعا کے لئے کافی ہے۔

قل انما ادعو ربی ولا اشرک بہ احداً

(کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں (دعا کرتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ (عبادت ودعا میں) کسی کو شریک نہیں کرتا)

آیت میں "دعاء" کو ذات حق جل شانہ کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا ہے اور اس کے خلاف کرنے کو یعنی غیر اللہ سے دعا کرنے کو شرک فرما کر اس سے براءت کا اظہار فرمایا گیا۔ لفظ "انما" انحصار کی صراحت کر رہا ہے اسی طرح لفظ "احداً" کا عموم بھی قابل غور ہے۔ انبیاء، اولیاء، شہداء، جن، ملائکہ کسی سے بھی دعا مانگنا شرک صریح ہے۔ یہاں تک کہ سرور کونین سلطان دارین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دعا مانگنا داخل شرک ہے۔

ومن یدع مع اللہ الٰھاً آخر لابرھان لہ بہ وانما حسابہ عند ربہ انہ لایفلح الکافرون

(اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو بھی پکارتا ہے (یعنی دعاء وعبادت میں شریک کرتا ہے) اس کے پاس (اس شرک کی) کوئی دلیل نہیں ہے اور اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہوگا۔ بے شک کفر کرنے والے کامیاب نہیں ہوتے۔

یہود ونصاریٰ کے متعلق قرآن مجید میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللہ

(انھوں نے اپنے علماء ومشائخ کو اللہ کو چھوڑ کر اپنا رب بنالیا ہے)

کلام خیر الانام میں اس کی تفسیر یہ وارد ہوئی ہے کہ وہ لوگ اپنے علماء ومشائخ کو تحلیل وتحریم کے بارے میں بالکل خود مختار سمجھتے تھے۔ آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بھی اسی قسم کے شرک میں مبتلا ہے۔ یعنی خدا پرست کے بجائے پیر پرست بنا ہوا ہے۔ پیر صاحب کیسے ہی فاسق وفاجر کیوں نہ ہوں۔ مرید کی عقیدت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ عبادت کا ایک خاص طریقہ ہے۔ جس پر عمل کرنا بعض صورتوں میں ہر مسلمان کے لئے ضروری ہوتا ہے کلمہ توحید پر ایمان رکھنے والا یہ بھی سمجھتا ہے کہ ہر قسم کی عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے جس طرح دن کی روشنی طلوع آفتاب کا یقینی اور بدیہی نتیجہ ہے۔ اسی طرح اس کلیہ سے یہ جزئیہ بھی بداہتہً سمجھ

میں آتا ہے کہ قربانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن ان لوگوں کی عقل وخرد کی تعزیت کن الفاظ میں کی جائے جو پیروں اور شہیدوں کے نام پر قربانیاں کر کے اپنے جذبۂ توحید کو کند چھری سے ذبح کرتے ہیں۔ حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ کے نام پر قربانی کرنا تو اس قسم کے لوگوں میں عام ہے۔ لیکن بعض دوسرے حضرات کے نام بھی اس سلسلہ میں آجاتے ہیں۔ ایک آدھ ایسے بھی ہیں جنھیں ولی اللہ بھی نہیں سمجھتے مگر ان کے نام پر مرغ وغیرہ کی قربانی کرتے ہیں۔ بعض تو ظاہری پردہ بھی اٹھا دیتے ہیں یعنی جانور کو مزار پر لے جاکر قربان کرتے ہیں۔ مندروں میں جو بھینٹ چڑھائی جاتی ہے اس میں اور اس میں ظاہری فرق بھی نہیں باقی رہتا۔

دین سے جہالت، فسق، ہوا پرستی، مشرکانہ ماحول ان چیزوں نے مل کر اس موحد قوم کے ہر شعبۂ زندگی میں شرک کی آمیزش کر دی ہے۔ معاشرت کی ابتدا شادی سے ہوتی ہے۔ اسلام میں یہ ایک مبارک معاہدہ ہے لیکن مسلمانوں نے اسے بھی نحوستِ شرک میں آلودہ کر دیا۔ دنوں اور تاریخوں کے سعد ونحس ہونے کا اعتقاد دراصل ستارہ پرستی کا ایک بچہ ہے جو اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ ہے۔ اور تعجب ہے کہ موحدین نے اسے پالک بنا لیا ہے۔ اس باطل عقیدے کا اثر یہ ہے کہ تقریب سے پہلے منجم یا جوتشی سے دن تاریخ کے سعد ونحس ہونے کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے یہی کیا کم ہے مگر نجومی کا کام اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس سے زائچہ بنوایا جاتا ہے۔ جس میں اس کی ساری زندگی کے متعلق پیشین گوئی ہوتی ہے ان افعال قبیحہ کو بھی شرک نہ کہا جائے تو شرک کس چیز کا نام ہے حدیث نبوی میں بڑی شدت کے ساتھ نجومیوں سے خبریں پوچھنے کی ممانعت آئی ہے۔ معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ منجم سے آئندہ واقعات پوچھنا اسے عالم الغیب سمجھنے کے مرادف ہے اور یہ اشراک باللہ کے ہم معنی ہے۔

رخصتی کے وقت بعض اوقات امام ضامن باندھا جاتا ہے۔ یعنی "امام" کو دلہن دولھا کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں انھیں حاضر وناظر اور ہر قسم کی امداد پر قادر سمجھا جاتا ہے۔ یہ کھلا ہوا اشراک باللہ ہے امامت کا عقیدہ بھی خالص شیعی عقیدہ ہے۔

شادی بیاہ میں بعض اور بھی رسمیں بعض مقامات میں ہوتی ہیں جو حدود شرک میں داخل ہیں۔ ان کی تفصیلات بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

استقرا کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے توحید عملی کو بہت نظر انداز کیا ہے۔ چند اعمال ورسوم کا تذکرہ کامل استقرا پر مبنی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے اعمال ورسوم آپ کو ملیں گے جو حدود شرک میں داخل ہیں۔ مثلاً غیر اللہ کی قسمیں کھانا۔ ٹونے ٹوٹکے کرنا۔ چیچک کو دفع کرنے کے لئے سیتلا پوجا کرانا اور اسی قسم کے بیسیوں مشرکانہ اعمال ہیں جن میں مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد مبتلا ہے جن میں جہلا بھی ہیں اور پڑھے لکھے بھی۔ مزید افسوس اس پر ہے کہ تعلیم یافتہ ان مشرکانہ اعمال کی گندگی پر دور از کار تاویلات کی مٹی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اس محال کو بھی ممکن فرض کر لیا جائے کہ اس قسم کے اعمال فساد عقیدہ سے محفوظ ہیں تو بھی شرک عملی کا سیاہ داغ ان کی پیشانی پر لگا رہے گا۔ دین توحید تو صورت شرک کو بھی حقیقت شرک کی طرح ملعون قرار دیتا ہے۔

توحیدِ حالی محبت، تسلیم و رضا، خوف، اعتماد یہ سب ہمارے نفس کے کیفیات و حالات ہیں۔ جو اضافی پہلو بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ان کا تعلق کسی دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ محبت کے لئے کسی محبوب کا وجود ضروری ہے۔ اعتماد کسی پر ہوتا ہے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

یہ اور انھیں کے مثل بعض دوسری نفسی کیفیتیں دوگونہ تعلق رکھتی ہیں یعنی ان کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے اور خالق سے بھی۔ مثلاً محبت ہمیں اپنے والدین سے بھی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے بھی۔ لیکن وجدانی طور پر ہم ان دونوں تعلقات میں فرق محسوس کرتے ہیں۔ ان کا ایک درجہ مخلوق کے لئے ہے اور ایک درجہ خالق کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ مخصوص درجہ خالق ہی کے ساتھ مخصوص رہے کسی دوسرے کو نہ دیا جائے۔ اسی چیز کا نام توحید حالی ہے۔ مثلاً والدین، اولاد، اقارب، احباب، مال و دولت، وطن و مسکن ہر چیز کی محبت طبعی ہے۔ شریعت اس محبت پر کوئی ملامت نہیں کرتی لیکن اس محبت کی ایک حد ہے اس سے تجاوز حدود توحید سے تجاوز ہے۔ کیونکہ اس سے بلند درجہ صرف حق تعالیٰ جل شانہ کا ہے ارشاد ربانی سنئے:- من الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ والذین اٰمنوا اشد حباً للہ

(بعض اشخاص اللہ کو چھوڑ کر بعض دوسروں کو اس کے مثل سمجھتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہیئے۔ اور اہلِ ایمان کا حال یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ رکھتے ہیں)

کوئی ایسا مادی پیمانہ دنیا میں موجود نہیں ہے جس سے ناپ کر بتایا جاسکے کہ فلاں قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت مخلوق کی محبت سے زائد ہے یا کم لیکن اس کے لئے عملی پیمانہ موجود ہے جس سے ہر شخص اپنے دل کا امتحان کرسکتا ہے جب مخلوق و خالق کی رضا کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ایمان کا تقاضا اور محبت الٰہی کا اقتضا یہ ہے کہ مالک و محبوب حقیقی کی رضا کو اختیار کیا جائے اور ان کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ خواہ اس راستہ میں اقربا و احباب کی طرف سے منہ موڑنا پڑے یا اپنی جان و آبرو سے تعلق توڑنا پڑے۔ اگر دل میں یہ جذبہ نہیں تو بلا شبہ توحید حالی حاصل نہیں ہے۔

دلوں کا حال علام الغیوب جانتا ہے۔ ہم ظاہر بین تو صرف ظاہر کو دیکھ کر دل کے متعلق اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ "توحید حبی" کی جنس گراں مایہ آج اس قدر کمیاب ہو چکی ہے کہ بہت تلاش و جستجو سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ اس کے سب سے بڑے دوکاندار مشائخ تھے۔ جن کی آتش دل کی چنگاریاں دور دور تک دلوں میں آگ لگا دیتی تھیں۔ مگر ان میں سے اکثر کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں شعلۂ طور کی تجلی کے بجائے آتش نمرود کی تپش محسوس ہوتی ہے۔ احکام شرعیہ کی خلاف ورزی ان کا شعار، سنت نبویہ سے سرکشی ان کی طبیعت ثانیہ۔ شرک و بدعت کے جذام میں مبتلا ہیں اور دوسروں تک اسے متعدی کرنے کے درپے۔ خلاصہ یہ کہ ان کے دلوں میں محبت الٰہی کے بجائے محبت دنیا نے گھر کر لیا ہے۔ یہ حال صوفیا و مشائخ کے ایک بڑے گروہ بلکہ ان کی اکثریت کا ہے۔ لیکن سب کو ایسا ہی سمجھنا سخت غلطی ہے۔ آج بھی ایسے حضرات اس طبقہ میں موجود ہیں۔ جن کے مقدس چہروں کا دیکھنا ہی محبت الٰہی کی فطری چنگاری کو ہوا دیتا ہے اور ایمان میں قوت و طاقت پیدا کرتا ہے

محبت الٰہی کا تذکرہ بھی مومن کو محبوب ہوتا ہے۔ اس لئے اس لذیذ حکایت کی یہ معمولی سی طوالت غالباً کسی کے لئے باعث خاطر نہ ہوگی۔ بات ختم کر رہا تھا کہ دو ایک "اپ ٹو ڈیٹ" قسم کے شرک یاد آگئے جو اگرچہ شرک اعتقادی اور عملی میں داخل ہیں لیکن ان کی بنیاد اسی محبت سے پڑتی ہے۔

پہلی چیز تو وطن پرستی ہے جو بلا تکلف خدا پرستوں کے فیشن میں بھی داخل ہوگئی ہے۔ وطن کی محبت ایک طبعی شئے ہے اور اس کے کچھ حقوق بھی ہیں۔ یہاں تک انکار نہیں ہے بلکہ اس طبعی اقتضا کی خلاف ورزی پر شریعت اسلامیہ بھی نکیر کرتی ہے۔ لیکن ان سب کی ایک حد ہے، اس وقت دنیا نے وطن کو ایک معبود بنا لیا ہے۔ اس کی تقدیس۔ اس کے لئے اخلاق و انسانیت کے ہر اصول کو توڑنے پر آمادگی۔ اس کی محبت کا درجہ دین و مذہب وغیرہ ہر چیز کی محبت سے فائق سمجھنا۔ اس کے لئے احکام الٰہی سے منہ موڑنا۔ یہ سب امور کیا اسے معبود کا درجہ نہیں دے دیتے ہیں؟ اور کیا یہ شرک نہیں ہے؟ اسلام میں حب وطن بہت مستحسن ہے بلکہ مامور بہ ہے۔ لیکن وطن پرستی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ افسوس ہے کہ آج مسلمان بھی اس مغربی شرک کو اپنی زندگی کا جزو بنا چکا ہے۔ ادھر مختلف اسلامی ممالک سے مغربی ممالک کے خلاف جنگ کی خبریں آئیں۔ آنکھیں دیکھنے کو اور کان سننے کو ترس گئے کہ کہیں تو فی سبیل اللہ کا لفظ دکھائی یا سنائی دیتا للہیت کی روح کے بجائے ہر طرف وطنیت کی روح کارفرما نظر آئی۔

ایک دوسرا بت ہے ایران کے ایک صنم تراش نے تراشا تھا۔ انسانیت کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بھی فی نفسہ قابل قدر و محبت شئے ہے۔ لیکن ایک گروہ نے اسے بھی معبود کا درجہ دے دیا ہے۔ اختلاف انسانیت کی محبت سے نہیں ہے بلکہ اس محبت و عظمت میں غلو اور افراط سے ہے۔ یہ بت درحقیقت ایک فلسفیانہ تخیل اور عمل دو چیزوں کا ایسا عجیب مرکب ہے جس کے اجزاء کے درمیان کوئی کشش نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے پرستار جب خیالی دنیا سے عملی دنیا کی طرف آتے ہیں تو خود اپنے ہاتھ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اسلام کا موقف ظاہر ہے۔ انسانیت نوازی اس کے نزدیک فرض لیکن انسانیت پرستی اس کے نزدیک خلاف فطرت اور شرک ہے جس کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔

محبت کی طرح اعتماد کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک درجہ مخلوق کے لئے ہے اور دوسرا رب العالمین کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس تخصیص کو باقی رکھنا توحید فی الاعتماد ہے جس کا اصطلاحی نام دین قیم میں توکل ہے۔ ارشاد حق ہے:

وعلی اللہ فلیتوکل المومنون

(اہل ایمان کو صرف اللہ پر توکل و اعتماد کرنا چاہئے)

خوف طبعی مخلوق سے بھی ہوتا ہے اور اسلام اس کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کی ایک حد ہے جس کے آگے خوف کا وہ درجہ ہے جس کے متعلق فرمان باری ہے:- وایای فارھبون

(اور صرف مجھ سے ڈرو)

بقیہ کیفیات کو انہیں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

یہ چند اشارات ہیں جن پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ توحید حالی خود ایک مستقل موضوع ہے جو شرح و بسط چاہتا ہے۔ بشرط توفیق اس پر پھر کسی وقت روشنی ڈالوں گا۔ آخر میں ایک جامع آیت نقل کرتا ہوں جو توحید کے سب ابواب کا خلاصہ۔ مومن کی زندگی کا مکمل دستور العمل۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا مطالبہ ہے:

ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین

(بے شک میری نماز۔ عبادت۔ زندگی اور موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے)

کاش! سمجھدار مسلمان اس دعوت کی طرف متوجہ ہوتے اور اسے اپنا مقصد حیات بنا لیتے۔

آذانِ بت کدہ

نغمہ و فریاد — صلاح و انقلاب — نقد و حساب

لکھے ہیں یہ اشعار، مگر خونِ جگر سے!

- اسد ملتانی
- عاصی کرنالی
- شفیق جونپوری
- ساقی جاوید
- پروفیسر ضیاء احمد بدایونی
- ابوالبیان حماد
- صابر القادری
- عامر عثمانی
- دہر سعیدی
- فوق جامی
- بسمل سعیدی
- راغب مرادآبادی
- عبد الحمید ارشد
- رعنا ظفر
- ابوالعرفان مست انصاری
- محمد عبد العزیز شرقی
- شبنم رومانی
- ابراحسنی گنوری
- ابوالمجاہد زاہد
- ماہر القادری

اسدؔ ملتانی

کیا یہی توحید ہے؟

لب پہ تو اللہ کی تعریف ہے تحمید ہے — اور عمل دیکھیں تو خود ایمان کی تردید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
جنکو وردِ سورۂ اخلاص کی تاکید ہے — ان کو بھی کفار ہی سے خوف اور اُمید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
خود ہوائے نفس کی ہے بے تکلف پیروی — اور خدائے پاک کے احکام پر تنقید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
جا رہی ہے کیا قلم تعلیمِ قرآں کے خلاف — آیۂ قرآں سے جس تقریر کی تمہید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
مُشرکانہ رنگ میں ہوتا ہے اسکا اہتمام — خواہ وہ تقریبِ غم ہو خواہ جشنِ عید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
تُو ہم کوتاں دینِ حق کی سربلندی کیلئے — اور باطل قوتوں سے طالبِ تائید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
زندہ مردانِ خدا سے بے نیازی ہے سلوک — اور مُردوں سے تجھے امداد کی اُمید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
سجدۂ قبروں پر نظر دنیا پہ دل نذرِ بتاں — دین کی تنقیص میں اغیار کی تقلید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
کعبۂ دل میں بسائے جا رہے ہیں بُت نئے — جاہلیت کے پرانے دور کی تجدید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
اب مسلماں کو نہیں لاتقنطوا کا بھی یقیں — کفر سے مرعوب ہے اسلام سے نومید ہے
کیا یہی توحید ہے؟
وحدتِ ملت ہوئی ہے پارہ پارہ اے اسدؔ — انتشارِ فکر کی سو سو طرح تائید ہے
کیا یہی توحید ہے؟

عاصیؔ کرنالی

"توحید"

زخمۂ توحید سے جنبشِ تارِ حیات۔۔۔!
اس سے یقیں کی نمود، اس سے خودی کا ثبات
عشق جلال آفریں، حُسن جمال آفریں
اس سے بشر کی حیات سلسلۂ معجزات
اس سے نگاہِ عمرؓ فاشِ کُن رمزِ دیں!
اس سے دلِ مرتضیٰؓ جلوہ گہِ نورِ ذات
اس سے فضا تاب ہے وادیٔ بدر و حُنین
اس سے شفق رنگ ہے دامنِ موجِ فرات
اس کے اُفق سے طلوع نورِ جبینِ حرم
اس کی شعاعوں سے ماند تشقۂ لات و منات
اس کی بہاروں میں مست بندۂ مومن کا دل
اس کی فضاؤں میں چُست مردِ مسلماں کا ہات
اس کی تجلی میں گم ظلمتِ ذہن و خرد!
اس کے تصور سے حل نکتۂ ذات و صفات
وحدتِ فکر و عمل ہے اسی طوبیٰ کا پھل
غیرتِ عزم و یقیں، ہیں اسی ڈالی کے پات

شیطنتِ عصرِ نو، جرم و بغاوت کی رَد!
شورِ "انا" سے ہے پُر انجمنِ کائنات
آہ اس احساس سے تلخ مرے روز و شب
کام و دہن میں مرے، زہر ہے قند و نبات
وسوسۂ آدمی، ذہن کی غارت گری!
عقل کی پوشیدہ چوٹ، نفس کی دُزدیدہ گھات
شرک کی اُفتاد بھی، فتنۂ ایجاد بھی!
فکر کا الحاد بھی، کھاتے ہیں ہم جس سے مات
موجۂ توحید میں ساری خرافات غرق
ایک خُدا کا خیال، لاکھ بتوں سے نجات

شفیق جونپوری

حمد

خدا کی حمد سے آغاز ہر مقام کیا
کہ جس نے مجھکو سخن فہم و خوش کلام کیا

اسی نے نطق سے انسان کو شرف بخشا
اسی نے حرف و معانی کا اہتمام کیا

فلک کو سدرۂ و طوبیٰ و عرش و لوح و قلم
زمین کو اوجِ حرم دے کے نیک نام کیا

زمیں کی پیاس بجھانے کے واسطے کیا
فضا میں ابرِ بہاری کا انتظام کیا

فلک کو چاند ستاروں نے روشنی بخشی
زمیں کو سنبل و ریحاں نے خوش مقام کیا

وہ نورِ خاص جبینِ ابوالبشرؑ کو دیا
ملائکہ نے بھی آدم کا احترام کیا

بشر کو اپنی خلافت کا مرتبہ دیکر
فروغِ نامتناہی کو اور عام کیا

شفق سے دامنِ گردوں کو کر دیا رنگین
زمین کو خونِ شہیداں سے لالہ فام کیا

تجلی رخ و گیسو کو تھا جو شوقِ ظہور
تو کائنات کو پابندِ صبح و شام کیا

بقدرِ جلوۂ رخسار و زلفِ محبوباں
نگاہِ اہلِ نظر کو اسیرِ دام کیا

جمالِ خارِ مغیلاں دیا بیاباں کو
چمن کی گود میں پھولوں کو مشک فام کیا

بسایا وادی و کہسار کو غزالوں سے
نسیمِ صبح کو گلشن میں خوش خرام کیا

بتا کے جن و بشر کے وجود کی غایت
لیعبدون پہ مقصد کا اختتام کیا

ہزار شکر جہنم کی آگ کو اس نے
شفیق جیسے گنہگار پہ حرام کیا

خالق و کردگار

ہمیشگی ہی اگر مادّے کی ہے تسلیم
تو کردگار ازل سے کشیدگی کیا ہے

زمین آگ کا گولا تھی فرض کرتا ہوں
مگر زمین کی ہستی پہ آگہی کیا ہے

زمین آئی کہاں سے سوال کرتا ہوں
مکوّنات کے آغاز کی خودی کیا ہے

ہوئی نہ عقل کی تسکین خدا کو چھوڑ کے بھی
خدا نہیں ہے تو یہ نظمِ زندگی کیا ہے

چلا کہاں سے زمانے کا کاروانِ وجود
اور ابتدا ہے تو عنوانِ آخری کیا ہے

جب ابتدا کا پتہ ہے نہ انتہا کی خبر
تو فلسفی بھی حقیقت شناس ہی کیا ہے

زمیں پہ لالہ و گل کی بہار کیا معنی
یہ آسماں پہ ستاروں کی روشنی کیا ہے

یہ ڈالیوں پہ عنادل کے چہچہے کیسے
چمن میں غنچہ و گل کی شگفتگی کیا ہے

کہیں تو خشک ہیں چشمے کہیں رواں لہریں
زمین کا ابھی کیا رنگ تھا ابھی کیا ہے

بغور دیکھئے ترتیب فصل و موسم کی
خزاں کے بعد یہ آمد بہار کی کیا ہے

یہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے گھونسلے کیسے
یہ شاخِ گل پہ سلیقے کی زندگی کیا ہے

ہے اک شعور پہ مبنی وجود ہر شے کا
جو دھوپ ہے تو درختوں کی چھاؤں بھی کیا ہے

خود اپنی ذات سے ہوتی ہے معرفت اسکی
حقیقتِ بشری کیا ہے آدمی کیا ہے

ساقی جاوید بی۔ اے

مرقد پرستی

یہ سلگتی تربتیں یہ "آستانے" یہ مزار!
یہ چرس پیتے مجاور، اونگھتے خدمت گزار
کفر کا اٹھتا دھواں، الحاد کا اٹھتا غبار
زہد کے نیلام گھر، تقدیس کے جلتے دیار

مرقدوں پر سجدہ ریز انسے پجاری الاماں
قبر کے مُردوں کی یہ پروردگاری الاماں

عصمتوں کی منڈیوں کے بیوپاری دہر میں
سینکڑوں "تکیوں" کی یہ تحویلداری دہر میں
آج بھی الحاد کے سکے ہیں جاری دہر میں
آدمی کا دل ہے ظلمت کی پٹاری دہر میں

مرنے والوں سے مرادیں مانگنے آتے ہیں لوگ
کس عقیدت سے جہنّم کی طرف جاتے ہیں لوگ

پھر زمانہ ایک زنجیرِ کہن دیتا ہوا —
وقت پینے کیلئے خونِ چمن دیتا ہوا۔
آدمی کو پھر ہلاہلِ اہرمن دیتا ہوا
کعبۂ تقدیس کو خونیں کفن دیتا ہوا

رکھنے والوں نے ادا اک یاد رکھی کفر کی
"پیر و مرشد" نے بھی اک بنیاد رکھی کفر کی

سینکڑوں مدفن ہزاروں تعزیے پوجے گئے
جانے کتنی خانقاہوں کے دیئے پوجے گئے
جانے کتنی "چادروں" کے حاشیے پوجے گئے
کتنے "پنجے" خیر و برکت کے لئے پوجے گئے

خیر و برکت کا صحیفہ طاق میں رکھا رہا
نقشِ ہستی پردۂ اوراق میں رکھا رہا

ہر لحد اک وقت کا ناسور ہے کس سے کہیں
شیشۂ تقدیس چکنا چور ہے کس سے کہیں
دل یہاں خود اک صلیبِ نور ہے کس سے کہیں
کن اندھیروں میں سحر محصور ہے کس سے کہیں

کون سازِ وقت کی آواز سنتا ہے یہاں
آدمی کا ذہن انگارے ہی چنتا ہے یہاں

رہروانِ حق مگر کچھ آج بھی بیدار ہیں
کچھ اجالے رات سے آمادۂ پیکار ہیں
پھر افق پر کچھ نمودِ صبح کے آثار ہیں
کچھ نگاہیں اے زمانے نقش بر دیوار ہیں

پھر چراغِ زیست کی ہم لو بڑھاتے ہیں یہاں
انجم و مہتاب بن کر جگمگاتے ہیں یہاں

مرقدوں کے پوجنے والو۔ حرم کا واسطہ
اس نبیِ پاکؐ کے نقشِ قدم کا واسطہ
انقلابِ چین و روما و عجم کا واسطہ
جاگتی صبحوں کے سیلِ یم بہ یم کا واسطہ
تابکے یہ دل لگی توحید سے، اسلام سے
صبح کی تم کو امیدیں ہیں غروبِ شام سے

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی ایم-اے

غیر اللہ کو سجدہ

آئے سفر سے ایک صحابیؓ باوفا
سجدہ کیا رسول علیہ السلام کو
لیکن نہ تھی پسند یہ تعظیم کی ادا
اللہ کے پیمبرؐ عالی مقام کو
پوچھی جو ان سے وجہ تو بولے کہ بارہا
دیکھا ہے رومیوں میں خواص و عوام کو
کرتے ہیں سجدہ وہ بہ کمالِ فروتنی
مذہب کے ہادیان و سران عظام کو
میرا بھی دل ہوا کہ نبیؐ کے حضور میں
لاؤں بجا خصوص سے اس رسم عام کو
فرمایا یہ طریق نیایش یہ عاجزی
مشروع ہے اگر تو خدائے انام کو
گر غیر حق کے واسطے یہ شیوۂ نیاز
ہوتا روا شریعت حقہ میں نام کو
کرتا میں عورتوں کو ہدایت کہ سجدہ ریز
ہوں اپنے شوہروں کے حضور احترام کو

ابوالبیان حمّاد

نغمۂ توحید

کلیدِ گلشنِ فردوس و دولتِ جاوید
رضائے باری تعالیٰ تصورِ توحید

دلیل و حجتِ توحید، انجم و ناہید
مہ و ثریا و پروین و اختر و خورشید

ہمیں نصیب جو ہو جائے اپنے رب کی دید
وہی ہے عید ہماری وہی ہماری عید

گوارا کر نہ سکے جو نظام باطل کو
وہی ہے رمز شناسِ حقیقتِ توحید

وہ سب خدا کے مطیع و فقیر بندے ہیں
نبی ہو یا کہ ولی یا سکندر و جمشید

اُمید و بیم نہیں ماسوا سے کچھ بھی جسے
اسی کے ساتھ ہے اللہ کی نصرت و تائید

حسینؓ ابن علی نے کٹا کے سر اپنا
سکھایا اہلِ زمانہ کو نکتۂ توحید

کبھی بدل نہیں سکتے حقائقِ ابدی
عبث ہی بحثِ لاطائلِ قدیم و جدید

دل و دماغ صنم خانۂ ہوا و ہوس
مگر زبان سے ہر بار دعوئ توحید

ہے اجتناب ضروری رسوم بدعت سے
زبسکہ لعنتِ بدعت ہی شرک کی تمہید

سفینہ اس کا بھنور سے نکل نہیں سکتا
جو ناخدا سے تو راجی خدا سے نا اُمید

جو بت شکن تھا کبھی بت فروش ہے وہ اب
ہے کفر و شرک کا منّاد، حاملِ توحید

کسی پہ اسکو بھلا تبصرہ کا کیا حق ہے
جو اپنی ذات ہی پہ خود ہے مستقل تنقید

ہے جس کا گوہرِ مقصود مرضئ مولا
فرشتے اس کی اداؤں کی کرتے ہیں تقلید

چراغ و چشم براہیم! بتکدہ ہے جہاں
سنبھال تیشۂ حق اور ایک ضرب شدید

ابوالبیان زمانہ ہزار دشمن ہو
میں بتکدوں میں سناؤنگا نغمۂ توحید

نامان
صابر القادری

ندائے حق

اے کہ انسان تجھے خلق کیا ہے کس نے
مرتبہ بڑھ کے ملائک سے دیا ہے کس نے
اور مخلوق ہے جتنی بھی، وہ سب تیری غلام
بخشا یہ کس نے تجھے عزّت و عظمت کا مقام
فہم و ادراک کی سونپی ہے امانت کس نے
کی عطا عقل و خرد کی تجھے دولت کس نے
نطق کو کس نے عطا طاقت گویائی کی —
دیدۂ کور کو دیں نعمتیں بینائی کی !
بندہ کہہ کر تری توقیر بڑھائی کس نے
راہ منزل پہ پہونچنے کی دکھائی کس نے
یہ نہ سوچا کہ ہے طاقت بھی کوئی لامحدود
عبد کی شان یہ تھی اُس کو سمجھتا معبود
تو نے اپنوں میں جسے چاہا خدا مان لیا
وقتِ مشکل اُسے حاجات روا جان لیا
ہوش اتنا بھی نہیں ہے تجھے دیوانۂ عقل
عقل رکھکر بھی بنا پھرتا ہے بیگانۂ عقل
ہم نے بخشا تجھے تسلیم و رضا کا پیکر
ہم کو ہی بھول گیا آج ہمارا ہو کر
تجھ میں مومن بھی ہیں مشرک بھی ہیں کفّار بھی ہیں
کچھ ہیں وہ، ہم سے ہی جو برسرپیکار بھی ہیں
اس لئے تجھ سے مسلمان شکایت ہے ہمیں
اپنے محبوب کی اُمّت سے محبت ہے ہمیں
ایک بندہ تھا تجھی میں سے ہمارا محبوبؐ
جس کو ہر لحظہ ہماری ہی رضا تھی مطلوب
اس کے کردار پہ کونین کی عظمت قرباں
اس کی توقیر کی دیتا ہے شہادت قرآں
ہم نے بھیجا اُسے یوں تیری ہدایت کیلئے
تو مرا جاتا تھا غیروں کی اطاعت کے لئے
تیرا ہادی، ترا رہبر، وہ مکمّل انسان
زندگی جس کی سراپا تھی، ہمارے فرمان
جانتا تھا کہ ہے کیا رشتۂ محبوبؐ و حبیب
تھا یقیں یہ بھی کہ کونین کی عظمت ہی نصیب
حق سے نہ قدم پھر بھی ہٹائے اس نے
بندگی کے تجھے آداب سکھائے اس نے
ایک بندے سے کبھی خود کو نہ بڑھ کر سمجھا
اپنے کردار سے تجھ کو بھی یہی درس دیا
چھوڑ کر ہم کو اُٹھائی نہ کسی سمت نگاہ
جب بھی مانگی ہے کبھی، ہم سے ہی مانگی ہے پناہ
بارہا یہ بھی بتایا تجھے، یہ اہل قبور!
کوئی طاقت ہی نہیں ان میں یہ خود ہیں مجبور
ان کی تعظیم کو جھکنا ہے سراسر بدعت
ان سے کچھ مانگنا مومن کے لئے ہے ذلت
تو نے چاہا جہاں، پھیلا دیا دستِ سوال
ہم نہ چاہیں تو بھلا دے کوئی کیا اسکی مجال
ہم سے مُنہ موڑ کے غیروں کی پرستش کی ہے
قابلِ عفو نہیں تو نے وہ لغزش کی ہے
اپنے ہاتھوں سے ہوا اوہام پرستی کا شکار
اُس پہ یہ آرزو، ہو بندۂ مومن میں شمار
جتنے غفّار ہیں ہم، اُتنے ہی قہار بھی ہیں
ہر جزا اور سزا کے تری مختار بھی ہیں
ہے ہمارے ہی کرم پر تری ہستی موقوف
ہم جو چاہیں ترے ہر عضو کو کر دیں ماؤف
اب بھی ہے وقت ہمارے غضب و قہر سے ڈر
بدعت و شرک کو چھوڑ اور رہِ حق سے گزر

تو اگر تابعِ فرمان ہمارا ہو جائے
حشر میں پھر تری بخشش کا سہارا ہو جائے

عامر عثمانی

اذانِ بُت کدہ!

عشق و وفا کی راہگذر میں زیرِ قدم جب کانٹے آئے
کتنے ہی اربابِ محبت ساتھ مرا دیکر پچھتائے

جشنِ چراغاں کرنے والو! تم نے یہ کیسے دیپ جلائے
اور گھٹے کمیاب اجالے اور بڑھے ظلمات کے سائے

رنج میسر ہو یا راحت، فتح ملے یا سر کٹ جائے
لیکن یارب شوقِ طلب پر غفلت کا الزام نہ آئے

کس کو ہم مجرم ٹھیرائیں، کس کو دیں الزام کہ ہم نے
اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی عظمت کے ایوان گرائے

خوب ہے ملنے اربابِ محبت ذکر و بیانِ عظمتِ ماضی
لیکن غازی وہ ٹھیرے گا جو ماضی کو حال بنائے

شیوۂ اہلِ عزم و یقیں ہے طوفانوں سے ٹکر لینا
اس کو مجاہد کون کہے گا سیل کی رو پر جو بہہ جائے

راہِ وفا کا رہرو ہوں میں، کانٹوں پر چلنا ہے مجھکو
کربِ بلا سے ڈرنے والا ہرگز میرے ساتھ نہ آئے

اُس مذہب کا باغی ہوں میں جو اپنے اربابِ ہمم کو
رزم گہِ جلوت سے اٹھا کر گوشۂ خلوت میں لیجائے

نغمۂ و نَے کے متوالوں کو صاحبِ وجد و حال تو دیکھا
لیکن اِن خاصانِ خدا سے رزم کے میداں خالی پائے

غیروں نے جو بھڑکائے تھے اُنکو بجھایا ہم نے، لیکن
جو اپنوں نے بھڑکائے ہیں اُن شعلوں کو کون بجھائے

راہ نورد و! آسکتے ہیں جانبازی کے سخت مراحل
یوں مٹ جانا راہِ وفا میں، لاش بھی ڈھونڈے ہاتھ نہ آئے

فضلِ خدا سے رشتہ توڑے، کفر جلی سے ناطہ جوڑے
دیر سے بیٹھا ہے اک صوفی قبرِ ولی پر آس لگائے

چھوڑ گئی تثلیث کو پیچھے تیز قدم توحید ہماری
ہم نے مٹی کے ڈھیروں پر ماتھے ٹیکے پھول چڑھائے

اے غمخوار دیر مت پوچھو کیوں پیہم رفتار رہتا ہوں
دل پر عجب عالم طاری ہے بن رستے آرام نہ پائے

خم لینا اور ہنسکر لینا، سر دینا اور شوق سے دینا
کوئی یہ باتیں کیا سمجھے گا جب تک دل پر چوٹ نہ کھائے

قبروں پر جب میلے دیکھے تب یہ بات سمجھ میں آئی
بن جاتے ہیں ناداں انساں کس آسانی سے چوپائے

عامر مثلِ نشۂ بادہ گمراہی بھی ایک نشہ ہے
جن کو اپنا ہوش نہیں ہے کیسے انھیں کوئی سمجھائے

درد سعیدی

قطعہ

بن جائے پھر حرم نہ عقیدت کا بتکدہ
مجھ کو یہ خوف چشمِ عقیدت نگر سے ہے

سر پر اٹھائے پھر نہ وہ خانقاہ کو
تقدیس کچھ حرم کی نہ دیوار و در سے ہے

سجدے یہ احترام کے سب بے جواز ہیں
سجدوں کا احترام شریعت کے ڈر سے ہے

ہے اہلِ کاروانِ طریقت یہ وہ مقام
گمراہیوں کا خوف جہاں راہبر سے ہے

ذوق جامی

اسلام کے نئے بُت ساز

اے خدا رکھے ترقی اس قدر کی قوم نے
بن گئے آئینۂ حیرت بتانِ مکر و فن

ہو رہی ہیں ارتقا کی منزلیں طے پے بہ پے
جام و بادہ، رقص و نغمہ، اختلاطِ مرد و زن

پردۂ فرسودہ گر باقی نہیں تو کیا ہوا
ہیں مگر نامِ خدا باقی رسوماتِ کہن

یہ کھلے بازار پھرنا دخترانِ قوم کا
دید سے شرمندہ جنگی اہلِ مغرب کا چلن

ان بزرگانِ مقدس کی کروں تعریف کیا
مغربیت پہ ہے جن کی دو رِ پیری خندہ زن

رہبرانِ قوم کی توصیف ہو کیونکر بیاں
نام سے اسلام کے پڑتی ہے ماتھے پر شکن

مسجدیں ویران ہیں آباد میخانے ہوئے
عیش و مستی کے بھنور میں غرق ہے سارا وطن

یہ بزرگانِ طریقت صوفیانِ پاکباز
سی رہے ہیں روز ناموسِ شریعت کا کفن

کنجیاں رکھتے ہیں اپنے ہاتھ میں جنت کی یہ
زیرِ دامن ان کے ہیں فردوس کے سرو و سمن

حکم پر قرآن و سنّت کے عمل کرتے نہیں
ان کی ملت ان کا مذہب ہے رسوماتِ کہن

شرک و بدعت کے فسانے خانقاہوں میں ہیں عام
اور مجالس میں غرض کی بُت نوازی کا چلن

کیا تعجب ہے یہی حالت رہی گر قوم کی
بُت گری کرنے لگے اک روز دستِ بُت شکن

بزمِ ابراہیم کی ریت بتانِ آذری!
خوب ہے وحدت پرستوں کا شعارِ کافری

یہ محرم کے تماشے اور یہ جشنِ شبِ برات
گیارہویں کی مجلسیں یہ مقبروں پر اژدہام

نت نئی بدعت پرستی اُمتِ مرحوم کی
زینِ عرسوں کا میلوں کا یہ تزک و احتشام

یہ مزاراتِ مقدس یہ بزرگوں کے نشاں
جانتی ہے جن کو دنیا ایک پاکیزہ مقام

زمزمے قوالیوں کے اور یہ ڈھولک کا شور
لوگ جن پر ناچتے ہیں مست ہو ہو کر مدام

رہ گئے قبروں کے پتھر سجدہ ریزی کے لئے
ہو چکا رخصت دلوں سے مسجدوں کا احترام

مانگی جاتی ہیں مزاروں سے مرادیں رات دن
بن چکی ہیں قبلۂ حاجات قبریں لاکلام

بُت پرستی گر کرے کوئی تو کافر بن گیا
پوجنا قبروں کا مسلم کیلئے ہے نیک کام

سر بتوں کے سامنے غیروں کا جھکنا کافری
اور مسلمانوں کے سجدے سجدہ ہائے احترام

مقبروں میں ہے پرستش روز غیر اللہ کی
خانقاہوں میں چھلکتے ہیں مئے بدعت کے جام

خوب ہے یہ اہلِ دیں کی پیرویٔ آذری
خوب ہے اولادِ ابراہیم کا دینی نظام

دین کی تعلیم جنسِ خام ہو کر رہ گئی
حق پرستی کفر کا پیغام ہو کر رہ گئی

بسمل سعیدی

شہ پارے

○

مستغنیٔ احکامِ شریعت ہولوں
وابستۂ اوہامِ طریقت ہولوں
چھوڑیں گے نہ اب حضرتِ مرشد کے قدم
بہتر ہے کہ اللہ سے رخصت ہولوں

○

صوفی نے کہا خستہ ہے درگاہ کا حال
اے روحِ مزار! اک نظرِ فیضِ کمال
مُلّا نے کہا ہوتی نہ یہ حالتِ دیں
گر روح کو ہو سکتی تصرّف کی مجال!

○

ملتی ہے جب اک شوخ و فتنگ اِن کو سرِ راہ
محشر بقدم، سیمتن، آوارہ نگاہ —!
مُلّا کو نظر آتا ہے اس میں ابلیس!
صوفی کو نظر آتا ہے اس میں اللہ!

○

بربادیٔ اسلام الٰہی توبہ
اُس صبح کی یہ شام الٰہی توبہ
قرآن سے آغاز ہو قوّالی کا
قرآن کا انجام الٰہی توبہ

○

قرآن کو مجروحِ قوانین نہ کر
اللہ کے احکام کی توہین نہ کر
تو خود تو رہے تابعِ مذہب کے رہے
مذہب کو مگر تابعِ آئین نہ کر

○

ایمان کی ہر سانس میں ڈھل جاتا ہے جہل
ایقان کی رگ رگ میں مچل جاتا ہے جہل
ثابت نہیں کر سکتے، اُسے جہلِ علوم
جب دین کے آغوش میں پل جاتا ہے جہل

راغب مرادآبادی

○

قبروں پہ شب و روز یہ میلے ٹھیلے
یہ پھول چنبیلی کے یہ کھلتے بیلے
پیرانِ ریائی سے خدا سب کو بچائے
ایماں سے مسلماں کے یہ برسوں کھیلے

○

دل سوزِ نہاں سے ہو چکے ہیں خالی
اک کھیل ہے اب ذکر ہو یا قوّالی
ہُو حق کا یہ غوغا نہیں اس گلشن میں
اک آگ بھڑک رہی ہے ڈالی ڈالی

○

پیرانِ ریائی کے نہ پوچھو حالات
دل کش ہے اگر صبح تو دلچسپ ہے رات
معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں
حضرت ہی کے دم سے ہیں یہ ساری برکات

○

منبر پہ بصد عجز و نیاز آتے ہیں
رد رو کے نکات خلق سمجھاتے ہیں
لیکن یہ خدا پرست، تسبیح بدست!
خلوت میں کچھ اور شغل فرماتے ہیں

عبدالحمید ارشد

ترانۂ توحید

خداوندا! تو ہستی ربِ عالم ، واحد و یکتا
نداری ہیچ ہمسر، نے ترا باشد کسے ہمتا

جہانے ساختی از آب و گل بہرِ ظہورِ خود
چہ حکمت!! حکمتِ کامل، چہ صنعت! صنعتِ زیبا

جہاں، روشن شدہ است از پرتوِ حُسنِ دل افروزت
کجا شمس و قمر باشد؟ کجا حُسنت جہاں آرا!

توئی خلاقِ عالم، صانعِ کامل، شہنشاہے
سزاوارِ جہانبانی توئی در پستی و بالا!

تعالی اللہ! رخِ پاکِ تو حُسنِ دلاویزت
ہمہ عالم شدہ حیراں، ہمہ عالم بود شیدا

نمی یارد کسے ہرگز، برآرد حاجتِ کس را
توئی حاجت روا، مشکلکشا، بر ہر کسے بالا

ندارد ہیچ شرمے، ہیچ غیرت مشرکِ احمق
کہ سازد غیرِ تو معبود، خواند غیرِ تو آقا

ببیں آں بدعتی را کوز بدذوقی و بد بینی
بخواند غیرِ حق تا او برآرد حاجتِ او را

نہے احسان فرمودی کہ بہرِ محوِ کفر و شرک
فرستادی رسولِ خود محمدؐ گوہرِ والا

کتابے دادۂ او را زفضلِ بے حسابِ خود
کہ عاجز از نظیرش عالمِ ادنیٰ و ہم بالا

ہمہ از برکتِ توحید تُست ایں نعمتِ وافر
ہمیں قرآنِ پاکِ ما، امام المرسلینؐ ما

الٰہی! ارشدِ مسکیں ندارد غیرِ تو آقا
توئی آقائے من، مولائے کُل، بے مثل و بے ہمتا

ابوالبیان حماد

"آثارِ توحید"

یہ جہانِ رنگ و بوئے، عالمِ کون و فساد آہن و سنگ و زجاج و آب و آتش خاک و باد
تاجدارِ کشورِ خاور، وہ روشن آفتاب مسند آرائے تجلی گاہِ انجم، ماہتاب
چرخِ نیلی فام سقفِ پرشکوہ و زرنگار بے عمود و بے ستون و بے وسیلہ استوار
ابر و باد و موج و طوفاں ساحل و دشت و جبل یاسمین و سنبل و ریحان و نسرین اور کنول
سرو و شمشاد و صنوبر، بانؔ و گلنار و چنار نکہتِ گل، صوتِ بلبل، جزر و مد، یہ جوئبار
نور و ظلمت، دھوپ چھاؤں، اختلافِ روز و شب صورتوں کا فرق، یہ نیرنگِ اشکال عجب
یہ فضائے ہستی، ارض و فرازِ آسماں عرش و کرسی سدرہ و طوبیٰ مکان و لامکاں
آبشاروں کا ترنم، نغمۂ جوئے رواں رقصِ طاؤسی، پپیہے کی سُریلی پی کہاں
بجلیوں کی یہ چمک اور صاعقہ کی یہ کڑک سبزۂ نو کی لہک، پھولوں کی بھینی مہک
دن کا ہنگامہ، سکوتِ شام، تاروں کے گہر رات کا پرہول سناٹا، نبہاشیرِ سحر
گردشِ ایام، اعصار و قرون و ازمنہ امتیازاتِ قبائل، اختلافِ السنہ
ناچتی گاتی ہوائیں، گنگناتی ندیاں نغمۂ بادِ سحر، فصلِ بہارِ گلستاں
خامشی کی راگنی، یہ چاندنی کی نغمگی جگنوؤں کی روشنی اور یہ گلوں کی تازگی
یہ تحیر آفریں نقش و نگارِ کہکشاں اور یہ قوس و قزح، اور اس کی یہ رنگینیاں
سازِ فطرت کی مدھر تانیں، فضاؤں کے یہ گیت غلبۂ دینِ مبیں، باطل کی ہار اور حق کی جیت
زمزمے جھرنوں کے، نغمے آبشاروں کے سرود اور صلواتِ ملائک، چاند تاروں کے درود

سب گواہی دے چکے اللہ کی توحید پر
کیوں نہ پھر آمادہ ہو انسان بھی تجدید پر

لہ عرب کا ایک مشہور درخت جسے شعرائے عرب اپنے کلام میں ویسے ہی استعمال کرتے ہیں جیسے شعرائے عجم سرو و صنوبر کو۔

رعنا ظفر

شرک و بدعت کی گرم بازاری

چل رہی ہیں شرک و بدعت کی ہوائیں چار سُو
گھومتے پھرتے ہیں پیرانِ ریائی کو بہ کو!
عام ہے بدعات و بے دینی کی اب تو گفتگو
ملّتِ اسلام کی خطرے میں ہے پھر آبرو
رازِ توحید سے آج اک جہاں بیگانہ ہے
اب حقیقت سے زیادہ عظمتِ افسانہ ہے

ایک دنیا سر بہ خم قبروں پہ آتی ہے نظر
ہے دلوں پر ان کے پیروں کی کرامت کا اثر
کیا خبر ان کو کہ یہ بھی ہے شریعت سے مفر
جو موحّد ہیں نظر رکھتے ہیں وہ اللہ پر
جز خدا کے کوئی بھی مالک نہیں قادر نہیں
غیب کا عالم نہیں اور حاضر و ناظر نہیں!

سر عقیدت سے مزاروں پر جھکانا بھی ہے شرک
منتوں کی ان پہ چادر چڑھانا بھی ہے شرک
اور قبروں پر چراغوں کا جلانا بھی ہے شرک
"المدد یا شیخ" کا نعرہ لگانا بھی ہے شرک
حشر میں مشرک کی بخشش ہو نہیں سکتی کبھی[1]
شرک سے ہوتی ہے توحید و رسالت کی نفی

مسلم و مشرک کی ہیں راہیں جدا منزل جدا
اُس کا ہے صرف اک خدا اُسکے ہزاروں ہیں خدا
دل سے قائل ہے یہ ارشاد رسول اللہ کا
خواہشوں پر نفس کی قائم ہے اُس کا سلسلا
جو موحد ہے وہ ایسے کام کر سکتا نہیں
بھول کر ترکِ رہِ اسلام کر سکتا نہیں

---

[1] ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ (قرآن مجید)

ابوالعرفان منت انصاری

سفیدی پر سیاہی

رخسار سے ہے گردِ مزارات ہویدا
سجدوں کی جبینوں سے جھلکتی ہے سیاہی
اے "اشہد ان اللہ" کے پیرو یہ بتا دے
رخسار و جبیں دیتے ہیں اب کس کی گواہی

سجدے بھی کئے خاک مزاروں کی بھی چاٹی
بتلاؤ تو کیا ہیں یہی احکام الٰہی!
جو بات تمہاری ہے شریعت سے الگ ہے
دو دن بھی نہ فرمانِ محمدؐ سے نبھاہی

مسجد سے تمہیں عار مزاروں سے عقیدت
اللہ کرے دُور دلوں سے یہ سیاہی
غیرت کی ہے یہ بات بڑے شرم کی جا ہے
ہو شرک کا سالار محمدؐ کا سپاہی!!

کیا کیا نہ مزاروں پہ ان آنکھوں نے دکھایا
توبہ ہے الٰہی مری توبہ ہے الٰہی
مزارِ عقیدت تجھے رہتی نہیں معلوم
ہوتی ہے ذرا سے میں سفیدی پہ سیاہی

ابوالمجاہد زاہدؔ

اشارے

رموزِ کون و مکاں کو ٹٹولنے والا — مزہ تو جب ہے کہ خود بے نقاب ہو جائے
خدا کی راہ پر آنا پڑے گا مجبوراً — ابھی کچھ اور یہ انساں خراب ہو جائے

سنور رہے ہیں نئے سر سے گیسوئے افکار — اب اپنی خیر منائے تمدنِ گمراہ
نکھر رہا ہے حیاتِ نظامِ نو کا جمال — نہ رنگ ہے نہ وطن ۔ لا الٰہ الا اللہ

---

(۱)

اے ناصیہ سائے در باطل برخیز
یک حرف بگویم بسوئے ما بنگر
آسودگی امن و اماں گر خواہی
لا تدع مع اللہ الٰہاً آخر

(۲)

رنگ و نسل و وطن کے دلکش لفظ
ہیں اساس تباہیٔ عالم
بہر امنِ جہاں ضروری ہے
وحدتِ رب و وحدتِ آدم

پسند آئی مجھے بات اک مفکر کی — خدا کرے کہ تری بھی سمجھ میں آ جائے
یہی ہے "کشف" ترا آج کے زمانے میں — کہ تو حقیقتِ توحید ہی کو پا جائے

ستیزہ کار ہیں تاریکیاں اجالوں سے — گماں کے پنجۂ بیداد میں حقیقت ہے
تو اس فضا میں اگر نامِ حق بلند کرے — مرے عزیز! یہ تیری "بڑی کرامت" ہے

بہت ہی خوب ہے یہ وجد و حال کی دنیا — بہت ہی سامعہ پرور ہے بزمِ قوالی
مرے عزیز! مگر تو نے یہ بھی سوچا ہے — یہ بیخودی ہے کہ ہے بیخودی کی نقالی

بجھا رہا ہے جو ایمان کے چراغوں کو — وہ "بھوت" تیرے "فتیلوں" سے جل نہیں سکتا
سوارِ ذہنیتوں پر ہے آج جو "آسیب" — وہ تیری "چلہ کشی" سے تو ٹل نہیں سکتا

جو برق تابِ عزائم کو مضمحل کر دے — اسے حیات کا پیغام میں نہیں کہتا
سبق پڑھائے جو انساں کو ترکِ دنیا کا — اسے تصوفِ اسلام میں نہیں کہتا
یہ جوگیانہ طریقے یہ راہبانہ شعار
یہ زندگی سے ہے اے بیخبر گریز و فرار

محمد عبد العزیز شرقی

سرمستِ بادۂ مئے توحید سیدنا بلالؓ

سرمستِ بادۂ مئے توحید ایک دن
کوڑوں سے پٹ رہے تھے سرِ رہگذر کہیں
تھا جرم ان کی وردِ زباں ہے احد احد
اور وہ منات و لات کو پوجتا نہیں
ہر تازیانہ ذکرِ خدا سے تھا ہمنوا!
یہ دردِ عشق بھی ہے عجب لذّت آفریں
کہنے لگا بہ طنز وہاں اک ستم ظریف
تم جس پہ جان دیتے ہو وہ پوچھتا نہیں
سرخیلِ عاشقانِ نبیؐ نے دیا جواب
سُن لو مری یہ بات کہ ہو عقل کے قریں
جاتے ہو تم جو مٹی کا برتن خریدنے
ٹھنکا کے دیکھ لیتے ہو کچا نہ ہو کہیں
تم تو حقیر شئے کو بھی لو دیکھ بھال کر
مولیٰ مرا خریدے یونہی کیا مرے تئیں

شبنم رومانی

تلقین

اے بحث کے اماموا!
اک مردِ باوفا کی تعلیم یاد رکھو
نقطہ کبھی نہ ہوگا تقسیم یاد رکھو
رسّی خدا کی تھامو!
اے بحث کے اماموا!

اے غازیانِ ہستی!
اسرارِ کیف و مستی زاہد پہ فاش کیوں ہیں
کل تک جو بُت شکن تھے اب بُت تراش کیوں ہیں
اتنی مہیب پستی!
اے غازیانِ ہستی!

قرآں سے منھ نہ موڑو!
کیوں بٹ گئے ہو تم بھی فرقوں میں ٹولیوں میں
کیوں گر پڑے ہو تم بھی غیروں کی جھولیوں میں
تقلیدِ غیر چھوڑو!
قرآں سے منھ نہ موڑو!

رشتہ خدا سے جوڑو!
ایماں کرینگے غارت ابلیس کے یہ چیلے
مُردوں کی یہ تجارت قبروں کے یہ جھمیلے
ان بدعتوں کو چھوڑو!
رشتہ خُدا سے جوڑو!

دیکھو وہ دُور اُفق میں
توحید کا سویرا اک جال بُن رہا ہے
دل اپنی دھڑکنوں کا پیغام سُن رہا ہے
دیکھو وہ نُور اُفق میں!
دیکھو وہ دُور اُفق میں!

ابر احسنی گنوری

"توحید"

پاسباں عقل کی ایماں کی اماں ہے توحید
راز تخلیق ہی سوچو تو نہاں ہے اس میں
قابل فخر ہے عزت کا نشاں ہے اس میں
آدمیت کی جہاں میں نگراں ہے توحید

عبد و معبود کا رشتہ ہے اسی سے محکم
اہرمن نام سے اس کے ہی لرز جاتا ہے
مرتبے روز نئے اس سے بشر پاتا ہے
وجہ عظمت ہے یہی عظمتِ یزداں کی قسم

انبیا آئے اسی کے تو پیامی بن کر
جز خداوند جہاں میں کوئی معبود نہیں
ایک خالق کے سوا کوئی بھی مسجود نہیں
کاش رہ جائے عقیدہ یہ دوامی بن کر

وہ خدا خالق کل۔ مالک و مختار جہاں
جو برے وقت میں انسان کے کام آتا ہے
اپنے بندوں کی ہر امید جو برلاتا ہے
دل میں رہنے نہیں دیتا کوئی باقی ارماں

جو بڑے پیار سے کہتا ہے طلب ہم سے کرو
کوئی سن ہی نہیں سکتا ہے تمہاری فریاد
کوئی کر ہی نہیں سکتا ہے تمہاری امداد
ہم خوشی بخشتے ہیں کسب طرب ہم سے کرو

ہم اسے چھوڑ کے غیروں سے کریں جا کے سوال
سجدے قبروں کو؟ یہ اعمال ہیں کتنے گندے
تعزیوں سے ہوں تمنا طلبی کے دھندے
آدمیت کا ہے کیا اس سے زیادہ بھی زوال؟

صاف قرآں میں اللہ کا اعلان ہے یہ
اور ہم ان کی ہی مخصوص نظر کے محتاج
سب نبی اور ولی ہیں مرے در کے محتاج
ہم ہیں سچے کہ خدا صاف سی پہچان ہے یہ

اس پہ دعوی ہے ہمارا کہ مسلمان ہیں ہم
رشتہ اللہ سے بندوں کا ملانے والے
شرک کا نام زمانے سے مٹانے والے
دین برحق کے زمانہ میں نگہباں ہیں ہم

بت پرستوں پہ ہمیں کہیئے فضیلت کیا ہو
حکم شیطاں کی کیا کرتے ہیں دونوں تعمیل
شرک کی دونوں کیا کرتے ہیں یکساں تاویل
اہل تثلیث پہ طعنوں کی ضرورت کیا ہے

کر نہ تذلیل حمیت کی ذرا جوش میں آ
تیرے کردار سے اللہ و پیمبر ہیں ملول
تیرا ایمان ہے قرآن و احادیث رسول
اے مسلمان خدا کے لئے اب ہوش میں آ

بت پرستی تو مسلماں کو سزاوار نہیں
دین اسلام کی ذلت تجھے منظور ہے کیوں
اپنے خالق سے بغاوت ترا دستور ہے کیوں
تو موحد ہے موحد کا یہ کردار نہیں

ماہر القادری

آہ ـــــ یہ مناظر!

ہر طرف خیمے لگے ہیں، دُور تک بازار ہے
یہ نمائش ہے کوئی میلہ ہے یا تہوار ہے

کوئی بارات اس جگہ اُتری ہے با صد کرّ و فر
میں یہ سمجھا شامیانوں کی قطاریں دیکھکر

یہ نفیری کی صدائیں، یہ کٹوروں کی کھنک
یہ دھوئیں کے پیچ، یہ پھولوں کے گجروں کی مہک

نیم وا بُرقعے نگاہوں پر فسوں کرتے ہوئے
شوقِ نظارہ کو ہر لحظہ فزوں کرتے ہوئے

ہے یہ تقریبِ عقیدت، عُرس ہے اک پیر کا
کام کرتی ہے یہاں کی خاک بھی اکسیر کا

اک طوائف گا رہی ہے سامنے درگاہ کے
کیا مزے ہیں حضرت قبلہ سہاگن شاہ کے

ساز پر کچھ چھوکرے قوالیاں گاتے ہوئے
گٹکری لیتے ہوئے، ہاتھوں کو بچکاتے ہوئے

رقص فرمانے لگے، کچھ صاحبانِ وجد و حال
یہ کرامت شیخ کی ہے، یا ہے نغمہ کا کمال

عورتوں کی بھیڑ میں نظارہ ٹھوکر کھائے ہے
اس ہجومِ رنگ و بو میں کب خدا یاد آئے ہے

مقبرے کی جالیوں پر عرضیاں لٹکی ہوئیں
یہ وہ منزل ہے جہاں ہیں نیکیاں بھٹکی ہوئیں

ان میں لکھا ہے ہماری جھولیاں بھر دیجئے
دردِ دل سُن لیجئے، مشکل کشائی کیجئے

آپ اگر چاہیں تو ٹوٹے آئینوں کو جوڑ دیں
آندھیوں کو روک دیں طوفان کے رُخ موڑ دیں

آپ کو اللہ نے سب کچھ دیا ہے اختیار
میرا گلشن بھی بہت دن سے ہے بے فصلِ بہار

پھول بٹتے ہیں کہیں، اور دیگ لٹتی ہے کہیں
دل مچلتا ہے کہیں، اور سانس گھٹتی ہے کہیں

یہ ملیدے، یہ بتاشے، یہ مٹھائی کے طباق
یہ عقیدت کا تموّج، یہ وفورِ اشتیاق!

بالوں باتوں میں یہاں خدام دے جاتے ہیں جُل
یہ اگر کی بتیاں، لوبان، صندل، عود و گل

یہ چراغوں کی قطاریں، جگمگاتے بام و در
جس طرف بھی دیکھئے سامانِ تفریحِ نظر

چادریں چڑھتی ہوئیں، ڈھولک بھی ہے بجتی ہوئی
یہ موحد ہیں جو لپٹا کر رہے ہیں قبر کی

کوئی سجدہ میں جھکا ہے، کوئی مصروفِ طواف
تھام رکھا ہے کسی نے دونوں ہاتھوں سے غلاف

رو رہا ہے کوئی چوکھٹ ہی پہ سر رکھے ہوئے
ہیں کسی کے ہاتھ بہرِ التجا اٹھے ہوئے

بدعتوں کے باب میں وہ کب کسی گھر بند ہیں
جن کے سینوں میں عقیدت کے سمندر بند ہیں

دیکھتا ہی رہ تماشائی زباں سے کچھ نہ بول
چادروں کی دھجیاں بکتی ہیں یاں سونے کے مول

مُن برستا ہے یہاں، چاندی اُگلتی ہے زمیں
آخرت کی یاد اس جا پاؤں رکھ سکتی نہیں

زائروں کے خود مجاور ہی جھکا دیتے ہیں سَر
مور کے پنکھوں کے سایہ میں کلاوے باندھ کر

ہے یہ تعلیم نبیؐ، فرمانِ قرآنِ کریم
ہے ہر اک بدعت ضلالت، شرک ہے ظلمِ عظیم

بدعتیں ہی بدعتیں کی ہر طرف شیشہ گری
اس طرح تردید، فرمانِ رسول اللہ کی

مُدعی توحید کے اور شرک سے یہ ساز باز
اک طرف قبروں پہ سجدے، دوسری جانب نماز

التجا، فریاد، استمداد غیر اللہ سے
یہ نہیں ہے شرک، تو پھر شرک کس کا نام ہے

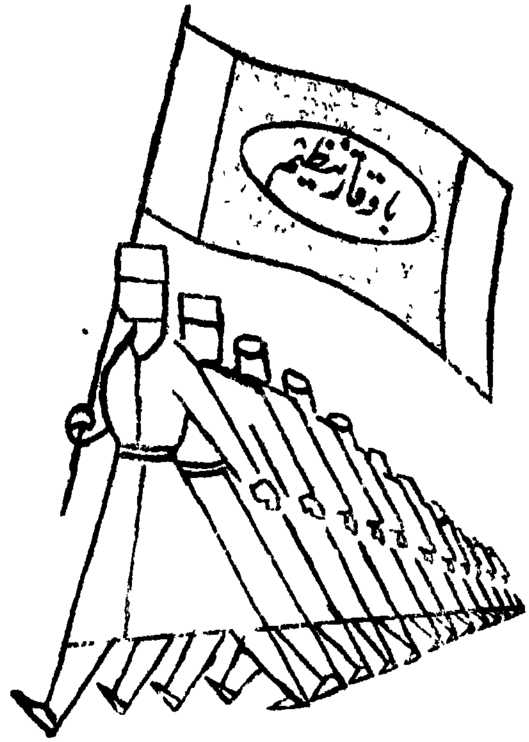
تابکے یہ کھیل دُنیا کو دکھایا جائے گا
مضحکہ توحید کا کب تک اُڑایا جائے گا

باوقار تنظیم

باہمی بچت کی پرافٹ شیئرنگ اسکیم

اقتصادی انتشار اور معاشی بدحالی کی اصلاح کیلئے

ہماری پہلی پیشقدمی



ایک ضروری اعلان

ماہ مئی ۵۸ء میں پانچویں گروپ کی تکمیل کیساتھ "باوقار تنظیم" کا ابتدائی پروگرام مکمل ہوگیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ خلاف توقع ہم نے اپنے ابتدائی مراحل بڑی تیز رفتاری سے طے کر لئے ہیں اس کے لئے ہم رب کریم کے بیحد شکرگذار ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ہم ان احباب کے بھی تہ دل سے ممنون ہیں جنہوں نے کارکنان تنظیم پر پورا اعتماد کر کے بڑی فراخ دلی سے اس اسکیم کا پرجوش خیر مقدم کیا اور اپنے پرخلوص تعاون سے ہماری حوصلا افزائی فرمائی۔ ورنہ ہوسکتا تھا کہ آجکل کے فاسد ماحول میں جہاں جھوٹ، خیانت، دھوکہ اور لالچ کا دوردورہ ہے، ایک ایسی اسکیم (ممبر سازی) جو جوئے، لاٹری اور تقدیر آزمائی جیسے دلفریب محرکات سے خالی ہو کسی توجہ کی مستحق نہ سمجھی جاتی اور ایک دیانتدارانہ اصولوں پر مبنی اسکیم کا قدم جمانا مشکل ہو جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ پانچ گروپوں کی تکمیل کے بعد یہ اسکیم اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی ہے۔

ابتدا میں پانچ گروپوں کی تعداد متعین کرنے سے ہمارا مقصد یہی تھا کہ کامیابی سے چلنے کیلئے یہ کم از کم تعداد تھی، اس سے کم تعداد میں ایسی اسکیمیں کبھی بھی کامیابی سے نہیں چلائی جاسکتیں۔ اب اس اسکیم کو پوری طرح کامیاب، مفید عام اور بارآور بنانے کے لئے اس کی ممبر سازی جاری رہیگی۔ گروپ ۶ زیر تکمیل ہے۔ دسمبر ۵۸ء تک کم از کم بارہ گروپ مکمل کرنے کا پروگرام ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل کے بعد انشاءاللہ تعالیٰ ہم اپنے منصوبوں کو پوری قوت کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہونچا کر مفید عام اور بارآور بنا سکیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ حسب سابق ہمارے معاون احباب اپنے پرجوش جذبہ اور پرخلوص تعاون سے بدستور ہماری حوصلا افزائی فرماتے رہیں گے۔

زیر تشکیل گروپ ۶ کی پہلی ڈرائنگ انشاءاللہ تعالیٰ ۲۳ جون ۵۸ء کو باقی پانچ گروپوں کے ساتھ ہی ہوگی۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۞ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۞

تفصیلات: **باوقار کمپنی لمیٹڈ۔ بندر روڈ۔ کراچی** سے حاصل کریں

فون ۹۲۳۳


ننھے بچوں کو بیماری سے بچائیے!
بہارِ اطفال
شربت
ننھے بچوں کا قدرتی محافظ ہے
بچوں کی عام جسمانی کمزوری لاغری دانت نکلنے کی تکالیف اسہال نزلہ
اپنے شہر کے سٹاکسٹوں یا ادارہ کی ایجنسیوں سے حاصل کریں
فہرست مفت طلب کریں
اشرفیہ

مطبوعہ - ادبی پریس - رابسن روڈ - کراچی

پرنٹر و پبلشر - مسرور حسین